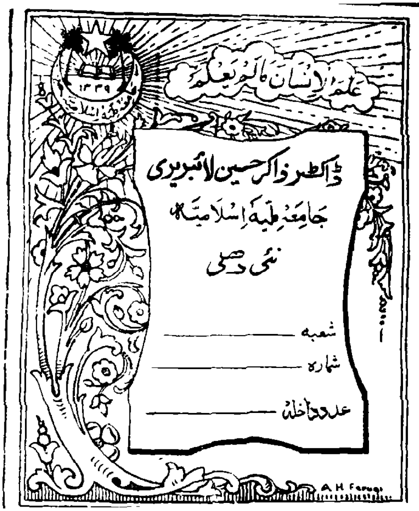

عَلَّمَ الْإِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ
۱۳۳۹
ڈاکٹر ذاکر حسین لائبریری
جامعہ ملیہ اسلامیہ
نئی دہلی
شعبہ
شمارہ
عدد داخلہ
A. H. Faruqi

جلد سازی مندرجہ ذیل طور سے ہے۔

	جلد	شمارہ	ماہ	سال
۱	۹	۱۰	جنوری	۱۹۵۵ء
۲	۹	۱۱	فروری	//
۳	۱۰	۱	اپریل	//
۴	۱۰	۲	مئی	//
	۱	۳	جون	//
۶	۱۱	۱۰	جنوری	۱۹۵۶ء
۷	۱۱	۱۱	فروری	//
۸	۱۱	۱۲	مارچ	//

آموزش

جلد ۹ شمارہ ۱۰] لاہور [جنوری

اس شمارہ میں

ادارہ تحریر { پروفیسر سراج الدین / پروفیسر ایم ۔ اے ۔ مخدومی }

معاونین { عبدالغفور چوہدری / فضل احمد }

ماہنامہ

آموزش

لاہور

جنوری سنہ ۱۹۵۷ء

جلد ———— ۹

شمارہ ———— ۱۰

سالانہ چندہ

پاکستان کے لیے ۶ روپے

غیر ممالک کے لیے ۸ روپے

قیمت فی پرچہ دس آنے

پبلشرز

یونی ورسٹی بک ایجنسی لاہور

آر۔ ایچ۔ ڈی۔ خالد۔ پرنٹر پبلشر نے دین محمدی پریس لاہور میں طبع کرا کے
یونیورسٹی بک ایجنسی ۸ کچہری روڈ۔ لاہور سے شائع کیا

اس ضیاع کو روکیے

ایم۔ اے مدنی

آموزش کے اس شمارے میں ایک تفصیلی مضمون شائع ہو رہا ہے جس میں اعداد و شمار سے ثابت کیا گیا ہے کہ جو بچے پرائمری مدرسے کی پہلی جماعت میں داخل ہوتے ہیں ان کی اکثریت پانچویں جماعت کی پڑھائی ختم کرنے سے پہلے پہلے ہی مدرسہ چھوڑ جاتی ہے۔ مثلاً سنہ ۱۹۵۲-۵۳ء میں پرائمری کا نصاب کامیابی سے ختم کرنے والے طلبہ کی تعداد اس تعداد کا صرف ۳۱ فی صد تھی جو پانچ سال پہلے جماعت اول میں داخل ہوئی تھی گویا جو بچے سنہ ۱۹۴۸-۴۹ء میں پہلی جماعت میں داخل ہوئے تھے ان میں سے ایک تہائی سے کم نے پرائمری تعلیم ختم کی۔ سنہ ۱۹۴۷-۴۸ء سے لے کر سنہ ۱۹۵۲-۵۳ء تک کے اعداد و شمار پر نگاہ ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ سب سے زیادہ ضیاع پڑھائی کے پہلے سال میں واقع ہوتا ہے۔ بعض حالتوں میں پہلی جماعت میں داخل ہونے والے بچوں میں سے صرف آدھے دوسری جماعت میں پہنچ پاتے ہیں، عام حالتوں میں بھی پہلی سے دوسری جماعت میں جاتے جاتے کم و بیش ایک تہائی بچے مدرسے سے غائب ہو جاتے ہیں۔

یہ صورت حالات بڑی افسوس ناک ہے۔ ہم ابھی اس قابل نہیں ہو سکے کہ ملک کے تمام بچوں کے لیے پرائمری تعلیم کی سہولتیں بہم پہنچا دیں، یہ امر بذات خود توجہ طلب ہے۔ مگر اس سے کہیں زیادہ اندوہناک یہ امر ہے کہ ابتدائی تعلیم کی جو سہولتیں موجود ہیں ان سے بھی بہت کم فائدہ اٹھایا جا رہا ہے۔ ناخواندگی کو ملک بدر کرنا آج ہماری سب سے پہلی تعلیمی ضرورت ہے۔ مگر اس ضرورت کو پورا کرنے کے لیے صرف اتنا ہی کافی نہیں کہ سرکاری بجٹ میں تعلیم کے لیے زیادہ رقم وقف کر دی جائے اور نئے مدرسے کھلیں۔ اس سے کہیں زیادہ ضروری یہ امر ہے کہ قومی آمدنی کی ہر پائی [illegible] صرف ہوتی ہے اس سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھایا جائے۔ تعلیم کے لیے جو روپیہ فراہم کرنا قوم کا کام [illegible]

[illegible] بڑی حد تک استاد کی ذمہ داری ہے۔

فاضل مضمون نگاروں نے ان اسباب پر بھی تفصیلی نگاہ ڈالی ہے جو بچوں کو مدرسہ چھوڑنے پر آمادہ کرتے ہیں۔ [illegible] مطالعہ کے مطابق بیشتر حالتوں میں مدرسہ چھوڑنے کی فوری وجہ طلبہ کی لگاتار غیر حاضری ہے۔ سب سے زیادہ غیر حاضری پہلی جماعت میں دکھائی دیتی ہے، اور اس کے بعد دوسری جماعت میں، اوپر کی تین جماعتوں میں غیر حاضری بہت کم رہ جاتی ہے، یعنی جو بچے دو سال تک مدرسے میں آنے کے خوگر ہو جائیں پھر وہ بہت کم حالتوں میں پڑھائی چھوڑتے ہیں۔ اس تجربے کی روشنی میں مدرسے کی پہلی ذمہ داری یہ نظر آتی ہے کہ وہ اپنے اندر اتنی جاذبیت پیدا کرے کہ ہر داخل ہونے والا بچہ اس کے ساتھ جلد از جلد دلی لگاؤ پیدا کرلے۔

ایک عام پرائمری مدرسہ بیشتر بچوں کے لیے جاذبیت کیوں نہیں رکھتا؟ فاضل مضمون نگاروں نے اس کے پانچ اسباب بیان کیے ہیں۔

(۱) مدرسے میں لڑکوں کی دلچسپی کا کوئی سامان موجود نہیں ہوتا۔

(۲) استاد کا طریقۂ تعلیم خشک ہوتا ہے۔

(۳) تعلیم کو دلچسپ بنانے کے وسائل اختیار نہیں کیے جاتے۔

(۴) طلبہ پر غیر ضروری پابندی عائد کی جاتی ہے اور انہیں اوقات مدرسہ کے بیشتر حصہ میں بھیڑ بکریوں کی طرح کمرے کی چار دیواری میں بند رکھا جاتا ہے۔

(۵) مدرسے کا عام ماحول بچوں کے لیے حسب حال نہیں ہوتا۔

یہ اسباب پرائمری درجہ پر کام کرنے والے تمام استادوں کو دعوت فکر دیتے ہیں۔ پرائمری مدارس کے منتظموں کو خصوصیت سے ان امور کی طرف فوری توجہ کرنی چاہیے۔ اگر پہلی جماعت کو پڑھانے والا استاد صحیح معنوں میں اہل، محنتی اور بچوں کے ساتھ ہمدردی رکھنے والا اور مدرسے کا عام ماحول اجازت دے ہو تو پرائمری درجہ کے خوفناک ضیاع کا ایک کافی حد تک تدارک ہو سکتا ہے۔

پرائمری مدارس میں ضیاع کے اسباب اَور اُن کا تدارک

چوہدری مظفرالدین و سید انور علی (مرحوم)

ہماری رفتارِ تعلیم —— پہلے اور اب

زمانہ بہت تیزی سے ترقی کر رہا ہے، اور اس میں صرف وہی ملک اور قومیں اپنی ہستی کو عزت کے ساتھ برقرار رکھ سکتی ہیں جو زمانے کے ساتھ ساتھ ترقی کرتی جائیں گی۔ یہ ایک مسلّمہ امر ہے کہ ترقی کا انحصار بہت حد تک علم پر ہے گویا دوسرے الفاظ میں آج کل کے زمانے میں وہی قومیں اور وہی ملک سرفراز اور کامران ہو سکتے ہیں جو علم کے میدان میں ترقی کرتے جائیں، اور جن کے زیادہ سے زیادہ افراد زیورِ تعلیم سے آراستہ ہوں۔ چناں چہ ہم دیکھتے ہیں کہ جو ملک اور جو قوم ترقی کی راہ پر گامزن ہوئی اس کا پہلا اصلاحی قدم تعلیم ہی کی طرف اُٹھا ہے، اور اس کی پہلی کوشش یہی ہوئی ہے کہ وہ اپنے عوام کو زیادہ سے زیادہ تعلیم یافتہ بنائے۔ ہماری اپنی اسلامی تاریخ اس تجربے کی شاہد ہے۔ موجودہ زمانے میں مغربی ممالک کی مثالیں ہماری نظروں کے سامنے ہیں جرمنی، فرانس، برطانیہ، امریکہ اور روس میں خواندگی اور تعلیم کو عام کرنے کے لیے جو کچھ کیا گیا وہ ہمیں معلوم ہے اور تعلیم نے جو ان میں بیداری پیدا کی ہے اور انھیں قعرِ مذلّت سے نکال کر بامِ عروج تک پہنچایا ہے وہ بھی ہماری آنکھوں کے سامنے ہے۔ مشرقی ممالک میں جاپان اور ترکی کی مثالیں موجود ہیں جنھوں نے پچیس تیس سال کے اندر اندر اپنی خواندگی آٹھ دس فی صد سے بڑھا کر نوّے فی صد کر لی ہے اور اس علمی ترقی کی بدولت اُن ملکوں کی حالت جس طرح سدھری ہے وہ بھی صاف ظاہر ہے۔

اس سے کون انکار کر سکتا ہے کہ تعمیرِ قوم میں تعلیم کا بہت بڑا حصہ ہے۔ تعلیم ہی ہے جو انسان کو انسان بناتی ہے اور اُسے خلیفۃ اللہ کے جلیل القدر منصب پر فائز کرتی ہے۔ اس کی پوشیدہ صلاحیتوں کو اجاگر کر کے اسے معاشرے کا مفید اور بہتر فرد بناتی ہے اور پس ماندہ ملکوں اور قوموں کو تھوڑے عرصے کے اندر مہذب اور طاقت ور ممالک کی صف میں لا کھڑا کرتی ہے۔

آیئے دیکھیں تعلیم کے بارے میں ہماری رفتارِ ترقی کا کیا حال ہے۔ آپ اپنے اس سنہری زمانے کا ذکر چھوڑئیے جب تعلیم و تربیت، تہذیب و تمدن اور علوم و فنون میں آپ استادِ زمانہ کہلاتے تھے، جب آپ کے افراد کی [illegible] [illegible] تھیں، جب آپ کے یہاں طالبِ علم کے لیے عسرت و افلاس کے شدائد اور سفر و حضر کی [illegible]

علم کی حفاظت کیا کرتے تھے۔ جب اُن کے شوقِ علم کا یہ عالم تھا کہ وہ دور دراز ملکوں سے علماء اور فضلاء اس کے ملکوں میں تحصیلِ علم کے لیے جوق در جوق چلے آتے تھے، اُس گئے گذرے زمانے میں بھی جب کہ ہماری حکومت ہندوستان میں زوال پذیر تھی [illegible] چرچا تھا اور مکاتب اور پاٹھ شالا ہر جگہ قائم تھے، اورنگ زیب عالمگیر کے زمانے میں ریورنڈ لانڈ کی تحریر کے مطابق ہندوستان میں ہر ستائیس لڑکوں پر ایک ابتدائی مدرسہ موجود تھا۔ ٹامس آرنلڈ نے پنجاب کی پہلی تعلیمی رپورٹ میں مسلمانوں کی تعلیمی حالت کے متعلق لکھا ہے کہ حیثیت سے علمی میدان مسلمانوں کے ہاتھ تھا۔ لیکن تاجرانِ فرنگ نے آتے ہی مسلمانوں کے تعلیمی شوق کو کچل دیا، اور جوں جوں زمانہ گذرتا گیا ان کی تہذیب و تمدن اور صنعت و حرفت کے ساتھ ساتھ ان کے علوم و فنون پر بھی کاری ضرب لگائی، اُن کے مدرسوں کو بے آباد اور تعلیم کو ناکارہ بنانے کی کوشش کی، اپنے ایسے مدرسے جاری کیے جن میں تعلیم کا زندگی اور تمدن سے کوئی واسطہ نہ تھا۔ بلکہ وہ محض انگریز حکمرانوں کے دفاتر کے لیے کلرک پیدا کرنے کے کارخانے تھے۔ اہلِ فرنگ کی اس تعلیمی پالیسی کا نتیجہ یہ ہوا کہ بجائے ہماری رفتارِ تعلیم میں رکاوٹ پیدا ہو گئی جس کا خمیازہ ہم اب تک بھگت رہے ہیں عہدِ برطانیہ میں ہماری رفتارِ تعلیم و خواندگی کا اندازہ اس بات سے لگائیے کہ ۱۸۸۱ء میں ہماری خواندگی صرف ۳½ فی صد رہ گئی اور اس کے بعد پچاس سال کے عرصے میں یعنی ۱۹۳۱ء تک خواندگی میں بمشکل ۴½ فی صد اضافہ ہوا، اور وہ آٹھ فی صد پہونچی، اور آجکل ہماری خواندگی تقریباً دس فی صد ہے۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ گذشتہ بیس بائیس سال کے عرصے میں ہماری خواندگی میں صرف دو فی صد کا اضافہ ہوا ہے۔ حالاں کہ اسی عرصے میں روس اور ترکی میں آٹھ نو فی صد سے اسّی نوّے فی صد لوگ خواندہ ہو گئے ہیں، اور تو اور جزائر فلپائن ایسے ملک میں بھی خواندگی ۷ فی صد سے پچپن فی صد تک پہونچ گئی ہے۔

ہماری سست رفتاری کا اصل سبب

آخر یہ تفاوت کیوں اور ہماری سست رفتاری کا سبب کیا؟ صاف ظاہر ہے غلامی، اور محض غلامی، جس نے ہمارے دل و دماغ کو بے کار کر دیا ہے۔ جس نے ہمارے خدمتِ خلق اور خدمتِ قوم کے جذبے کو دبا دیا۔ جس نے حب الوطنی کے جذبے کو سلا دیا، اور جس نے [illegible] اور خود فراموشی کا سبق پڑھا کر ہمیں اپنی روایات، اپنی تہذیب اور تمدن بلکہ خود اپنی ذات سے بیگانہ بنا دیا۔ جس نے ہمیں سود فراموش بنا کر ہمارے احساس زیاں تک کو زائل کر دیا۔ اور جس نے ہم میں یہ عادت ڈال دی کہ ہم اپنے کام کو بھی اپنا کام سمجھ کر نہ کریں۔ بلکہ غیروں کی خوشنودیٔ مزاج کے لیے کریں۔

آزادی نعمت اور ہمارا فرض لیکن خدا کا احسان ہے کہ اب وہ غلامی کی زنجیریں کٹ گئی ہیں

بدل گئی ہیں۔ سب سے بڑا ہمارا اپنا ملک ہے جس کا مستحکم ہونا لازم ہے اور جس کی ترقی ہمارا بنیادی فرض ہے کہ اس لیے اپنے ملک کو ترقی یافتہ بنانے کے لیے ہمیں ہر طرح کی جدوجہد کرنے کی ضرورت ہے۔ اس کے نظام تعلیم کو درست کرنا اور صحیح نظام تعلیم کے مطابق ملک وقت کے زیادہ سے زیادہ لوگوں کو تعلیم یافتہ بنانا اور نئی نسل ملک کو صحیح قسم کی تعلیم و تربیت سے آراستہ و پیراستہ کرنے کے لیے تمام رکاوٹوں اور خامیوں کو دور کرنا جو ہماری تعلیم میں حائل ہو رہی ہیں ہمارا سب سے پہلا کام ہونا چاہیے۔

یہ آپ جانتے ہیں کہ پاکستان ایک نوزائیدہ مملکت ہے جسے ابھی ترقی کی بہت سی منزلیں طے کرنی ہیں۔ اور یہ بھی آپ جانتے ہیں کہ ہمارے ملک کے لیے جس آئین کا مطالبہ کیا جا رہا ہے وہ اسلامی جمہوریت پر مبنی ہے۔ جمہوریت کی کامیابی کے لیے کسی ملک کے باشندوں کا زیادہ سے زیادہ تعداد میں کم از کم ابتدائی تعلیم سے آراستہ ہونا نہایت ضروری ہے۔ نیز اسلام کا تقاضہ بھی یہی ہے کہ ہمارا ہر فرد زندگی کے ضروری اور بنیادی علوم سے واقف ہو تاکہ وہ اپنے حقوق و فرائض کو پہچان سکے۔ نیک و بد میں تمیز کر سکے، اپنا اور اپنے ملک و قوم کا نفع و نقصان سمجھ سکے اور اپنے صحیح نمائندے منتخب کر سکے۔

آئیے جائزہ لیں کہ ہم اپنے ملک میں ابتدائی تعلیم کے لیے کیا کچھ کر رہے ہیں، اور اس میں کتنی کامیابی ہو رہی ہے۔ وہ کیا اسباب ہیں جو ہماری کوششوں کو بارآور نہیں ہونے دیتے اور ہمارے وقت اور روپیہ کے ضیاع کا باعث بن رہے ہیں۔ تاکہ ہم ان کا تدارک کر کے ابتدائی تعلیم کی توسیع میں تھوڑے سے تھوڑے روپیہ میں زیادہ سے زیادہ اچھے نتائج پیدا کر سکیں۔ اور شرح خواندگی میں اضافہ کر کے اپنے ملک و قوم کو ترقی یافتہ ممالک کی صف میں لا کھڑا کریں۔

ابتدائی تعلیم کی غرض و غایت اور اس کی تکمیل میں رکاوٹ

ابتدائی تعلیم کی غرض و غایت طلبہ میں خواندگی پیدا کرنا اور ان کی صلاحیتوں کو صحیح طور پر بیدار کرنا ہے یعنی یہ کہ وہ معمولی عبارت پڑھ کر اس کا مطلب سمجھ اور سمجھا سکیں۔ چھوٹا موٹا خط لکھ سکیں۔ اپنی روزمرہ زندگی میں صحت اور خوش حالی کے لیے مطلوبہ حساب کتاب کر سکیں اور دوسرے بنیادی علوم کے علاوہ اپنے گرد و پیش کا جائزہ لینے کی صلاحیت پیدا کر کے ان سے کام لینا سیکھیں اور ان کی ہمہ گیر تربیت کی ایسی بنیاد ڈالی جائے کہ وہ بڑے ہو کر ملک و قوم کے لیے مفید شہری بن سکیں۔ اس [illegible] کی طرف سے صرف [illegible] سال کا نصاب مقرر [illegible] ۱۹۵۰ء [illegible]

حاصل کر دی گئی ہے، یہ اس لیے کہ اس سے کم عرصے میں بچوں کو نہ ابھی طرح خواندہ بنایا جا سکتا ہے نہ ان کے علم میں پختگی پیدا ہوتی ہے اور نہ اُن کی صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کے لیے ان کی بنیادیں استوار کی جا سکتی ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ ابتدائی تعلیم کی تکمیل کے بغیر بچوں میں نہ کوئی لیاقت پیدا ہو سکتی ہے اور نہ خواندگی۔ لہٰذا ہماری کوشش یہ ہونی چاہیے کہ ہمارے زیادہ سے زیادہ بچے ابتدائی تعلیم کا نصاب پورا کر لیں، اور اس طرح پورا کریں کہ ان کا کوئی سال ضائع نہ ہو۔

ضیاع کا مفہوم

وہ بچے جو پانچ سال کے عرصے میں تعلیمی استعداد اور خواندگی کا مقررہ معیار حاصل نہیں کر سکتے یا ابتدائی تعلیم کو ادھورا چھوڑ کر چلے جاتے ہیں وہ ہماری تعلیمی رفتار کو دھیما کر دیتے ہیں، اور ہماری محنت، اپنا قیمتی وقت اور قومی روپے کے ضائع ہونے کا باعث بنتے ہیں۔ ہماری تمام محنت اور کوشش جو ہم ابتدائی تعلیم کی توسیع میں صرف کر رہے ہیں، اس صورت ہی میں بارآور سمجھی جا سکتی ہے جب ہمارے مدارس میں داخل ہونے والے سارے کے سارے طلبہ پانچ سال مقررہ عرصے میں پانچویں جماعت کا امتحان پاس کر کے چلے جائیں۔ اگر ایسا نہیں ہے تو جتنے طالب علم بھی اپنی تعلیم ادھوری چھوڑ کر جاتے ہیں یا بہرحال خاطر خواہ ترقی کر کے پانچ سال میں ابتدائی تعلیم کا نصاب پورا نہیں کرتے، اتنی ہی ہماری تعلیمی ترقی میں کمی واقع ہوتی ہے۔ اور اسی نسبت سے ہماری محنت وقت اور روپیہ جو ہم ابتدائی تعلیم پر خرچ کرتے ہیں، اکارت جاتے ہیں۔ اسی کو ہم ضیاع یا تضیع کے نام سے پکارتے ہیں۔ ضیاع کی گویا دو صورتیں ہیں (۱) ابتدائی تعلیم کی تکمیل سے پہلے طلبہ کا اخراج (۲) طلبہ کی سال بہ سال ترقی میں رکاوٹ، یعنی ان کا کسی جماعت میں ناکام ہو کر ایک سال سے زیادہ عرصہ صرف کرنا۔ موخرالذکر کو زائد المیعاد ہونے کے نام سے بھی موسوم کرتے ہیں۔ ضیاع کی ان دونوں صورتوں کے متعلق مفصل بحث بعد میں آئے گی جہاں اس کے اسباب و تدارک پر مفصل غور کیا جائے گا۔ تاکہ خواندگی کی رفتار کو بہتر بنایا جا سکے۔ یہاں ہم صرف ضیاع کی کمیت اور کیفیت کے متعلق سرسری طور پر جائزہ لیتے ہیں۔

جائزہ

ضیاع کا صحیح جائزہ لینے کے لیے اصل میں ہمیں اگر کل پاکستان کے تعلیمی اعداد و شمار کی ضرورت نہیں تو کم سے کم صوبے کے تعلیمی اعداد و شمار کی ضرورت ہے۔ لیکن چونکہ قیام پاکستان سے لے کر اب تک ملک یا صوبے کی تعلیمی ترقی کی کوئی مفصل رپورٹ شائع نہیں ہوئی۔ اس لیے ملک یا صوبے کے تعلیمی مستند اعداد و شمار میسر نہیں آ سکے۔ لہٰذا ہم اس وقت

رت لاہور قسمت کے تعلیمی اعداد و شمار پر ہی اکتفا کریں گے اور انھی کی بنا پر جو نتائج اخذ کریں گے ان کا اطلاق اپنے صوبے کے
آسانی سے کر سکیں گے کیوں کہ جہاں تک ضیاع کا تعلق ہے۔ اس کی کیفیت و کمیت یا اس کے اسباب و علل جو لاہور
کمشنری میں ہیں تقریباً وہی ہمارے صوبے کے دوسرے حصے میں ہوں گے۔

جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں ضیاع کی دو صورتیں ہیں۔ ایک ابتدائی تعلیم کی تکمیل سے پہلے طلبہ کا اخراج اور دوسری طلبہ کا کسی جماعت میں ایک یا ایک سے زیادہ سال فیل ہو کر زائد المیعاد ہونا۔ یہ اندازہ کرنے کے لیے کہ ضیاع کی یہ دونوں صورتیں کہاں تک ہمارے ابتدائی مدارس میں موجود ہیں۔ ان کا ہماری تعلیمی رفتار ترقی پر کیا اثر پڑ رہا ہے۔ اور ان کی وجہ سے ہمارا کتنا نقصان ہو رہا ہے۔ ہمیں اپنے چند گزشتہ سالوں کے ابتدائی تعلیم کے بجٹ پر نظر ڈالنی ہوگی اور ساتھ ہی ساتھ انھی سالوں کی جماعت وار تعداد کو نظر کے سامنے رکھنا ہوگا۔ چناں چہ کوائف ناظرین کی واقفیت کے لیے درج ذیل ہیں۔

(الف) قسمت لاہور کا گزشتہ سات سالوں میں ابتدائی تعلیم پر خرچ۔

سنہ ۱۹۴۵-۴۶ء قبل از پاکستان مشترکہ پنجاب	سنہ ۱۹۴۷-۴۸ء	سنہ ۱۹۴۸-۴۹ء
۲۰۲۲۴۲۰ روپے	۱۱۶۹۴۲۲۱ روپے	۲۵۴۴۶۸ روپے

سنہ ۱۹۴۹-۵۰ء	سنہ ۱۹۵۰-۵۱ء	سنہ ۱۹۵۱-۵۲ء	سنہ ۱۹۵۲-۵۳ء
۲۴۲۳۲۲۷۶ روپے	۳۰۸۴۴۰۰ روپے	۳۶۸۴۴۸۶ روپے	۴۹۶۸۹۵۸ روپے

گویا ابتدائی تعلیم پر ہم پاکستان بننے سے پہلے کے مقابلے میں تقریباً ڈھائی گنا زیادہ رقم خرچ کر رہے ہیں۔ جو یقیناً اس بات کو ثابت کرتا ہے کہ ہم ابتدائی تعلیم کے پھیلانے کے خواہشمند ہیں۔ لیکن کہاں تک اس صرف سے خاطر خواہ نتیجہ پیدا ہوا ہے۔ اس کا اندازہ مندرجہ ذیل اعداد و شمار سے لگائیے۔

گزشتہ چند سالوں کی جماعت وار تعداد طلبہ۔

سال	اول	دوم	سوم	چہارم	پنجم
سنہ ۱۹۴۷-۴۸ء	۵۰۱۹۵	۲۲۸۴۳	۲۱۰۸۰	۱۵۸۷۵	—
سنہ ۱۹۴۸-۴۹ء	۵۲۲۷۶	۲۰۹۸۱	۲۲۷۹۳	۱۸۸۴۳	—

[illegible]

سال	اول	دوم	سوم	چہارم	پنجم
سنہ ۱۹۴۹-۵۰ء	۵۷۶۲۵	۳۴۶۱۷	۲۵۷۳۹	۲۰۲۷۷	—
سنہ ۱۹۵۰-۵۱ء	۵۸۵۷۴	۳۲۷۱۹	۳۲۲۹۰	۲۳۸۳۳	—
سنہ ۱۹۵۱-۵۲ء	۶۲۳۰۹	۴۳۱۸۲	۳۲۵۳۶	۲۲۵۳۱	—
سنہ ۱۹۵۲-۵۳ء	۶۵۰۵۱	۴۱۳۳۲	۳۴۷۷۱	۲۷۳۱۱	۲۱۶۰۳

نوٹ:- چونکہ سنہ ۱۹۵۲-۵۳ء سے قبل جماعت پنجم پرائمری میں شامل نہیں تھی، اس لیے اس سے قبل کے سالوں میں جماعت پنجم کی تعداد کو ظاہر نہیں کیا گیا۔ انھی کوائف کو ذیل کی شکل بھی دی جا سکتی ہے، جن سے عیاں ہو جائیگا کہ ایک جماعت سے اندازاً کتنا فیصد حصہ اگلی جماعت میں ترقی پاتا ہے۔ اور جماعت بجماعت ہماری پرائمری کلاسز کی رفتار ترقی کیا ہے۔

پرائمری کی کل تعداد سے ہر جماعت کی نسبت

سال	اول	دوم	سوم	چہارم	پنجم
سنہ ۱۹۴۷-۴۸ء	۴۴٫۰۸	۲۲٫۶۲	۱۸٫۰۸	۱۳٫۶۲	—
سنہ ۱۹۴۸-۴۹ء	۴۲٫۶۴	۲۳٫۶۸	۱۸٫۶۵	۱۵٫۶۳	—
سنہ ۱۹۴۹-۵۰ء	۴۱٫۰۳	۲۵٫۶۲	۱۸٫۶۷	۱۴٫۶۹	—
سنہ ۱۹۵۰-۵۱ء	۳۷٫۶۴	۲۷٫۶۹	۲۰٫۶۴	۱۳٫۰۵	—
سنہ ۱۹۵۱-۵۲ء	۳۷٫۰۸	۲۷٫۰۹	۲۰٫۶۵	۱۴٫۰۴	—
سنہ ۱۹۵۲-۵۳ء	۳۲٫۶۵	۲۳٫۰۲	۱۸٫۰۴	۱۴٫۰۴	۱۱٫۰۵

مندرجہ بالا اعداد پر غور کرنے سے ذیل کے نتیجے برآمد ہوتے ہیں۔

(الف) تعداد جماعت اول میں زیادہ ہے۔ لیکن اوپر کی جماعتوں میں بتدریج کم ہوتی گئی ہے۔

(ب) جماعت اول کی تعداد کی نسبت دوم میں تعداد کی یک لخت کمی نظر آتی ہے۔

(ج) سنہ ۱۹۴۷-۴۸ء میں جماعت اول میں تعداد طلبہ ۵۰۱۹۵ تھی۔ یہی تعداد سنہ ۱۹۵۰-۵۱ء میں جماعت چہارم تک پہنچتے پہنچتے صرف ۲۳۸۳۳ یعنی نصف سے بھی کم رہ گئی۔ اسی طرح سنہ ۱۹۴۸-۴۹ء کی جماعت اول کی

۵۰۴۴۴ کی تعداد کے مقابلہ میں ۵۲-۱۹۵۱ء کی جماعت چہارم کی تعداد صرف ۳۱۰۲۲۵ ہے [illegible]

میں یہی تعداد جماعت پنجم میں جاکر صرف ۳۰۲۱۷ رہ گئی گویا ۴۹-۱۹۴۸ء کی پہلی جماعت کی تعداد کے مقابلہ میں صرف اس کا ۴۸ فی صد حصہ جماعت پنجم یعنی پرائمری کی آخری جماعت میں پہنچا۔ بالفاظ دیگر ۵۲ فی صد حصہ راستے ہی میں ضائع ہوگیا۔ ہم نے ۵۲-۱۹۵۱ء میں جو گراں قدر رقم مبلغ ۲۵۲۲۱۴۸ روپے ابتدائی تعلیم پر خرچ کی تھی اس کا حصہ ۱۲۹۹۸۸۱ روپے کی رقم کثیر اکارت ہی نہیں گئی بلکہ پانچ سالوں کے ابتدائی تعلیم کے اخراجات کو جمع کر کے پھر حساب کرنا چاہیے کہ کل کتنی رقم ضائع گئی کیونکہ ۵۲-۱۹۵۱ء کی جماعت پنجم صرف ایک سال یعنی ۵۲-۱۹۵۱ء کی محنت کا نتیجہ نہیں ہے۔ بلکہ مسلسل پانچ سالوں کی محنت کا نتیجہ ہے، اس لحاظ سے صرف قسمت لاہور میں محض ضیاع کی وجہ سے جس قومی دولت کا نقصان ہوا ہے اس کا اندازہ ۹۳۸۰، ۹۸۱۵/۲ روپے تک پہنچتا ہے۔ اگر آپ ان اعداد پر مزید غور کریں گے تو آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ اصل میں نقصان اس سے بھی زیادہ کا ہوا ہے کیونکہ جماعت پنجم کی اس تعداد میں کئی ایسے لڑکے بھی شامل ہیں، جو

(۱) یا تو پچھلے سالوں کے فیل شدہ زائد المیعاد (STAGNATION CASES) ہیں یا گذشتہ سال جماعت پنجم کا امتحان پاس نہ کرنے کی وجہ سے دوبارہ اسی جماعت میں داخل ہو گئے ہیں۔ یا

(۲) کسی غیر ڈویژن سے آکر داخل ہوئے ہیں۔

اب اگر اس تعداد کو جن کا ذکر اوپر (نمبر ۱ اور ۲) میں ہوا ہے نکال دیں اور خالص اس تعداد کو لیں جو جماعت اول سے چلے آئے ہیں اور جنہوں نے ہر سال ایک جماعت سے دوسری جماعت میں ترقی کر کے پانچ سال کے عرصے میں پرائمری کا امتحان پاس کیا ہے تو ہمیں معلوم ہو جائے گا کہ یہ بہت ہی قلیل تعداد ہے اور صرف یہی تعداد ایسی ہے جس کے متعلق ہم کہہ سکتے ہیں کہ ان کی تعلیم پر یقیناً روپیہ اور وقت صرف کیا گیا وہ صحیح طور پر کام آیا۔

۵۳-۱۹۵۲ء میں جب ہم ایسے طلبہ کی تعداد جنہوں نے پرائمری کورس پورے پانچ سال میں ختم کیا، معلوم کرتے ہیں تو ان کی تعداد ۱۵۷۱ نظر آتی ہے۔ یعنی ۴۸-۱۹۴۷ء کی جماعت اول کی تعداد کا ۳ فی صد گویا پرائمری تعلیم پر [illegible] جتنا روپیہ اور وقت صرف ہوا۔ اس کا صرف ۳ فی صد ٹھکانے لگا ہے۔ باقی ۹۷ فی صد [illegible]

[illegible]

کہ اگر یہ وقت اور روپیہ اس طرح ضائع نہ ہوتا تو اسی روپے اور محنت سے موجودہ خواندگی میں ایک سال میں کئی فیصد کا اضافہ ہو جاتا ہے۔

کیا اس مالی انحطاط اور اقتصادی بدحالی کے زمانہ میں جبکہ ہر طرف سے قوت لایموت کے لیے چیخ و پکار اٹھ رہی ہے اس قدر زرِ کثیر کا ضائع ہو جانا قوم و ملک کے لیے ناقابلِ برداشت نقصان نہیں ہے؟ ہے اور یقیناً ہے۔ اندریں حالات ضروری ہے کہ ہم امدادی کلیہ پر زور دینے کے علاوہ اپنی کوششیں خواندگی کو بڑھانے میں صرف کریں تاکہ جو لڑکے ایک دفعہ پہلی جماعت میں داخل ہو جائیں وہ باقاعدہ سال بسال ترقی پاتے ہوئے پانچ سال کے مقررہ عرصہ میں پانچویں جماعت کا امتحان پاس کر لیں۔ اس طرح پرائمری جماعتوں کی تعداد کا تناسب (PROPORTION) سال بہ سال درست ہوتا جائے گا۔ اور تضیعِ زر، تضیعِ محنت اور تضیعِ وقت سے نجات مل جائے گی۔

ضیاع کے اسباب

ضیاع کی کمیت اور کیفیت دیکھنے کے بعد اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ کون سے اسباب ہیں جو ضیاع کا موجب ہیں اور خواندگی کی ترقی میں حائل ہوتے ہیں۔ تاکہ ہم ان اسباب کا سدِباب کر کے ابتدائی تعلیم کی توسیع کے لیے سازگار حالات پیدا کر سکیں۔ اس ضمن میں مثال کے طور پر چند سکولوں کے اعداد و شمار پیش کیے جاتے ہیں جن سے یہ واضح ہو جائے گا کہ ہم اپنے مقصد یعنی خواندگی کے بڑھانے میں کہاں تک کامیاب ہوئے ہیں اور کہاں تک ناکام، نیز یہ کہ ناکامی کی وجوہ کیا ہیں۔

نام مدرسہ	تعداد جماعت اول ۲۹،۳۰،۳۱	تعداد جو اگلے سال جماعت دوم میں گئی	تعداد جو اگلے سال جماعت سوم میں گئی	تعداد جو اگلے سال جماعت چہارم میں گئی	تعداد جو اگلے سال جماعت پنجم میں گئی	تعداد جس نے ۳۰،۳۳،۵۳ کو جماعت پنجم پاس کی	فی صد خواندگی
گلی رضاآباد درجہ اسکول (ذ)	۲۵	۱۹	۱۵	۱۴	۱۳	۱۲	۵۲ فی
نیاز بیگ درجہ اسکول (ب)	۵۳	۳۰	۲۵	۱۹	۱۴	۱۲	۲۳ فی
کچھ کلاں درجہ اسکول (ج)	۲۰	۱۰	۴	۳	۲	۲	۱۰ فی
گوپال پورہ درجہ اسکول (ذ)	۵۰	۳۲	۲۷	۲۴	۲۲	۲۱	۵۰ فی
[illegible] درجہ اسکول (ب)	۷۴	۵۰	۴۱	۳۲	۲۵	۲۴	۷ درو فیصد
کوٹ شنبالہ درجہ اسکول (ج)	۳۵	۱۰	۴	۳	۳	۳	۸.۵۷

شرقپور کلاں درجہ سکول (ا)	۴۶	۳۲	۲۵	۲۱	۲۱	۲۱	۴۶ فیصد
کوٹ محمود درجہ سکول (ب)	۴۲	۲۳	۱۸	۱۴	۱۲	۱۲	۲۹ فیصد
شریف پورہ درجہ سکول (ج)	۳۴	۱۳	۷	۶	۴	۳	۹ فیصد
میزان	۳۶۳	۲۱۹	۱۶۶	۱۳۶	۱۱۶	۱۱۱	۳۰ فیصد

ان کے علاوہ حلقہ قصور ضلع لاہور کے چند قصباتی اور دیہاتی مدارس کے کوائف بھی ملاحظہ فرمائیے۔

قصباتی سکول

نام مدرسہ	تعداد جماعت اول ۳۱،۳،۴۹	تعداد جو اگلے سال جماعت دوم میں گئی	تعداد جو اگلے سال جماعت سوم میں گئی	تعداد جو اگلے سال جماعت چہارم میں گئی	تعداد جو اگلے سال جماعت پنجم میں گئی	تعداد جس نے ۳۱،۳،۵۴ کو جماعت پنجم پاس کی	فی صد خواندگی
ایم سی پرائمری سکول موری گیٹ قصور	۸۶	۷۳	۶۳	۴۹	۳۸	۳۶	۴۲ فی صد
ایم بی پرائمری سکول للیانی نمبر ۱	۱۰۳	۸۱	۷۰	۵۸	۴۰	۴۰	۳۹ ٪
دیہاتی سکول							
قادی ونڈ	۳۱	۲۵	۲۳	۱۸	۱۵	۱۵	۴۹ ٪
کیسر گڑھ	۱۸	۱۰	۶	۴	۴	۴	۲۰ ٪
دولے والا	۲۶	۱۰	۷	۶	۵	۵	۱۹ ٪
میزان	۲۶۴	۱۱۹	۱۴۸	۱۳۵	۱۰۲	۱۰۰	۳۸ ٪

مندرجہ بالا کوائف سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ابتدائی تعلیم کے دوران میں قریباً دو تہائی بچے ایسے ہیں جو مقررہ وقت میں اپنی منزل مقصود کو نہیں پہنچتے اور وہ تعداد جو پانچ سال پہلے کی جماعت اول میں سے مقررہ میعاد میں ابتدائی تعلیم مکمل کر کے خواندہ بنتی ہے بہت قلیل ہے۔ یوں تو ہر جماعت میں طلبہ کی تعداد کثیر ہے جو تعلیمی لحاظ سے ضائع ہوتی نظر آتی ہے لیکن جماعت اول سے دوم میں جاتے وقت یہ ضیاع جس قدر شدید ہے وہ کہیں اور نظر نہیں آتا۔ آئیے اب یہ دیکھنے کے لیے کہ ہر جماعت سے اگلی جماعت میں جاتے وقت جو تعداد کم ہو جاتی ہے وہ کدھر جاتی ہے۔ انھی مدرسوں کے مزید کوائف کا ملاحظہ کریں۔

(صفحہ ۱۳ پر)

نام سکول	تعداد جماعت اول ۳۱-۳-۴۹	وہ تعداد جس نے پانچ سنہ ۱۹۵۴ء کو خواندگی حاصل کی	وہ تعداد جو پانچویں جماعت پاس کرنے سے پہلے خارج ہو گئی	وہ تعداد جو ابتدائی ابھی تک زیر تعلیم ہے: اول	دوم	سوم	چہارم	پنجم	میزان
علی رضا آباد	۲۵	۱۳	۷	-	-	-	۱	۴	۵
نیاز بیگ	۵۲	۱۷	۱۹	-	-	۲	۶	۱۴	۲۲
گرکلاں	۲۰	۲	۱۱	-	-	۱	۲	۴	۷
گوپال پور	۵۰	۲۱	۲۰	-	-	-	-	۹	۹
بہرتھ	۷۶	۲۴	۲۶	-	-	۳	۶	۱۷	۲۶
کوٹ منڈیالوار	۲۵	۳	۱۵	-	-	-	۴	۳	۷
شرقی پور کلاں	۴۶	۲۱	۱۵	-	-	۱	۴	۵	۱۰
کوٹ محمود	۴۲	۱۲	۱۲	-	-	-	۶	۱۲	۱۸
شریف پور	۳۲	۳	۲۸	-	-	-	-	۱	۱

ان اعداد سے ظاہر ہوتا ہے کہ ضیاع کی دو بڑی صورتیں ہیں ۔

(۱) طلبہ کا مدرسہ سے قبل از تکمیل نصاب خارج ہو جانا یعنی اخراج (LEAKAGE)

(۲) ہر سال ترقی نہ پا سکنا اور فیل ہوکر زائد المیعاد ہو جانا ۔ (STAGNATION)

یہ دو بڑے اسباب ہیں جو رفتار خواندگی کی ترقی میں حائل ہیں اور ضیاع تعلیمی کا باعث بنے ہوئے ہیں ۔ لہٰذا خواندگی کی رفتار کو بڑھانے اور ضیاع تعلیمی کو کم کرنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم پوری کوشش سے اخراج کو روکیں اور طلبا کو زائد المیعاد ہونے سے بچائیں یعنی ہر جماعت سے بالعموم اور پہلی جماعت سے بالخصوص زیادہ سے زیادہ بچے اوپر کی جماعت میں ترقی پانے کے قابل بنائیں ۔

ضیاع تعلیمی کے اسباب کی مزید تجزیہ اور تدارک

اب ہم ضیاع تعلیمی کی ان دونوں بڑی صورتوں کے متعلق علیحدہ علیحدہ بحث کرتے ہیں اور ان کے اسباب و علل تدارک پر غور کرتے ہیں ۔

اخراج کے اسباب

اگر ہم پرائمری اسکولوں کے اخراج کی تجزی کریں تو ہمیں مختلف وجوہ نظر آئیں گے۔ کہیں تو تنگی ہے تو کہیں بیماری کہیں نقل مکانی ہے، اور کہیں ننھیال یا ددھیال کے پاس رہائش کی تبدیلی۔ کہیں والدین کا افلاس اور عدم ادائے گی واجبات اور کہیں سرپرستوں کی بدشوقی اور جہالت۔ ان کے علاوہ اہالیانِ دہ کی دھڑا بندی اور عداوت۔ آپس کی چپقلش اور تفرقہ بازی۔ مدرس کی بے راہ روی اور فرض ناشناسی۔ موزوں عمارت اور باصلاحیت عملے کی کمی بھی اخراج کا بالواسطہ یا بلاواسطہ سبب بن جاتی ہے۔ لیکن اخراج کی سب سے بڑی اور عام صورت طلبہ کی متواتر غیر حاضری ہے۔

اخراج کے سلسلے میں ایک اور بات جو مشاہدے میں آئی ہے وہ یہ ہے کہ بیشتر اخراج جماعت اول سے اور اس سے کم جماعت دوم سے ہوتا ہے۔ اس کے بعد کی جماعتوں سے اخراج بہت کم دیکھنے میں آتا ہے۔ ہاں مدرسے کی آخری جماعت سے بھی کمزور طلبہ کو خارج کرنے کی کوشش کیا کرتے ہیں تاکہ سنٹر کے امتحان میں نتیجہ خراب نہ نکلے۔ یہ بھی دیکھنے میں آیا ہے کہ بڑی عمر کے لڑکوں کو داخل کر لیا جائے تو وہ بھی اکثر تکمیلِ خواندگی سے پہلے مدرسہ چھوڑ جاتے ہیں۔

اخراج کا تدارک

جو اخراج بوجہ غیر حاضری ہوتا ہے وہ زیادہ تر ایسے لڑکوں کا ہوتا ہے جن کی حاضریوں کی میزان بہت کم ہوتی ہے۔ ایسے لڑکوں کو خارج کرنے کی بجائے انھیں حاضر باش بنایا جائے۔ حاضر باش بنانے کے لیے مندرجہ ذیل وسائل اختیار کیے جائیں۔

(ا) جب لڑکا پہلی غیر حاضری کرے تو فوراً اس کا تدارک کیا جائے، ورنہ بعد میں جب اسے غیر حاضری کی عادت پڑ گئی تو اس کا حاضر کرنا مشکل ہو جائے۔

(ب) غیر حاضر طالب علم کے والدین کو بچے کی غیر حاضری سے آگاہ کیا جائے اور اسے حاضر باش بنانے کے لیے ان کا تعاون حاصل کیا جائے۔

(ج) طلبہ کے ساتھ ہمدردی سے پیش آیا جائے۔

(د) مدرسے کے کسی دلچسپ مشغلے میں اسے شریک کیا جائے، اسے ذمے داری کا کوئی عہدہ دے دیا جائے جو اسے حاضر باش رہنے کا احساس دلائے۔

(ط) اول مدرس کی ذاتی نگرانی اور پڑتال۔ اگر شروع شروع میں اصلاح حاضری کے لیے اول مدرس ذیل کا نقشہ بنا کر اپنے پاس رکھے تو بہت مفید ہے۔

تاریخ	نام جماعت	حاضری روزمرہ	وہ طلبہ جو چند دن سے نہیں آئے	وہ طلبہ جو کل نہیں آئے	وہ طلبہ جو خانہ نمبر ۲ میں سے غیر حاضر کیے گئے	وہ طلبہ جو خانہ نمبر ۵ میں سے حاضر کیے گئے	کیفیت
۱	۲	۳	۴	۵	۶	۷	۸

(ی) عام حاضری کو بہتر بنانے کے لیے اخراج کو روکنے کے لیے مندرجہ ذیل تدابیر بھی بہت مفید ثابت ہوں گی:۔

(۱) فیملی سسٹم کا اجرا:۔ اعلیٰ جماعت کے بڑے عمر کے حاضر باش طلبہ کو لیڈر بنایا جائے اور پانچ یا چھ لڑکے جو ان کے محلے کے ہوں یا نزدیک رہتے ہوں ان کی ٹولی میں رکھے جائیں۔ لیڈر کو ان کی حاضری کا ذمہ دار گردانا جائے۔

(۲) محلے وار، موضع وار، یا جماعت وار ٹولیاں:۔ اگر نائب مدرس مختلف دیہات سے آتے ہوں تو ان کی نگرانی میں ورنہ سمجھدار بڑے لڑکوں کے ماتحت علیحدہ علیحدہ محلے۔ موضع یا جماعت کی ٹولیاں بنا دی جائیں، اور ان کا آپس کا حاضری کا مقابلہ کرا دیا جائے۔ زیادہ حاضر باش ٹولی کی مناسب طریقوں سے حوصلہ افزائی کی جائے۔ مثلاً شاباش دی جائے، ان کے نام اعزازی تختہ پر لکھے جائیں۔ امتیازی جھنڈا یا شیلڈ دی جائے یا چھوٹی چھوٹی چیزیں مثلاً صابن، سیاہی۔ پنسل وغیرہ بطور انعام دی جائیں۔ کمرۂ جماعت میں نمبروار جگہ دینا بھی طلبہ میں رشک پیدا کرتا ہے۔ اور وہ ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی کوشش کرتے ہیں۔

مدرسے کے مختلف کاموں میں بچوں کو ان کی استطاعت کے مطابق حصہ لینے کے مواقع بہم پہنچائے جائیں۔ مثلاً وہ اپنے کمروں کو خود مزین کریں۔ کیاریوں میں پھول لگائیں۔ مدرسے کی صفائی کا خیال رکھیں

(۳) مدرسے کی مختلف تحریکات:۔ مثلاً کبنک، ادبی جلسے، یوم والدین، مدرسے کے چھوٹے چھوٹے انتظامیہ معاملات میں حصہ لیں۔ اس طرح ان کو مدرسے محبت پیدا ہوگی۔ وہ اسے اپنا ادارہ سمجھیں گے، اور مدرسے کی بہبودی میں مدرس کے بہت بڑے معاون اور مددگار ثابت ہوں گے۔

(۴) ایک ہی محلہ یا موضع کے لڑکوں کا پراپیگنڈا گیت گاتے ہوئے مدرسہ آنا:۔

(۵) مدرسہ میں پندرہ روزہ یا ماہانہ اجلاس:۔ پندرہ روزہ یا ماہانہ اجلاس منعقد کرنا اور ان میں ریالیاں دہ کو

مدعو کرنا بلکہ اپنی آنکھوں سے اپنے بچوں کی تعلیمی کارکردگی ملاحظہ کریں بہت سود مند ہے، اور لوگوں کو مدرسے کے خیر خواہ اور ہمدرد بنانے کا بہت بڑا ذریعہ ہے۔

۶۔ جن مدارس میں زراعتی فارم یا باغیچے ہوں وہاں سال میں دو دفعہ جلسے کر کے مختلف مفید زرعی تجربات کے نتائج گردو نواح کے لوگوں کے سامنے پیش کرنے چاہئیں۔

۷۔ اسکول میں دل چسپ کھیلوں کو رواج دینا۔ اسکول میں لڑکوں کو دل چسپ نئے نئے کھیل کھلانا تاکہ وہ کھیلوں کے لیے اسکول میں خود بخود کھچے چلے آئیں۔ غیر داخل شدہ قابل ادخال اطفال کو بھی طلبہ مدرسہ کے ساتھ کھیلوں میں شامل ہونے کی ترغیب دی جائے۔

۸۔ اسکول میں کسی مناسب وقت دل چسپ کہانیوں، پہیلیوں، دل چسپ مکالموں، اور مفید تعلیمی اور سماجی فلموں کے دکھانے کا انتظام کرنا۔

۹۔ اسکول کی فضا کو ظاہری زیبائش و آرائش مثلاً پھول پھلواڑی سے دل کش بنانا، تاکہ طلبہ وہاں خوشی اور مسرت محسوس کریں۔

۱۰۔ دیہاتی اسکول کا کمرہ زراعتی ماحول لیے ہوئے ہو۔ اس میں زراعتی کہاوتیں لکھی ہوں، حفظان صحت اور دیہات سدھار سے متعلق ماٹو اور تصاویر موجود ہوں۔ ایسے چارٹ بھی آویزاں ہوں جن میں گاؤں کی کاشت شدہ فصلوں، گاؤں کے اہل کاروں کے نام اور فرائض، امراض مویشیاں اور رفاہ عامہ کے محکموں کی سرگرمیوں کی بابت معلومات درج ہوں۔ جدید آلات کاشت کی تصاویر بھی دیواروں پر آویزاں ہوں۔

۱۱۔ دیہاتی کلب و لائبریری کا اجرا کیا جائے۔ تاکہ گاؤں کے لوگ شام کو یا کسی اور مناسب وقت آکر اخبار اور رسائل پڑھ سکیں۔ اہم ملکی اور قومی تحریکات کے متعلق مفید معلومات حاصل کریں، مختلف منڈیوں کے اجناس وغیرہ کے بھاؤ اور مفید خبریں بھی سنائی جائیں۔

۱۲۔ یوم والدین منا کر بچوں کی تعلیم و تربیت اور اسکول کی مفید تحریکات سے واقف کرنا۔

۱۳۔ بڑی عمر کے لوگوں میں بھی کھیلوں کا شوق پیدا کیا جائے اور ان کی تنظیم کر کے ہفتہ وار باقاعدہ مقابلے رکھے جائیں

۱۴۔ پرانے طلبہ کا ایک ادارہ (OLD BOYS CLUB) قائم کیا جائے اور ان میں مطالعہ اخبار بینی کا شوق

پیدا کیا جائے۔ اور مدرسے کی تقریبوں میں ان کو شریک کیا جائے۔ تاکہ وہ مدرسے کے ممد و معاون بنے رہیں۔

۱۵۔ **استاد کی شخصیت**:۔ مدرس ہر دل عزیز اور باسوخ ہو۔ لوگوں کے دلوں میں اس کی وقعت ہو۔ لڑکوں کو اس سے محبت ہو۔ بقول شخصے استاد کو فرشتہ نہیں تو فرشتہ سیرت فرد ہونا چاہیے۔

۱۶۔ مدرس خود حاضر باش اور وقت کا پابند ہو۔ اس کا اثر طلبہ پر غیر شعوری طور پر پڑے گا

۱۷۔ غیر حاضری کرنے والے طلبہ کی فہرستیں بنا کر کمرے میں آویزاں کی جائیں، اور پھر ان میں سے ہر ایک لڑکے کی حاضری کی کمی کی وجہ دریافت کر کے مناسب تدارک کیا جائے۔

۱۸۔ فرضی تعداد سے قطعی اجتناب کیا جائے۔ لڑکوں کو حاضر باش بنایا جائے اور فرضی تعداد ہرگز نہ رکھی جائے۔

۱۹۔ اخراج کی جماعت وار فہرستیں بنا کر کمرے میں آویزاں کی جائیں۔ خارج شدگان کو واپس مدرسہ میں لانے کی کوشش کی جائے۔ فہرستیں حسب ذیل نمونہ کی ہوں۔

نمبر شمار	نام جماعت	نام طالب علم جو خارج ہوا	تاریخ داخلہ مدرسہ	تاریخ داخلہ جماعت	تاریخ اخراج	اصل وجہ اخراج	تاریخ دوبارہ داخلہ	کیفیت
۱	۲	۳	۴	۵	۶	۷	۸	۹

۲۰۔ مدرسے کی رفتار ترقی اور خواندگی کو جانچنے کے لیے گراف اور نقشے تیار کر کے اول مدرس کے کمرے میں لگائے جائیں صفحہ ۱۷ پر چند ایک پرائمری مدارس کے رفتار خواندگی کے اعداد و شمار دیے گئے ہیں۔ ان میں سے اگر مدرسہ علی رضا آباد کا خواندگی کا نقشہ تیار کیا جائے تو وہ حسب ذیل شکل کا ہوگا۔

سال	اول	دوم	سوم	چہارم	پنجم	وہ تعداد جو پرائمری پاس ہوئے	استعداد فیصد
۱۹۴۹	۲۵						
۱۹۵۰		۱۹					
۱۹۵۱			۱۵				
۱۹۵۲				۱۴			
۱۹۵۳					۱۳		
۱۹۵۴						۱۲	۵۲ فیصد

۱۲۔ لازمی تعلیم کا جائز اور دانش مندانہ استعمال۔ چند ایسے مخصوص اشخاص کے خلاف جو بار بار کہنے پر بھی اپنے لڑکوں کو مدرسے میں نہ بھیجیں یا خارج ہونے پر واپس مدرسہ میں نہ لائیں۔ لازمی تعلیم کے ایکٹ کے ماتحت مناسب کارروائی کی جائے۔

پہلی جماعت سے اخراج کی بڑی بڑی وجوہ

(۱) بچوں کی دلچسپی کا کوئی سامان موجود نہیں ہوتا۔

(۲) استاد کا طریقۂ تعلیم خشک ہوتا ہے۔

(۳) تعلیم کو دلچسپ بنانے کے وسائل اختیار نہیں کیے جاتے۔

(۴) طلبہ پر غیر ضروری پابندی عائد کی جاتی ہے۔

(۵) مدرسہ کا ماحول ان کی فطرت کے مطابق نہیں بنایا جاتا۔

دوسری جماعت سے اخراج کی وجوہ۔

دوسری جماعت سے اخراج کی کئی وجوہ کے علاوہ سب سے بڑی وجہ کمزور لڑکوں کو پہلی جماعت سے دوسری جماعت میں ناجائز ترقی دینا ہے۔ ان تمام خرابیوں کو دور کیا جائے اور درج ذیل طریقے اختیار کیے جائیں۔

(۱) جماعت اول کو پڑھانے کے لیے ایسا استاد مقرر کیا جائے جو لائق، محنتی، متحمل مزاج، خلیق اور مخلص ہو۔ جسے

(۲) اس بات کا خیال ہو کہ اسے قوم کو بنانا ہے۔ اور آئندہ بننے والی قوم کی باگ ڈور اس کے ہاتھوں میں ہے۔

ورنہ ؎ خشت اول چوں نہد معمار کج تا ثریا می رود دیوار کج

(۳) تعلیم کو دلچسپ بنانے کے مختلف وسائل استعمال میں لانے چاہئیں۔ مثلاً مصوری اور مشاغل کو ذریعہ تعلیم بنایا جائے۔ اور بچوں کو روزمرہ مشاہدات، تجربات اور دلچسپیوں کو تدریس سے مربوط کیا جائے۔ توضیحی سامان اور سمعی و بصری امدادات سے اسباق کو مؤثر اور زندہ بنایا جائے۔ تدریسی کھیلوں کو رائج کیا جائے۔

(۴) تدریس کو عملی اور دستی کام مثلاً قینچی سے کاغذ کاٹنا۔ مٹی کے کھلونے بنانا۔ باغیچہ کا کام وغیرہ سے مربوط کر کے اس میں دلچسپی پیدا کی جائے۔

(۵) لڑکوں کے ساتھ ہمدردانہ سلوک روا رکھا جائے۔ اور بے جا سختی و ملامت اور بدزبانی سے پرہیز کیا جائے

(۶) چھوٹے بچوں کو جسمانی سزا بالکل نہ دی جائے

(۷) استاد بچوں کو تعلیم و تربیت اور ہر گونہ نشو و نما کا خیال رکھے۔ تدریس میں بھی تمام طلبہ کی طرف توجہ دی جائے یہ نہ ہو کہ صرف سنٹر کی جماعت کا خیال رکھا جائے اور باقی جماعتوں کی تعلیم کو اس کے بھینٹ چڑھا دیا جائے۔

(۸) کسی دن بھی کوئی ایک لڑکا ایسا نہ رہے جو سبق سیکھے بغیر یا کچھ نہ کچھ حاصل کیے بغیر اسکول سے گھر واپس چلا جائے

(۹) جماعت اول سے صرف انھیں لڑکوں کو ترقی دی جائے جو فی الحقیقت اس کے مستحق ہوں، اور اچھی طرح اپنا نصاب پورا کر چکے ہوں۔

بعض مدرسین جماعت اول سے زائد المیعاد لڑکوں کی تعداد کم کرنے یا پاس شدگان کی فیصد زیادہ دکھانے کے لیے متعدد لڑکوں کو بھی جنھوں نے کورس کو ختم نہ کیا ہو ترقی دے دیتے ہیں، ایسے لڑکے جماعت کے ساتھ نہ چل سکنے کی وجہ سے بے دل ہو کر اسکول چھوڑ جاتے ہیں اور ضیاع میں اضافہ کرتے ہیں۔

بڑی عمر کے لڑکوں کا اخراج

بڑی عمر کے لڑکوں کے اخراج کا باعث یہ ہے کہ:۔

(۱) ان لڑکوں کو ان کے والدین گھر کے کام کاج کی خاطر اسکول سے نکال لیتے ہیں، یا

(۲) خود وہ لڑکے زیادہ عرصے میں تھوڑی تعلیم حاصل کرنے کی وجہ سے بے دل ہو کر سکول کو چھوڑ دیتے ہیں یا۔

(۳) چھوٹی عمر کے بچوں کے ساتھ پڑھنا اپنی طبیعت کے خلاف پاتے ہیں۔

(۴) بعض مدارس میں طلبہ کی تعداد زیادہ ہوتی ہے، اور عملے کے ناکافی ہونے کی وجہ سے ان کی طرف انفرادی توجہ نہیں دی جا سکتی جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بچے بددل ہو کر مدرسہ چھوڑ جاتے ہیں۔ اس کا انسداد یہ ہے کہ

(۱) داخلہ سوچ سمجھ کر لیا جائے۔ یہ نہ ہونا چاہیے کہ مدرس پہلے تو آرام سے بیٹھا رہے۔ اور جب داخلے کے دن قریب الاختتام ہوں تو داخلے کی فکر کرے، اور اس وقت جیسے بھی لڑکے اسے ملیں انھیں اندھا دھند داخل کرتا جائے۔ مدرس کو چاہیے کہ مدرج رجسٹر کرنے سے پہلے بچوں کی آزمائش کرے کہ کون سا لڑکا حاضر باش ہوگا اور کون سا نہیں وہ پہلے صرف حاضر باش طلبہ کو داخل کرے۔ چھوٹے بچوں کو کچھ عرصہ نرسری کلاس میں رکھ کر حاضر باش بنا لیا جائے پھر جماعت اول میں داخل کیا جائے۔ نرسری کلاس کی حاضری کا رجسٹر علیحدہ رکھا جائے۔

(۲) جہاں تعداد بہت زیادہ ہو وہاں لڑکوں کا ایک اور فریق بنا کر انہیں ایک زائد فریق میں بہت کچھ پڑھایا جا سکے۔

(۳) حتی الوسع بڑی عمر کے لڑکے پہلی جماعت میں داخل نہ کیے جائیں۔ آٹھ سال سے بڑی عمر کے لڑکوں کا درجہ جماعت میں داخل کرنا بے سود ہے کیوں کہ وہ عموماً جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا ہے، کچھ عرصے کے بعد نصف تعلیم پا کے بغیر اسکول چھوڑ جاتے ہیں۔

(۴) اخراج کی ایک بڑی وجہ ہماری تعلیم کا موجودہ زندگی سے بے تعلق ہونا بھی ہے۔ لڑکوں کو مدرسے میں جو کچھ سکھایا جاتا ہے وہ اسے اپنی زندگی کی ضروریات میں مناسب طریقے سے استعمال نہیں کر سکتے۔ اور جو کچھ اپنے اردگرد دیکھتے ہیں اس کو بیان نہیں کر سکتے۔ اس لیے لوگ جب خواندہ اور ناخواندہ لڑکوں میں کوئی نمایاں فرق نہیں پاتے اور اُدھر ملازمت کا دروازہ مسدود دیکھتے ہیں تو تعلیم سے متنفر ہو کر اپنے لڑکوں کو مدرسے اٹھا لیتے ہیں۔ لہٰذا تعلیم کو دیہاتی رنگ میں رنگا جائے۔ گھر اور مدرسے میں موانست اور مواصلت پیدا کی جائے تاکہ جو کچھ پڑھیں وہ اس کو اپنی گھریلو زندگی اور آبائی پیشہ میں مفید پائیں اور جو کچھ وہ مدرسہ میں سیکھیں اس کا اسکول کی چار دیواری کے باہر استعمال بھی کر سکیں، اردگرد کی اشیاء کا مشاہدہ کرنے پر بھی زور دیا جائے تاکہ وہ اپنے گرد و پیش کو سمجھنے کے قابل بن جائیں۔ ان کو کہا جائے کہ وہ اپنے مدرسے اور گاؤں کے گرد و نواح کی چیزوں مثلاً درخت پرندوں، مکان وغیرہ کو بغور دیکھیں، بعد ازاں وہ ان کا حال زبانی اپنے الفاظ میں بیان کریں۔ پھر اپنی استعداد کے مطابق ان کو دائرہ تحریر میں لائیں۔ غرض ماحول اور تعلیم اور گھر، سماج اور مدرسے میں ہم آہنگی اور یک جہتی پیدا کرنا ضروری ہے۔

زائد المیعادی

اس کے بعد ہم خواندگی کے دوسرے بڑے دشمن یعنی زائد المیعادی (STAGNATION) کو لیتے ہیں۔ یوں تو ہر جماعت میں ناکام ہونے والا طالب علم زائد المیعاد ہوتا ہے لیکن چوں کہ جماعت اول میں ایسے طلبہ کی تعداد بہت ہوتی ہے۔ لہٰذا یہ مسئلہ جماعت اول کے ساتھ مخصوص ہو گیا ہے۔ چنانچہ جو زائد المیعادی کے اسباب و تدارک سوچتے وقت ... زیادہ تر جماعت اول ... کو مد نظر رکھتے ہیں۔ زائد المیعاد ہونے کے ... [illegible]

[illegible] مندرجہ ذیل ہیں۔

(۱) حاضری کی خرابی (۲) چھوٹی عمر کے بچوں کا داخلہ (۳) مختلف اوقات پر داخلہ (۴) غیر دلچسپ اور غیر مؤثر طریق تعلیم (۵) اساتذہ کی ناقابلیت اور فرض ناشناسی اور غیر تربیت یافتہ استادوں کا تقرر:۔ (قسمت لاہور میں اس وقت کل ۱۸۱۸ استادوں میں سے ۶۳۰ یعنی تقریباً ۲۰ فی صد غیر تربیت یافتہ ہیں۔ ان اعداد سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ پسماندہ علاقوں کا کیا حال ہوگا) (۶) جماعت اول کے بہت سے گروپ بنانا (۷) ناجائز ترقی (۸) جماعتوں میں طلبہ کا بہت زیادہ ہونا (۱۹۵۲-۱۹۵۳ء میں قسمت لاہور کی پرائمری جماعتوں کی کل تعداد ۱۹۰۰۶۸ ہے اور کل پرائمری مدرسین کی تعداد ۴۴۴۴ ہے گویا فی مدرس ۴۵ طلبہ آتے ہیں۔ یہ تعداد بہت زیادہ ہے۔ اس میں وہ بے شمار بچے شامل نہیں ہیں جو مدرسوں میں بغیر داخلے کے بیٹھے ہوتے ہیں) (۹) جگہ کی قلت:۔ (ہر مدرسہ میں جگہ ناکافی ثابت ہو رہی ہے۔ جن مدرسوں کی اپنی عمارات ہیں وہ بھی جگہ کے لحاظ سے ناکافی ہیں۔ قسمت لاہور میں اس وقت کل ۱۱۱۵ مدارس ہیں۔ جن میں سے ۴۴۴ مدارس کی اپنی عمارتیں ہیں ۲۴۲ مدرسے کرائے کی عمارتوں میں ہیں ۲۷۵ بلا کرایہ عمارتوں میں ہیں اور ۲۹۴ مدارس ایسے ہیں جن کی کوئی عمارت ہی نہیں۔ اس زبوں حالی میں پرائمری مدارس سے کس طرح اچھے نتائج اور عمدہ تعلیم کی توقع کر سکتے ہیں) ان سب کے تدارک کے لیے درج ذیل طریقے کام میں لانے چاہئیں۔

(۱) حاضری کو بہتر کیا جائے:۔ حاضری کو بہتر بنانے کے لیے مدرسے اور اس کی فضا کو دلچسپ اور اس کی تعلیم کو مفید، جاذب، اور مؤثر بنانا ضروری ہے۔ اس کے لیے مختلف تدابیر "خارج" کے تحت بیان ہو چکی ہیں۔

(۲) چھوٹی عمر کے لڑکوں کو داخل نہ کیا جائے:۔ بچوں کو داخل کرنے سے پیشتر نرسری کلاس میں رکھ کر آزمائش کر لی جائے۔

(۳) داخلہ ایک وقت پر ہو:۔ اس کے لیے سب سے موزوں وقت پہلی سہ ماہی ہے۔ تاکہ سارے لڑکے اگلی جماعت میں جانے کے قابل ہو جائیں۔ تیسری سہ ماہی میں داخل ہونے والے لڑکے عام طور پر زائد المیعاد ہو جاتے ہیں۔ اس لیے داخلہ جہاں تک ممکن ہو۔ پہلی سہ ماہی تک ہی محدود رکھا جائے۔

(۴) قابل ترین استاد:۔ جماعت اول کو پڑھانے کے لیے قابل ترین استاد مقرر کیا جائے جو شخص کہ مستقل مزاج [illegible] بچوں کی فطرت اور نفسیات سے واقف ہو۔ سوجھ بوجھ کا ملکہ رکھتا ہو [illegible] [illegible] کے نئے نئے وسائل [illegible]

ہوجاتا ہو۔ پہلی ہی جماعت میں بچوں کی [illegible]، اور وہ [illegible] ہو کر [illegible]

جماعت دوم کے لیے تیار کرنے کی قابلیت رکھتا ہو۔

(۵) ناجائز ترقی نہ دی جائے۔ - اس امر کا شروع ہی سے خیال رکھا جائے کہ کسی لڑکے کو ناجائز ترقی نہ دی جائے [illegible] ایسے ناجائز ترقی پانے والے لڑکے اگلی جماعت میں جا کر رہ جائیں گے۔ اور زائد المیعاد بن کر نیم خواندگی کو ترقی دیں گے۔

(۶) نگرانی اور پڑتال۔ - (ا) اول مدرس، جماعت اول کے لڑکوں کی ترقی کا جائزہ باقاعدہ لیتا رہے۔ اور [illegible] چارٹ خود تیار کیا کرے۔ عام طور پر شروع شروع میں مدرسین ادنیٰ جماعتوں کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ یہ طریقہ غلط ہے شروع ہی سے ان بچوں کی ترقی کا اسی طرح جائزہ لیتے رہنا چاہیے جس طرح اعلیٰ جماعتوں کا لیا جاتا ہے۔

(ب) جماعت اول کے لیے ماہوار سلیبس بنایا جائے۔ جس میں بجائے مہینوں کے نام کے پہلا مہینہ۔ دوسرا مہینہ، تیسرا مہینہ۔ بارہواں مہینہ لکھا جائے۔ مدرس سلیبس کے مطابق لڑکوں کو تعلیم دے اور ان کی ترقی کا خیال رکھے۔

(ج) ہر روز باقاعدہ تعلیم دی جائے اور روز کا کام روز کیا جائے۔ جو سبق دیا جائے اسے سکول میں خوب پختہ کرا دیا جائے۔ تاکہ دوسرے دن بچہ مدرسہ میں آتا ہوا جھجک محسوس نہ کرے۔

(د) زائد المیعاد لڑکوں کی جماعت وار فہرستیں بنا کر کمرے میں آویزاں کی جائیں۔ ان میں حسب ذیل خانے ہوں۔

نام جماعت	نمبر شمار	نام متعلم	تاریخ داخلہ		زائد المیعاد ہونے کی وجہ
			مدرسہ	جماعت	

(ہ) اسی طرح کمزور لڑکوں کی فہرست کمرے میں آویزاں ہونی چاہیے جس میں حسب ذیل خانے ہوں۔

نمبر شمار	نام طالب علم	تاریخ داخلہ		نام مضمون جن میں کمزور ہے	کمزوری کی کیفیت اور وجہ
		مدرسہ	جماعت		
۱	۲	۳		۴	۵

ان لڑکوں کو زائد وقت دیا جائے جن مضمون میں وہ طالب علم کمزور ہو [illegible]

[illegible] کی جائے۔

دیکھا گیا ہے کہ سب سے زیادہ لڑکے خارج بھی جماعت اول سے ہوتے ہیں اور سب سے زیادہ زائد المیعاد
جماعت میں ہوتے ہیں، اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ جس طریقے سے بچوں کو تعلیم دی جاتی ہے وہ نہایت خشک
دلچسپ ہوتا ہے۔ لڑکوں کو ایک جگہ بٹھا کر طوطے کی طرح حروف، الفاظ وغیرہ رٹا دیے جاتے ہیں، نہ انھیں
سے کام کرنے کا موقع دیا جاتا ہے اور نہ ان کے لیے کام کو دل چسپ بنایا جاتا ہے۔ کھیل جو ان کو فطری طور پر پسند
سے اس کو محروم رکھا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ بچوں کے لیے ایک ہی جگہ دیر تک نچلا بیٹھنا دوبھر ہوتا ہے۔ انھیں
نے پر مجبور کرنا گویا ان پر ظلم کرنا ہے۔ اسی لیے ہمارے اکثر مدارس میں بچے خائف اور افسردہ رہتے ہیں۔ ان دنوں حالات
ان کے لیے ایک قسم کا قید خانہ بن جاتا ہے۔ جس کا لازمی طور پر نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مدرسے سے بچے متنفر ہو جاتے ہیں
سے دور رہنے کی کوشش کرتے ہیں۔ لہٰذا اس جماعت سے یہ دونوں نقائص دور کرنے چاہئیں۔ یعنی بچوں کو بے
سمجھے اسباق کو رٹوانا چاہیے، اور نہ دیر تک انھیں ایک ہی جگہ بیٹھے رہنے پر مجبور کیا جائے۔ بلکہ تعلیم کو خوش گوار بنانے
بچوں کی فطری دل چسپی کا سامان پیدا کیا جائے۔ تدریس میں کھیل کا عنصر پیدا کر کے اسے دل چسپ بنایا جائے۔ اگر چھوٹے
کے لیے کھیل کھیل میں تعلیم کا انتظام ہو جائے تو وہ مدرسے کو اپنے گھر سے زیادہ اچھا اور پسندیدہ خیال کریں گے اور
سکول کے کمرے میں بھی کھیل کے میدان کی طرح خوشی اور مسرت قلبی حاصل کرتے ہوئے اس کی طرف کشاں کشاں
ئیں گے۔ اس طرح نہ صرف جماعت کی حاضری اچھی ہو جائے گی بلکہ تعلیمی حالت بھی بہتر ہو جائے گی۔ تعلیمی کھیل
قسم کے اور سادہ ہونے چاہئیں۔ ایسے کھیل جن میں کسی خاص قیمتی سامان کی ضرورت ہو یا جو پیچیدہ قسم کے ہوں
بچوں کے لیے موزوں نہیں۔ کھیل ایسے ہوں جن کو بچے خود بخود استاد کی رہنمائی کے بغیر کھیل سکیں اور جو بچوں کو تھوڑے
تھوڑے وقت میں زیادہ سے زیادہ مشق مہیا کریں۔ ایسے چند ایک کھیل مثال کے طور پر آخر میں درج کیے جاتے ہیں
ناظرین اندازہ کر سکیں کہ ہم کس قسم کے تدریسی کھیل کھلانے کی سفارش کر رہے ہیں۔

۷) تعلیمی کھیلوں کی مدد سے سبق پڑھانے اور یاد کرانے کے علاوہ مختلف مضامین کی تدریس کو دستی کام سے مربوط کر کے بھی
دلچسپ بنایا جا سکتا ہے۔ مثلاً لکھنے پڑھنے کے کام کو تصاویر یا شذرات کا البم بنانے، ان کے متعلق چارٹ تیار کرنے تصاویر
رنگ بھرنے کے ساتھ مربوط کر کے بچوں کے لیے دل چسپ بنایا جا سکتا ہے اسی طرح جغرافیے کی تدریس کو عملی کام کے ذریعے
دل چسپ بنایا جا سکتا ہے۔ زراعت اور سائنس کا تعلق بہت حد تک عملی کام سے ہے جو مختلف قسم کا ہو سکتا ہے مثلاً

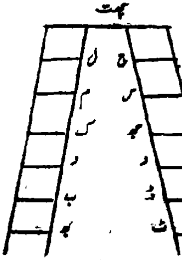
طلبہ پدستی کام میں دلچسپی لیتے ہیں۔ دستی کام کئی قسم کا ہوتا ہے مثلاً چکنی مٹی سے حروف، الفاظ اور کھلونے بنانا، کاغذ اور مقوے کے حروف اور اشکال کاٹنا۔ مختلف چیزوں کی ڈرائنگ کرنا اور ان میں رنگ بھرنا۔ مختلف چیزوں کی ڈرائنگ کرنا اور ان میں رنگ بھرنا۔ مختلف چیزوں کے نمونے بنانا۔ باغیچے میں کیاریاں تیار کرنا اور پھول لگانا وغیرہ

امید ہے کہ اگر مندرجہ بالا ہدایات کو پیش نظر رکھ کر کام کرنے کی کوشش کی جائے تو خراج اور زائد المیعادی کا مسئلہ حل کرنے میں ہم بڑی حد تک کامیاب ہو جائیں گے۔ اور اس طرح ہمارا وہ زر کثیر اور قیمتی روپیہ اور وقت ضائع ہونے سے بچ جائے گا، جو ان دونوں خامیوں کی وجہ سے ضائع ہو رہا ہے۔

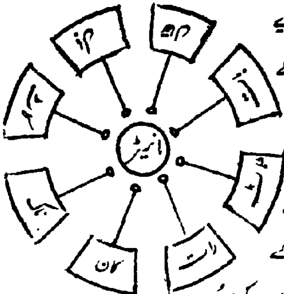
تدریسی کھیل

(۱) دیکھیں کتنی جلدی بوجھ لیتے ہو۔ (آموختہ حروف) الفاظ یا اعداد وغیرہ تختہ سیاہ پر لکھ دیے جائیں۔ ایک لڑکے کی آنکھیں بند کر کے دوسرے سے کہا جائے کہ وہ لکھے ہوئے حروف۔ الفاظ یا اعداد میں سے کسی ایک پر پوائنٹر سے اشارہ کرے، تمام لڑکے اس کو دیکھیں۔ پھر وہ طالب علم جس کی آنکھیں بند کی گئی تھیں آنکھیں کھولنے پر بوجھنے کی کوشش کرے اور لکھے ہوئے حروف یا الفاظ کی طرف اشارہ کر کے پڑھتا جائے۔ تمام جماعت کے طالب علم اس پر کہتے جائیں "پڑھا تو ٹھیک پر بوجھا نہیں" اور جب وہ بوجھ لے اور ٹھیک پڑھ بھی لے تو کہیں کہ "پڑھ بھی لیا اور بوجھ بھی لیا"۔

(۲) سیڑھی کا کھیل:۔ زمین پر ایک سیڑھی بنائیں جس کا اوپر والا سرا چھت کے ساتھ لگا ہوا ہو۔ سیڑھی کے ڈنڈوں پر جو (افق کے متوازی ہیں) یا تو زمین پر الفاظ یا حروف لکھ دیے جائیں یا ان پر تاش کے پتے رکھ دیے جائیں۔ پھر جماعت سے کہیں کہ سیڑھی چڑھتے چڑھتے ڈنڈوں پر لکھے ہوئے حروف پڑھتے جائیں۔ جو بچہ سب ٹھیک پڑھ لے وہ گویا چھت پر چڑھ گیا۔ جو بچہ کوئی لفظ یا حرف نہ پڑھ سکے وہ گویا گر گیا۔ کھیل کو بیان کرنے کے بعد کسی اچھے لڑکے سے کہیں کہ اب وہ سیڑھی پر دی ہوئی ہدایات کے مطابق چڑھے اور پھر اترتے وقت بھی ان الفاظ کو پڑھتا آئے۔ گرے ہوئے بچوں کو پھر سے موقع دیں۔



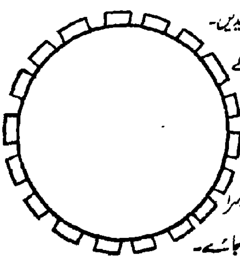
(۳) چھو چھو کا کھیل:۔ سامان: ۔۔ تاش ۔۔ مٹر اور کنڈے کے سٹنڈ



یکھوے بناکراس میں سرکنڈے کے ٹکڑے گاڑ دیے
ہر ایک ٹکڑے کے اوپر والے سرے میں افق کے
ی چیرد سے کران میں ایسے تاش لٹکا دیے
جن پر زیرِ مشق الفاظ یا حروف لکھے ہوئے ہوں
رف کا رُخ دائرے کے مرکز کی طرف ہو۔ لڑکے
ائرے کے محیط پر اندرونی طرف بھاگیں۔ استاد کے
بجانے پر ٹھہر کر اپنے اپنے سامنے کا حرف پڑھیں۔ یہ کھیل اُس
تک جاری ہے جب تک سب بچے ہر ایک حرف کو باری باری نہ پڑھ لیں۔

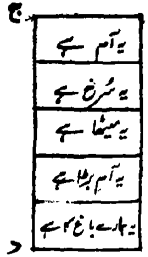
میری ٹوکری میں کیا ہے: - سامان :- کاغذ۔ مقوے یا چھڑیوں کی ٹوکری اور حروف، الفاظ یا اعداد کے تاش
ائرہ بنا کر بیٹھ جائیں۔ ایک بچہ ایک ٹوکری میں چند الفاظ یا حروف ڈال کر دائرہ کے اندر آجائے۔ پھر جب وہ دائرہ کا چکر
ے تو پھرتی سے کوئی سا تاش نکال کر کسی بچے کے سامنے کرے۔ اگر وہ بچہ فوراً پڑھ لے تو وہ ٹوکری کا مالک بن گیا۔ وہ
ے کے اندر آجائے اور پہلا لڑکا اس کی جگہ بیٹھ جائے۔ یہ کھیل کافی وقت تک جاری رہے تاکہ اکثر بچے ٹوکری کے
ے بن سکیں۔

چٹھی پڑھ کر آگے بھیجنا: - سامان :- حروف، الفاظ یا اعداد کے تاش۔



ں کو دائرے میں بٹھا دیں۔ ان کے ہاتھ میں تاش کا ایک پتہ دیدیں۔
ر اُن سے کہیں کہ یہ ان کی چٹھیاں ہیں، ان کو پڑھ لیں۔ اس کے
۔ ان سے کہا جائے کہ اپنی اپنی باری پر چٹھی پڑھ کر اپنے دائیں ہاتھ
لے لڑکے کو دیدو۔ مانیٹر یا گروپ لیڈر کھیل شروع کرے۔ جب
ب چکر ختم ہو جائے تو دوبارہ تاشوں کی تبدیلی اور پڑھنے کا دوسرا
پھر شروع ہو جائے۔ اس طرح کھیل کچھ عرصہ کے لیے جاری رکھا جائے۔
اگر حروف، الفاظ کی اچھی طرح مشق ہو جائے۔

(۵) لنگڑیے کا کھیل:- ا - ب - ج - د - دو خط زمین پر کھینچ کر دی ہوئی شکل کے مطابق خانے بنالیں۔ ان

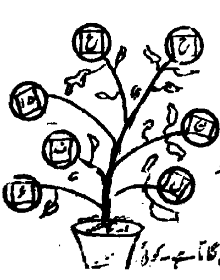


خانوں میں مختلف الفاظ یا فقرات لکھ دیں۔ اب ہر ایک بچہ اپنی اپنی باری پر ایک پاؤں پر اچھلتا ہوا ہر ایک خانے سے گذرے اور فقرہ پڑھتا جائے، جب غلط پڑھے تو واپس جائے۔ کامیابی کی شرط فقرات کا درست پڑھنا ہے اور شروع سے آخر تک ایک پاؤں پر اچھلنا ہے۔

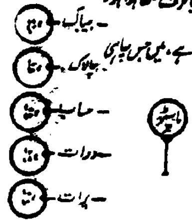
(۶) ایک ٹانگ پر کھڑے ہونا:- درس صحن میں چھوٹے چھوٹے خانے بنا کر ان میں تاشوں پر لکھے ہوئے حروف، الفاظ یا ہندسے رکھ دے۔ ایک لڑکا کود کر پہلے خانے میں جائے اور اس میں پڑے ہوئے ہندسے کو پڑھے، اور اٹھا کر ایسے خانے میں جا رکھے جس کا نمبر اٹھائے ہوئے گتے سے ایک کم ہو۔ پھر اگلے خانے میں کود کر جائے اور یہی عمل کرے، جب تمام گتوں کے جوڑے بنالے تو واپس آجائے۔ جو لڑکا درست ترتیب دے دے وہ کامیاب خیال کیا جائے۔ اسی طرح ہاتھ والے گتے سے ایک نمبر زائد والے گتے سے ملانے کا کھیل ہو سکتا ہے۔

۵	۱۳	۳
۶	۱۱	۱۲
۷	۹	۱۰
۱۴	۸	۷

(۷) پھول چننا اور پھول لگانا:- سامان۔ آموختہ حروف، الفاظ یا اعداد کے تاش۔ زمین پر یا تختۂ سیاہ پر پودے کی شکل بناؤ۔ اور ٹہنیوں کے سروں پر گول گول دائرے بنادو۔ گول دائروں میں تاش رکھ دو۔ پھر جماعت کو کہو کہ دیکھیں کہ کون سب سے زیادہ پھول چُن سکتا ہے۔ پھر کسی ایک طالب علم سے کہا جائے کہ وہ تاش کو پڑھ کر گول دائرے میں سے اٹھاتا جائے، باقی دیکھتے رہیں اور اس کے غلطی کرنے پر اسے بتادیں، لیکن ایسی صورت میں اس طالب علم کو وہ تاش اٹھانے کی اجازت نہ ہوگی۔ ایک دفعہ اس طرح تاش اٹھانے کے بعد پھر کہا جائے کہ دیکھیں کون زیادہ سے زیادہ پھول لگاتا ہے۔ کوئی

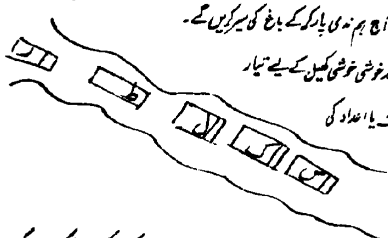


پولیس کا سپاہی: سامان:- حروف، الفاظ یا اعداد کے تاش



مدرس بچوں میں ایسا تاش تقسیم کرے جس کے ہر پتے پر زیر مشق لفظ یا حرف لکھا ہوا ہو۔ یا مدرس کہے کہ جس بچے کے پاس جو لفظ یا حرف ہے وہ لڑکا اسی نام کا سپاہی ہے۔ میں جس سپاہی کا نام لوں وہ آکر مجھے سلوٹ کر کے میرے سامنے کھڑا ہو جائے اس طرح جب سب بچے آجائیں تو پھر مدرس کہے کہ اب میں جس سپاہی کا نام لوں وہ واپس اپنی جگہ پر چلا جائے۔

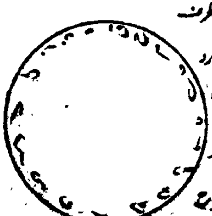
(۹) ندی پار کرنا:- مدرس بچوں کو کہے گا کہ آج ہم ندی پار کر کے باغ کی سیر کریں گے۔



بچے کھیل کا نام سن کر بہت خوش ہوں گے اور خوشی خوشی کھیل کے لیے تیار ہو جائیں گے۔ ان میں کہیں کہیں جن حروف یا اعداد کی مشق کروانا ہو گی ان کو لکھ دے گا یا ان کے تاش رکھ دے گا۔ اور ان کے ساتھ ہی پاؤں رکھنے کے لیے خانے بنا دے گا پھر کہے گا کہ آؤ باری باری اس ندی کو پار کریں۔ لیکن ندی کو پار وہی کر سکے گا جو ان پتھروں پر پاؤں رکھ کر ان کو پڑھ لے گا اور جو نہیں پڑھ سکے گا وہ پار نہیں کر سکے گا اور ندی میں گرا ہوا مانا جائے گا۔ اس طرح بچے باری باری زیر مشق حروف یا الفاظ وغیرہ کو پڑھ کر یاد کریں گے۔

(۱۰) ڈاکیے کا کھیل:- تاش ایک بچے کو دے دیے جائیں اور اسے ڈاکیہ بنایا جائے وہ تاش دوسرے لڑکوں کو پڑھ پڑھ کر سناتا ہوا بانٹتا جائے۔ جو سب سے زیادہ تعداد میں تاشوں کو پڑھے وہ ڈاکیہ سب سے زیادہ پڑھا گیا۔

(۱۱) دائرے کے گرد گھومنا:- مدرس ایک دائرہ لگا کر اس کے اندر کی طرف



حیطہ کے ساتھ حروف، الفاظ یا ہندسے لکھے گا، اور پھر بچوں کو اس کے گرد گھومنے کے لیے کہے گا۔ سیٹی یا تالی بجنے پر یا گانا بند ہونے پر بچے کھڑے ہو جائیں گے اور اپنے سامنے یا قریب لکھے ہوئے حروف، الفاظ یا اعداد کو پڑھیں گے اور حکم ملنے پر پھر چلنا شروع کریں گے۔ غرض اسی طرح

کھیل کھو دینے کے لیے جاری رہے گا۔ اسی کھیل میں درمیان میں کوئی عدد لکھ کر نمبر جوڑ، تفریق اور ضرب کی مشق بھی ہو سکتی ہے۔ اس صورت میں بچہ اپنے قریب کا عدد درمیان والے عدد سے یا جمع کر کے یا تفریق کر کے یا ضرب کر کے جواب بتائیں گے جو دیر سے جواب بتائے گا یا غلط بتائے گا ہار جائے گا۔

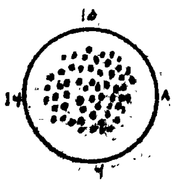
(۱۲) ٹھیکری پھینکنا:۔ تختہ سیاہ یا زمین پر خانے کھینچیے، اور زیر مشق حروف، الفاظ یا اعداد کو خانوں میں لکھ دیجیے تمام طلبہ کو سامنے کھڑا کر لیجیے۔ پھر ایک طالب علم کو ٹھیکری دیجیے کہ وہ انھیں ان خانوں میں پھینکے جس نقطہ پر ٹھیکری پڑے اسے پڑھے، جب تک ٹھیک پڑھتا رہے اس کی باری قائم رہے گی۔ اسی طرح باری باری تمام طلبہ ٹھیکری پھینکیں اور پڑھیں۔

م	ک	ل
س	ب	ن
ے	ع	د

یہ کھیل اس طرح بھی کھلایا جا سکتا ہے کہ جماعت کو دو ٹولیوں میں تقسیم کر دیا جائے اور انھیں ان خانوں کے دونوں طرف کھڑا کر دیا جائے اور مدرس یا مانیٹر ٹھیکری کی بجائے چھڑی کے ذریعے کسی خانہ کی طرف اشارہ کرے اور بالمقابل کھڑے ہوئے دو دو طالب علم حرف، لفظ یا عدد کو پڑھنے کی کوشش کریں۔ جو پہلے صحیح پڑھ لے گا وہ جیت جائے گا اور اس کا ایک نمبر ہو جائے گا آخر میں ٹولیوں کے نمبر جمع کر لیں۔ جس ٹولی کے نمبر زیادہ ہوں گے وہ جیت جائے گی۔

۶	۱	۲	۱۲
۳	۵	۴	۱۱
۸	۹	۷	۱۴
۱۰	۱۵	۱۶	۱۳

(۱۳) عدد کے برابر گولیاں نکالنا:۔ سامان:۔ مٹی کی گولیاں۔



ایک گول دائرے میں مٹی کی گولیوں کا ڈھیر ہے۔ باہر عدد لکھے ہوئے ہیں، بچے بیٹھے ہیں، "ٹھہر جاؤ" کے حکم پر کسی ایک لڑکے کو کہا جائے کہ وہ اپنے سامنے پڑے ہوئے عدد کے برابر گولیاں اٹھا لائے۔

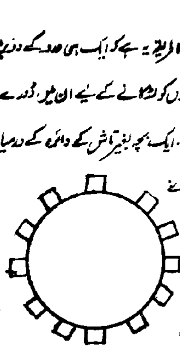
(۱۴) ڈھیری توڑنا:۔ سامان:۔ گتے کے روپے اور اعداد کے تاش۔

مدرس یا مانیٹر تاش اپنے پاس رکھ لے اور گتے کے روپے طلبہ کو بانٹ دے اور پھر تاش دکھائے جو عدد اس کے اوپر لکھا ہوا ہو، ہر ایک بچہ اس کے مطابق روپے گن کر اپنے سامنے پھیلا دے، [illegible]

گا لے، جو بچہ سب سے پہلے یہ کام ٹھیک کر لے مدرس اس سے رو پیہ لے لے اور تاش دے دے۔ جو طالب علم سب سے زیادہ تاش حاصل کر سکے وہ جیتا ہوا سمجھا جائے۔

(۱۱) جگہ بدلنا :- سامان :- اعداد کے جوڑا جوڑا تاش۔

یہ کھیل زبانی جمع تفریق کے لیے بہت مفید ہے۔ اس کھیل کے کھیلنے کا طریقہ یہ ہے کہ ایک ہی عدد کے دو دو بڑے تاش بنائے جاتے ہیں اور ان پر جلی قلم سے اعداد لکھ دیے جاتے ہیں۔ تاشوں کو لٹکانے کے لیے ان میں ڈوری ڈال دیتے ہیں۔ اور ایک ہی عدد والے طالب علموں کو بالمقابل کھڑا کر دیا جاتا ہے۔ ایک بچہ بغیر تاش کے دائرہ کے درمیان میں کھڑا کر دیا جاتا ہے۔ پھر مدرس دو عدد بولتا ہے جن کا مجموعہ یا فرق آمنے سامنے کھڑے ہوئے دو طالب علموں کے پاس ہوتا ہے۔ وہ آپس میں جگہ بدل لیتے ہیں اور درمیان والا لڑکا کوشش کرتا ہے کہ ان میں سے کسی ایک کی جگہ پر پہلے پہنچ جائے۔ مثلاً مدرس کہتا ہے کہ ۵ اور ۴ کا مجموعہ



بدلو تو جن کے پاس ۹ کا عدد ہوگا وہ آپس میں جگہ بدلیں گے۔ اسی طرح اگر کہے کہ ۱۲ اور ۷ کا فرق بدلو ۵ کے ہندسے والے اپنی جگہ بدلیں گے۔

میرے دل کی بات بوجھو :- مدرس یا مانیٹر کہے کہ میں نے دو عدد سوچے ہیں، جن کا مجموعہ یا فرق یا حاصل ضرب فلاں ہے۔ بتاؤ وہ کونسے عدد ہیں۔ مثلاً وہ ۳ اور ۶ سوچتا ہے اور کہتا ہے کہ میں نے دو عدد سوچے ہیں جن کا مجموعہ ۹ ہے بوجھو وہ کیا ہیں۔ کوئی لڑکا کہے گا کہ ۷ اور ۲ کوئی کہے گا ۵ اور ۴۔ علیٰ ہذا القیاس مدرس یا مانیٹر کہے گا۔ "بتایا تو ٹھیک لیکن بوجھا نہیں" حتیٰ کہ کوئی لڑکا ۶ اور ۳ بتا دے۔ اس وقت مدرس یا مانیٹر کہے "ٹھیک ہے بوجھ لیا"۔ پھر بوجھنے والا لڑکا دو عدد دل میں سوچ کر پوچھے گا جب تک طلبہ دلچسپی لیتے رہیں، کھیل جاری رکھا جائے۔

(۱۲) بال فریم کے کھیل :- (۱) مدرس، مانیٹر یا کوئی عدد کا تاش دکھائے اور دوسرا بال فریم کی اتنی ہی گولیاں گن کر علیحدہ کر دے (۲) ایک لڑکا بال فریم کی گولیاں گن کر علیحدہ کرے اور دوسرے اس عدد کا تاش دکھائے۔ یا وہی عدد زمین پر یا سلیٹ پر لکھیں۔ ٹھیک کرنے والے جیت گئے۔ نہ کرنے والے یا غلط کرنے والے ہار گئے۔ (۳) اسی طرح زبانی جمع اور تفریق کی مشق بھی ہو سکتی ہے۔

(۱۳) جملے بندی کا کھیل :- سامان :- کوئی چیز یا تصویر — کسی مقررہ چیز کے متعلق طلبہ باری باری ایک ایک جملہ

دوبارہ نہیں بولا جا سکتا۔ جو بچہ نیا جملہ نہ بول سکے وہ ہارگیا۔ یہ کھیل جماعت کی دو ٹولیاں بنا کر بھی کھیلا جا سکتا ہے۔ اس صورت میں جو ٹولی جلدی سے نیا جملہ نہ بنا سکے اور دوسری ٹولی بنا دے تو اس وقت کھیل کی جیت ہار کا فیصلہ ہو جائے گا۔

(۱۹) روٹی پکانا:۔ استاد کہے آؤ بھی آج روٹی پکائیں۔ پھر ان چیزوں کا نام پوچھے جو درکار ہیں، پھر مختلف طلبہ کو مختلف کام سپرد کرے، مثلاً کسی کو مٹی گوندھنے کا، کسی کو چولھا بنانے کا، کسی کو فرضی آگ جلانے کا، کسی روٹی گھڑنے کا: جو جو کام جس جس طرح کرتے جائیں۔ باری باری بتلاتے بھی جائیں۔ اس طرح طلبہ روٹی پکانے کی پوری ترکیب بیان کریں گے۔ ابتدا میں بچے اپنی مادری زبان میں بتائیں، پھر بتدریج ان کو اُردو میں بیان کرنے کی طرف لایا جائے۔ اس طرح بچوں کا ذخیرہ الفاظ بڑھے گا اور اپنے خیالات کو ترتیب دینے سے اظہار کی قوت پیدا ہو گی۔

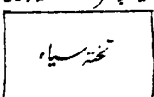
(۲۰) پہیلیاں بنانا اور بوجھنا:۔ چیزوں کے متعلق طلبہ انفرادی طور پر یا ٹولیوں میں اپنی پہیلیاں بنائیں۔ اس کے لیے کچھ وقت دیدیا جائے، اس وقت کے گذرنے پر طلبہ اپنی اپنی پہیلیاں بیان کریں اور دوسرے بوجھیں۔

(۲۱) فقرے بنانا:۔ مدرس ایک ایسا تاش تیار کرے جس میں فقرے کے سارے الفاظ آجائیں۔ مثلاً:۔

دوات میں سیاہی کم ہے

| میں | ہے | دوات | سیاہی | کم |

اس طرح ایک ایک لفظ کئی کئی پتوں پر لکھا ہوا ہو: سب پتے اچھی طرح آپس میں ملا دیے جائیں۔ جماعت کی دو ٹولیاں بنا دی جائیں۔ انھیں ایک دوسرے سے کچھ فاصلے پر تختہ سیاہ کے سامنے بٹھا دیا جائے، تختہ سیاہ پر فقرات لکھ دیے جائیں۔



پھر ان سے کہا جائے کہ بورڈ پر لکھے ہوئے فقرات کے مطابق تاش بناتے چلو۔ دس منٹ کے بعد پڑتال کی جائے کہ کس ٹولی نے زیادہ اور صحیح فقرات بنائے۔ وہی ٹولی جیتی ہوئی تصور ہو گی۔

(۲۲) دیکھیے کون جلدی لفظ تلاش کرتا ہے:۔ آموختہ سبق میں سے کوئی لفظ پوچھا جائے اور اس کے لیے وقت مقرر کر دیا جائے، کوئی شرط مقرر کر دی جائے، اس شرط اور وقت کے اندر اندر بچے اپنی کتاب کے صفحے پر سے مطلوبہ لفظ تلاش کریں اور انگلی رکھیں اور بیٹھے بیٹھے مانیٹر یا مدرس کو دکھا دیں۔

(حدیث [illegible])
مترجمہ [illegible]

پابندی آئین نے
ـسانوں کو تربیت دی

ـبدالغفور چودھری
مسلسل نمبر ۲

آموزش دسمبر میں یہ ذکر ہو چکا ہے کہ قانون اور آئین کا مقصد محض اصلاح تھا۔ اندھے انصاف کے تحت مجرم کو سوسائٹی سے تحلیل کرنا اس کی غایت ہرگز نہ تھی۔ سزا اس نیت سے دی جاتی تھی کہ مجرم کی روح اور ضمیر کو ستھرا کیا جائے۔ سزا کے بعد آپؐ ہر اصول اور آئین کا مفہوم واضح فرما دیتے۔ آپ کے کردار اور اخلاق کا لوگوں کے دلوں پر اتنا اثر تھا کہ وہ جرم کے بعد غیر شعوری طور پر دوڑے آتے اور سزا دیئے جانے پر مصر ہوتے۔ ایک بار معیز حاضر ہوئے اور کہا کہ اس نے زنا کا جرم کیا ہے، اور یہ اعتراف کھلے بندوں کیا۔ آپؐ نے معیز کی بات کو ٹال دیا۔ انہوں نے مکرر یہی اعتراف کیا، تو آپؐ نے پوچھا کیا تم دیوانے تھے؟ معیز بولے "نہیں"۔ پھر پوچھا "کیا تم نے نشے کی حالت میں ایسا کیا تھا؟" چنانچہ ایک آدمی نے اس کی تصدیق کرنے کو اس کے ہونٹوں کو سونگھا۔ آپؐ نے یہ بھی سوال کیا کہ وہ شادی شدہ ہے؟ عرض کیا "ہاں یا رسول اللہ"۔ آپؐ نے آخری بار دریافت فرمایا کہ "کیا تم نے عورت کو اپنے ہاتھوں سے چھوا تھا؟" اس پر معیز نے برجستہ کہا "نہیں یا رسول اللہ میں نے اس کے ساتھ زنا کیا تھا۔" آپؐ نے معیز کو بچانے کی کوشش سے مایوس ہو کر فرمایا کہ "اسے سنگسار کر دیا جائے"۔

ایک شخص نے روزہ کی حالت میں عورت سے ہم بستری کی اور دوڑا دوڑا آیا کہ یا رسول اللہ! میں نے جرم کیا ہے۔ آپ نے فرمایا "ایک غلام آزاد کر دو"۔ لیکن وہ شخص اتنا مفلس تھا کہ ایسا نہ کر سکتا تھا۔ آپ نے دو ماہ روزے رکھنے کو فرمایا لیکن اس نے معذوری کا اظہار کیا۔ آپ نے کہا ساٹھ بھوکوں کو کھانا کھلا دو، وہ یہ بھی نہ کر سکا۔ اتنے میں ایک شخص کھجوروں کا ٹوکرا لایا۔ آپ نے یہ ٹوکرا اس کو دیتے ہوئے فرمایا، "اسے غریبوں میں بانٹ دو"۔ اس پر اس نے عرض کیا یا رسول اللہ! سارے مدینے میں مجھ سے بڑھ کر کوئی غریب نہیں ہے"۔ آپ نے مسکرا کر فرمایا "لے جاؤ اور اپنے بیوی بچوں میں بانٹ دو"۔ (بخاری)

جب بھی آپ نے دیکھا کہ مجرم اپنے جرم پر نادم ہے تو آپ نے کبھی پوری سزا نہیں دلائی۔ معیز کے متعلق آپ کو جب [illegible] اس نے پتھروں کی بارش میں بھاگنے کی کوشش کی تھی، تو فرمایا "تم نے اسے بھاگ جانے کیوں نہ دیا؟" [illegible] لڑکی کے ساتھ زنا کیا تھا جو ہزال کی غلام تھی، اور پھر ہزال کے سامنے بھی اعتراف گناہ کر لیا تھا۔ لیکن پھر

اس کو پیغمبر کے پاس لائے جب غیرت سے شرمسار ہو گئے تو آپ نے شفقت سے فرمایا اگر تم غیرت کا یہ حال پا ہے
ڈھانپ لیتے تو کیا اچھا ہوتا۔ (مشکوٰۃ)

ایک شراب خور لایا گیا، جو اتنا مدہوش تھا کہ چل نہ سکتا تھا آپ نے دیکھا تو گر کر حضرت عباس کے گھر میں داخل ہو گئے، جو آپ کے حجرۂ مبارک کے نزدیک تھا جب لوگ وہاں بھی پہنچ گئے تو آپ نے فرمایا "کیا اس نے یہی کیا ہے"۔ اور پھر کچھ نہ فرمایا۔

جو لوگ معاشی بدحالی کا شکار ہوتے، انھیں نسبتاً ہلکی سزائیں دی جاتیں۔ اور غلاموں کے حق میں تو آپ بہت نرم تھے کیوں کہ وہ بے چارے شہری آزادی کی نعمت سے محروم تھے۔ اور انھیں زندگی کے بہت سے حقوق حاصل نہ تھے۔ چناں چہ اسلامی آئین کے مطابق غلاموں کو دوسرے شہریوں کے مقابلے میں آدھی سزا ملتی تھی۔ ان کے لیے زنا کے لیے پچاس دُرّے اور شراب خوری کے لیے بچاس درے سزا تھی، ایک غلام لڑکی کو آپ نے زنا کے جرم میں سزا دی اور فرمایا، کہ اس پر کسی حال میں بھی طعن نہ کی جائے، اور اگر اس سے یہی جرم پھر سرزد ہو تو اسے فروخت کر دیا

حضرت عمرؓ فرماتے تھے کہ اگر ایک غلام لڑکی، اپنے مالک کا کوئی سامان چوری کر لے تو اس کے اعضاء کاٹے جائیں، ایک شخص نے اپنے غلام کو چوری کے جرم میں پیش کیا کہ اس نے میری بیوی کا آئینہ چرا لیا ہے، اس پر حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ میں اس کے اعضاء کاٹوں گا کیوں کہ یہ شخص بھی تمہاری ملک ہے اور چرایا ہوا مال بھی۔

پیغمبر علیہ السلام سرقہ کے مقدمات کا فیصلہ کرنے میں سخت محتاط تھے۔ آپؐ کی ہمدردی عام طور پر سارق کے حق میں ہوتی۔ اگر یہ معلوم ہوتا کہ جرم مالی مجبوری کے تحت ہوا ہے، اور مجرم جرم کا عادی نہیں ہے، تو اس صورت میں آپ نہایت عزم و احتیاط کے ساتھ فیصلہ فرماتے، اسی طرح غربا، حاجت مندوں اور غلاموں کے لیے بھی احتیاط برتی جاتی۔ ایک غلام جو نہایت درجے کا اوباش تھا، چوری کے جرم میں چار بار آپ کے دربار میں لایا گیا، اور آپ نے ہر بار معاف کیا لیکن جب پانچویں بار اس نے یہی جرم کیا تو آپ نے ہاتھ کاٹنے کو فرمایا" (مشکوٰۃ)

ایک شخص نے بھوک سے تنگ آ کر مدینہ کے ایک باغ میں گھس کر خوب پھل کھائے، اور جس قدر ہو سکا اپنے کپڑوں میں بھی باندھ لیے۔ ابھی چلنے ہی کو تھا کہ مالک آ پہنچا اور اس کو اچھی طرح پیٹا اور [illegible]
کے پاس لے گیا آپ نے اس کی [illegible] حالت دیکھ کر فرمایا یہ بھوکا تھا [illegible]

اور یہ بے علم تھا تمہیں کچھ اسے سکھانا چاہیے تھا" پھر فرمایا "اسے چھوڑ دو"۔ کھجوروں کی چوری قابل مواخذہ نہیں خیال کی جاتی۔ بھوکا مسافر اگر کسی باغ سے حسب ضرورت پھل کھا لے یا گلے سے کسی بکری کا دودھ مالک کی اجازت کے بغیر لے لے تو قانون اس کے حق میں ہے۔ بشرطیکہ اس نے اپنی ضرورت سے زیادہ نہیں لیا ہو۔ حضرت امام ابو حنیفہؒ کے قول کے مطابق روزمرہ استعمال کی چیزیں۔ مثلاً ایندھن۔ گھاس پھلی۔ جنگلی جانوروں کا شکار یا پتھروں کی چوری قابل سزا نہیں ہے۔ (مشکوٰۃ)

حضرت عمرؓ فاقہ زدہ مجرموں کے بارے بہت محتاط تھے، ایک آدمی لایا گیا جس نے کسی شخص کی اونٹنی چرا کر ذبح کر لی اور کھالی۔ آپ نے اعضا کاٹنے کے بجائے اونٹنی کی قیمت سے دوگنا تاوان ادا کرنے کی سزا دی۔ اکثر حالتوں میں حضرت عمرؓ ان مجرموں کو جو مفلسی سے مجبور ہو کر چوری کرتے سزا دینے سے انکار کر دیتے۔

مدعی ہمیشہ مجرموں کے ساتھ رعایت کا برتاؤ کرتے۔ پیغمبرؐ ہمیشہ یہ مشورہ دیتے کہ مجرم کو معاف کر دیا جائے جرم کے بعد عام شرمساری تہمت یا ملامت ہی جرم کی سزا کافی خیال کی جاتی۔ آپؐ نے اعلان فرمایا تھا کہ :۔

"جہاں تک حدود اللہ کا تعلق ہے تم ایک دوسرے کو معاف کر دیا کرو، ورنہ میرے لیے جرم کی نوعیت کے مطابق سزا دینا ناگزیر ہے"

فتح مکہ سے پیشتر ہجرت کی بعض شرائط تمام مسلمانوں پر عائد تھیں۔ صفوان بن اُمیّہ ان کی پڑتال کے لیے مدینہ میں آیا۔ رات کو وہ مسجد نبوی میں ٹھہرا، اپنی ردا سرہانے رکھی اور سو گیا، ایک آدمی نے یہ ردا چرالی لیکن صفوان نے پکڑ لیا اور حضورؐ میں لے گیا۔ آپؐ نے ہاتھ کاٹنے کا حکم دیا۔ صفوان نے کہا کہ میرا ہرگز یہ مطلب نہ تھا کہ اس بے چارے کو یہ سنگین سزا ملے، اور کہا کہ میں یہ ردا اسے بطور خیرات پیش کرتا ہوں۔ اس پر پیغمبرؐ نے فرمایا ۔

"تم نے یہ خیرات میرے پاس پہنچنے سے پیشتر کیوں نہ کی؟"

ایک بار جب آپؐ نے ایک سارق کے لیے ہاتھ کاٹنے کی سزا تجویز کی تو آپؐ کو نہایت قلق ہوا۔ ایک صحابی نے عرض کیا۔ یارسول اللہ! کیا آپؐ یہ پسند نہ فرماتے تھے، تو فرمایا، اگر تم اپنے بھائیوں کے مقابلے میں شیطان بن جاؤ تو مجھے سزا دینے سے کون روک سکتا ہے ؟ حاکم کو چاہیے کہ وہ انصاف کرے۔ لیکن خدا غفور الرحیم ہے اس لیے تمہیں بھی اپنے بھائیوں کو معاف کر دینا چاہیے۔ کیا تم نہیں چاہتے کہ خدا تمہیں معاف کرے"۔

حضورؐ کے نزدیک معافی کی صورت یہی تھی کہ حاکم کے پاس دعویٰ دائر ہی نہ کیا جائے، ورنہ اس کے بعد انصاف کا

فیصلہ لانا آتا ہے۔ اگر مجرم کے جرم کا تعلق محض اس کی ذات سے ہی ہوتا تو نرم سزا دی جاتی۔ شراب خوری کے لیے آپؐ نے

ہمیشہ شرابی کے ذاتی حالات کو مدنظر رکھ کر سزا تجویز کی۔ ایک عادی شراب خور کے متعلق فرمایا کہ اگر پھر اس نے ایسا کیا تو اس کی

سزا موت ہو گی، لیکن جب وہ پھر لایا گیا تو آپ نے اسے موت کی سزا نہ دی۔

جنگ بدر کا ایک بہادر مجاہد شراب پینے کے الزام میں پیش ہوا تو حضرت عمرؓ نے اسے قتل کر دینے کی بجائے

چاہی لیکن آپؐ نے کہا۔ تم اسے کیوں کر قتل کر سکتے ہو جبکہ بدر کی لڑائی میں لڑنے والا مجاہد ہے۔ ابو محجن ثقفیؓ جو جنگ

قادسیہ کی رات شراب خوری کے جرم میں قید تھے، اس قید خانے کی نگران سالار اعظم سعد بن ابی وقاص کی بیوی تھیں۔

صبح جب لڑائی ہو رہی تھی اور ابو محجن لڑائی کا منظر قید خانے کی کھڑکی سے دیکھ رہے تھے تو افسوس کر رہے تھے

کہ میں قید میں ہوں اور دوسرے لڑائی میں شامل ہیں۔ سعدؓ کی بیوی نے یہ دیکھ کر انھیں باہر نکال دیا۔ وہ سیدھے

میدان جنگ میں پہنچے اور اس بے جگری سے لڑے کہ تمام لوگ دنگ رہ گئے۔

یہ ضرور دیکھ لیا جاتا کہ جرم کن حالات میں سرزد ہوا ہے، اس کے لیے مجرم کا نفسیاتی، ذہنی، اور جسمانی طور

پر جائزہ ضروری ہوتا۔ مثلاً طویل بیماری کی صورت میں اعصاب زیادہ متاثر ہوتے ہیں اور اعضاء میں فوری تغیر پیدا

ہو جاتا ہے اور آدمی جلد مغلوب الغضب ہو جاتا ہے۔ ایسی باتیں بہرحال مدنظر رکھی جاتیں۔

"ایک انصاری کو لایا گیا کہ اس نے ایک غلام لڑکی سے زنا کیا ہے، وہ آدمی بیماری کی وجہ سے ہڈیوں کا ڈھانچہ تھا۔

آپ نے فرمایا کہ کھجور کی ایک لکڑی لاؤ جس کی سو شاخیں ہوں اور اس لکڑی کی ایک ضرب اس کو مار دو۔ (مشکوٰۃ)

ارادہ جرم اور اشتعال طبع کو ملحوظ رکھا جاتا۔ ایک قاتل نے اپنے جرم کا اقبال کیا تھا، اس نے کہا کہ مقتول اور

وہ دونوں ایندھن جمع کر رہے تھے کہ مقتول اچانک غصے میں آ گیا اور گالیاں دینے لگا، جس پر اس نے کلہاڑی کا ایک

ہی وار کیا اور وہ ڈھیر ہو گیا، آپؐ نے قصاص کے لیے کہا، لیکن وہ شخص نہایت مفلس تھا، اس پر آپؐ نے اس کو مقتول کے

بھائی کے حوالے کر دیا، جس نے اس کے گلے میں رسی کا پھندا ڈال دیا۔ آپؐ نے فرمایا کہ اس نے تمہارے بھائی کو قتل کیا ہے

اس لیے اس کی سزا بھی قتل ہی ہو گی، اس پر مدعی نے فیصلہ پیغمبرؐ پر چھوڑ دیا، آپؐ نے فرمایا اور کیا تم یہ پسند نہیں کرتے

کہ قاتل اپنے اور تمہارے بھائی کے گناہوں کو برداشت کرے؟ مدعی نے کہا ضرور کروں گا۔ اس پر آپؐ نے فرمایا کہ

"تو ایسی صورت میں ہو سکتا ہے کہ تم اس کو چھوڑ دو"

کئی بار ایسا ہوا کہ جب قاتل نے کہا کہ جرم میں اس کی نیت کو دخل نہ تھا تو مدعی یا ولی نے اس کو چھوڑ دیا۔ ہر مقدمے کے فیصلے میں منصف، مدعی اور مدعا علیہ کے احساسات اور جذبات ہم آہنگ رہتے اور فیصلے کا اطلاق حقائق پر کیا جاتا۔ مجرم کمال صاف باطنی کے ساتھ والہانہ انداز میں اقرار جرم کرتے اور اپنے آپ کو سزا کے لیے پیش کرتے وہ جرم کے بعد اپنی روحانی اذیت کا ازالہ اسی میں دیکھتے، وہ اپنی اندھی ضمیر میں پھر روشنی پیدا کرنے کے لیے سزا کو کافی خیال کرتے۔ اکثر حالتوں میں قومی مفاد اور مقاصد کے پیش نظر اپنے دعوؤں سے دست بردار ہو جاتے۔ اور اگر جرم اور خطا کا اثر ہمہ گیر نہ ہوتا تو اکثر درگذر اور معاف بھی کیا جاتا۔ عبدالرحمن بن عوف کو جو جلدی بیماری میں مبتلا تھے ریشمی کپڑا پہننے کی اجازت تھی۔ حضرت ابوبکر باوجود کوشش کے تہبند کو ٹخنوں سے اوپر نہ رکھ سکتے تھے، آپ نے انہیں معاف کر دیا۔ حجۃ الوداع کے موقع پر کچھ لوگوں نے عرض کیا کہ انہوں نے حج کی بعض واجبات غلط طور پر انجام دی ہیں۔ بہت سے ایسے تھے جنہوں نے مقررہ وقت سے پیشتر ہی قربانیاں دے دی تھیں۔ آپ نے فرمایا کہ کوئی بات نہیں تم اب پھر ایسا کر دو۔ ایک زخمی صحابی نے دوران سفر میں باوجود روکنے کے غسل کر لیا جس پر اس کے زخم خراب ہو کر اس کی موت کا باعث ہو گئے۔ آپ نے سنا تو فرمایا۔ اگر اس نے مجھ سے تیمم کے متعلق پوچھا ہوتا تو اس کی جان بچ جاتی۔

مذہبی فرائض کی ادائیگی میں تساہل کے معاملے میں آپ خطا کاروں پر نرم تھے۔ کیوں کہ یہ تساہل اکثر ذاتی ہوتا تھا۔ اگر کسی آدمی نے قومی بہبود کے پیش نظر نماز قضا کر دی تو آپ نے اس کے حق میں دعا فرمائی۔

انس بن مالک کہتے ہیں کہ سفر میں ہم جب کبھی پیغمبر کے ساتھ ہوتے تو دھوپ سے بچاؤ کے لیے چادریں تان دیتے۔ جنہیں روزہ ہوتا وہ ان چھاؤں میں بیٹھ جاتے اور جو روزے سے نہ ہوتے وہ اونٹوں کی نگرانی کرتے اور دوسرے ضروری کام سرانجام دیتے۔ آپ نے جب ان لوگوں کو فرائض میں معروف دیکھا تو فرمایا۔

"آج روزہ توڑنے والوں نے روحانی طور پر فتح پائی ہے"

یوں یوں مجرم کا اخلاق پاکیزہ ہوتا گیا۔ اسلامی آئین نے ان کے دلوں میں انتقام کے جذبات کو سرد کر دیا۔ … فرد اور معاشرے کا یکساں محافظ تھا۔ ہر شہری کا غیر شعوری طور پر معاشرے کے اخلاقی معیار کا احترام کرتا تھا، ایسے

جو انسان کا فردی اور معاشرتی لحاظ سے نقصان دہ ہوتا ہے۔ ہر شخص اسے روکنے کی کوشش کرے تو صغیرہ خطائیں جو کمزوری کا تقاضا ہیں، در گزر کی جائیں۔

"اور یقیناً جو لوگ کبیرہ گناہوں اور فواحش سے بچے اور معمولی خطاؤں میں گرفتار ہوئے۔ یقیناً تمہارا خدا انہیں معاف کر دے گا۔" (قرآن الحکیم)

پنج وقتہ نماز گویا پاکیزگی کا ایک بہتا ہوا دریا تھا کہ جس نے اس میں سے ایک قطرہ بھی پالیا، اس کے گناہوں کی نجاست صاف ہو گئی۔ ایک شخص نے مسجد نبوی میں حاضر ہو کر عرض کیا۔ یا رسول اللہ مجھ سے گناہ سرزد ہوا ہے۔ میرے لیے سزا کا حکم دیجیے۔ آپؐ باتوں میں مصروف ہو گئے اور اس کی طرف توجہ نہ فرمائی، اس شخص نے پھر وہی الفاظ دہرائے آپؐ پھر بھی خاموش رہے، اتنے میں نماز کا وقت آگیا اور وہ شخص نماز میں شامل ہو گیا۔ نماز کے بعد اس نے پھر وہی کہا تو آپ نے فرمایا:-

"تم نے نماز ادا کی تو تمہارا گناہ معاف ہوا" (مسلسل)

بچے اور کتابیں

ڈاکٹر عبدالرؤف

بچوں کی مناسب نشوونما میں کتابوں کو بہت اہمیت حاصل ہے۔ کتابیں بچے کے لیے دل چسپی اور تفریح کا بہترین سامان مہیا کرتی ہیں۔ بچپن میں پڑھی ہوئی کتابیں انسان کے اخلاق اور شخصیت پر نمایاں اثر چھوڑتی ہیں۔ انہی کتابوں کی رو سے بچے کے ذہن میں نیکی اور بدی غلط اور صحیح کے ابتدائی تصورات کی داغ بیل پڑتی ہے۔ ظاہر ہے کہ ان ابتدائی تصورات کی نوعیت ان کتابوں کی نوعیت پر منحصر ہے جو اس عمر میں بچے کی توجہ اور دل چسپی کا مرکز بنتی ہیں۔

لطف اندوزی پہلو

بچوں کی زندگی میں کتابیں متنوع اغراض و مقاصد کو پورا کرتی ہیں۔ بچوں میں لطف اور مسرت حاصل کرنے کی فطری خواہش بڑی قوی ہوتی ہے۔ اس خواہش کو پورا کرنے کا ایک اچھا ذریعہ کتابیں ہیں۔ قصے کہانیوں کی کوئی دلچسپ کتاب پڑھنے سے بچے کو جو فرحت نصیب ہوتی ہے اس کا اندازہ لگانا مشکل ہے۔ کہانی کے واقعات اور کردار بچے کو اس قدر بھاتے ہیں کہ وہ کچھ دیر کے لیے کتاب میں کھو جاتا ہے۔ کسی دل چسپ شغل میں کچھ دیر کے لیے اس طرح مکمل طور پر کھو جانا بچوں کی شخصیت کی نشوونما کے لیے بہت مفید ہے۔

معاشرتی تعلیم

کمسن بچے کی معاشرتی کائنات بہت محدود رہتی ہے۔ اس کی ابتدائی معاشرتی ارتباط تعلقہ والدین اور اپنے قریبی ماحول کے چند ایک دوسرے افراد تک ہی محدود ہوتا ہے۔ نتیجتاً انسانی زندگی اور کردار سے متعلق اس کا علم اور اسکی معاشرتی اقدار انہی معدود ے چند لوگوں سے اختلاط اور ارتباط پر مبنی ہوتے ہیں۔ بچہ جب کتابوں میں دوسرے لوگوں کا ذکر اور مختلف جگہوں کے حالات پڑھتا ہے تو اس کے معاشرتی علم اور روزمرہ سلیقے میں وسعت پیدا ہوتی ہے۔ کتابوں سے اس کی خود مرکزیت پر بڑی لطیف ضرب لگتی ہے۔ پھر جوں جوں اس کا مطالعہ وسیع ہوتا جاتا ہے اس کے معاشرتی سلیقے میں مزید وسعت پیدا ہوتی چلی جاتی ہے۔

سیرتی ادب کا مقام

بچوں کی معاشرتی تعلیم میں سیرتی ادب کو ممتاز مقام حاصل ہے۔ سوانح حیات کے مطالعے سے بچے کے ذہن پر خوش گوار اثر پڑتا ہے۔ مذہبی رہنماؤں، سائنس دانوں، ادیبوں اور بڑے آدمیوں کی زندگی کے حالات پڑھنے سے بچے میں اصلاح اور رغبت کی خواہش تقویت پکڑتی ہے۔ سیرت کے اکابر کم سن قاری پر بہت گہرا اثر چھوڑتے ہیں کیونکہ اثر پذیری اور تقلید کے اعتبار سے عمر کا یہ حصہ بہترین دور ہوتا ہے۔

کتاب اور عمر

عمر کے مختلف ادوار میں مختلف قسم کی کتابیں بچوں کی توجہ اور دلچسپی کا مرکز بنتی ہیں۔ بہت چھوٹے بچے ایسی تصویری کتابیں پسند کرتے ہیں، جن میں ان کے قریبی ماحول کی چیدہ چیدہ اشیا کا تصویر میں ذکر ہو۔ کچھ عرصہ بعد ایسی کتابیں انھیں مرغوب ہونے لگتی ہیں جن میں ان کی ذاتی زندگی کے روزمرہ واقعات کا ذکر ہو۔ مثلاً کسی ننھے بچے کا ذکر ہو جو کھانا کھا رہا ہو۔ غسل کر رہا ہو، کھیل رہا ہو وغیرہ وغیرہ۔ بڑے بچے ایسی کتابیں شوق سے پڑھتے ہیں، جن میں واقعات کا تانا بانا ہو اور انہیں ماحول کے ساتھ مربوط کر کے بیان کیا گیا ہو۔

بچوں کو جانوروں، باغوں، درختوں، پھولوں، دریاؤں، نہروں، پہاڑوں، چاند ستاروں اور بادلوں سے بڑی دلچسپی ہوتی ہے۔ قصے کہانیوں وغیرہ کی کتابوں میں قدرت کے ان مظاہروں کا ذکر ان کے لیے بہت مفید ثابت ہوتا ہے۔ بچوں کے ادب کا ایک اہم مقصد بچوں کو ماحول سے متعلق صحیح واقفیت بہم پہنچانا ہے۔ اس لیے کتابوں میں ماحول اور مظاہر قدرت کا ذکر کرتے وقت صحیح بیانی کا خصوصی خیال رکھنا چاہیے۔ مثال کے طور پر اگر کسی کتاب میں دریا کو پہاڑ کی چوٹی کی طرف بہتے، مچھلی کو ہوا میں اڑتے اور ہاتھی کو درخت پر چڑھتے ہوئے بیان کیا گیا ہو تو کم سن قاری کے غلط فہمی اور انتشار میں مبتلا ہو جانے کا اندیشہ لاحق ہو جاتا ہے۔

جنوں اور پریوں کی کہانیاں

پانچ چھ برس کی عمر تک بچوں کو جنوں اور پریوں کے قصے کہانیوں سے محفوظ رکھنا چاہیے۔ ذہنی طور پر ناپختہ ہونے کی وجہ سے بچے ان کہانیوں کے غیر معمولی، مافوق اور خیالی کرداروں کو صحیح طور پر سمجھنے سے قاصر ہوتے ہیں۔ ایسی کہانیاں اس عمر میں کوئی مفید مقصد پورا کرنے کی بجائے بچے کے ذہن میں بیجا خوف و وہم اور اضطراب کی تخلیق

لگ دیتی ہیں۔ مجھے کئی ایک ایسے جن اور پری زدہ بچوں کے مطالعہ کا موقع ملا ہے جو ابتدائی عمر ہی میں ان کہانیوں کے ایسے اثرات کا شکار ہو گئے تھے۔

میرے خیال میں بہتر یہی ہے کہ جب تک بچے ذرا بڑے نہ ہو جائیں اور ان میں روزمرہ زندگی کی سمجھ بوجھ کا شعور پیدا نہ ہو جائے انھیں اس قسم کے ادب سے دور رکھنا چاہیے۔ ذرا بڑی عمر میں جنوں اور پریوں کی کہانیاں کافی مفید ثابت ہو سکتی ہیں۔ ایسی کہانیاں پڑھنے سے ذرا بڑی عمر کے بچے نہ صرف لطف اور مسرت ہی محسوس کرتے ہیں، بلکہ ان کی قوت تخیل کو مناسب غذا بھی ملتی ہے۔ مگر اس عمر میں والدین اور مصنفین کو اس بات کا خصوصی خیال رکھنا چاہیے کہ جنوں اور پریوں کی کہانیاں پڑھتے وقت بچوں کو اچھی طرح یقین ہو کہ کتاب کے کردار اور واقعات حقیقی نہیں بلکہ تخیلی ہیں۔

مذہب اور سائنس سے متعلق ابتدائی کتب

مذہب، سیاست اور تمدن کا وہ سرچشمہ ہے جس سے تشنہ رہنے والے بچے یقیناً بڑے بدنصیب ہیں۔ مذہبی تاریخ روایات اور عبادات سے متعلق آسان فہم کتابیں بچوں کے لیے بے حد مفید رہتی ہیں۔ انحطاط کے اس بدترین دور میں جب جاہل اور دقیانوسی مولویوں نے مساجد کو علمی، تمدنی اور ثقافتی زاویہ نگاہ سے ویران کر دیا ہو اور معاشرے کے گلی کوچوں کو اخلاقی بدحالی سے مسموم کر دیا ہو، بچوں کو بداخلاقی کی زد سے محفوظ رکھنے کا ایک موثر ترین طریقہ یہ ہے کہ انھیں اچھی اچھی مذہبی اور اخلاقی کتابوں سے مستفیض کیا جائے۔

ہماری روزمرہ زندگی کو سائنس کی اشیاء اور ایجادات نے کس قدر آسان اور آرام دہ بنا دیا ہے۔ بچوں کے ادب میں برقی قوت، جہازوں، موٹر کاروں، ریڈیو، ٹیلی فون، ٹیلی ویژن وغیرہ کا ذکر ہونا چاہیے۔ قصے کہانیوں کی کتابوں میں بھی ان اشیاء کا ذکر کیا جا سکتا ہے۔ اس سے بچوں میں ان سائنسی اشیاء پر خصوصی اور تحقیقی کتابیں پڑھنے کا شوق پیدا ہوتا ہے۔ ایسے بچے جنھیں ابتدائی عمر میں کتابوں کے ذریعے سے سائنس کی اشیاء اور ایجادات سے تعارف نہیں ہوتا، آئندہ زندگی میں طرح طرح کی دقتیں محسوس کرتے ہیں۔

مزاحیہ تصویریں اور جرائم پسندی

مغربی ممالک میں بچوں کے ان تصویری رسالوں کی تباہ کاریوں سے کون واقف نہیں جنھیں انگریزی میں [illegible]

کومک (comic) کتابوں پر جو نفسیاتی تحقیق ہوئی ہے ان رسالوں کے بچوں پر برے اثرات پر خاصی روشنی ڈالی ہے۔ بچے جب ایک مرتبہ ان تصویری رسالوں میں جرائم، تشدد اور ہولناک واقعات کی دلچسپ داستانیں پڑھتے ہیں تو ان میں خلاف معاشرت اور اوباش زندگی بسر کرنے کے چھوٹے موٹے تجربے کرنے کی اکساہٹ پیدا ہوتی ہے۔ ہمارے ہاں کومک ابھی شروع نہیں ہوا۔ مگر مغربی ممالک سے درآمد شدہ کومک بعض بچوں میں کافی مقبول ہونے لگے ہیں۔ ہمارے ہاں بچوں پر ان رسالوں کے مخصوص اثر کے بارے میں ابھی تک کوئی تحقیق نہیں ہوئی۔ تاہم بہتر یہی ہے کہ ہم اپنے بچوں کو ان مخرب اخلاق رسالوں کی زد سے محفوظ رکھیں۔

ہمارا مقدس فریضہ

آج ہماری اخلاقی قدریں پامال ہو چکی ہیں۔ ہمارے بدنصیب بچے اپنے روزمرہ اوقات کا بیشتر حصہ ایسی گندہ فضا میں گذار رہے ہیں جو ان کے لیے ہر طرح سے مہلک ہے۔ ان کے بیشتر تفریحی مشاغل غیر متمدن ہیں۔ نتیجتاً ہمارے بچوں میں بری عادات۔ گالی گلوچ۔ اٹھائی گیری، محنت اور تعلیم سے نفرت، اور خلاف معاشرت حرکات سے رغبت عام ہو گئی ہے۔ بچوں کے اخلاقی اور تمدنی انحطاط کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ ہم انہیں ایسی کتابیں مہیا کرنے میں غفلت برت رہے ہیں جو ان کی دلچسپی کا محور بن کر ان کی علمی، ادبی، اخلاقی، اور معاشرتی فلاح و بہبود کا ذریعہ بن سکیں۔ بچوں اور قوم کی صحیح اور سائنسی خدمت کا موثر ترین طریقہ یہ ہے کہ مختلف عمر کے بچوں کے لیے زندگی اور علم کے ہر شعبے سے متعلق دلچسپ اور مفید کتابوں اور رسالوں کے عمدہ عمدہ سلسلے شروع کیے جائیں۔ اس مقدس فریضہ کو پورا کرنے کے لیے ہر اس حساس اور روشن دماغ شہری کے تعاون اور جدوجہد کی ضرورت ہے۔ جسے بچوں اور قوم سے کسی نہ کسی قسم کی کوئی دلچسپی ہو

طلبہ پر سینما کے اثرات

فضل احمد

مغرب کی میکانکی تہذیب نے مشرقی ملکوں میں نہایت دور رس معاشرتی تبدیلیاں پیدا کی ہیں، یوں تو یہ اثرات پچھلی صدی کے آغاز سے ہی مصروف کار ہیں، لیکن موجودہ صدی میں ان کی کارفرمائیاں بہت شدت پکڑ گئی ہیں۔ مشرقی روایات اور قدامت پسندی نے ہر چند ان اجنبی اثرات کا راستہ روکنے کی کوشش کی، مگر اسے ہر مرتبہ ہار ماننی ہی پڑی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جدید میکانکی ذرائع بذات خود کوئی بری شے نہیں، وہ مادی دنیا میں ذہن انسانی کی حیرت انگیز کامیابیاں ہیں اور ان کی طفیل زندگی کی مادی آسائشوں میں بے حد اضافہ ہوا ہے۔ انسان فطرتاً ایسی چیزوں کا شیدائی ہے جو جسمانی تکان کو کم کرنے اور حواس ظاہرہ کو فرحت بخشنے والی ہوں، لہٰذا روایات کے نام پر ایسی چیزوں کا راستہ روکنا ایسا ہی ہے جیسے کوئی بیوقوف کا بند باندھ کر ندی کے پانی کو پہاڑ کے اوپر کی طرف دھکیل دینا چاہے۔ ایسی کوشش کا نتیجہ سوائے اس کے کیا ہوگا کہ گو عارضی طور پر پانی رکتا ہوا دکھائی دے، مگر بہت جلد اس کا ریلا بندشوں کو اس طرح بہا لے جائے گا کہ ان کی صف آرائی کا کوئی اثر باقی نہ رہے گا، پس جدید میکانکی ایجادوں کے بارے میں صحیح طریق کار یہ نہیں کہ انہیں مذہب یا روایات کے نام پر ملعون قرار دیکر ممنوع قرار دیدیا جائے بلکہ معقولیت کا تقاضہ یہ ہے کہ ان کے وجود کو ناگزیر مان کر انہیں ایک صحت مند معاشرتی زندگی کی ترقی کے لیے استعمال کیا جائے۔ ایسا کرنا عین منشائے فطرت اور دلیل ہوشمندی ہے اور اس کے برخلاف عمل کرنا سراسر نادانی اور ضیاع توانائی۔

ہماری قومی زندگی کی ایک بڑی مصیبت یہ ہے کہ اکثر نئی چیزوں کی مخالفت مذہب کے نام پر کی جاتی ہے، اور جہاں مذہب کا نام بیچ میں آیا جذبات کا بھڑک اٹھنا لازمی ہو گیا اور معاملہ پر ٹھنڈے دل سے غور کرنے کے امکانات ختم ہو گئے۔ تاہم جذبات کی ہنگامہ آرائی انقلاب وقت کا راستہ روکنے کے معاملے میں ہمیشہ بے بس ثابت ہوا کرتی ہے۔ اس حقیقت کا روشن ثبوت درکار ہو تو منبروں پر کھڑے ہو کر جذبات بھڑکانے والوں کا اپنا عمل ملاحظہ کر لیا جائے، عموماً حالت یہ ہوگی کہ ؎

چوں بخلوت مے روند ۔ آں کار دیگر مے کنند

مثلاً یہ ایک مشاہدہ ہے کہ جو حضرات آج سینما اور فلموں کے سختی سے مخالف ہیں اگر وہ خود ان سے واسطہ بھی رکھتے ہوں تو ان کے خویش و اقارب اور اہل و عیال ان کی مثال سے ہرگز متاثر نظر نہیں آتے۔ اس اجتناب سے کہیں زیادہ اچھا ہوتا کہ یہ پاک امن حضرات خود فلم کی لذت سے آشنا ہوتے اور اپنے زیر اثر لوگوں کو اس کے حسن و قبح سے واقف کر کے مناسب راہنمائی فرماتے کیونکہ رفتار زمانہ سے الجھ کر ہم اس کا رُخ نہیں بدل سکتے۔ البتہ اس کی قوتوں کو اچھی طرح جانچ کر ہم ان کی مدد سے زندگی کی مادی اور روحانی مسرتوں میں اضافہ کر سکتے ہیں۔

اس تمہید کے بعد ہم اب سینما کے مختلف معاشرتی پہلوؤں پر ایک تنقیدی نگاہ ڈالیں گے، بحث کے آغاز میں یہ کہہ دینا ضروری ہے کہ ہر چیز کی طرح سینما نے بعض اچھے نتائج بھی پیدا کیے ہیں اور بعض بُرے بھی۔ ہاں ضروری ہے کہ مناسب احتیاطوں سے اس کے بُرے اثرات کو محدود کیا جا سکتا ہے، اور اس کی خوبیوں کو اور بڑھایا جا سکتا ہے۔ مغربی ممالک نے اس ضمن میں کافی کچھ تحقیقی کام بھی کیا ہے۔

سر رچرڈ لونگ سٹون کا قول ہے کہ فلم موجودہ صدی کی ایک نئی قوت ہے جس نے گرجے کے کام کو سنبھال لیا ہے۔ مغرب میں اس خیال کو عام طور پر صحیح سمجھا جاتا ہے۔ تاہم ایسی آوازوں کی کمی نہیں جو خطوط اور مضامین کی شکل میں آئے دن اخبارات اور رسائل میں سینما کے خلاف اٹھائی جاتی ہیں، اور جن کا لب لباب یہ ہوتا ہے کہ نوجوانوں کی بے راہ روی اور طلاق بازی براہ راست ہالی وڈ کی تعلیمات کا اثر ہے۔ حال ہی میں انگلستان میں جو تحقیقی کام ہوا ہے اس نے اس معاملے پر بڑی دلچسپ روشنی ڈالی ہے۔ یہ تحقیقات ابھی صرف بچوں اور نوخیز جوانوں کے متعلق ہی کی گئی ہے، اس کا یہ مطلب نہیں کہ تجربہ کار بالغوں پر فلموں کا کوئی اثر نہیں ہوتا بلکہ بچوں کو چنے کی وجہ یہ تھی کہ بالغوں کی طرح ان کی رہنمائی کے لیے زندگی کا تجربہ موجود نہیں ہوتا جس کی روشنی میں نیک و بد کی تمیز آسانی سے ہو جائے، اس کی دوسری وجہ یہ تھی کہ نوخیز نوجوانوں کو بالخصوص اس بات کی جستجو ہوا کرتی ہے کہ جنس مخالف کو متاثر کرنے کے لیے کون کون سے اوضاع و اطوار ملائم اور مہذب شمار کیے جاتے ہیں۔ ان امور کے پیش نظر یہ ظاہر تھا کہ بچوں اور نوجوانوں پر سینما کا اثر زیادہ گہرا اور زیادہ پائیدار نوعیت کا ہے، اس لیے اس کا مطالعہ نسبتاً زیادہ اہم ہے۔

برمنگھم یونیورسٹی نے اس اہم مسئلہ کے متعلق اعداد و شمار فراہم کرنے کے لیے ایک مجلس مقرر کی تھی

تین سال کی تحقیقات کے بعد اس مجلس نے جو اطلاعات فراہم کی ہیں وہ صدر درجہ سبق آموز ہیں۔ کیوں کہ ان کی روشنی میں بعض غلط الزامات کی تردید ہو جاتی ہے اور بعض دوسرے پہلوؤں کے متعلق بہت دل چسپ حقائق منظر عام پر آگئے ہیں۔ سب سے پہلی بات جو واضح طور پر ثابت ہوئی ہے یہ ہے کہ یہ کہنا غلط ہے کہ طلبہ اپنے فارغ اوقات کا بیشتر حصہ سینما دیکھنے میں صرف کرتے ہیں۔ کتابوں کے مطالعہ، کھیلوں اور ریڈیو سننے کو یقینی طور پر سینما کی نسبت زیادہ وقت ملتا ہے۔ اس کو تقریباً تقریباً اتنا ہی وقت دیا جاتا ہے جتنا دوسرے دل چسپ مشاغل کو۔ گھر کے کام کو تحقیقات کرنے والی جماعت نے تین سو طلبہ کے جس نمائندہ گروہ کا مطالعہ کیا اس میں صرف آٹھ فی صد طلبہ ایسے تھے جو سینما دیکھنے میں بہت زیادہ وقت ضائع کرتے تھے۔ اکثریت ایسے طلبہ کی تھی جو ہفتہ میں ایک دو بار فلم دیکھنے جاتے تھے اور وہ بھی اپنے ہمجولیوں یا والدین کی معیت میں۔ صرف کوئی سولہ فی صد طلبہ نے تسلیم کیا کہ وہ علیحدگی میں فلم دیکھنے کو ترجیح دیتے ہیں۔

سینما پر ایک عام اعتراض یہ ہے کہ یہ زندگی سے پناہ ڈھونڈنے کا ایک ذریعہ ہے اور بچوں کو حقائق زندگی سے بے تعلق بنانے کا موقعہ پیش کرتا ہے۔ لیکن بالکل یہی اعتراض ناول خوانی اور بعض دوسری ثقافتی سرگرمیوں پر وارد ہو سکتا ہے۔ جب ان چیزوں کو ثقافتی تربیت کے لیے مفید خیال کیا جاتا ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ فلم کو مردود قرار دیا جائے۔ درآں حالیکہ طلبہ بالعموم ایسی فلموں کے شیدائی ہوتے ہیں جو عمل اور زندگی سے بھرپور ہوں، مثلاً ایسی فلمیں جو معرکہ ہائے جدال و قتال خطرناک مہموں اور سنسنی خیز جرائم کو پردہ سیمین پر پیش کریں، وہ چودہ برس تک کے طلبہ کے دلوں کو خوب گرماتی ہیں۔ نوعمر طلبہ زیادہ تر فیچروں کے دلدادہ ہوتے ہیں، جس کا صاف مطلب یہ ہے کہ فطرت انسان، حسن قدرت اور مطالعہ حیوانات کے متعلق ان کی دل چسپی بڑھ رہی ہے۔ اس گروہ میں ایک طبقہ ایسا بھی ہوتا ہے جو فلمی تنقیدوں کو متواتر دیکھتا رہتا ہے اور اگر ان کی مناسب رہنمائی کی کوئی صورت نکالی جاسکے تو اسے فلمی آرٹ کے متعلق گہری نگاہ کا مالک بنایا جا سکتا ہے۔

حال ہی میں مانچسٹر کی علمی اور فلسفی مجلس کے ایک جلسہ میں شہر کے چیف پروبیشن افسر نے بتایا کہ طلبہ کی بے راہروی کا بیشتر حصہ محض شرارت نفس کی وجہ سے ظہور پذیر ہوتا ہے، اس کا دوسرا بڑا سبب انفرادیت کی ترقی کے امکانات کا دھندلا ہے۔ سینما اس کے لیے ذرہ بھر بھی ذمہ دار نہیں ہے۔" اگرچہ اس رائے سے بہت کم لوگوں کو اتفاق ہوگا، لیکن حالیہ تحقیقات نے اس کی تائید کر دی ہے۔ اس تحقیقات نے جس چیز کی طرف توجہ دلائی ہے وہ یہ ہے کہ اگرچہ کم عمر طلبہ جرائم والی فلموں کا

بہت پسند کرتے ہیں لیکن خود ان سے بد اخلاقی کے بجائے خوش اخلاقی کا سبق اخذ کرتے ہیں کیونکہ ایسی فلموں میں مجرم کو بالآخر گرفتار ہوتے اور اپنے کیے کی سزا پاتے دکھایا گیا ہوتا ہے۔ اس سے نہ صرف قانونی اور انتقامی کارروائی کی قابلیت کا نقش کھنچ جاتا ہے بلکہ اخلاقی اور روحانی قوانین کی ہمہ گیر قوت کا احساس بھی ہونے لگتا ہے۔

مضمون کے خلاف ایک شکایت یہ بھی تھی کہ وہ بچوں کی نگاہ میں والدین کی توقیر کو گھٹا دیتی ہیں۔ اس سلسلہ میں جو شہادتیں ہاتھ لگی ہیں ان سے کوئی واضح نتیجہ نہیں نکالا جا سکا۔ ایسی فلمیں جن میں والدین کی غیر معمولی قربانیوں کو پیش کیا گیا ہو یقینی طور پر بچوں کے دلوں میں اپنے ماں باپ کا احترام بڑھا دیتی ہیں اور انہیں آئندہ زندگی میں اچھے والدین بننے میں بھی مدد دیتی ہیں۔ اس کے برعکس ایسی فلمیں جن میں ماں باپ کو اولاد سے بے پرواہ دکھایا گیا ہو یا جہاں ان کے باہمی تعلقات ناخوشگوار دکھائے گئے ہوں۔ یا جہاں میاں یا بیوی میں سے ایک کو بے وفا اور سنگدل ظاہر کیا گیا ہو وہاں لازمی طور پر نتیجہ یہی ہوتا ہے کہ بچے اپنے ماں باپ کی طرف سے بدظن ہو جاتے ہیں۔ غرضیکہ فلم اخلاقی تربیت کا ایک نہایت مؤثر ذریعہ ہے۔ وہ اگر مرغوب اخلاقی اسباق کو غیر معمولی کامیابی کے ساتھ ذہن نشین کرا سکتی ہے تو ناپسندیدہ اخلاقی الحاد کا بیج بھی ایسی ہی کامیابی کے ساتھ بو سکتی ہے۔

فلموں پر ایک اعتراض یہ بھی ہے کہ ان کو دیکھ کر ہماری بہو بیٹیاں لباس اور آرائش کے مذموم طریقے اختیار کر لیتی ہیں۔ اس میں کلام نہیں کہ لباس اور زیبائش کے معاملے میں سینما عورتوں پر بڑا اثر ڈالتا ہے۔ تیرہ اور چودہ برس کی جن تین سو بچیوں کا مطالعہ کیا گیا ان میں سے ایک تہائی ایسی تھیں جنہوں نے لباس اور ذاتی زیبائش کے بارے میں فلمی ستاروں کو نمونہ بنا رکھا تھا۔ یہاں تک کہ کئی لڑکیاں اپنے بال بھی بالکل اسی طرح سنوارتی تھیں جس طرح ان کی چہیتی ایکٹریسیں۔ ان کے علاوہ بہت سی دوسری لڑکیوں نے تسلیم کیا کہ اگر انہیں روک ٹوک کا ڈر نہ ہوتا تو وہ یقیناً اپنے بالوں کو فلم ایکٹریسوں کی طرح سنواریں۔ تاہم ایک خاصی تعداد نے کہا کہ وہ سادگی کو بناوٹ پر ترجیح دیتی ہیں۔ اس سلسلے میں زیادہ قابلِ لحاظ بات یہ ہے کہ جہاں فلمی کرداروں کو نمونۂ عمل بنایا بھی گیا، وہاں بھی عموماً صرف سلجھے ہوئے مذاق کے معیاری ستاروں کو ہی نمونے کے لیے چنا گیا۔ ان تمام شواہد کی روشنی میں یہ کہنا بجا ہے کہ سینما کے عیوب کو بڑھا چڑھا کر بیان کیا گیا ہے۔

فلموں کے انتخاب کے بارے میں جو سوالات پوچھے گئے ان کے جوابوں سے پتہ چلتا ہے کہ فلم کا انتخاب یا ان ہی نمونوں کی وجہ سے کیا جاتا ہے جو سینما گھروں میں دکھایا جاتا ہے اور فلمی ستاروں کی شہرت کی بنا پر [illegible]

فلم کے خاتمہ پر آگے آنے والی فلموں کے نمونے دکھائے جاتے ہیں، یہ نمونے عام طور پر فلم کے بعض نہایت جذباتی اور شورش حصوں کو یکجا کر دیتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس طرح فلم کی اصل ماہیت کے متعلق کوئی صحیح رائے قائم کرنا مشکل ہوتا ہے۔ اس طرح بعض طلبہ فلمی دنیا کے مشہور کرداروں کے ساتھ جذباتی لگاؤ پیدا کر لیتے ہیں، اور جس فلم میں ان کا نام آیا اس کو ایک معیاری فلم سمجھ لیا گیا۔ فلم کے انتخاب کی یہ دونوں صورتیں صد درجہ ناتسلی بخش ہیں اور ان کو ختم کرنے کے لیے فلمی صنعت اور محکمہ تعلیم کے درمیان تعاون ہونا چاہیے۔ فلمی موضوعوں کے اخلاقی پہلوؤں کے متعلق جو شہادت ہاتھ لگ سکی ہے وہ لازمی طور پر تشویش انگیز ہے۔ امریکہ میں تین سو نوخیز جوان طلبہ کا دو ہفتے تک مطالعہ کیا گیا۔ معلوم ہوا کہ کم و بیش نصف طلبہ نے ایسی فلمیں دیکھیں جو سنسر بورڈ کی طرف سے بچوں کے لیے ناموزوں قرار دی جا چکی تھیں۔ اس پر مستزاد یہ کہ ان میں اکثریت ایسوں کی تھی جنھوں نے یہ فلمیں بغیر کسی ساتھی کے دیکھی تھیں۔ ان فلموں کا ایک نمایاں پہلو یہ تھا کہ ان میں مصنوعی شہری پس منظر کی بھرمار تھی، لیکن قدرتی دیہاتی پس منظر تقریباً ناپید تھا۔ شہری زندگی اور گھریلو زندگی کے جو منظر دکھائے گئے تھے وہ حقیقت سے بہت ہٹے ہوئے تھے۔ مثلاً گنجان آباد شہروں کے تنگ و تاریک حصوں کو سرے سے اڑا دیا گیا تھا اور رہائشی مکانوں کے صرف سونے کے کمرے دکھائے گئے تھے۔ جبکہ باورچی خانے اور دوسرے حصے منظر پر نہیں لائے گئے۔ ان تمام باتوں نے یہ بات ثابت کر دی ہے کہ فلموں کے اخلاقی اثرات کے متعلق جو شکایتیں سنی جاتی ہیں وہ بہت کچھ اصلیت پر مبنی ہیں اور بچوں کو ناموزوں فلموں سے بچانے کے لیے زیادہ مؤثر ذرائع کی ضرورت ہے۔

ایک اور بات جس کی طرف توجہ دلائی گئی ہے، یہ ہے کہ گو سینما دیکھنے والوں میں اکثریت ایسے لوگوں کی ہے جو غریب طبقوں سے تعلق رکھتے ہیں، تاہم فلمی کرداروں کو اکثر دولت میں کھیلتے دکھایا جاتا ہے۔ ۲۵ فی صد فلمیں ایسی تھیں جن کے کردار اپنی موزوں معاشرتی سطح سے کہیں بڑھ چڑھ کر ابھر دکھائے گئے تھے۔ صرف ۱۲ فی صد فلمیں ایسی تھیں جو غریب طبقہ کی زندگی کی عکاسی کرتی تھیں اور صرف ۲۳ فی صد درمیانہ طبقہ کی زندگی۔ اس یک طرفہ مبالغہ کا ایک نتیجہ یہ ہے کہ بچے پردہ سیمیں پر اکثر نکھے اور تن آسان لوگوں کی زندگیوں کو دیکھتے ہیں اور قدرتی طور پر خود آئندہ زندگی میں اسی قسم کے اوضاع و اطوار کو نصب العین بنا لیتے ہیں۔ مگر جب دیکھتے ہیں کہ یہ خواہش بر آتی نظر نہیں آتی تو اپنی زندگیوں کو خواہ مخواہ تلخ پاتے ہیں۔

فلمی کرداروں کی اکثریت کو خود غرض اور بے اصول دکھایا گیا تھا اور آدمی سے زیادہ [illegible]

ت مقاصد کو کامیاب ظاہر کیا گیا تھا حقیقی انہماک باہمی پر محبت کبھی کبھار ہی نمایاں کی گئی تھی صرف محبت اور
شادی کا انحصار زیادہ تر جذبات اور ظاہری نمائش پر تھا۔ ان تمام باتوں سے بچوں کے جذباتی توازن کا درہم برہم ہونا
ونا بہت اغلب ہے۔

ان پندرہ فلموں کو مطالعہ کے لیے اس لیے نہیں چنا گیا تھا کہ ان فلموں کی خاص طور پر قابل اعتراض فلمیں
دکھائی جانے والی تھیں، وقت کا یہ انتخاب بالکل اتفاقی تھا، اس لیے ظاہر ہے کہ فلمی موضوعوں کے اخلاقی پہلوؤں
کو زیادہ توجہ سے دیکھنا چاہیے۔

اس مطالعہ نے ایک اور مطالعہ کی طرف بھی توجہ دلائی ہے۔ وہ یہ کہ بچے اور نوعمر طلبہ خواہ وہ لڑکے ہوں
یا لڑکیاں جذباتی کیفیتوں سے حد درجہ متاثر ہوتے ہیں۔ مثلاً خواہ فلم کا موضوع خاصہ سنجیدہ ہو تو بھی اگر کوئی
معمولی سا ہنسانے والا واقعہ بھی آجائے گا تو وہ قہقہہ مار اٹھیں گے۔ اسی طرح اگر کسی کہانی میں کوئی اکا دکا
ہراس انگیز واقعہ بھی آجائے تو وہ جھٹ خوف سے سہم جائیں گے۔ پھر یہ چیز صرف وقتی نہیں ہوتی۔ ان
جذباتی کیفیتوں کی واضح تصویریں بعد میں بھی باقی رہتی ہیں۔ اکثر بچے کئی دنوں بعد بھی ڈراؤنے واقعات کی ہو بہو
تصویریں کھینچ کر رکھ دیتے ہیں۔ اس تجزیے کی روشنی میں یہ ضروری نظر آتا ہے کہ جذبات کو شدید طور پر جھنجھوڑنے
والی فلمیں بچوں کے لیے ممنوع قرار دی جائیں۔

رومانی فلمیں نوعمر طلبہ کے جنسی جذبات کو بلاشبہ بہت متاثر کرتی ہیں۔ کوئی دو تہائی طلبہ نے عشق و محبت
کے منظروں کے ساتھ اپنی دل بستگی کا اعتراف کیا اور لڑکے لڑکیوں دونوں نے تسلیم کیا کہ وہ فلم دیکھتے وقت اپنے آپ کو
علی الترتیب ہیرو اور ہیروئن کے مترادف خیال کرتے ہیں۔ ان فلموں کا مجموعی نتیجہ یہ ہے کہ پاکیزہ اوصاف کی بجائے جسمانی زیب
زینت کو ہی صنف مخالف کی کشش کا ذریعہ خیال کیے جانے لگتا ہے۔ امریکی تحقیقات نے ثابت کیا ہے کہ عشقیہ مناظر کا ردعمل
بالغوں پر اس قدر شدید نہیں ہوتا جتنا نوعمروں پر۔

طلبہ عموماً ہنگامہ خیز اور تہلکہ ڈالنے والے واقعات سے بھرپور فلموں کے بہت دلدادہ ہوتے ہیں اور چونکہ
خود اپنی زندگیوں کو گرم ہنگامے سے خالی پاتے ہیں، اس لیے یہ زندگیاں انھیں بے کیف اور مثالی زندگی سے گھٹیا
معلوم ہونے لگتی ہیں تاہم یہ امر موجب اطمینان ہے کہ اکثر طلبہ نے اپنی زندگیوں میں ایسے ہنگامے پیدا کرنے کی

خواہش ظاہر نہیں کی۔

مندرجہ بالا مطالعہ صرف کم سن یا نو عمر طلبہ سے متعلق تھا۔ بالغوں پر سینما کے گوناگوں اثرات کیا ہیں؟ اس سوال کا جواب دینے کے لیے ابھی کوئی قابل اعتماد مواد ہاتھ نہیں لگا۔ تاہم یہ رائے غالباً صحیح ہے کہ جب تک کوئی بالغ گہری نگاہ اور بے لاگ رائے کا مالک نہ ہو، اس وقت تک وہ سینما کے سارے مضر اثرات سے نہ بچ سکے گا۔ بالغوں میں یہ اوصاف پیدا کرنے کی کیا صورت ہو، اور ان صورتوں کو کس طرح عملی جامہ پہنایا جائے؟ یہ ایسے سوالات ہیں جو جواب دینے سے پہلے کافی وسیع تحقیقاتی کام کی ضرورت ہے۔

بچوں کے بارے میں اب تک جو تحقیقی کام ہو چکا ہے اس سے فلموں کے کئی ایک برے اثرات پوری طرح ثابت ہو چکے ہیں، ان کا تدارک کیوں کر ہو؟ بعض کی رائے ہے کہ بچوں کے لیے فلمیں دیکھنا بالکل ممنوع قرار دیا جائے۔ یہ تجویز بالکل ناقابل عمل ہے۔ جہاں والدین اور دوسرے سمجھ دار لوگ باقاعدہ سینما جاتے ہوں وہاں بچوں کو اس سے جبراً باز رکھنے کی کوئی صورت نہیں۔ اگر بفرض محال کوئی ایسی راہ ڈھونڈ بھی لی جائے تو بچپن میں فلموں کو شجر ممنوعہ قرار دے کر بالغ ہونے پر یک دم کھلی چھٹی دینا نہایت خراب اثرات پیدا کر سکتا ہے۔ اغلب یہی ہے کہ وہ بالغ جس نے بچپن سے فلموں کے حسن و قبح کے متعلق کچھ نگاہ پیدا کر لی ہے وہ ان سے زیادہ مستفید ہو سکے گا۔ پس اصل علاج فلموں کا دیکھنا سرے سے بند کر دینا نہیں بلکہ بعض ضروری احتیاطوں کو کام میں لانا ہے۔

ایک برطانوی مدرس نے مشورہ دیا ہے کہ عین جس طرح علم ادب کے مطالعہ میں مصنف کے مقاصد اور ان مقاصد میں اس کی کامیابی سے بحث کی جاتی ہے، اسی طرح فلموں کے بارے میں بھی یہی ہونا چاہیے۔ اس میں غالباً کلام نہیں کہ اگر ایسی بحث کا کچھ اہتمام ہو سکے تو یہ شے ذہنی اور جذباتی تربیت کے لیے خوب کارآمد ثابت ہوگی۔ کیونکہ اس بحث میں ان تمام غلط زاویہ ہائے نگاہ کو کھول کر بیان کیا جا سکتا ہے جن کے پاس باعث طلبہ کے خراب تاثر لینے کا خدشہ تھا۔ اگر یہ چیز ممکن ہو سکے تو اس صورت میں طلبہ کو ہر قسم کی فلمیں دیکھنے کی اجازت دی جا سکتی ہے، عین جس طرح انہیں ٹیڑھا یا الٹا عکس دینے والے آئینوں کو دیکھنے کی اجازت ہے۔ ایسے آئینوں کے متعلق کسی کو یہ کھٹکا نہیں کہ ان کو دیکھ کر طلبہ اپنے چہرے کے متعلق کوئی غلط تصور قائم کر لیں گے۔ کیوں کہ غلط عکس کے اثر کو زائل کرنے کے لیے اچھا آئینہ ہر وقت مل سکتا ہے۔ بالکل اسی طرح اگر طلبہ کے لیے ممکن ہو کہ ہر فلم کی اصل ماہیت کو بھی دیکھ لیا کریں تو پھر ان کے مضر اثرات

زیادہ چھوڑنے کی ضرورت نہیں۔

دوسری صورت یہ ہے کہ بچوں کے لیے تمام فلمیں حکومت خود تیار کروائے اور خود اپنے مخصوص سینما گھروں میں نمائش کرے۔ فلم چونکہ ایک نہایت مؤثر تعلیمی ذریعہ ہے اس لیے حکومت اسے کلی طور پر اپنے ہاتھ میں لینا چاہے تو بالکل بجانب ہوگی۔ بلکہ ایسے پُر تاثیر تعلیمی حربہ کو تجارتی اداروں کے ہاتھ میں چھوڑ دینا اصولاً درست نہیں۔ اگر حکومت براہ راست یہ کام ہاتھ میں نہ لینا چاہے تو اسے لازم ہے کہ ایک مجلس ایسی قائم کر دے جو طلبہ کو دکھائے جانے والی فلموں کی پوری پوری نگرانی کرے۔ بچوں کے لیے تمام فلمیں اس جماعت کے مشوروں سے تیار ہوا کریں۔

بہر صورت حکومت کا یہ فرض بالکل بدیہی ہے کہ طلبہ کے حسب حال فلموں کے لیے کچھ واضح معیار مقرر کر دے اور انہیں صرف انہی فلموں کے دیکھنے کی اجازت دے جن کو ان معیاروں کے مطابق قرار دیا جا چکا ہو۔ یہ امر بے حد افسوسناک ہے کہ ہمارے ہاں طلبہ پر اس قسم کی کوئی پابندی عائد نہیں، وہ بلا تکلف جن فلموں کو چاہتے ہیں دیکھتے ہیں حالانکہ آزاد خیال مغربی دنیا اپنے طلبہ کی اخلاقی صحت مندی کے لیے یہ احتیاط اختیار کر چکی ہو۔ ہمارا تغافل اور بھی افسوسناک ہے۔ ہماری مجالس آئین ساز کو چاہیے کہ پہلی فرصت میں اس اہم سوال کی طرف توجہ دیں۔

فلم جدید میکانکی تہذیب کا ایک اہم حلیہ ہے۔ پچھلی سطور کے مطالعہ سے یہ حقیقت واضح ہو چکی ہے کہ مغرب میں بھی سینما نے بعض ناخوشگوار نتائج پیدا کیے ہیں۔ امریکہ سے اور والدین و معلمین یہ محسوس کرنے لگے ہیں کہ چھوٹے اور نو عمر بچوں کو ان مضر اثرات سے بچانے کے لیے مناسب تدبیریں اختیار کرنی چاہئیں۔ اس غرض کو حاصل کرنے کے لیے تحقیقی کام شروع ہو چکا ہے اور کئی صورتوں میں فلم دیکھنے کے بارے میں طلبہ پر پابندیاں بھی لگائی جا چکی ہیں۔ کوشش یہ کی جا رہی ہے کہ فلموں کے مضر اثرات کو زیادہ سے زیادہ محدود کر دیا جائے تا کہ طلبہ پر ان کے برے اثرات کا خطرہ باقی نہ رہے۔

ہمارے ہاں صورت حال بالکل مختلف ہے۔ پرانی وضع کے لوگ فلم اور سینما کو سرے سے ناقابل برداشت خیال کرتے ہیں۔ ان کا بس چلے تو آج ہی تمام سینما گھروں کے بند کیے جانے کا حکم جاری ہو جائے۔ دوسری طرف جدید انگریزی خواں طبقہ ہے جو سینما کا اس حد تک دلدادہ ہے کہ اس کے بغیر اسے زندگی ہیچ نظر آتی ہے۔ تیسرا گروہ بھی ایک آدھ شہروں اور قصبوں کے [illegible]

کا رُخ کرتے ہیں اور دوسرے ہمارے سکولوں اور کالجوں کے طلبہ جن کی عام طبعی اور قوتِ برداشت انہیں اکثر سینما کا دلدادہ بنا دیتی ہے۔ یہ تیسرا گروہ ایسے لوگوں پر مشتمل ہے جن پر سینما کے اثرات بہت کچھ مضر ہیں۔ ان مضر اثرات کو محدود کرنے کے لیے تحقیقی مطالعہ اور ہمدردانہ سوچ بچار کی ضرورت ہے۔ لیکن اس سلسلہ میں دشواری یہ ہے کہ ہمارے ہاں علمائے کرام تو سینما کو سرے سے حرام قرار دے کر اس کا نام تک سننا نہیں چاہتے، اور مغرب زدہ روشن خیال اس کو زندگی کے لیے اکسیر سمجھ کر اس کے خلاف لب کشائی گناہ سمجھتے ہیں، اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ وہ بے خبر اور بے بس طبقہ جس کو رہنمائی اور دستگیری کی ضرورت ہے، ضروری احتیاطوں کے بغیر اندھا دھند اپنی راہ پر چلے جا رہا ہے۔ پسماندہ اقوام میں یہ افسوسناک صورت عام ہوا کرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایسے ممالک میں حزم و احتیاط کی ساری ذمہ داریاں حکومت کے کندھوں پر آ جاتی ہیں۔ جہاں رائے عامہ اجتماعی زندگی کی صحت مندی کا بندوبست نہ کر سکے، وہاں یہ کام چار و ناچار حکومت کو انجام دینا پڑتا ہے۔ ہمارے ہاں یہ امید رکھنا عبث ہے کہ کوئی بھی ادارے یا رضاکار جماعتیں طلبہ پر سینما کے اثرات کا تحقیقی جائزہ لیں گی اور فراہم کردہ شواہد کی روشنی میں حکومت سے حفاظتی تدابیر کا مطالبہ کریں گی۔ یہاں یہ سارا کام زود یا بدیر خود حکومت کو ہی کرنا ہو گا۔

فراعنۂ مصر کے عہد میں نظامِ تعلیم

نذیر احمد

وادیٔ نیل دنیا کی قدیم ترین تہذیبوں کے گہواروں میں سے ایک ہے۔ قدیم مصریوں نے حضرت مسیح کی پیدائش سے ہزاروں برس پہلے اس سرزمین میں جس بلند پایہ تہذیب کی داغ بیل ڈالی تھی اس کے آثار آج بھی دنیا کو حیرت میں ڈال رہے ہیں۔ یہ امر مسلمہ ہے کہ کوئی قابلِ ذکر تہذیب تعلیم و تعلم کے بغیر ممکن نہیں۔ چنانچہ اس دھندلے تاریخی دور میں بھی ہم دیکھتے ہیں کہ مصری بستیوں میں مدرسے موجود ہیں اور نوشت و خواند کو اس قدر بلند مقام حاصل ہے کہ مصری لوگ اس کی تحصیل کے لیے کٹھن سے کٹھن ضبط میں سے گذرنے کے لیے بھی بشوق تیار ہیں۔

منشی گری کا پیشہ

آج کل تعلیم کا نصب العین فرد کے شخصی جوہروں کو چمکانا اور انسان کی ترقی کے پورے مواقع بہم پہنچانا ہے لہٰذا کسی شخص کو خواہ زندگی میں کوئی پیشہ بھی اختیار کرنا ہو تعلیم اس کے لیے ضروری خیال کی جاتی ہے۔ قدیم مصر میں تعلیم کا یہ تصور موجود نہ تھا، علم صرف وہ لوگ حاصل کرتے تھے جنھیں آگے چل کر منشی گری کا پیشہ اختیار کرنا ہوتا تھا، منشیوں کی مانگ کافی تھی، کیوں کہ نہ صرف شاہی محاصل اور تعمیرات کا حساب کتاب رکھنے کے لیے ان کی ضرورت ہوتی تھی، بلکہ ہر شہر اور قریہ کی عبادت گاہوں میں بھی ان لوگوں کے بغیر کام نہ چلتا تھا۔ رئیسوں اور امرا کو بھی ان کی خدمات حاصل کیے بغیر چارہ نہ تھا، اس کے علاوہ ابتدائی اور ثانوی مدارس اور اعلیٰ تعلیمی اداروں میں بھی ان لوگوں کی خدمات ناگزیر تھیں الغرض فراعنہ کی تہذیب میں منشی کو ایک خاص مقام حاصل تھا۔ شاہی منشیوں کو دربار میں خاص تقرب حاصل ہوتا تھا گویا ایک ادنیٰ سے ادنیٰ مصری بھی لکھنا پڑھنا سیکھ کر فرعون کے تقرب سے نوازے جانے کی امید کر سکتا تھا۔

ابتدائی تعلیم کا نصاب

تمام طلبہ کو ابتدائی تعلیم یکساں نوعیت کے پرائمری مدرسوں میں دی جاتی تھی، ان مدرسوں کے اخراجات عوامی محاصل سے پورے کیے جاتے تھے، شاہی محل کی چار دیواری کے اندر بھی مدرسے موجود ہوتے تھے جہاں

امتیازی حیثیت کے مدرس شہزادوں، امرا کے بچوں اور ان غیر ملکی طلبا کو تعلیم دیتے تھے جو غیر ممالک سے محض تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے شاہی مہمانوں کی حیثیت سے آئے ہوتے تھے۔

ابتدائی تعلیم کے عرصہ میں طلبا کو سینکڑوں تصویری علامات اور ان کے معانی کو یاد کرنا پڑتا تھا۔ یہ معانی کئی ایک جدولوں میں تقسیم کیے ہوتے تھے، یاد کرنے کے ساتھ ہی ساتھ انہیں ان تصویری علامات کو شکستہ خط میں لکھنے کی مشق بھی کرائی جاتی تھی۔ علمی زبان عام بول چال سے بہت کچھ الگ تھی اور بے چارے طلبہ کو یہ علمی زبان اور اس کے مخصوص الفاظ یاد کرنے پڑتے تھے۔ ایسا کیے بغیر وہ چھوٹے فقروں اور آسان عبارتوں کو نقل کرنے کے قابل بھی نہ ہو سکتے تھے کیونکہ تصویری الفاظ کے باہم ملا کر شکستہ خط میں لکھنے سے بڑی دشواریاں پیدا ہوتی تھیں۔ ان الفاظ کے غیر مانوس ہجا ایک اور مشکل پیدا کرتے تھے۔

ابتدائی اسباق کے دوران میں طلبہ کو پیپرس پر لکھنے کی اجازت نہ ہوتی تھی، بلکہ وہ ٹوٹے ہوئے برتنوں یا پتھروں کے چوڑے ٹکڑوں پر مشق کرتے تھے۔ ہر طالب علم کے پاس عموماً لکڑی کا بنا ہوا ایک لمبا قلم دان ہوتا تھا جس میں دو گڑھے موجود ہوتے تھے۔ ان میں سے ایک میں کالی سیاہی اور دوسرے میں سُرخ سیاہی ہوتی تھی۔ اسی قلم دان میں چند ایک کلک کی قلمیں بھی ہوتی تھیں جنہیں گھڑ کر آگے سے باریک کیا ہوتا تھا۔ اس باریک سرے کے ریشوں کو کوٹ کر ایک برش کی شکل دیدی جاتی تھی، اور منشی ہمیشہ اسی برش کے ساتھ لکھتے تھے۔ ہر منشی لکھنا شروع کرنے سے قبل برش کو سیاہی میں ڈبو کر باہر نکالتا تھا اور سیاہی کے چند قطرے علم کے دیوتا تھوتھ کی نذر کے طور پر زمین پر گرا دیتا۔

ہر تحریری مشق کے ساتھ تاریخ کا اندراج ضرور کیا جاتا تھا جیسا کہ آج کل دستور ہے، ایک سال کی تعلیم کے بعد طالب علم اس قابل ہو جاتے تھے کہ اخلاقی کتابوں سے عبارت کو ٹھیک طور پر نقل کر سکیں۔

صبح کے اوقات پڑھنے لکھنے کے لیے مخصوص تھے جبکہ شام کے اوقات تربیت جسمانی اور طرح طرح کی کھیلوں کے لیے۔ بنی حسن کے مقام پر ایک مقبرے کی دیوار پر جسمانی ریاضت کے مختلف کرتبوں کی تصویریں پائی گئی ہیں۔

بدنی سزا

قدیم مصری مدرس بہت سے نفسیاتی حقائق سے بالکل بے خبر تھے۔ ان کا عام خیال یہ تھا کہ جس طرح ایک حیوان کو سختی کے ساتھ سدھایا جاتا ہے، بالکل اسی طرح انسانی بچے کو علم سکھانے کے لیے بھی اسے ایک کا تختہ بنا دیتے

گزارنا چاہیے اور بدنی سزا کے بارے میں اول ذکر کیا جا چکا ہے، جہاں یہ بات مشہور تھا کہ ایک کم عمر لڑکے کے کان اس کی پشت پر ہوتے ہیں، اور وہ اس وقت توجہ سے سنتا ہے جب اسے پیٹا جاتا ہے"

بعض اوقات ایک طالب علم کو سو سو کوڑے بھی لگا دیے جاتے تھے۔ مگر یہ شدید سزا زیادہ عام نہیں تھی۔ ایک تصویر میں ایک طالب علم کو سو کوڑے لگانے کا منظر دکھایا گیا ہے۔ غریب طالب علم کی ٹانگیں ایک چوبی ستون کے ساتھ جکڑی ہوئی ہیں، اور اس کے دونوں ہاتھ ایک مضبوط آدمی نے پکڑ رکھے ہیں۔ جبکہ دو اور آدمی کوڑے کے ہمراہ ضربیں لگانے کو تیار کھڑے ہیں۔

زجر و توبیخ

اس سے یہ مطلب نہ لینا چاہیے کہ استاد معمولی ڈانٹ ڈپٹ یا ترغیب و تحریص سے کام ہی نہ لیتے تھے۔ یہ پہلے کہا جا چکا ہے کہ قدیم مصری ایک جانور اور ایک انسانی بچے کی تربیت میں کوئی فرق نہیں دیکھتے تھے، چنانچہ یہ ذیل کے اشعار ان کے اس نظریہ کے حامل ہیں۔

بندر کو ناچنا سکھایا جاتا ہے اور گھوڑے سدھائے جاتے ہیں۔

چیل اوپر اپنے گھونسلے میں بیٹھی ہے۔

میں بھی تمہیں لکھنا سکھاؤں گا۔

مشورہ سے فائدہ اٹھانے میں جلدی کرو۔

اسے نظر انداز مت کرو اور لکھنے سے مت اکتاؤ۔

اپنا جی اس کام میں لگاؤ۔ میری باتوں پر کان دھرو۔

وہ تمہارے لیے سودمند ثابت ہوں گی۔

اس قسم کی زجر و توبیخ کے ساتھ ساتھ اکثر اوقات طالب علموں کو معقولیت کے ساتھ قائل کرنے کی کوشش بھی کی جاتی تھی، مثلاً۔

اچھے خط کے ساتھ پڑھو۔

اچھے ہاتھ کے ساتھ لکھو۔

جو تم سے زیادہ جانتے ہیں ان سے مشورہ لو۔

اپنے آپ کو اعلیٰ عہدوں کے لیے تیار کرو۔

تم بڑے ہو کر اس منصب کو پاؤ گے۔

وہ منشی کیسا خوش نصیب ہے جو اپنے کام میں ماہر ہے۔

وہ ہر کام کر لیتا ہے جو اسے سونپا جائے۔

ہر روز اپنا کام محنت سے کرو۔

تم یقیناً اپنے فن میں مہارت حاصل کر لو گے۔

اعلیٰ تعلیم

ابتدائی تعلیم کے بعد ثانوی تعلیم شروع ہوتی تھی، اس مرحلہ پر طالب علم کو کاغذ پر لکھنا، اور منشی گری کا علم سکھایا جاتا تھا اور پہلے روز سے ہی اس کے دل میں اس فن کی عظمت کا احساس پیدا کرنے کی ہر ممکن کوشش کی جاتی تھی، اور یہ بات اسے اچھی طرح ذہن نشین کرائی جاتی تھی کہ :۔

"حقیقت یہ ہے کہ منشی گری سے بہتر اور کوئی پیشہ نہیں۔ ایک منشی باقی سب لوگوں سے بالا ہے۔ اگر تم ایک دن بھی بطور ایک کامیاب منشی کے بسر کر لو تو زندگی کا یہ دن غیر فانی بن جائے گا، جو کام تم اس حیثیت سے کرو گے وہ پہاڑوں کی طرح پائندہ رہے گا۔ کیا تم قلمدان کو ہاتھ میں اٹھائے ہوئے نہیں ہو، یہی امتیاز ہے جو تمہیں ایک چپو چلانے پر حاصل ہے، اپنی کتاب میں بالکل اسی طرح غوطہ لگاؤ جس طرح تم پانی میں غوطہ لگایا کرتے ہو۔ جو آدمی کبھی بھی اس حالت کو نہیں پہنچتا وہ بڑا بدنصیب ہے۔"

ثانوی تعلیم کے عرصے میں طالب علم پرانی کتابوں سے پوری پوری واقفیت حاصل کر کے مضمون نگاری کی صلاحیت پیدا کر لیتے تھے۔ مضامین بالکل کالی سیاہی سے لکھے جاتے تھے مگر تاریخ کا اندراج سُرخ سیاہی سے کیا جاتا تھا۔ اساتذہ ان مضامین کی تصحیح بھی سُرخ سیاہی سے کرتے تھے۔

ثانوی مدارس کے نصاب میں، حساب، جغرافیہ اور فوجی ضروریات سے متعلقہ علوم شامل تھے۔ کامل منشی گری کی تعلیم حاصل کرنے سے پہلے تقریباً سولہ برس کی عمر میں ایک امتحان لیا جاتا تھا، جس میں مضمون نگاری کی قابلیت دیکھی جاتی تھی۔

ں نگاری کے بیتے مناقب مدرس تک ایک نہایت پسندیدہ موضوع تھا۔ طالب علم ان مناقب کو بیان کرنے میں
ہ کے مبالغہ سے کام لیتے تھے۔ مثلاً ایک مضمون کے الفاظ یہ ہیں "آپ کتابوں کی عبارت میں سے صدر پر تیر کی
ذر جاتے ہیں۔ آپ کا علم وزن اور حجم کے اعتبار سے ایک پہاڑ ہے، اور یہ علم ایک ایسا کتب خانہ ہے جو تالکو لا
بجل ہے۔"

ان امتحانوں میں کامیاب ہونے والے چوٹی کے طلبہ کو "دارالحیات" میں بھیج دیا جاتا تھا۔ دارالحیات سے مراد
ہ کالجوں کی طرح اعلیٰ تعلیمی مدرس گاہیں تھیں اور یہ ادارے کافی تعداد میں موجود تھے۔ ان میں مذہب۔ جادو۔ طب۔
ہ علم ہیئت۔ جوتش، اور تعبیر خواب کے علوم پڑھائے جاتے تھے۔ دارالحیات کے منشی چوٹی کے عالم اور پارسا
کیے جاتے تھے۔

کا مشاہرہ اور معاشرے میں اس کا مقام

اوپر ذکر کیا جا چکا ہے کہ زراعت کی تہذیب میں منشی کو ایک نہایت بلند مقام حاصل تھا۔ اس قدر بلند کہ اکثر طالب علم
کے والدین اس کٹھن اور طویل ضبط کو بخوشی قبول کرتے تھے، جو منشی گری سیکھنے کے لیے ضروری تھا۔ کیوں کہ علم و تعلیم
ذرائع تھے جن کی بدولت غریب سے غریب مصری بھی ایک دن عظیم المرتبت فرعون کے دربار میں باوقار جگہ حاصل کرنے کی
ہو سکتا تھا۔

اس اہمیت کے باوجود مدرس کی تنخواہ چنداں زیادہ نہ تھی۔ سکوں کا تو ابھی رواج نہ تھا، اس لیے اجرت جنس
میں ہی ادا کی جاتی تھی، اور بعض تحقیقات کے مطابق ایک مدرس کی اجرت دو پیالے شراب اور تین روٹیاں ہوتا
دہ نہ تھی۔ یہ بات اب بالکل طے شدہ ہے کہ مزدوروں کے کام کا حساب رکھنے کے لیے جو منشی مقرر ہوتے تھے ان کی
جرت اکثر حالتوں میں ان مزدوروں سے کم ہوتی تھی۔

اس مادی معاوضے کی کمی کے باوجود علم کی عظمت و توقیر کئی لوگوں کو عجیب معلوم ہو گی۔ غالباً اس عظمت و توقیر کا ایک
بـ خود اہل علم کا اپنا احساس بلندی تھا۔ وہ آج کل کے مدرسین کی طرح احساس کہتری کا شکار نہ تھے۔

معلومات عامہ پر ایک نظر

ووٹ کے کیا معنی ہیں؟

"ہرگاہ کہ دستور ساز اسمبلی نے جو اہلِ پاکستان کی نمائندہ ہے، خود مختار اور آزاد مملکت پاکستان کے لیے ایسا دستور مجوزہ کیا ہے، جس میں حکومت اپنا اقتدار اور اختیار لوگوں کے منتخب نمائندوں کے ذریعہ استعمال کرے گی۔"

یہ عبارت بنیادی جزو ہے اس اسلامی دستور کا جو ۲۳ مارچ ۱۹۵۶ء کے دن سے ہمارے ملک میں رائج ہوا۔ اس دستور کے تحت پاکستان کے ہر باشندہ کو اپنے ملک کی حکومت کی تشکیل میں حصہ لینے کا پورا پورا حق دیا گیا ہے۔ اس قیمتی حق کے اظہار کا ذریعہ ووٹ ہے۔

درج ذیل مضمون کا مقصد ووٹ کے بارے میں ضروری معلومات فراہم کرنا ہے، ووٹ کیا ہے؟ اس کو کیا اہمیت حاصل ہے؟ ووٹ ڈالنا قومی فریضہ کیوں ہے؟ ووٹ میں آزادیٔ رائے کی ضرورت کیوں ہے؟ آزادی اور جمہوریت کے بقا کا دار و مدار صحت مند اظہار رائے پر کیوں ہے؟ یہ ایسی باتیں ہیں جن کا علم ہونا ہم سب کے لیے لازمی ہے، کیوں کہ اسلامی جمہوریہ پاکستان کے دستور کے تحت ہمارے ملک کا ہر باشندہ اپنے ملک کی حکومت بنانے میں برابر کا حصہ لے گا۔

ووٹ کی تعریف: ووٹ سے مراد ہے وہ رسمی اظہار رائے، جس کے ذریعہ ووٹر پرچی پر لکھ کر یا نشان لگا کر یا زبانی بول کر یا ہاتھ اٹھا کر یا علیحدہ کھڑے ہو کر کسی شخص یا قانون یا کسی ایسے اقدام کے بارے میں جس میں دوسروں کے ساتھ مشترکہ مفاد رکھتا ہو، اپنی پسند یا ناپسند کا اظہار کرے۔

پرچیوں کے ذریعہ ووٹ دینے کا طریقہ یہ ہے کہ رائے دینے والا پرچی پر اپنی رائے کا اظہار کرتا ہے، اور ایک خاص صندوق میں ڈال دیتا ہے۔ رواج یہی ہے کہ پرچیوں کے ذریعہ اسی صورت میں رائے کا اظہار کیا جاتا ہے جب رائے کا اظہار خفیہ طریق پر کیا جانا مقصود ہو۔

اسلامی جمہوریہ پاکستان کے دستور کے تحت لوگوں کو یہ حق دیا گیا ہے کہ انتخابات میں وہ اپنی رائے کا خفیہ طریق پر

اظہار کریں۔ تاکہ کسی امیدوار کے متعلق اپنی پسند یا ناپسند کے اظہار میں ہر شخص کو پوری آزادی حاصل ہو۔

ووٹ کی اہمیت:۔ جمہوریہ سے مراد وہ ملک ہے، جس میں عوام کی حکومت عوام کے اپنے چنے ہوئے نمائندوں کے ذریعہ ہو۔ پاکستان کو یہ نعمت آزادی کی نعمت کے ساتھ ہی مل گئی تھی، ورنہ دنیا کے دوسرے ملکوں کے لوگوں نے صدیوں کی جدوجہد کے بعد جمہوری حکومتیں قائم کی ہیں۔

دو ہزار سال پہلے یونان اور روم میں کچھ مدت کے لیے ایک قسم کا جمہوری نظام رائج رہا لیکن اس زمانہ میں شخصی غلامی کے رواج کی وجہ سے ان علاقوں کے باشندوں کی ایک محدود تعداد ہی جمہوری طرز حکومت سے فائدہ اٹھا رہی تھی۔ یعنی انہیں ووٹ ڈالنے کا حق تھا۔ صرف بڑے خاندانوں اور بڑی جائداد والوں کو ووٹ ڈالنے کی اجازت تھی۔

یورپ میں اٹھارھویں صدی عیسوی میں جمہوری طرز حکومت کے حصول کی خاطر لوگوں نے بہت جدوجہد کی اور بڑی حد تک کامیابی حاصل کی اور جمہوری حکومتیں قائم ہونا شروع ہو گئیں۔ انگریزوں کے ملک میں بادشاہ کا وجود رہا لیکن پارلیمنٹ نے عام آدمی کے حقوق کی حفاظت کی اور ایسے قوانین بنا لیے گئے جن کی رو سے اصل اختیارات عوام کے چنے ہوئے نمائندوں یعنی ممبران پارلیمنٹ کے ہاتھ میں آ گئے۔ رفتہ رفتہ دنیا کے بہت سے ممالک میں حکومت کا کام ایسے اشخاص کو سونپا جانے لگا جو ہر کارروائی کے لیے عوام کے نمائندوں کے سامنے جواب دہ ہوں۔

انگریزوں سے آزادی حاصل کرنے کے بعد امریکہ میں بھی جمہوری حکومت قائم ہوئی۔ وہاں کی حکومت کی باگ ڈور ایسے لوگوں کے سپرد ہوتی ہے جنہیں عوام خود منتخب کرتے ہیں۔

اٹھارھویں صدی کے آخر میں فرانس میں تاریخی انقلاب رونما ہوا جس میں بہت سے کشت و خون کے بعد وہاں بھی عوام کی حکومت قائم ہو گئی۔ اس مشہور انقلاب کے اثرات دوسرے ملکوں پر بھی پڑے، اور جمہوری طرز کی حکومتیں قائم ہوتی گئیں۔

موجودہ صدی میں جمہوری حکومتوں کے قیام کی رفتار بہت تیز ہو گئی اور آج بہت کم ایسے ملک باقی رہ گئے ہیں جن میں ابھی تک شخصی یعنی کسی بادشاہ یا ڈکٹیٹر کی حکومت ہو۔ ایسے ملکوں میں بھی آئین اور دستور بن گئے ہیں۔ طویل جدوجہد اور بے شمار قربانیوں کے بعد دنیا کے لوگوں نے بالآخر آزادی کی وہ نعمت حاصل کر لی جسے جمہوریت کہتے ہیں۔ اور جس میں حکومت عوام کے اپنے چنے ہوئے نمائندے کرتے ہیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ ووٹ کتنی قیمتی

ہم اور قیمتی چیز ہے۔ چوں کہ بغیر ووٹ کے حق کے جمہوری طرز کا تصور ہی ناممکن ہے۔

پاکستان کے لوگوں نے بھی یہ اہم اور قیمتی حق حاصل کرنے کے لیے بہت قربانیاں دی ہیں۔ یوں تو غلامی کے زمانہ میں بھی، جب ہمارے ملک پر انگریزی کی حکومت تھی، ووٹ ڈالے جاتے تھے، لیکن وہ ووٹ ایک آزاد قوم کے افراد کے ووٹ نہ تھے۔ ان ووٹوں سے جو نمائندے اسمبلیوں کے لیے چنے جاتے تھے، ان کے اختیارات محدود ہوتے تھے، اور اصل اقتدار انگریز گورنر اور وائسرائے کے پاس ہوتا تھا۔ علاوہ ازیں غلامی کے زمانہ میں ووٹ ڈالنے کا حق بھی محدود تھا۔ ہر شخص ووٹ نہیں ڈال سکتا تھا۔ تھوڑی بہت جائداد کا ہونا ضروری تھا۔

سالہا سال کی تگ و دو اور ان گنت قربانیوں کے بعد جب ہم نے آزادی حاصل کی اور ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو پاکستان قائم ہوا، تو اس کے بعد سے ہمارے ووٹوں کی اہمیت بھی بڑھ گئی۔ آج ہم سب آزاد جمہوریہ اسلامیہ پاکستان کے آزاد اور خود مختار شہری ہیں۔ اب اصل اقتدار اور پورا اختیار پاکستان کے لوگوں کے ووٹوں کے ذریعہ پاکستان کی اپنی حکومتوں کو سونپا جاتا ہے۔ اور اب ہمارے ملک میں ووٹ ڈالنے کے حق پر جائداد وغیرہ کی کوئی قید نہیں۔ چاہے کوئی غریب ہو یا امیر، سب کو ووٹ ڈالنے کا برابر کا حق حاصل ہے، مرد اور عورت دونوں اس حق میں حصہ دار ہیں۔

ہمارے ملک کی حکومت کونسی پارٹی کو بنانی چاہیے؟ اس میں کیسے آدمی ہونے چاہئیں؟ ہماری حکومت کا کیا پروگرام اور کیسی پالیسی ہونی چاہیے؟ لوگوں کی خوش حالی اور ترقی کے لیے حکومت کو کیا کیا کام کرنے چاہئیں؟ اب ان سب باتوں کا انحصار پاکستان کے لوگوں کے اپنے ووٹوں کی طاقت پر ہے۔

ظاہر ہے کہ ان حالات میں ووٹ کس قدر اہم اور بیش بہا نعمت ہے۔

ووٹ کا صحیح استعمال: — جو چیز جتنی اہم اور قیمتی ہو، اس کو اتنی ہی احتیاط اور سمجھ کے ساتھ برتنا چاہیے۔ ورنہ بجائے فائدہ کے سخت نقصان پہنچتا ہے۔ یہ مانا ہوا اصول ہے کہ جو قوم اپنے ووٹوں کا صحیح استعمال نہیں کرتی اور جس قوم میں صحت مند طریق سے ووٹ نہیں ڈالے جاتے، وہ قوم بدنصیب ہوتی ہے۔ چوں کہ وہ آزادی اور جمہوریت جیسی نعمتوں سے بے خبر ہوتی ہے اور ان سے خاطر خواہ فائدہ نہیں اٹھاتی۔

انتخابات میں ہر ایک باشندہ اپنی رائے کا اظہار کرتا ہے کہ میں فلاں شخص کو اپنی طرف سے حکومت کی ذمہ داریاں سنبھالنے کے قابل سمجھتا ہوں اور اپنی پسند اپنے ووٹ کے ذریعہ ظاہر کرتا ہوں۔ یہ حق جمہوریت میں

یہ حاصل ہے، یہ ووٹ میرا اپنا حق ہے، اسے میری ذاتی چیز ہے، جسے میں قومی مفاد کے لیے دیانت داری سے استعمال کرتا ہوں۔"

اگر ووٹ آزادانہ نہیں، دیانت پر مبنی نہیں، تو وہ ووٹ ہی نہیں کہا جا سکتا، اس لیے ہر شہری کا فرض ہے کہ وہ اپنی رائے سے ووٹ ڈالے۔

کسی کے کہنے یا کسی طرح پر ووٹ ڈالنا اپنے جمہوری حق سے دست بردار ہونا ہے، ووٹوں کے ذریعے آپ ایسے لیڈروں کو چنتے ہیں، جن کے ذمے سماج اور قومی زندگی کی تعمیر کا کام ہوگا، جو آپ کی حکومت بنائیں گے اور جن کے ہاتھوں میں کم سے کم پانچ سال کے لیے ملک کا انتظام رہے گا۔ اگر آپ کا ووٹ آزادانہ نہیں، دیانت داری سے نہیں دیا گیا، بلکہ خوف یا لالچ، برادری یا ذاتی دشمنی کی وجہ سے دیا گیا ہے۔ تو ممکن ہے آپ کا نمائندہ صحیح شخص نہ ہو، اور اگر وہ صحیح شخص نہیں تو آپ کے قومی امور صحیح طریقے پر سرانجام نہیں پائیں گے، جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ جمہوریت کمزور ہو جائے گی اور ملک کی ترقی کو بھی نقصان پہنچے گا۔

واضح رہے جو امیدوار رشوت دیں، نقد، تحفے یا قرض وغیرہ کی شکل میں، یا وہ تشدد کریں، یا تشدد کی دھمکی دیں، تو یہ سب حرکات خلافِ قانون ہیں، آپ کو ان حرکات سے کوئی اثر قبول نہیں کرنا چاہیے، نہ ڈرنا چاہیے نہ لالچ میں آنا چاہیے۔ آپ کے ملک کا قانون آپ کے ووٹ کی آزادی اور اس کے صحیح استعمال کی خاطر آپ کا ساتھ دے گا۔

بوگس ووٹنگ اور جھوٹی فہرستوں کی لعنت :۔ جعلی ووٹ ڈالنا اور ووٹروں کی فہرست میں فرضی ناموں کا اندراج کرانا، نہ صرف قانون کی نظر میں جرم ہے، بلکہ بہت بڑی اخلاقی بددیانتی ہے، اور یہ حرکت جمہوریت سے دغا اور قوم سے خیانت بھی ہے، اس کی جتنی مذمت کی جائے کم ہے۔

کسی باعزت اور محبِ وطن پاکستانی کو یہ زیب نہیں دیتا کہ وہ جعلی ووٹ نہ ڈالے یا ووٹروں کی فہرست میں جھوٹا نام درج کرائے۔

صحیح ووٹ ڈالنا اور صحیح ووٹ لکھوانا قومی فریضہ ہے :۔ مندرجہ بالا سطور میں ووٹ کی اہمیت اور قیمت واضح کی جا چکی ہے۔ لہٰذا یہ ضروری ہے کہ جب ووٹروں کی فہرستیں تیار کی جا رہی ہوں اور حکومت کے کارندے ووٹ

...دیانت کے ساتھ پورا تعاون کیا جائے، اور پورے اور صحیح ووٹ ڈالے جائیں۔ دانستہ، سستی یا غفلت کی وجہ سے اپنا ووٹ نہ ڈالنا، اپنے آپ کو آزادی اور جمہوریت کی سب سے بڑی نعمت سے محروم رکھنا ہے۔

اسی طرح جب ووٹ ڈالنے کا وقت آئے تو ہر ووٹر کا اولین فرض ہے کہ وہ پوری آزادی اور دیانت سے اپنا ووٹ ڈالے، ووٹ ڈالنے کے معنی ہیں کہ آپ ایک قومی فرض ادا کر رہے ہیں، وہ قومی فرض جس کی بدولت آپ ملک کی آئندہ حکومت کی تشکیل میں برابر کے حصہ دار ہوں گے۔ اگر آپ اس فریضہ سے کوتاہی برتتے ہیں، تو نہ صرف اپنے ساتھ بلکہ اپنے ملک کے ساتھ بھی ناانصافی کرتے ہیں۔

ووٹ دینے کا حق:- اسلامی جمہوریہ پاکستان کے دستور کے تحت ہر شخص کو انتخابات میں رائے دینے یعنی ووٹ بنوانے اور ڈالنے کا حق حاصل ہوگا جو:-

(الف) پاکستان کا شہری ہو۔

(ب) انتخاب کنندگان کی فہرستیں مرتب کیے جانے والے یا ان کی نظرثانی کی جانے والے سال کی یکم جنوری کو اکیس برس سے کم نہ ہو۔

(ج) کسی ذی اختیار عدالت نے اس کو فاترالعقل (پاگل) قرار نہ دیا ہو۔

(د) انتخاب کنندگان (ووٹروں) کی فہرست مرتب کیے جانے والے یا اُن کی نظرثانی کیے جانے والے سال کی یکم جنوری سے عین قبل کم از کم چھ ماہ تک وہ اسی حلقۂ انتخاب میں رہائش پذیر ہو۔

(ہ) دستور یا پارلیمانی ایکٹ کی رُو سے عائد کردہ کسی نااہلی کا مستوجب نہ ہو۔

ووٹ دینے کے سلسلے میں ان قواعد کا اطلاق مرد اور عورت دونوں پر ہوتا ہے۔

ووٹ آزادی کی نعمت ہے۔ اس کا صحیح استعمال آزادی کی ضمانت ہے۔

(محکمہ تعلقاتِ عامہ، مغربی پاکستان)

یونیسکو کانفرنس پر نظر بازگشت

اقوامِ متحدہ کے تعلیمی، سائنسی اور ثقافتی ادارے (یونیسکو) کی جنرل کانفرنس کا نواں اجلاس، جو ایک مہینے کے مذاکرات کے بعد اس ماہ کے شروع میں ختم ہوا تھا، کئی لحاظ سے ایک یادگار حیثیت رکھتا ہے۔ مبصرین کی رائے ہے کہ

کہ اس اجلاس میں نمائندوں نے سیاسی مسائل پر جس قدر توجہ دی اس کی مثال پہلے کبھی نہیں ملتی۔ اجلاس شروع ہوا تو مصر اور ہنگری کے واقعات ہوش اڑا رہے تھے، اس لیے چند دن تک یہی موضوع زیر بحث رہا کہ کیا سیاسی مسائل یونیسکو سے تعلق رکھتے ہیں، اگرچہ اس مسئلے پر اختلاف رائے تھا، پھر بھی متعدد نمائندوں نے بین الاقوامی حالات پر تبصرہ کر دیا۔ انھوں نے بین الاقوامی امن و عافیت کے قیام پر اظہار خیال کیا اور بتایا کہ یونیسکو اس ضمن میں کس طرح حصہ لے سکتا ہے۔

ادارے کی تاریخ میں یہ پہلا موقع تھا کہ کانفرنس نے ڈائرکٹر جنرل کے بجٹ میں دس لاکھ ڈالر کا اضافہ کر دیا، حالانکہ ریاست ہائے متحدہ اور برطانیہ کے نمائندوں نے اس تحریک کی مخالفت کی تھی۔

کانفرنس کے بعض دوسرے پہلو بھی خاص اہمیت رکھتے ہیں، مثلاً اس کی تاریخ میں پہلی بار یہ اجلاس بحیرہ روم سے بھی آگے بڑھ کر مشرق میں منعقد ہوا۔ اس کانفرنس میں یونیسکو کی دسویں سال گرہ منائی گئی، اور یونیسکو کے لائحہ عمل میں یہ ایک نئی بات کہی جا سکتی ہے کہ اس نے تین منصوبوں پر خاص توجہ دیتے ہوئے انھیں ترجیحی حیثیت دی۔

ان تین میں سے ایک بڑا منصوبہ اگلے سال شروع ہو کر دس سال تک جاری رہے گا، اس کی رو سے ممبر ملکوں میں اسکولوں، یونیورسٹیوں، تعلیم بالغاں کے اداروں، نوجوانوں کی انجمنوں، عجائب گھروں اور لائبریریوں کے وسیع پروگرام عمل میں آئیں گے۔ نیز ذرائع ابلاغ عامہ کے ذریعہ مشرق و مغرب کی ثقافتی قدروں کو آپس میں اچھی طرح سمجھنے کی تدابیر کو فروغ دیا جائے گا۔

خصوصی کام: — یونیسکو کے خصوصی کام یہ ہیں کہ وہ تعلیم، سائنس اور ثقافت کے میدان عمل میں ماہرین کے تعاون کو فروغ دے تاکہ وہ حوالہ جات کے مجموعے تیار کر سکیں، خاص جائزے مرتب کریں اور بین الاقوامی اجلاس منعقد کریں۔ یونیسکو سفری امداد بھی فراہم کرتا ہے، تاکہ مطالعہ کرنے یا درس دینے کا مقصد پورا ہو۔ مدرسوں کے لیے تعلیمی نصاب تیار کرانے میں مدد دیتا ہے، تاکہ مشرق و مغرب کی ثقافتوں کا ایک ساتھ مطالعہ کیا جا سکے۔ وہ اساتذہ اور ناظمین تعلیمات کو سفری امداد دیتا ہے، اور مشرق و مغرب کے درمیان اطلاعات کے تبادلے میں سہولت فراہم کرتا ہے۔

یونیسکو کا دوسرا بڑا منصوبہ دس سال کی مدت کے لیے مرتب ہوا ہے، اس کے بموجب جنوبی امریکہ کے ملکوں میں تمام بچوں کے لیے ابتدائی تعلیم کا انتظام کیا جائے گا۔ اس ضمن میں استادوں کی تربیت پر خاص توجہ دی جائے گی تاکہ

علاقوں کی ضروریات کو بھی پورا کیا جا سکے۔

یونیسکو کا تیسرا بڑا منصوبہ خشک بنجر علاقوں کی سائنسی تحقیقات سے تعلق رکھتا ہے، اس کے مطابق اس طرح علاقے پر خاص توجہ دی جائے گی، جو ساحلِ یورپ سے مشرقِ وسطیٰ تک اور وہاں سے جنوبی ایشیا تک پھیلا ہوا ہے یہ کام اقوامِ متحدہ اور خصوصی اداروں کے مشورے سے اور خشک علاقوں کی تحقیقات سے متعلق مشاورتی کمیٹی کے تعاون سے پورا کیا جائے گا۔

علومِ طبعی کے ضمن میں یونیسکو نے ایک ایسا بین الاقوامی نظام قائم کیا ہے، جس کے تحت تحقیقات کے خوشگوار اور مناسب حالات پیدا ہو سکتے ہیں۔ سائنسی اداروں کو مالی امداد دینا اس پروگرام کا سب سے بڑا مقصد ہے، تاکہ وہ اپنی تحقیقات کو شائع کرائیں، جلسوں کا اہتمام کریں اور بین الاقوامی تجربہ گاہیں قائم کریں۔

خاص منصوبے :۔ سائنسی تحقیقات کے ضمن میں چار بڑے اور خاص منصوبے تیار کیے گئے ہیں۔

(۱) ایٹمی طاقت کا پُرامن استعمال (۲) خلیاتی تجزیات (۳) خشک بنجر علاقوں کے مسائل اور (۴) سمندری علوم۔

کانفرنس نے فیصلہ کیا کہ اقوامِ متحدہ کی فنی امداد کے توسیعی پروگرام کے ماتحت یونیسکو کی فنی امداد کا پروگرام بھی جاری رہے۔ اگلے سال فنی امداد کے پروگرام پر ۱۵ لاکھ ۴۴ ہزار ۲۰۰ ڈالر صرف کیے جائیں گے۔ یونیسکو کے ڈائرکٹر جنرل ڈاکٹر ماکلم ادی سیشادہ کا کہنا ہے کہ ہمارا فنی امداد کا پروگرام سطحِ زمین سے اوپر اُٹھ چکا ہے، اور اب اسے فضا میں پرواز کرتا ہے، جب سے یہ پروگرام شروع ہوا ہے ۷۵ ملکوں سے امداد کی ۳ سو ۲۹ درخواستیں موصول ہوئی ہیں اور ۴۰ بنیادی معاہدوں پر دستخط ہوئے ہیں، اس وقت ۴۸ ملکوں میں ۱۲۰ منصوبوں کو عملی جامہ پہنایا جا رہا ہے۔ یونیسکو کے ۱۰۲ ماہرین دوسرے ملکوں میں جا کر خدمات انجام دے رہے ہیں، اور یہ پروگرام شروع ہونے کے بعد سے اب تک ۲۱۳ ماہرین اپنے فرائض پورے کر چکے ہیں، ۱۹۵۱ء سے ۱۹۵۶ء تک ۶ سو ۷۷ وظیفے دیے گئے ہیں۔

۱۹۵۷-۵۸ء میں یونیسکو ممبر ملکوں کی درخواست کے مطابق ان سات مقاصد کے لیے فنی امداد دے گا۔ ابتدائی اور ثانوی تعلیم۔ بنیادی تعلیم۔ فنی تعلیم۔ معاشرتی تعلیمی خدمات۔ سائنسی تحقیقات۔ سائنسی تعلیم اور سائنسی دستاویزات کی فراہمی ان دو سال کے دوران میں اندازاً ۶ سو ۳۰ ماہرین دوسرے ملکوں میں بھیجے جائیں گے۔

شائقینِ علم کے لیے :۔ یونیسکو نے صلاحیت و استعداد کے عالمگیر رابطہ و تعاون کے لیے جو بیڑا اٹھایا ہے [illegible]

تحت دنیا بھر کے عالموں۔ موسیقاروں۔ فن کاروں اور مصنفوں کو مالی امداد دی جائے گی تاکہ اعلیٰ ثقافتوں کو بین الاقوامی فروغ نصیب ہو سکے۔

جنوبی امریکہ کے ملکوں میں ابتدائی تعلیم کو فروغ دینے کے بڑے بڑے منصوبوں کے علاوہ صنعت اور اقتصادی تعلیم کے ضمن میں بھی خدمات انجام دی جائیں گی۔

یونیسکو کے شعبۂ علوم معاشرت نے جو پروگرام منظور کیا ہے، اس کے تین بڑے حصے ہیں۔ علم معاشرت کے موجودہ لائحہ عمل کو جاری رکھنا اور مزید فروغ دینا معاشرتی سائنسدانوں، عالموں اور ناظموں کے مابین مذاکرات کے لیے جلسوں کا انتظام کرنا تاکہ نظری اور عملی کاموں میں باہمی ربط و ضبط قائم کیا جا سکے اور علوم معاشرت کی تحقیقات کے ضمن میں اہم جائزوں کو ترقی دی جا سکے۔

روابط عمومی کے ضمن میں کانفرنس نے ایسی تدابیر منظور کیں جن پر عمل کرنے سے ممبر ملکوں کے درمیان اطلاعات و خیالات کی آزادانہ ترسیل اور فروغ میں آسانیاں پیدا ہو سکتی ہیں اور موجودہ رکاوٹیں دور کی جا سکتی ہیں۔ اس موضوع سے متعلق یونیسکو کا شعبہ اپنی مطبوعات اور اطلاعی سامان کی نشر و اشاعت کا سلسلہ جاری رکھے گا۔ تاکہ ہر ملک میں عوام یونیسکو کے اغراض و مقاصد اور کارناموں کو سمجھ سکیں، اور اس طرح اقوام متحدہ کی برادری میں دوسروں سے ان کا تعارف بھی ہو سکے۔

صحافیوں کے لیے :۔ کانفرنس نے یہ فیصلہ بھی کیا کہ صحافیوں کی تعلیم و تربیت کے بہتر قسم کی سہولتیں فراہم کی جائیں۔ اس مقصد کے لیے طبقاتی تربیتی مرکزوں اور سیمیناروں کا اہتمام اور صحافتی تعلیم سے متعلق مطالعی نصاب کی تیاری مدد و معاون ہو سکتی ہے۔

۱۹۵۵-۵۶ء میں یونیسکو شخصی خدمات کے تبادلے کے سلسلے میں غیر ملکوں میں مطالعہ کے طریقہ کو فروغ دینے کے لیے مدد دے گا، اس طرح ایک ملک کے افراد کی صلاحیت و استعداد سے دوسرے ملک والے استفادہ کرتے ہیں، اور بین الاقوامی مفاہمت کا جذبہ فروغ پاتا ہے، اس ضمن میں مزدوروں۔ نوجوان کاریگروں اور استادوں کے تبادلے پر زیادہ توجہ دی جاتی ہے۔

۱۹۵۵-۵۶ء میں یونیسکو ایک ہزار سے زیادہ وظیفوں کا اہتمام کرے گا۔ خود یونیسکو کی طرف سے سو وظیفے

دیے جائیں گے۔ ان وظیفوں کا مقصد یہ ہوگا کہ کام جاننے والے ایسے لوگوں کو بین الاقوامی اعتبار سے مزید مطالعہ و تربیت حاصل کرنے کا موقع مل جائے جو یونیسکو کے پروگرام اور منصوبوں کو عملی جامہ پہنانے میں مفید ثابت ہو سکیں۔ ان موضوعات کے لیے وظیفے دیے جائیں گے۔ تعلیم بچوں کی پرورش۔ علم بحر، خشک علاقوں کی تحقیقات، فزا صنعت کے ساتھ فرقی تعلقے اور ایٹمی طاقت کا پُرامن استعمال، صوت لپسند فن کاروں، مصنفوں، موسیقاروں اور صحافیوں کو بھی وظیفے دیے جائیں گے۔

پنجاب یونیورسٹی کے لیے ماہر طبقات الارض

جرمنی کے ایک ماہر طبقات الارض ڈاکٹر گستر زینسکے جو یورپ اور ایشیائے کوچک کے تمام علاقوں میں پٹرول کی دریافت کا کام کر چکے ہیں۔ اس مہینے پاکستان آئے ہیں۔ وہ پنجاب یونیورسٹی کے شعبۂ طبقات الارض و معدنیات میں شامل ہو کر جسے حال ہی میں قائم کیا گیا ہے، خدمات انجام دیں گے۔ انہیں یونیسکو نے فنی امداد کے پروگرام کے ماتحت بھیجا ہے۔ ان سے قبل یونیسکو کے ایک اور سائنس دان آئے تھے جو پنجاب یونیورسٹی میں طلبہ کو پٹرول دریافت کرنے کے موضوع پر تعلیم دے رہے ہیں، ڈاکٹر زینسکے جرمنی کے ایک صنعتی کارخانے میں تین سال تک خام لوہے اور پتھر کی تحقیقاتی تجربہ گاہ میں کام کر چکے ہیں۔

خاک دھول سے بچنے کی تدابیر

بین الاقوامی ادارۂ محال نے اپنے ممبر ملکوں کو ایک سوال نامہ بھیجا ہے جس کے ذریعے معلوم کیا گیا ہے کہ کانیں یا سرنگیں کھودنے اور پتھر کاٹنے کے وقت جو خاک دھول اڑتی ہے اسے دبانے اور اس سے بچنے کے لیے کیا تدابیر اختیار کی جا رہی ہیں۔

یہ سوال نامہ ان سفارشات پر مبنی ہے جو ماہرین کے ایک اجلاس میں پیش ہوئی تھیں۔ ان میں کوئلے اور دوسری کی اور دوسری کانوں، سرنگوں اور پتھر کے ذخیروں کا ذکر ہے۔

سانس کے ذریعے جسم میں داخل ہونے والی خاک دھول پھیپھڑوں کی بعض بیماریاں پیدا کرتی ہے اور اگر یہ سلسلہ برابر جاری رہے تو بعض صورتوں میں پھیپھڑوں کا مرض مہلک ثابت ہوتا ہے۔

سوال نامے کا مقصد صحیح اور جدید اعداد و شمار حاصل کرنا ہے تاکہ معلوم ہو سکے کہ کس مقام پر کتنی مدت تک کام کرنے سے یہ خطرہ لاحق ہو سکتا ہے۔

آموزش

شمارہ ۱۱] لاهور [فروری

اس شمارہ میں

مدیر { پروفیسر سراج الدین
پروفیسر ایم ۔ اے ۔ مخدومی }

معاونین { عبدالغفور چوہدری
فضل احمد }

آموزش لاہور

فروری ۱۹۵۷ء

جلد ـــــــــ ۹

شمارہ ـــــــــ ۱۱

سالانہ چندہ

پاکستان کے لیے ۶ روپے

غیر ممالک کے لیے ۸ روپے

قیمت فی پرچہ دس آنے

پبلشرز

یونی ورسٹی بک ایجنسی۔ لاہور

آر۔ ایچ۔ ڈی خالد پرنٹر پبلشر نے دین محمدی پریس لاہور میں طبع کرا کے
یونی ورسٹی بک ایجنسی ۲ کچہری روڈ لاہور سے شائع کیا

ایک تعمیری مشورہ

ایم۔ اے مخدومی

۱۸ فروری ۱۹۵۸ء کو سنٹرل ماڈل سکول لاہور کے سالانہ جلسۂ تقسیم انعامات میں تقریر کرتے ہوئے ڈائرکٹر تعلیم مغربی پاکستان جناب ڈاکٹر محمد جہاں گیر خاں نے حاضرین کی توجہ وقت کے ایک سب سے اہم تعلیمی مسئلہ کی طرف مبذول کرائی آپ نے فرمایا :۔

"آج ہمارے سامنے بڑا مشکل سوال یہ ہے کہ قوم کی بڑھتی ہوئی تعلیمی ضرورتوں کو تسلی بخش طور پر کس طرح پورا کیا جا سکتا ہے۔ صوبے کے گوشے گوشے سے مدرسے جاری کرنے کے مطالبے ہو رہے ہیں۔ ہمارے ذرائع اور وسائل محدود ہیں۔ موجودہ مدرسوں میں تعداد طلبہ بالعموم ایسی حد تک پہنچ چکی ہے، جسے مؤثر تدریس کے راستے میں رکاوٹ خیال کیا جاتا ہے۔ تاہم بعض ایسے مدرسے بھی ہیں جنھوں نے تعداد طلبہ کے بھاری اضافے کے باوجود اپنے تدریسی معیاروں کو برقرار رکھا ہے۔ سنٹرل ماڈل سکول ایسے ہی مدرسوں میں سے ایک ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ایسی تدریسی تکنیکیں بھی وضع کی جا سکتی ہیں جو پُر ہجوم مدرسوں میں کارگر ثابت ہوں۔ میں آپ حضرات سے درخواست کروں گا کہ اس مشکل مسئلہ کے حل میں ہمارا ہاتھ بٹائیں۔ ہم سائنسی شہادت کی روشنی میں یہ معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ ایک اچھے مدرسے کے لیے تعداد طلبہ کی انتہائی حد کیا ہونی چاہیے۔ آپ میں سے جن حضرات نے اس مسئلہ کا مطالعہ کیا ہے وہ اپنے مطالعہ کے نتائج سے محکمہ تعلیم کو آگاہ کریں"۔

مندرجہ بالا الفاظ میں ڈائرکٹر تعلیم نے استادوں کو اس امر کی دعوت دی ہے کہ وہ ایک بنیادی نوعیت کے مسئلہ کے حل میں ان کا ہاتھ بٹائیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ہر ملک کے تعلیمی مسائل اس ملک کے معاشرتی پس منظر کے ساتھ اس طرح الجھے ہوئے ہوتے ہیں کہ اس پس منظر سے الگ ان کے حل کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ کوئی فرد یا افراد کا

کوئی جماعت کسی دفتر میں بیٹھ کر تعلیمی مسائل کے حل وضع نہیں کر سکتی۔ ان کے تسلی بخش حل کی واحد صورت یہ ہے، کہ غور و فکر میں وہ لوگ بھی حصہ لیں جو کمرہ ہائے جماعت میں موجودہ صورت حال کا مقابلہ کر رہے ہوں۔ اور جن میں سے بعض نے اس صورت حال پر قابو پانے کے کامیاب طریقے بھی ڈھونڈ نکالے ہوں۔ ان لوگوں کے تجربات اور مشاہدات سائنسی تول ماپ کے پیمانوں میں جانچے جانے کے بعد دوسروں کے لیے مشعل راہ بن سکتے ہیں اور اس طرح کئی مشکل تعلیمی مسائل کے حل تلاش کیے جا سکتے ہیں۔

ترقی یافتہ ملکوں میں تعلیمی تحقیق کو تعلیمی مسائل کے حل کا واحد ذریعہ قرار دیا جا چکا ہے۔ ہمارے استادوں نے ابھی اس مفید تعلیمی آلے سے کام لینا نہیں سیکھا۔ تاہم ہمارے یہاں بھی ایسے اساتذہ موجود ہیں جو گوناں گوں تعلیمی مسائل کے متعلق غور و فکر سے کام لیتے اور اپنے مخصوص حالات کے مطابق ان کے شافی حل تلاش کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں لیکن ان کا یہ کارنامہ ان کے اپنے کمرہ جماعت سے باہر کسی اور کو مستفید نہیں کرتا، وجہ یہ کہ ہمارے استادوں نے فنی مسائل کو ابھی موضوع بحث بنانا نہیں سیکھا۔ وہ اپنی دشواریوں اور اپنی کامیابیوں کو محض اپنی ذات تک محدود رکھتے ہیں وہ اس بات کی کوشش نہیں کرتے کہ فنی رسائل اور پیشہ ورانہ تنظیموں کی وساطت سے دوسرے ہم پیشہ لوگوں کو اپنے تجربات اور مشاہدات میں شریک کریں۔ اس بات کا نتیجہ قابل اعتماد شہادت کی وہ افسوسناک کمی ہے جس نے ہمیں اپنے اہم تعلیمی مسائل کے دو ٹوک جواب معلوم کرنے سے روک رکھا ہے۔

ڈائرکٹر تعلیم نے اپنی تقریر میں استادوں کو اپنے ایک ضروری فرض کی طرف متوجہ کیا ہے۔ جدید تعلیمی ضرورتیں اس بات کا سختی سے مطالبہ کرتی ہیں کہ چوٹی کے تعلیمی افسروں اور کمرہ جماعت میں کام کرنے والے استادوں کے درمیان بلا روک ٹوک تبادلہ افکار ہوتا رہے۔ ڈائرکٹر تعلیم کی تقریر اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ اس قسم کے تبادلہ افکار کے قائل بلکہ متلاشی ہیں۔ اب یہ فرض استادوں کا ہے کہ وہ اس دعوت پر لبیک کہیں اور تعلیمی منصوبہ بندی کرنے والوں کو اپنے تجربات اور مشاہدات سے فائدہ اٹھانے کے مواقع بہم پہنچائیں ؏

جنسی تعلیم اور اس کی ایک تکنیک

فضل احمد

تعلیم کا جامع مفہوم

تعلیم کو ہر زمانے میں نشو و نما کے مترادف سمجھا گیا ہے۔ جدید تعلیمی فکر بھی بالیدگی کو تعلیم کا خلاصہ قرار دیتا ہے۔ ایک جدید ماہر تعلیم کے الفاظ میں تعلیم کا سب سے بڑا مقصد یہ ہونا چاہیے کہ وہ ماحول پر قابو پانے کی قوت میں برابر اضافہ کرتی چلی جائے۔

انسانی ماحول دو اہم اجزا سے عبارت ہے (۱) مادی (۲) غیر مادی۔ اوّل الذکر میں ماحول کے طبعی خدوخال اور انسانی تہذیب کے مادی آثار شامل ہیں۔ ثانی الذکر معاشرتی آداب و اطوار، قومی روایات اور اخلاقی اقدار پر مشتمل ہوا کرتا ہے۔ ظاہر ہے کہ جنسی مراسم اور جنسی اخلاق کو ماحول کے غیر مادی حصے میں بڑا اہم درجہ حاصل ہے۔ فرائڈ کے اس نظریے میں بہت غلو موجود ہے کہ جنسی مراسم ہی انسانی زندگی کے سارے دھارے کا رُخ معین کرنے والی قوت ہیں۔ تاہم ان مراسم کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ وہ معاشرتی ماحول میں ایک اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ ان کی صحیح نوعیت سمجھے بغیر ماحول کے ساتھ پوری ہم آہنگی ممکن نہیں۔ اس لیے کوئی تعلیم جو جامعیت کی دعویدار ہو ان کو نظر انداز نہیں کر سکتی۔

تعلیم کی ایک بڑی ذمے داری جذبات کی صحیح تربیت بھی ہے۔ جو تعلیم محض ذہنی ادراک اور بدنی مہارتیں پیدا کرنے پر بس کر دے وہ بالکل ادھوری تعلیم ہے۔ یہ ایک عام مشاہدہ ہے کہ واقعات کا علم اور فنی مہارت بذات خود اس بات کے ضامن نہیں ہو سکتے کہ ان کا مالک صحیح کردار کا حامل ہو۔ علم اور فنی مہارت درست کردار کی شکل اُسی وقت اختیار کر سکتے ہیں، جب ان کی پشت پر جذبات کی قوت متحرکہ بھی موجود ہو۔ مغرب نے اس نکتے کو بہت دیر کے بعد سمجھا ہے۔ مشینی تہذیب نے مادی ساز و سامان کی جو ریل پیل پیدا کر دی تھی مغرب نے بالکل حال ہی تک اس کو زندگی کا سارا ماحصل سمجھے رکھا۔ اس غلط فہمی کی بنا پر درست علم اور فنی کمال کو ہی انسانی سعی کی آخری منزل سمجھ لیا گیا۔ گو مغرب کی یہ غلط فہمی ابھی پوری طرح دور نہیں ہوئی، لیکن اب اس خالص مادیت پرستی کے خلاف آوازیں بھی سنائی دینے لگی ہیں۔ کئی صاحب نظر ماہرین تعلیم یہ مطالبہ کرنے لگے ہیں کہ درست علم اور روزافزوں فنی مہارت مہیا کرنے کے

ساتھ ہی تعلیم پر یہ فرض بھی عائد ہوتا ہے کہ جذبات کی صحیح تربیت کرے۔ تاکہ ادراک و مہارت کو ایک ایسی قوت متحرکہ میسر آئے جو انھیں درست کردار کی منزل پر پہنچانے کی ضامن ہو۔

انسانی فطرت کے جنسی تقاضے جذبات کے ساتھ کچھ اس طرح وابستہ ہیں کہ جذبات سے یکسر الگ ہو کر ان کے متعلق بات چیت کرنا قریب قریب محال ہے۔ لیکن ان فطری تقاضوں کے متعلق صحیح تربیت نہ ملنے سے متوازن نشوونما میں ایک بڑا خلا باقی رہ جاتا ہے۔ ماضی میں مدرسے نے اس تربیت کی ذمہ داری قبول کرنے سے انکار کیا ہے۔ لیکن اب یہ احساس زور پکڑتا جا رہا ہے کہ صحت مند جنسی تعلیم کی ذمہ داری بھی مدرسے ہی کو قبول کرنی چاہیے۔

کس کی ذمہ داری ہو؟

یہ سوال دیر تک موضوع بحث بنا رہا ہے کہ آیا جنسی تعلیم والدین خود دیں یا یہ خدمت استاد کو سونپی جائے ایسے لوگوں کی کمی نہیں، جو یہ محسوس کرتے ہیں کہ والدین اس کام کے لیے زیادہ موزوں ہیں۔ مگر اب یہ حقیقت تسلیم کر لی گئی ہے کہ افراد کنبہ کے جذباتی مراسم اس قدر پیچیدہ قسم کے ہوتے ہیں کہ وہ جذباتی کھچاوٹ کے بغیر جنسیات پر گفتگو نہیں کر سکتے۔ اس کے مقابلے میں استاد اور شاگرد کا جذباتی رشتہ نسبتاً کم پیچیدہ ہوتا ہے، اس سے یہ مراد نہیں کہ استاد جنسیات کی بحث سے جذبات کو سرے سے خارج کر سکتا ہے۔ تاہم اس قدر مسلم ہے کہ استاد اس بحث سے دزدانہ دل چسپی۔ احساس جرم اور مجرمانہ دل چسپی جیسے ناپسندیدہ جذبات کو آسانی سے خارج کر سکتا ہے۔ اس طرح وہ نسبتاً زیادہ آسانی کے ساتھ جنسی حقائق کو طلبہ کی دوسری معلومات کے ساتھ مربوط کر سکتا ہے۔ ان حقائق کے پیش نظر جدید مدرسہ جنسی تعلیم کی ذمہ داری قبول کرنے لگ گیا ہے۔ علم الحیات کے استاد کے لیے اس کام میں چنداں دشواری نہیں۔ اس کے نقطہ نگاہ سے جنسیات سے مراد انسانی نسل کی افزائش کا مسئلہ ہے۔ جن مدرسوں میں علم الحیات داخل نصاب ہو، وہاں جنسیات کی تعلیم از خود موجود ہو گی۔

عملی صورت کیا ہو؟

انسانی نسل کی افزائش کے مسئلہ پر بحث کرتے وقت اس بات کا خیال رکھنا چاہیے کہ اس مسئلہ کو کوئی غیر ضروری اہمیت نہ دی جائے، اور نہ ہی اس پر سے جلدی میں گذر جانے کی کوشش کی جائے۔ علم الحیات کے استاد کا فرض ہے کہ افزائش نسل کو بھی انسانی جسم کا ایک ایسا ہی دل چسپ، اہم اور قابل بحث وظیفہ خیال کرے، جیسے انہضام

اور تنفس وغیرہ کو۔

علم الحیات کے استاد کا اہم فرض یہ ہے کہ وہ طلبہ کو جنسی مسائل کے متعلق ایک تازہ اور صحت بخش نقطۂ نگاہ عطا کرے۔ اغلب یہ ہے کہ وہ جنسیات کے بارے میں اپنے طالب علموں کی معلومات میں کوئی خاص اضافہ نہیں کر سکے گا۔ جنسیات کے ہنگاموں سے دنیا کا شاید کوئی گوشہ خالی نہیں۔ مدرسے کا ہر طالب علم ایک ایسے ماحول میں پل کر آتا ہے، جو جنسی اپیل سے بھرپور ہوتا ہے۔ تاہم اسے اس اہم موضوع کے متعلق کھلے کھلے لفظوں میں کچھ نہیں بتلایا گیا ہوتا۔ ایسا کرنا خلاف تہذیب خیال کیا جاتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ ہر قسم کے جنسی حقائق کو گرد و پیش کی بے محابا مغلظات اور مجرمانہ سرگرمیوں سے اخذ کر لیتا ہے۔ مگر وہ ان حقائق کو موزوں طور پر مرتب کر کے ان کے بارے میں درست زاویہ نگاہ قائم نہیں کر سکتا۔ استاد کا کام صرف اس قدر ہونا چاہیے کہ جنسی حقائق کے متعلق طلبہ کے علم میں جو چھوٹے موٹے خلا رہ گئے ہوں، ان کو پورا کر دے، اور انھیں ان کے متعلق ایک سائنسی نقطۂ نگاہ عطا کرے۔

ایسے والدین سرے سے ناپید نہیں جو اپنے بچوں کو اس قسم کا زاویہ نگاہ بھی عطا کر سکتے ہیں۔ مگر بے حد غالب اکثریت ایسے والدین کی ہے جو ایسا نہیں کر سکتے۔ اس معاملے میں وہ ایک حد تک معذور بھی ہیں۔ اس معذوری کا ذکر پیچھے گذر چکا ہے۔ لہٰذا علم الحیات کے استاد کو یہ نکتہ اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے کہ اس کا کام جنسی معلومات بہم پہنچانا نہیں بلکہ ان معلومات کو ایک نئے انداز میں پیش کرنا ہے۔

مسئلہ کے دو پہلو

جنسیات کا موضوع دو پہلو لیے ہوئے ہے (۱) بدنی (۲) روحانی۔ ان میں سے روحانی پہلو زیادہ اہم ہے لیکن یہ پہلو علم الحیات کے استاد کی بجائے دینیات کے استاد کی توجہ کا محتاج ہے۔ علم الحیات کے لیے وہ بے لاگ معروضی نگاہ زیادہ اہم ہے، جو سائنسی استدلال کا امتیازی نشان ہے۔ یہ درست ہے کہ ہر مضمون کے استاد کا یہ بھی فرض ہے کہ وہ طلبہ کو درست اقدار کے اخذ کرنے میں مدد دے، لیکن جس وقت بدنی اعضاء کے فطری وظائف پر بحث کی جا رہی ہو اس وقت معروضی اور غیر جذباتی انداز بحث ہی زیادہ مفید ثابت ہوتا ہے۔ اس بحث کے دوران میں اخلاقی اور روحانی اقدار کو گھسیٹ لانا فائدے کی بجائے نقصان کا موجب ہو سکتا ہے۔

موزوں وقت

جنسی تعلیم کے متعلق ایک اور نعیسہ طلب سوال عمر کی موزونیت کا ہے۔ یہ تعلیم بچوں کو کس عمر میں ملنی چاہیے بعض کا خیال ہے کہ پرائمری مدرسے کے آخری سالوں ہی سے بچوں کو جنسیات کی مبادیات سے آگاہ کر دینا چاہیے بعض کا خیال ہے کہ تعلیم کافی دیر سے ملنی چاہیے دوسری رائے زیادہ معقول معلوم ہوتی ہے۔ عام مشاہدہ یہ ہے کہ جنسیات کی تعلیم زیادہ سود مند اس وقت ثابت ہوتی ہے جب طلبہ کو اس کی حقیقی ضرورت محسوس ہو رہی ہو۔ اس لحاظ سے تیرہ چودہ سال کی عمر کا زمانہ جنسی تعلیم کے لیے زیادہ موزوں نظر آتا ہے۔ عام رائے یہ ہے کہ اس عمر سے پہلے جنسی تعلیم دینے کے دو ہی نتیجے ہو سکتے ہیں، اوّل یہ کہ اسے غلط طور پر سمجھا جائے، دوسرا یہ کہ اس سے تنفر پیدا ہو جائے۔ تاہم اس سے یہ مراد نہیں کہ تیرہ چودہ سال سے کم عمر کے بچوں کے لیے جنسیات کا موضوع ایک شجر ممنوعہ قرار دیا جائے۔ چھوٹی عمر کے بچے بھی اگر جنسیات کے متعلق کوئی سوال پوچھیں تو اس کا کھلے لفظوں میں تسلی بخش جواب دینا چاہیے لیکن جنسیات پر تفصیلی بحث آغاز بلوغت کے زمانے پر اٹھا رکھنی چاہیے۔ کیوں کہ اس زمانے میں طلبہ اس بحث میں حقیقی دل چسپی لیتے ہیں، اور اس سے عملی راہ نمائی حاصل کرنا چاہتے ہیں۔

اس بحث کا آغاز کرنے سے پہلے استاد کے سامنے پہلا سوال یہ ہونا چاہیے کہ انسانی افزائش نسل کے متعلق ایسے الفاظ اور اصطلاحات کی تلاش کی جائے جو جذباتی مفہوم سے خالی ہوں۔

ایک تکنیک

اس میں کلام نہیں کہ جنسیات ایک نازک موضوع ہے، اور آغاز بلوغت کے زمانے میں اس کو موضوع بحث بنانا بڑی احتیاط اور ہوش مندی کا کام ہے۔ یہ موضوع بڑی آسانی سے جذبات میں تلاطم پیدا کر سکتا ہے اسے بے لاگ سائنسی انداز میں پیش کرنے کے لیے علم الحیات کے ہر استاد کو اپنی سمجھ اور تجربہ کی روشنی میں کوئی معقول تکنیک وضع کرنی چاہیے۔ ذیل میں ایک ایسی تکنیک کا ذکر کیا جاتا ہے، جو ایک برطانوی استاد نے کامیابی کے ساتھ استعمال کی ہے۔

افزائش نسل کا موضوع چھیڑنے کے لیے ہائڈرا (HYDRA) نامی ایک ننھے سے آبی جاندار کو چن لیا جاتا ہے۔ طلبہ نہ صرف اس چھوٹے سے جانور میں دل چسپی لیتے ہیں بلکہ اسے آسانی کے ساتھ پروجیکٹر کے ذریعے پردے

پیش کیا جاسکتا ہے۔ اس کے مطالعہ میں دوسرا اہم فائدہ یہ ہے کہ اس کی افزائش نسل کا سلسلہ غیر ضروری الجھنوں سے آزاد ہے کیونکہ یہاں نر مادہ کا سوال نہیں۔ اس سے فائدہ یہ ہوتا ہے کہ نطفہ، رحم، قرار حمل، اور اسی قسم کے دوسرے الفاظ اس بحث میں کسی جذباتی مفہوم کے بغیر داخل کیے جا سکتے ہیں۔

اب اس غیر جنسی افزائش نسل کے نتائج پر نگاہ ڈالی جاتی ہے، جس کا نمایاں خاصہ یہ ہے کہ بچے بجنسہ اپنے جننے والے کی شکل ہوتے ہیں۔ تقریباً تمام اہم اوصاف نسلاً بعد نسلاً منتقل ہونے چلے جاتے ہیں۔

اس تقلید پر جماعت کی توجہ از خود جنسی افزائش نسل کی طرف پلٹ جاتی ہے۔ اگر فطرت اس بات پر قادر ہے کہ غیر جنسی طور پر نسل کو قائم رکھ سکے تو جنسی افزائش نسل کی ضرورت کیوں پیش آئی؟ اس سوال کا جواب استاد کی سمجھداری کا امتحان لینے والا ثابت ہوگا۔ اس مرحلہ پر استاد کو یہ نکتہ پوری وضاحت کے ساتھ پیش کرنا چاہیے کہ جنسی طور پر نسل بڑھانے سے فطرت کا منشا اختلاف و تفاوت کو فروغ دینا ہے۔

اس نکتہ کی تشریح کے لیے قرب و جوار سے مثالیں تلاش کرنی چاہئیں۔ مثال کے طور پر ایک مادہ خرگوش کو لے لیا جائے۔ فرض کیجیے کہ وہ بہت تیز دوڑ سکتی ہے لیکن اس کی قوت سماعت کمزور ہے۔ ظاہر ہے کہ رفتار اور قوت سماعت دونوں کی تیزی خرگوش کی سلامتی کے لیے ضروری ہے۔ اگر یہ مادہ خرگوش غیر جنسی طور پر بچے پیدا کر سکے تو اس کے تمام بچے بڑی تیز رفتاری کے ساتھ دوڑ سکیں گے۔ لیکن ان سب کی قوت سماعت کمزور ہوگی۔ اب آگے فرض کیجیے کہ قریب ہی ایک نر خرگوش رہتا ہے، جس کے کان خوب تیز ہیں لیکن وہ بھاگنے میں پھسڈی ہے۔ اگر وہ غیر جنسی طور پر بچے پیدا کر سکے تو اس کے تمام بچے بڑی تیز قوت سماعت کے مالک ہوں گے۔ لیکن دوڑنے کے معاملے میں وہ سب کے سب گھٹیا سطح پر ہوں گے۔

اب آگے فرض کیجیے کہ یہ مادہ اور نر خرگوش باہم مل کر جنسی طور پر بچے پیدا کرتے ہیں۔ اس کا نتیجہ کیا ہوگا؟ طلبہ اس سوال کا جواب فوراً دیں گے۔ وہ یہ کہ غالباً ان کے بچے رفتار اور قوت سماعت دونوں کے لحاظ سے بلند سطح پر ہوں گے، وہ خوب تیز دوڑ سکیں گے اور معمولی سے معمولی آہٹ کو بھی فوراً سن لیں گے۔ اس جواب کے ساتھ بعض طلبہ کا ذہن دوسرے امکان کی طرف بھی جائے گا، وہ کہہ اٹھیں گے کہ یہ بھی تو ممکن ہے کہ اس جوڑے کے بعض بچے دونوں خوبیوں سے محروم ہوں، وہ نہ تیز دوڑ سکتے ہوں اور نہ آسانی سے سن سکتے ہوں۔ استاد اس امکان کو درست تسلیم کر کے

جماعت کی توجہ تنازع للبقا کے اصول کی طرف مبذول کرائے گا۔ بے شک اس جوڑے کے بعض بچے دوسری قسم کے بھی ہوں گے لیکن وہ زندگی کی دوڑ میں مات کھا کر جلد ہی ختم ہو جائیں گے اور بالآخر وہی بچے باقی رہیں گے جو ساخت اور رفتار دونوں کے معاملے میں زیادہ خوش نصیب ہوں گے۔

یہ سائنسی نکتہ انسانی زندگی کے لیے جو امکانات رکھتا ہے، اب ان کی طرف توجہ ہونی چاہیے۔ اس ضمن میں برناڈ شا کا ایک مشہور لطیفہ بڑا نکتہ آفریں ثابت ہو سکتا ہے۔ اس مشہور برطانوی ڈرامہ نویس سے ایک مرتبہ ایک فلم ایکٹرس نے کہا تھا، کہ مسٹر شا اگر ہم دونوں شادی کر لیں تو کیا اچھا ہو۔ ہمارے بچے تمہاری شہرہ آفاق ذہانت اور میری بے مثال خوب صورتی ورثہ میں پائیں گے۔ اس پر شا نے مسکرا کر جواب دیا تھا کہ یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ یہ بچے میری بدصورتی اور تمہاری ضعیف العقلی لے کر پیدا ہوں۔

جنسی افزائش نسل کی غرض وغایت واضح ہو جانے کے بعد بعض دوسرے آبی جانوروں کی افزائش نسل کا حال معلوم کرنا چاہیے۔ اس سلسلے میں چند عام قسم کی مچھلیوں کا حال کافی ہے۔ ان کے بعد مینڈک کو دیکھا جا سکتا ہے مینڈک ایک ایسا جانور ہے جو خشکی پر سانس لینے۔ چلنے پھرنے اور غذا حاصل کرنے کے قابل ہے۔ تاہم بچے دینے کے لیے اسے پانی ہی میں جانا پڑتا ہے۔

اب اگلا قدم ان جانوروں کی افزائش نسل کی کہانی کا مطالعہ ہے جو پانی سے باہر رہتے ہیں۔ سب سے پہلے پالتو مرغی کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔ انڈے کی ساخت اور اس کے تغذیہ کی داستان یقیناً طلبہ کے لیے بڑی دلچسپ اور سبق آموز ثابت ہو گی۔

یہاں تک پہنچ کر اگلا موضوع دودھ پلانے والے جانوروں کی افزائش نسل کا ہونا چاہیے۔ اس مطلب کے لیے خرگوش کا مطالعہ اچھا حسب حال ثابت ہو سکتا ہے۔ اس موضوع پر روشنی ڈالتے وقت جہاں کہیں خرگوش اور انسان کی عضوی ساخت اور وظیفہ اعضا میں مماثلت موجود ہو، اس کا خاص طور پر ذکر کر دینا چاہیے، جس جگہ ایسا ذکر کیا جائے، اس سے مراد یہ ہونی چاہیے کہ اس ضمن میں خرگوش کی کیفیت انسانی کیفیت سے مختلف ہے، اس سے فائدہ یہ ہو گا کہ طلبہ بے جھجک سوال پوچھ سکیں گے، اگر انھیں یہ احساس رہے کہ جو کچھ خرگوش کے متعلق کہا جا رہا ہے وہ سب کا سب خود ان پر بھی صادق آتا ہے تو ان میں سے کئی ایک سوال پوچھنے سے ہچکچائیں گے۔ نر اور مادہ کے

تناسل کی شرح خاکوں اور تصویروں کے ذریعے ہونی چاہیے۔ بحث کی ہر منزل پر اس تدریجی ارتقا کو مرکز توجہ بننا چاہیے جس پر فطرت نے افزائش نسل کے سلسلے میں عمل کیا ہے۔ ایسا کرنے سے طلبہ میں یہ احساس پیدا ہوگا کہ دودھ پلانے والے جانوروں یا بالخصوص انسان کی افزائش نسل کو مرکز توجہ بنایا جا رہا ہے۔ اس سے وہ یہ ہوگا کہ انسانی افزائش نسل کی کہانی کے لیے ایک پسندیدہ پس منظر تیار ہو جائے گا۔

ان مباحث کے بعد طلبہ کو چوہوں، خرگوشوں، اور مرغیوں کے جنین دکھائے جا سکتے ہیں۔ یہ نمائش ہمیشہ حیرت واستعجاب کے جذبات پیدا کرتی ہے۔ ایک خوردبینی جرثومہ کا جنین کی شکل اختیار کرنا اور پھر اس سے انسان جیسی محیر العقول ہستی کا وجود میں آجانا ایک بہت بڑا معجزہ ہے۔ اس معجزے کو دیکھ کر ہر شخص خواہ وہ بچہ ہو یا بوڑھا، عالم ہو یا بے علم۔ بے ساختہ "فَتَبَارَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخَالِقِيْنَ" کہنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ جنسیات کے متعلق حیرت کا یہ جذبہ اس دزدانہ جذبے سے کہیں زیادہ ارفع اور پاکیزہ ہے جو جنسی ...سے پہلے اکثر بچوں کے دلوں میں چٹکیاں لے رہا تھا۔

خصوصی توجہ

تعلیم نفسیات کے اس مختصر سے نصاب کے خاتمہ پر اس سارے موضوع پر ایک عام بحث ہو جانی چاہیے جس میں ...کو اجازت ہو کہ جو سوالات چاہیں پوچھیں۔ ممکن ہے کہ بعض طلبہ ایسے سوال بھی پوچھ بیٹھیں جن کے جواب بھری ...میں دینا موزوں نہ ہو۔ ایسے سوالوں کے متعلق آسانی سے کہا جا سکتا ہے کہ اس بحث میں جانے کا یہ وقت نہیں۔ کسی فارغ وقت میں مجھ سے بات کر سکتے ہو۔

جو طلبہ جنسیات کے متعلق سوال پوچھنے میں غیر معمولی بے تابی کا اظہار کریں ان کے متعلق یقین کیا جا سکتا ہے ...وہ خصوصی توجہ کے مستحق ہیں۔ استاد کو چاہیے کہ ان کے ساتھ علیحدگی میں بات چیت کرے اور ان کی مشکلات معلوم کرکے انھیں کسی طبیب یا عالم دین کے حوالے کردے تاکہ ان کی موزوں دستگیری ہو سکے۔

معقول طریق کار

اکثر جنسی برائیوں کا سرچشمہ وہ دزدانہ دلچسپی ہے جو بچے جنسیات کے متعلق اچھے ماحول سے اخذ ...لیتے ہیں۔ برائی کے اس سرچشمے کو بند کرنے کی معقول صورت یہ ہے کہ دزدانہ دلچسپی کی جگہ حیرت واستعجاب کے

جذبے کو دی جائے۔ تقابلی مطالعہ کا ایک مختصر سا نصاب جس کی ایک صورت اوپر بیان کی جا چکی ہے اس مقصد کو پورا کر سکتا ہے۔ اس نصاب میں حقائق و حکمت کے طوماروں کی ضرورت نہیں۔ صرف کارخانۂ فطرت کے چہرے سے ایک ہلکا سا نقاب اٹھا دینے کی ضرورت ہے تاکہ طلبہ یہ نکتہ اچھی طرح سمجھ جائیں کہ جس چیز کو انہوں نے محض دل چسپی کا موضوع بنا رکھا ہے وہ فی الحقیقت منشائے فطرت پورا کرنے کا ایک اہم اور دلچسپ ذریعہ ہے۔ اس حقیقت کا احساس پیدا ہوتے ہی جنسیات کے متعلق ایک متوازن اور صحت مند نگاہ کی داغ بیل پڑنے لگتی ہے۔

ترقی پسند مدارس اب اس چیز کو بھی اپنے فرائض میں داخل سمجھنے لگے ہیں کہ بچوں میں جنسیات کے متعلق صحت مند نگاہ پیدا کریں۔ اس مطلب کے لیے انہیں چھوٹی عمر سے ہی ایسی فلمیں دکھائی جاتی ہیں جو انسانی بدن کے مختلف اعضا اور ان کے وظائف کی شرح بیان کرتی ہیں کہ عجیب و غریب انسانی مشین کس طرح وجود میں آتی ہے۔ امریکی ثانوی مدارس کے نصاب میں "خانگی زندگی" وغیرہ مضامین داخل نصاب ہیں۔ غرض جدید تعلیمی فکر اس بات پر زور دیتا ہے کہ جنسیات کے متعلق والدین کے سکوت اور معاشرے کی بے راہ روی کا ازالہ مدرسے کو کرنا چاہیے۔ یہ ذمہ داری اساتذہ پر عائد ہوتی ہے کہ جس کام کو عام حالتوں میں والدین انجام نہیں دے سکتے، اسے وہ انجام دے۔

روحانی پہلو

جنسی تعلیم کا زیادہ اہم پہلو اس کا روحانی پہلو ہے۔ قرآن حکیم نے جہاں حکمت کے دوسرے بنیادی رموز بیان کیے ہیں وہاں صحت مند جنسی تعلقات کے روحانی اسباب و نتائج پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ حدیث نبوی میں بھی اس مسئلہ کے تمام پہلوؤں پر شرح و بسط کے ساتھ بحث کی گئی ہے۔ یہ انہی روحانی تعلیمات کا صدقہ تھا کہ عربوں جیسی قوم جو جنسی بے راہ روی میں اپنی مثال آپ تھی چند سالوں ہی میں پاک دامنی کا نمونہ بن گئی۔

قرآن و سنت کے یہ سنہری اصول صدیوں تک اسلامی دنیا کے تعلیمی نصاب کا ایک لازمی جزو رہے۔ مغرب کی سیکولر تعلیم کے آنے کے ساتھ اس نصاب کا خاتمہ ہوا۔ اس طرح مغرب سے آنے والے معاصی کے سیلاب کے سامنے سے وہ بند ٹوٹ گیا جو اکیلا اس کا راستہ روک سکتا تھا۔ پھر بھی مشرقی اخلاق و روایات نے ایک مدت تک اس سیلاب کی شدت کو تھامے رکھا لیکن اب یہ اخلاقی روایات بھی دم توڑ رہی ہیں۔

جنسی خرابیوں کے خوفناک اضافے نے مغرب کو اس بات پر مجبور کیا ہے کہ وہ اپنے مدرسوں میں جنسی تعلیم کو

طرف توجہ دے ۔مغربی مدرسہ اس تعلیم کے صرف بدنی پہلو کی طرف توجہ دینے لگا ہے۔ اس کوشش کے نتائج بڑے حوصلہ افزا ثابت ہوئے ہیں۔ اگر ہم جنسی تعلیم کے روحانی پہلو کو تقلید مغرب کی نذر کر دینا ہی ضروری سمجھتے ہوں تو کم از کم اس قدر تو ہونا چاہیے کہ مغرب نے اپنے امراض کے لیے جو علاج تلاش کیے ہیں ان سے ہم بھی استفادہ کریں۔

حقیقت یہ ہے کہ اسلام زندگی کو ایک ناقابل تقسیم وحدت قرار دیتا ہے۔ وہ اس کے بدنی اور روحانی تقاضوں کو علیحدہ کر کے بھی دو الگ الگ میدان خیال نہیں کرتا۔ صرف اسی قدر نہیں بلکہ وہ تمام انسانی مسائل کو روحانی بنیادوں پر حل کرنے کا قائل ہے۔ تاریخی شہادت اس طریق کار کو انسانی دکھوں کا سہل ترین اور شافی ترین علاج ثابت کر چکی ہے۔ مغرب نے کوئی دو سو سال تک زندگی کے تمام مسائل کو خالصتہً مادی بنیادوں پر حل کرنے کی کوشش کی۔ اس سے مادی وسائل کی ریل پیل ضرور ہو گئی لیکن اخلاق و کردار کو تقویت نہ ملی۔ بیسویں صدی کی برق رفتار سائنسی ترقی کے ساتھ ساتھ اخلاقی اقدار میں جو تشویش ناک انحطاط پیدا ہوا ہے اس نے مغرب کو بھی یہ کہنے پر مجبور کر دیا ہے کہ اخلاقی اقدار کی بحالی کے لیے دینی تعلیم ناگزیر ہے ۔

مغرب نے جو سبق "تعبد از خرابی بسیار" سیکھا ہے وہ صدیاں گذریں ہمیں ایک پُر مغز جملے میں سکھا دیا گیا تھا **"العلم علمان علم الادیان و علم الابدان"** ایک مشہور حدیث ہے۔ امت مسلمہ کو اگرچہ ہر قسم کے علوم حاصل کرنے کی تاکید کی گئی ہے۔ لیکن دو علوم یعنی علم دین اور علم الحیات کو خصوصیت کے ساتھ اہم قرار دیا گیا ہے۔ اس میں حکمت یہ مضمر ہے کہ ان دو علوم کا مطالعہ جذبات کی صحت مند نشو و نما کے لیے ضروری ہے۔ بحث کے آغاز میں یہ نکتہ واضح کیا جا چکا ہے کہ صحت مند جذبات ہی انسانی ذہن اور انسانی ہاتھ کے لیے قابل اعتماد قوت متحرکہ کا درجہ رکھتے ہیں ضرورت اس بات کی ہے کہ مغربی سیادت کے زیر اثر ہم نے جس بیش قیمت سبق کو فراموش کر دیا تھا اسے از سر نو اپنائیں ۔

کتابیں اور قارئین

ڈاکٹر عبد الرؤف

کتابوں میں مذاق

کتابوں میں مذاق اور دلچسپی چوں کہ فطری نہیں بلکہ اکتسابی ہے۔ اس لیے مختلف قارئین کے مذاقوں اور ترجیحوں میں تنوع اور اختلاف ہونا طبعی ہے۔

مصنف، ناشر اور ناظم کتب خانہ کے لیے ان مذاقوں اور ترجیحوں کا علم بہت ضروری اور منفعت بخش ہے۔ مصنف کے لیے پڑھنے والے کی پسند اور ترجیح کا جاننا اس لیے ضروری ہے کہ اس علم کے بغیر اس کی تصنیف، مواد کی تبلیغ، پیشکش اور اشاعت کے مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکتی۔ ناشر کو اگر ان باتوں کا علم نہ ہو تو وہ تجارت میں کوئی معقول منافع حاصل نہیں کر سکتا۔ ناظم کتب خانہ اس علم سے بے بہرہ ہو تو کتب خانہ قارئین میں کسی طور مقبول نہ ہوگا۔

مصنف، ناشر اور ناظم کتب خانہ کے علاوہ قارئین کے مذاقوں اور ترجیحوں میں دلچسپی ہر اس شخص کے لیے مفید ہو سکتی ہے جو انسانی فطرت میں بصیرت حاصل کرنا چاہتا ہو۔ چوں کہ قارئین کے مذاقوں اور ترجیحوں میں طرح طرح کے تغیر و تبدل علم رونما ہوتے رہتے ہیں اس لیے ان تغیرات کے علم کے لیے قارئین کے مذاقوں کو ہر لحظہ غور سے زیر مطالعہ رکھنا بہت ضروری ہے۔

مغربی تحقیقیں

ظاہر ہے کہ اس قسم کا علم حاصل کرنے کا معقول اور سائنسی طریقہ تحقیقی طریقہ ہے۔ مغربی ممالک میں اس سلسلے میں کئی ایک مفید تحقیقیں ہوئی ہیں۔ گرے اور منرو کی امریکی تحقیق کا خلاصہ یہ ہے کہ:-

عورتیں مردوں کی نسبت زیادہ کتابیں پڑھتی ہیں۔ مرد عورتوں کی نسبت زیادہ وقت اخبار بینی میں صرف کرتے ہیں۔ شادی شدہ لوگوں کی نسبت کنوارے لوگ زیادہ کتابیں پڑھتے ہیں۔ شادی شدہ لوگ اخبارات اور رسالے زیادہ پسند کرتے۔ دیہاتیوں کے مقابلے میں شہری زیادہ کتابیں پڑھتے ہیں۔

ڈاکٹر ریپل نے بھی امریکہ میں اس موضوع پر بہت مفید کام کیا ہے۔ آپ کی تحقیق کا نچوڑ یہ ہے، کہ :- اکثر لوگ ہلکا پھلکا ادب اور ناول وغیرہ پڑھتے ہیں، مگر معلومات بڑھانے والی کتابوں کے قارئین کی تعداد بھی کم نہیں ہے۔ کھیتوں میں کام کرنے والے اور کم آباد علاقوں میں رہنے والے لوگ فرصت کا بیشتر وقت کتابیں پڑھنے میں گزارتے ہیں۔ ہر مہینے ایک کتاب شائع کرنے والی کلبوں نے کتابیں پڑھنے کے شوق کو بہت ترویج دی ہے۔ جنسی موضوعات پر لکھی ہوئی کتابیں پڑھنے والوں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ مگر ایک عظیم حقیقت یہ ہے کہ اکثر لوگ ایسے ہیں جو کسی نہ کسی مقصد کے لیے ہر قسم کی کوئی نہ کوئی کتاب پڑھتے رہتے ہیں۔"

چند قیاس آرائیاں

ہمارے ہاں مختلف قسم کے قارئین کے پڑھنے کے مذاق اور ترجیحیں کیا ہیں؟ اس سوال کا تسلی بخش جواب کسی منظم اور باقاعدہ تحقیق کی بنا پر ہی دیا جا سکتا ہے۔ مگر بدقسمتی سے ہمارے ہاں اس قسم کی کوئی تحقیق نہیں کی گئی۔ اس لیے اس سلسلہ میں میرے مشاہدوں کا درجہ قیاس آرائی اور رائے زنی سے کسی صورت بلند نہیں ہو سکتا۔

اس موضوع پر مختلف پہلوؤں سے قیاس آرائیاں ہو سکتی ہیں۔ مثلاً عمر کے اعتبار سے۔ جنس کے پہلو سے۔ ذہنی میلان اور فنی اور اکتسابی دلچسپی کے زاویہ نگاہ سے۔

(۱) عمر کے پہلو سے

عمر کے اعتبار سے دیکھا جائے تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ عمر کے تقاضوں کے پیش نظر مختلف عمر کے لوگ مختلف قسم کا ادب پسند کرتے ہیں۔

بچوں کی پسند۔ بچے عموماً تصویری کتابیں۔ بالک گیت، قصے، کہانیاں۔ وغیرہ کی کتابیں پڑھنا پسند کرتے ہیں۔

بالغوں کی پسند:- بلوغت کے ہیجانی دور میں، جنس، رومان، اور سراغ رسانی کے ناول اور کتابیں مرغوب ہونے لگتی ہیں۔

جوانوں کی پسند:- جوانی میں چونکہ معاش اور زندگی کے مسائل صورت پذیر ہو جاتے ہیں، اس لیے ایسی کتابیں جن میں معاش، تمدن اور معاشرہ کا سیاسی پر روشنی ڈالی گئی ہو زیادہ مقبول ہونے لگتی ہیں۔

بوڑھوں کی پسند:- بڑھاپے میں مذہبی کتابیں خیالات سب سے زیادہ پڑھی جاتی ہیں۔ [illegible]

ہلکے پھلکے ادب کو بھی پسند کیا جاتا ہے۔

(۲) جنس کے اعتبار سے

زنانہ پسند۔ لڑکیاں اور عورتیں غالباً عشق و رومان، کشیدہ کاری۔ امور خانہ داری وغیرہ سے متعلق زیادہ کتابیں پ

مردانہ پسند۔ لڑکے اور مرد سیر و سیاحت۔ سراغرسانی اور جرائم کے ناول اور زندگی کے مختلف شعبوں میں کامیا

شراکت میں مدد دینے والی کتابوں کی طرف غالباً زیادہ مائل ہوتے ہیں۔

(۳) ذہنی میلان اور فنی اور کتابی دلچسپی کے اعتبار سے

طالب علم نصاب اور نصاب سمجھنے اور مقابلہ کے امتحانوں میں مدد دینے والی کتب زیادہ پڑھتے ہیں۔

سنجیدہ طبقے کے لوگ ایسی کتابیں زیادہ شوق سے پڑھتے ہیں جن میں ان کے حلقہ دلچسپی اور مخصوص فن

وغیرہ کے مسائل پر روشنی ڈالی گئی ہو اور ان کے معقول حل پیش کیے گئے ہوں۔

بدنی محنت کا کام کرنے والے کاریگر ہلکا پھلکا ادب اور عشق و رومان بہت پسند کرتے ہیں۔ میرے مشاہدہ میں

ایسے موٹر ڈرائیور اور عمارت سازی کے راج مزدور آئے ہیں جو بجز جنسی کتابوں اور فحش ناولوں کو باقاعدگی سے مطا

بے فکر حضرات کے لیے کوئی کتاب جو وقتی لطف و سرور کا باعث بن سکے بہت مرغوب مطالعہ بن جاتی ہے۔

اوباش لوگ فقط فحش، عریاں اور بجز عشقیہ ناول پر ہی اکتفا کرتے ہیں۔ مگر میانہ رو قارئین کی تعداد سب سے ز

ان کی بھاری اکثریت ایسی ہے جن کے مذاق اس قدر محدود اور مفید نہیں ہیں۔ اس طبقہ کے لوگ تمام موضوعات پ

ہوئی کتابوں میں یکساں دلچسپی لیتے ہیں۔

تحقیق کی ضرورت

یہ چند باتیں قیاس آرائی کا درجہ رکھتی ہیں۔ مگر اس سلسلہ میں صحیح اور باوثوق علم فقط وہی ہو سکتا ہے جس کی بنا

مشاہدوں اور سائنسی تحقیق پر رکھی گئی ہو۔ اس قسم کی تحقیق کے لیے مصنف، ناشر، اور ناظم کتب خانہ کے تعاون کی اشد ض

ایسی تحقیق سے ہمیں صرف پڑھنے والوں کے مذاقوں اور ترجیحوں کا علم ہی نہیں بلکہ معاشرے کے مختلف طبقوں کے رجحا

اور میلانات کا بھی کافی صحیح اندازہ ہو سکتا ہے۔ اس لیے اس قسم کی مجوزہ تحقیق مصنف، ناشر اور ناظم کتب خانہ کے

آنے کے علاوہ معاشرتی اور تفصیلی اعتبار سے بھی ہمارے علم میں عظیم اضافہ کا باعث بن سکتی ہیں۔

حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم

مترجمہ خداداد خان

پابندیٔ آئین نے انسانوں کو تربیت دی

عبدالغفور چودھری

مسلسل نمبر ۳

اسلامی آئین میں حالات کے تحت لچک پیدا کی جا سکتی ہے یا یہ کہ اس کی دفعات میں کسی تبدیلی کا کوئی امکان ہیں، نہایت غور طلب مسئلہ ہے۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف مقدمات میں جو فیصلے کیے تھے، ان کی روشنی میں واضح ہوتا ہے کہ اس آئین میں حسب موقع وضرورت تبدیلی کی خاص گنجائش ہے۔ مثلاً آپ نے شراب خوری۔ زنا، چوری جیسے جرائم میں مقررہ سزاؤں کی بجائے مختلف سزائیں تجویز فرمائیں کیوں کہ سزا کی تعین کرتے وقت مجرم کی شخصیت، جرم کا وقت اور مقام، وہ حالات جن کے تحت جرم سرزد ہوا، یا یہ کہ ارتکاب جرم میں مجرم کی نیت کا کتنا دخل ہے ان ساری باتوں کا مطالعہ اور جائزہ نہایت ضروری ہوتا تھا، اسلامی آئین کے نفاذ کے بعد اگر ہم رسول کریمؐ کے فیصلوں کا تدریجی اور مسلسل مطالعہ کریں تو پتہ چلتا ہے کہ آپ نے ایک ہی جرم میں مختلف مجرموں کو مختلف سزائیں دیں، آپ نے ہر فیصلے میں اپنے شعور کامل اور عقل سلیم سے کام لیا۔ ابتدا میں آپ نے شراب خوری اور زنا کے جرائم کی سخت ترین سزائیں رکھیں کیوں کہ زمانۂ جاہلیت کی رسوم اور ذلیل روایات کا فوری تدارک ضروری تھا، اور جوں جوں سوسائٹی کا کردار مضبوط اور زیادہ روشن ہوتا گیا۔ آپ نے ان جرائم کی سزائیں بھی نرم کر دیں، چوری کے جرائم بہت کم ہو گئے، اور کہیں کوئی واقعہ ہوا بھی تو آپ نے ان کے لیے خفیف سزائیں عائد کیں لیکن عادی مجرموں یا ایسے لوگوں کو جو وسائل معاش کے ہوتے ہوئے بھی جرم کرتے تھے آپ نے انہیں نہایت سنگین سزائیں دیں، ان فیصلوں کی روشنی میں اسلامی آئین کی چھان بین کرنے والے کے لیے بڑی دل چسپ پیچیدگیاں نظر آتی ہیں کیوں کہ سزاؤں کے تنوع اور اختلاف کی بنیادی وجوہ اس کے علم میں نہیں اور وہ حالات بھی اسے معلوم نہیں ہیں جن کے تحت جرم سرزد ہوئے تھے۔

شراب

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پیشتر شراب خوری کا رواج نہایت عام تھا اور آپ کو اس کا بخوبی علم تھا۔

ایک بار ایک قبیلے کے لوگ بیعت کے لیے آئے تو آپؐ نے اُن سے شراب نہ پینے کی قسمیں لیں، کیوں کہ شراب پینا ان کا محبوب مشغلہ تھا۔ آپ نے ان لوگوں کو شراب کشید کرنے کی بھی ممانعت کی، جب آپؐ نے شراب کی تیاری کے وسائل اور طریقوں کی وضاحت فرمائی تو وہ لوگ دنگ رہ گئے۔ شراب کی حُرمت کے احکام کے نزول سے پہلے مسلمانوں میں شراب نوشی عام تھی، حضرت حمزہؓ نے ایک بار نشے کی حالت میں حضرت علی کا اونٹ مار دیا تھا، اور وہ اس وقت نشے میں اتنے مدہوش تھے کہ موقع پر رسول کریمؐ کو بھی نہ پہچان سکے۔

شرابیوں کو تھپڑ مارے جاتے، چھڑیوں اور کھجوروں کی سرسبز ٹہنیوں سے پیٹا جاتا، کبھی کپڑے کے کوڑے بٹ کر بھی مارے جاتے، سزا اگرچہ رسول کریمؐ کی موجودگی میں دی جاتی تھی، لیکن آپؐ نے خود اپنے ہاتھوں سے کسی کو سزا نہیں دی، صرف ایک بار آپؐ نے ایک مجرم کے منہ پر خاک پھینکی تھی (مشکوٰۃ)

حضرت عمرؓ کے وقت میں شراب نوشی کی سزا زیادہ سخت اور تیز تھی جو چالیس کوڑوں کی بجائے اسّی کوڑے کر دی گئی تھی، حضرت عمرؓ قانون کے بارے میں اپنے آپؐ کو بھی معاف نہیں کر سکتے تھے، اس لیے اس کی پابندی کے معاملے میں نہایت ہی سخت گیر تھے، آپؐ کے وقت میں جب ایک شرابی کو اسّی کوڑوں کی سزا ملی تو حضرت علیؓ نے اس کو دیت پر رہائی دلانا چاہی، کیوں کہ اس سزا سے اس کی موت کا خدشہ تھا۔

زنا

زنا کے لیے سنگساری کی سزا کا جواز قرآن کی کسی آیت میں نہیں، ممکن ہے توریت کی کسی آیت سے اس کا تعلق ہو۔ پیغمبرؐ نے ایک یہودی اور ایک یہودن کے لیے زنا کے جرم میں رجم کا حکم فرمایا تھا، کیوں کہ توریت میں اس جرم کی سزا یہی ہے، قرآن میں سو دُرّوں کی سزا نافذ ہونے سے پیشتر آپؐ زانیوں کے لیے رجم کی سزا ہی تجویز فرماتے تھے، دُرّوں کی سزا والی آیت کا نزول کہیں بعد میں جا کر ہوا۔ بلکہ حرمت شراب کی آیت سے بھی یہ آیت بعد اُتری تھی۔ معیز بن مالک نے جب زنا کا جرم کیا تو محض اس خیال سے کہ کہیں انہوں نے نشے میں یہ گناہ نہ کیا ہو، رسول کریمؐ نے ان کے منہ سے شراب کی بُو سونگھنے کو کہا تھا۔ رجم کی سزا ابتداءً جو نافذ تھی اس کا مقصد یہ تھا کہ جو اخلاق سوز جنسی تعلقات معاشرے میں بکثرت رائج ہیں، ختم ہو جائیں، اخلاق اور کردار کی تعمیر کا احساس عام کرنے کے لیے ایسی سزا کا نفاذ ضروری تھا۔ سزا کے حکم سے پیشتر آپؐ نہایت تحمل اور غور سے جرم کا جائزہ فرماتے، لیکن اعتراف جرم کی صورت میں کسی

مزید ثبوت کی ضرورت ہی نہ رہتی، ایک بار جب ایک شخص نے اپنے جرم کا اعتراف کیا تو آپ نے کوڑا لانے کو کہا لیکن جو کوڑا لایا گیا، ٹوٹا ہوا تھا۔ آپؐ نے فرمایا کہ دوسرا لائیں۔ لیکن یہ دوسرا کوڑا بہت سخت تھا، اس پر آپؐ نے تیسرا کوڑا منگوا کر اسے سزا دی، اور سزا کے بعد فرمایا۔

"اب وقت آگیا ہے کہ تم حدود اللہ سے تجاوز نہیں کر سکتے۔ اگر تم میں کسی سے کوئی گناہ سرزد ہو تو اس پر پردہ ڈالے، لیکن اگر وہ اس کا اعتراف کرے گا تو اسے جرم کے مطابق پوری سزا دی جائیگی"

قتل

ایام جاہلیت میں عربوں کے نزدیک انسانی زندگی کا کچھ احترام نہ تھا۔ قتل کی سزاؤں میں قصاص شامل نہ تھا، جاہلیت کے دور کی طویل جنگوں میں ہزاروں جانیں ضائع ہوئیں، اگر کبھی جنگ کا وقت ختم ہوا، تو انتقامی جذبات کی تسکین کے لیے قتل کے جرائم ہونے لگتے، چوں کہ عرب کا مروجہ قانون نہایت درجہ غیر مستقل تھا، اور اس میں قاتل کے لیے رعائتوں کی تمام گنجائش تھی، اس لیے حفاظت جان کا مسئلہ نہایت ہی پیچیدہ تھا، رسول کریمؐ نے امتناع قتل کے تحت احکام جاری فرمائے۔ لیکن حجۃ الوداع کے موقع پر ان تمام قتلوں کی معافی کا اعلان عام کیا، جو دور جاہلیت میں ہو چکے تھے۔ مسلمانوں کے لیے انسانی جان کا احترام ضروری قرار دیا، آپؐ نے فرمایا کہ اللہ کے نزدیک تمام دنیا کی ہلاکت اتنی قابل نفرت نہیں جتنی کہ ایک بے گناہ مسلمان کا قتل۔ آپؐ نے اللہ تعالیٰ کے اس حکم کو سنا دیا، "کہ ایک بے گناہ مسلمان کا قاتل ہمیشہ کے لیے جہنمی ہے" (قرآن حکیم) آپؐ کے نزدیک قتل کے واقعات میں جو بالکل واضح اور غیر مشتبہ ہوں معمولی چشم پوشی اور اغماض بہت بڑا جرم تھا، آپؐ نے واضح طور پر فرمادیا کہ جو شخص قتل کے جرم میں قاتل کو آدھے لفظ کی مدد بھی پہنچائے گا قیامت کے روز اس کے ماتھے پر صاف لکھا ہوگا، کہ

"یہ شخص اللہ کی رحمت سے محروم ہے"

بلندی کردار

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات اور اُسوہ نے معاشرے میں کردار کی پاکیزگی اور اخلاقی عظمت کا عام احساس پیدا کر دیا تھا، اور یہی احساس اس وقت کے اسلامی معاشرے کی اخلاقی قدروں کی اساس اور عدل وانصاف کے دستور کی بنیاد تھا، عدالتی کارروائی کا مقصد یہ نہ تھا کہ اس میں قانونی موشگافیوں اور آئینی دقیقہ سنجیوں کے شلاحہ

کیے جائیں، اور فریقین قانونی مجادلوں میں ایک دوسرے کو شکست دینے کے لیے نئے نئے اور عجیب انداز میں وار کریں، بلکہ عدالت کے ماحول پر اخلاقی عظمت کا احساس چھایا رہتا، فریقین کے جذبات کی پاکیزگی اور روح کی صفائی اس احساس کو اور بھی موثر اور پائدار بنا دیتی تھی۔ مدعی، مدعا علیہ اور منصف تینوں کی متفقہ طور پر یہی کوشش ہوتی تھی کہ دوران مقدمہ میں قومی اخلاق پر ضرب نہ آنے پائے۔ ان کے سامنے یہی مقصد ہوتا کہ احکام الٰہیہ کی تعمیل میں سر مو فرق نہ آنے پائے یہی وہ جذبہ تھا، اور یہی وہ مقام تھا، جہاں بڑے سے بڑے جرم کا مرتکب بھی کسی تذبذب کے بغیر علانیہ اپنے گناہ کا اعتراف کرتا تھا۔ اس اعتراف میں کسی پہلو داری کا شائبہ تک نہ ہوتا۔ مدعا علیہ یا مظلوم جذبات سے مغلوب ہو کر اپنا حق ہرگز نہ مانگتے، انھیں کسی انتقام اور کینے، کسی دنیاوی فائدے یا لالچ کا خیال حتیٰ نہ ہوتا، اور وہ محض احکام خداوندی کی روشنی میں انصاف کے طلب گار ہوتے۔

کئی مجرم گناہ کے اعتراف میں اشارات اور کنایات سے کام لیتے، لیکن رسول کریمؐ اپنے بے مثال شعور و ادراک اور اپنی دل نشیں اور پُرکشش گفتگو سے تمام پیچیدگیاں کھول کر رکھ دیتے۔ آپؐ فرمایا کرتے کہ مومن کو ہمیشہ گناہ اندا ش کے ممکن الوقوع اثرات سے ڈرتے رہنا چاہیے، اور پیہم اس خوف میں رہنا چاہیے کہ گناہوں کا پہاڑ اچانک گر کر اسے کچل نہ دے۔ لیکن ایک فاسق کی نشانی یہ ہے، کہ وہ گناہوں کے اس پہاڑ کو ناک پر بیٹھی ہوئی مکھی سے زیادہ اہمیت نہیں دیتا، جسے وہ معمولی بھونک یا ہاتھ کے اشارے سے اڑا سکتا ہے، مگر ایک صاحب ضمیر کے لیے چھوٹا سا گناہ بھی اخلاقی تباہی کا باعث ہے۔

گناہ گار کی پہچان یہ بھی ہے کہ وہ جیسے ایک لق و دق صحرا میں ایک خوفناک مقام ہے، سواری اس کے پاس ہے، خوراک کا ذخیرہ بھی موجود ہے، وہ اپنا قیام جماتا ہے اور آرام کی نیند سو جاتا ہے۔ جب جاگتا ہے تو اپنی سانڈنی کو مع سازوسامان اور خوراک کے غائب پاتا ہے، پریشان ہو کر ادھر اُدھر تلاش میں پھرتا ہے، مگر ناکامی اور مایوسی میں بھوکا پیاسا واپس اپنی جگہ پر لوٹتا ہے، بازو سر کے نیچے رکھ کر سو جاتا ہے، اب کے جو جاگتا ہے تو اپنی سانڈنی کو مع سازوسامان کے سامنے کھڑا پاتا ہے، اس وقت انتہائی مسرت کے عالم میں پکارتا ہے کہ "اے میرے رب میں تیرا رب ہوں"۔ اس طرح موت کے شکنجے سے بچ کر کفر بکنے لگتا ہے"

اس حکایت سے اخلاقی ذلت اور تباہی کا پتہ چلتا ہے، جو ایک گناہ گار پر ہمیشہ طاری رہتی ہے۔ لیکن جب ضمیر انفعالی قوت سے مغلوب ہو جاتی ہے تو انسان کے ذہن و دماغ میں ہیجان اور اضطراب کی سی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ آدمی کو اپنے کردار اور سیرت کی صورت صاف نظر آنے لگتی ہے، اور وہ غیر شعوری طور پر اپنے گناہ کی روداد بیان کرتا پھرتا ہے۔ انسان اگرچہ گناہ کا پتلا ہے، لیکن گناہوں پر پشیمان ہونے والے گنہگار، اللہ کو پسند ہیں۔

"اللہ تعالیٰ رات کو اپنے ہاتھ پھیلا دیتا ہے تاکہ گناہ گاروں کی پشیمانی کو قبول کرے۔"

ندامت

گناہ کے بعد ندامت اور انفعال بھی روحانی پاکیزگی کا ایک عمل ہے، جسے اللہ تعالیٰ نے پسند فرمایا ہے۔ لیکن اصلاح نفس کی حقیقت کا راز نیکی کے حقیقی رجحان میں ہی مضمر ہے، یہی ایک پائدار اور مسلسل کوشش ہے، اور جن کے دل اس حقیقت کے نور سے روشن ہو گئے۔ انھوں نے نیکی کے جاں گداز اور ایمان افروز راہ پر چلنے کے لیے اپنی زندگیاں وقف کر دی ہیں، یہی وہ لوگ ہیں جنھیں ہر قدم پر اللہ تعالیٰ نے اپنے لازوال اور بے پناہ انعامات سے نوازا ہے۔

"ایک شخص نے ننانوے قتل کیے اور ایک عابد کے پاس پہنچا اور پوچھا کہ کیا اب میری مغفرت کی کوئی صورت باقی ہے، اس عابد نے جواب دیا کہ تمہارے بخشے جانے کی کوئی وجہ نہیں ہے اس پر اس شخص نے اس عابد کو بھی قتل کر دیا اور اس طرح سو مقتولوں کی فہرست مکمل کر دی اور پھر ایک اور بندۂ خدا کے پاس پہنچا اور اپنی نجات کی صورت دریافت کی، اس بندۂ خدا نے جواب دیا کہ تمہارے اور تمہاری توبہ کے درمیان کوئی چیز حائل نہیں ہے، فلاں ملک میں اللہ کے نیک بندوں کی ایک بستی ہے، تم وہاں چلے جاؤ، وہ شخص چل دیا، لیکن ابھی آدھی راہ ہی طے کی تھی کہ موت نے آلیا، موت سے پہلے وہ شخص روحانی ندامت اور اذیت میں چاروں جانب پھرتا تھا، اس کی موت کے بعد اس کی نجات کے فرشتے نے اپنے پَر اس پر پھیلا دیے۔" (حدیث)

ایک ایسے ضابطۂ آئین کی تعیین جس میں انسان غیر شعوری طور پر نیکی کی طرف مائل ہو جائیں، اخلاقی اور روحانی اصلاح کی اثباتی صورت نہیں کہی جا سکتی۔ بلکہ کسی ضابطہ اخلاق کی صحیح کامیابی یہ ہے کہ معاشرے لوگوں کے دلوں میں

نیکی اور بدی کے جذبات آپس میں ٹکرا رہے ہوں، حقیقی اور باطل خواہشات کی مسلسل جنگ برپا ہو، نیکی کے جذبات جھوٹ اور دغل سے مغلوب ہو ہو کر ابھر رہے ہوں۔ یہاں تک نفس انسانی میں کسی سفلی خواہش کا نشان بھی باقی نہ رہے، روحانی عظمت کا بلند ترین معیار یہی ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات نے عوام کے ذہنوں میں وہ انقلاب پیدا کر دیا تھا، کہ اگر کوئی شخص ذرا بھی راہ حق سے بھٹک جاتا، تو ندامت سے اس کا دل اور اس کی مسلسل بے چین رہتی، وہ بے قرار ہو ہو کر پھرتا، اور جب تک اپنے گناہ کا کھلا اعلان نہ کر لیتا، بے چین رہتا، اور اسے اس وقت تک سکون نہ آتا جب تک وہ اپنے گناہ کی پوری پوری سزا نہ پا لیتا۔ اکثر بار ایسا ہوا کہ مجرم کو قانونی رعایت حاصل ہوتی، اس کے بچنے کے امکانات واضح ہوتے، لیکن اس نے یہ فائدہ اٹھانے سے صاف انکار کر دیا، کئی مجرموں نے رسول کریمؐ کی معافی پر سزا کو ترجیح دی۔

آپؐ کے قول کے مطابق گناہ گار کے لیے یہی ندامت اور پشیمانی ہی ایک بہت بڑی سزا ہے، آپؐ نے اکثر ان خطا کاروں کو چھوڑ دیا، جن کے جرم معمولی ہوتے تھے، لیکن جو لوگ گناہوں کا اعتراف اعلانیہ کرتے انہیں آپؐ نے پوری سزائیں دیں۔

احساس گناہ کے بعد مجرموں کا اعلانیہ اعتراف اور پھر سزا دیے جانے پر مصر ہونا ان کے بلند کردار اور عظیم ترین اخلاقی قوت کی واضح دلیل تھی، چھوٹی سے چھوٹی اور معمولی لغزش پر بھی ان کی ضمیر انھیں اس قدر ملامت کرتیں کہ وہ آپؐ کے معاف کر دینے پر بھی مطمئن نہ ہو کر سزا دیے جانے پر مصر ہوتے۔

خوفناک جرائم جن میں زنا بھی شامل تھا، اور ایسے جرائم کی سزا موت تجویز ہوتی تھی، حضرت ابو ہریرہؓ بیان کرتے ہیں کہ ماعز بن مالک نے جب زنا کا اعلانیہ اقرار کیا تو آپؐ نے منہ پھیر لیا، لیکن ماعز نے پھر وہی اعلان کیا، اور چار بار اقرار کیا آپؐ نے انہیں سنگسار کرنے کا حکم دیا، جب باہر میدان میں ان پر سنگ باری شروع ہوئی تو ماعز نے بھاگنے کی کوشش کی، لیکن ایک شخص نے انہیں اونٹ کے جبڑے کی ہڈی ماری اور گرا دیا، جب رسول کریمؐ کو یہ اطلاع ملی تو فرمایا۔ تم نے اسے جانے کیوں نہ دیا؟ ماعز کے اعتراف سے لے کر ان کی سزا تک آپؐ کی یہی خواہش تھی کہ کسی نہ کسی طرح ماعز کو رعایت ہو۔ آپؐ نے اس کے اعتراف گناہ سے اجتناب فرمایا، دراصل ماعز نے اپنی مہلک سزا خود ہی پسند کی تھی، اسے کوئی رعایت پسند ہی نہ تھی، لیکن اگر ماعز قانون کی رعایت سے بچ بھی جاتا تو اسے اپنی ضمیر اور احساس سے

کہاں رہائی تھی، گناہ کے بعد روحانی تحقیر اور ذلت کے جذبات اس پر اتنے غالب تھے، کہ ان کا ازالہ محض سزا سے ہی ممکن تھا، اور چوں کہ اُس کے اندرونی جذبات اور ضمیر کی پاکیزگی ہجوم کی نگاہوں سے اوجھل تھی، اس لیے انھوں نے اسے بھاگنے نہ دیا۔ حضرت عائشہ رض سے روایت ہے کہ رسول کریم فرمایا کرتے تھے کہ جہاں تک ممکن ہو، مومن کو سزا دینے سے گریز کرو، اگر وہ کسی طرح سے بچ سکتا ہے تو اسے چھوڑ دو، ایک امام کے لیے معاف کرنا سزا دینے سے کہیں زیادہ بہتر ہے۔

مجرم اور گناہ گار اخلاقی پابندیوں میں اتنے سخت تھے کہ وہ نہایت اطمینان سے جسمانی سزائیں برداشت کرتے تھے، عامر بن ثمورہ نے ایک اونٹ چوری کیا، اور رسولِ خدا کے سامنے اپنی چوری کا اعتراف کیا، جس قبیلے کا اونٹ تھا اُن سے بھی جرم کی تصدیق تو ہوئی لیکن انہوں نے عامر کو چور تسلیم نہ کیا، لیکن عامر کہتے تھے کہ میں نے چوری کی ہے۔ چناں چہ انھیں سزا دی گئی، اور جب ان کا بایاں ہاتھ کٹ کر زمین پر گرا تو عامر نے باوازِ بلند کہا، "اللہ کا شکر ہے کہ میرا گناہ معاف ہوا، ورنہ میرا یہ ہاتھ تو مجھے دوزخ میں جھونکنا چاہتا تھا۔"

ابن عبد اللہ انصاری رسول کریم کے صحابی تھے، انھوں نے اپنی ندامت سے جس کردار اور اخلاقی عظمت کا ثبوت دیا تھا، اس نے تمام مسلمانوں میں ہیجان پیدا کر دیا تھا۔ واقعہ یہ تھا کہ رسول پاک نے انھیں کسی کام کے لیے ایک انصاری کے ہاں بھیجا، اتفاق سے وہ گھر موجود نہ تھا، اس کی بیوی صحن میں نہا رہی تھی، ابن عبد اللہ اوٹ سے دیر تک اسے دیکھتے رہے، اور جب اچانک انھیں اپنی ذلیل حرکت کا احساس ہوا، اور رسول اکرم کے احکام یاد آئے تو اتنے شرمندہ ہوئے کہ بھاگ کر مدینہ سے نکل گئے، کچھ روز بعد آپ نے حضرت عمر رض اور سلمان رض کو ان کی تلاش میں بھیجا، وہ انھیں جنگلوں میں ڈھونڈتے پھرتے تھے کہ ایک گڈریے نے ان سے پوچھا کہ "کیا تم اسی آدمی کی تلاش میں ہو جو جہنم کی آگ سے بچ گیا ہے؟" حضرت عمر رض نے پوچھا "تمھیں کیا معلوم ہے کہ ہم اسے ڈھونڈتے ہیں"۔ گڈریے نے کہا کہ روزانہ آدھی رات کو ان پہاڑیوں پر ایک آدمی سر پر ہاتھ رکھ کر پکارتا ہے کہ

"اے اللہ! میری گناہ گار روح کو دوسری گناہ گار روحوں کے ساتھ طلب کر اور میرے جسم کو تباہ کر دے"

معیز کے سنگسار ہو جانے کے بعد جب حضور اپنے چند صحابہ کے ساتھ واپس آ رہے تھے، ایک صحابی نے آہستہ سے دوسرے کے کان میں کہا، دیکھو! اللہ نے اُس کے گناہ کی پردہ پوشی کی لیکن اس نے اپنے آپ کو معاف

نہیں کیا، اور کتے کی موت مرگیا۔ آپ نے بھی یہ گفتگو سن لی مگر خاموش رہے۔ راستے میں ایک جگہ ایک گدھے کی لاش پڑی تھی۔ آپ نے ان دونوں کو بلایا اور کہا "آؤ اس لاش کے گوشت کا مزہ چکھو"۔ انہوں نے عرض کیا "یا رسول اللہ! ایسا گوشت بھی کسی نے چکھا ہے؟" اس پر آپ نے فرمایا "جو نازیبا باتیں تم نے اپنے ایک بھائی کے متعلق کہی ہیں وہ اس لاش کا گوشت کھانے سے بھی بدتر ہیں" اس کے بعد آپ نے ماعز کے ایمان کی تعریف فرمائی۔

اعترافِ جرم کی بے مثال جرأت عورتوں میں بھی عام تھی، وہ اپنے گناہوں کی سنگین اور شدید سزاؤں کو ہی اپنی مغفرت کا ذریعہ خیال کرتی تھیں۔ ایک عورت نے آ کر عرض کیا "یا نبی اللہ! میری روح کو پاک کیجیے میں نے زنا کیا ہے۔" رسول کریمؐ نے اسے واپس جانے کو کہا، عورت چلی گئی لیکن دوسرے روز پھر حاضر ہوئی اور اعلانیہ اپنے جرم کا اعتراف کیا اور اپنی مغفرت کے لیے سزا چاہی اور عرض کیا کہ اسے بغیر سزا کے واپس نہ بھیجا جائے، کیوں کہ اسے حمل بھی ہے۔ اس پر آپ نے اس عورت کو بچے کی پیدائش تک انتظار کرنے کو فرمایا۔ اس مدت کے بعد وہ عورت اپنے نوزائیدہ بچے کو کپڑے میں لپیٹے ہوئے آئی اور اپنی سزا کی درخواست کی۔ اس دفعہ رسول خداؐ نے رضاعت کا وقت ختم ہونے کے بعد حاضر ہونے کو فرمایا۔ جب یہ وقت بھی گذر گیا تو وہ بچے کو گود میں اٹھائے ہوئے آئی، اور سزا لینے کا اعادہ کیا۔ یہ بڑا دردناک منظر تھا۔ سب سے زیادہ پیچیدہ مسئلہ بچے کی پرورش کا تھا۔ آپ نے ایک شخص کو اس کا ذمہ دار ٹھہرایا، اور عورت کے سنگسار کرنے کا حکم دیا۔ ایک روایت ہے کہ خالدؓ بن ولید نے اس عورت کو قریب سے جب سر پر پتھر مارا، تو خون کی دھار اٹھی، اور خالدؓ کے رخساروں پر پڑی۔ اس پر وہ نہایت برہم ہوئے اور اس عورت کو برا بھلا کہا۔ رسول کریمؐ نے سنا تو فرمایا "اس عورت کو برا مت کہو خدا کی قسم اس نے مغفرت پالی ہے، کیا تم اس سے بہتر کوئی آدمی ڈھونڈھو گے جس نے اللہ کے حکم پر اپنی جان دے دی۔"

مجرم صاف طور پر سمجھتے تھے کہ ان کے اعترافِ گناہ کی سزا موت ہوگی، لیکن اس کے باوجود کھلم کھلا اقبال کرتے تھے۔ عصمت دری کے ایک واقعہ میں عورت نے اصل ملزم کی بجائے ایک دوسرے پر ہاتھ رکھا کہ اسی نے مجھ پر زیادتی کی ہے، لیکن اصل مجرم نے جو وہاں موجود تھا فوراً کھڑے ہو کر اپنے گناہ کی تصدیق کی۔ آپ نے اس شخص کو سزا دی اور اس کی موت کے بعد فرمایا کہ اس شخص کی موت ایسی ہوئی ہے، جیسی کہ مدینہ کے مسلمانوں کی ہونی چاہیے۔ ظاہر ہے کہ جب سنگین جرائم کا اعتراف اتنی بے باکی سے ہوتا تھا تو معمولی خطاؤں کا اظہار کیوں نہ ہوتا ہوگا۔

جو لوگ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات اور آپ کی ذات بابرکات سے متاثر تھے، اگر اتفاقیہ طور پر راہ راست سے بھٹک جاتے تو ان کی ذہنی اذیت، روحانی تکلیف اور ندامت نہایت ہی رقت انگیز ہوتی ۔

کعبؓ بن مالک جنگ تبوک میں رسول کریم کے ساتھ نہیں گئے تھے۔ مسلمانوں کی واپسی پر انھیں جو ندامت اور پشیمانی ہوئی وہ نہایت درد انگیز تھی۔ یہ ندامت کعبؓ کی زندگی میں ایک بہت بڑا حادثہ تھا۔ جب بطور سزا ان پر پابندیاں عائد ہوئیں، تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ دنیا وسعت کے باوجود ان پر تنگ ہے۔ اُن کی ضمیر انفعال کے جذبے سے مجروح تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سارا ماحول ان کے لیے اجنبی ہے۔ وہ مایوسی اور اندھیرے میں دیوانہ وار پھرتے تھے۔ جہاں جاتے مایوسی کا اندھیرا اُن پر مسلط رہتا۔ ماتھے پر ندامت کا پسینہ تھا۔ اور آنکھوں میں آنسو تھے۔ وہ مجالس نبویؐ میں بھی شامل رہتے تھے۔ عزیزوں اور دوستوں کے گھروں میں جاتے لیکن ان کی بے کسی کا اثالہ کہیں بھی ممکن نہ تھا۔ ذہنی اور روحانی بے کسی انھیں کھائے جا رہی تھی۔ انھی دنوں غسان کے بادشاہ نے انھیں ایک دعوت نامہ بھیجا لیکن کعبؓ نے اسے آگ میں ڈال دیا۔

اسی درد اور ذہنی اذیت میں جب پچاس روز گذر گئے تو کعب کو خبر ملی کہ اُن سے پابندیاں ختم کر دی گئی ہیں یہ سنتے ہی کعبؓ خوشی سے دیوانے ہو گئے، اور جس شخص نے انھیں یہ خوش خبری دی اسے اپنے جسم کے تمام کپڑے انعام میں دے دیے اور کہا: "خدا کی قسم میرے پاس تن ڈھانپنے کو یہی کپڑے تھے۔" ؎

معلم

محمد سلیم کیانی

دوسرے پیشوں کی نسبت ایک معلم کا کام بعض لحاظ سے زیادہ دلکش اور آسان ہے۔ سب سے پہلی چیز وہ فراغت ہے جو دوسرے لوگوں سے کہیں زیادہ ایک معلم کے حصے میں آتی ہے۔ مگر فرصت کے یہ اوقات اکثر اساتذہ یونہی گنوا دیتے ہیں، اور ان سے استفادہ کرنے کے لیے کوئی باقاعدہ پروگرام بنانے کی فکر ہی نہیں کرتے۔ اس سلسلے میں ایک معلم کی سب سے بڑی وقت افلاس ہے، جو کسی نہ کسی درجے میں ہر معلم کی زندگی میں بہرحال موجود رہتی ہے۔ پھر معلم کے کام کی امتیازی خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ اپنی ذہنی صلاحیتوں کو بلند پایہ مضامین پر صرف کرتا ہے، جو اس کے ذہن کو اور بھی جلا بخشتے ہیں۔ تیسری بڑی کشش جو اس فن میں نظر آتی ہے وہ مسرت ہے جو کسی نئی چیز کے تخلیق کرنے سے حاصل ہوتی ہے۔ ننھے ننھے ناپختہ ذہنوں کو ایک مخصوص سانچے میں ڈھالنا معلم کا کمال فن ہے، اس کی بے پایاں مسرت بھی اسی میں ہے۔ بعض اساتذہ تخلیق نو کی یہ خوشی محسوس نہیں کر پاتے جو اُن کی زندگی کی شاید سب سے بڑی بدقسمتی ہے۔ اس میں قطعاً بھی تعجب نہیں ہونا چاہیے کہ اپنے استاد کی اُن کوششوں کی مزاحمت کرتے ہیں، جو وہ ان کے ذہن کو ایک مخصوص طرز پر بدلنے کے لیے کرتا ہے۔ کیوں کہ ان کی یہ مزاحمت بالکل قدرتی امر ہے۔ فن کی دنیا میں وہی تخلیقات بہترین ہوتی ہیں جو زیادہ ٹھوس اور سخت مواد سے تیار کی جاتی ہیں۔ موم کے مقابلے میں سنگ مرمر کو کسی اچھی سی صورت میں ڈھالنا زیادہ مشکل اور زیادہ مفید ہوتا ہے۔ یہی حال انسانی ذہن کا ہے۔

کامیاب معلم اور اس کی امتیازی خصوصیات

مضمون پر عبور: — ایک کامیاب معلم کی سب سے پہلی ضرورت یہ ہے کہ اسے اپنے مضمون پر عبور کامل حاصل ہو۔ جو مضمون وہ پڑھاتا ہے۔ اس سلسلے میں کوئی چیز بھی اس کی نظر سے اوجھل نہ ہو۔ اپنے متعلقہ مضمون کے جدید ترین اور روز بروز ارتقا پذیر نظریات سے اس کو کم از کم سرسری طور پر تو ضرور ہی آگاہ رہنا چاہیے، اور ان کے متعلق اس کا ذہن بالکل صاف ہونا چاہیے۔ کیوں کہ تدریس کے فعل کو سیکھنے کے عمل سے کسی صورت میں بھی علیحدہ نہیں کیا جا سکتا۔ استاد کو اپنے ذخیرۂ معلومات میں اضافہ کرتے رہنا چاہیے۔

ہر کامیاب معلم کو اپنے مضمون پر مکمل عبور ہونا چاہیے۔ اس لیے کہ:۔

اوّلاً ۔ کسی بھی مضمون کے انتہائی جدید ترین نظریات کو بھی بغیر اس کے مبادیات تک کو بھی کما حقہٗ سمجھا نہیں جا سکتا، اس سے صاف ظاہر ہے کہ اس طرح کی واقفیت حاصل کیے بغیر کسی مضمون کی تدریس کا کام کس حد تک تسلی بخش طور پر کیا جا سکتا ہے۔

ثانیاً ۔ انسانی ذہن اپنی وسعت کے اعتبار سے حیرت انگیز واقع ہوا ہے۔ ہمارے پاس یہ جاننے کا کوئی ذریعہ نہیں ہے کہ کسی بچے کو کتنے علم کی ضرورت ہے اور کس قدر مقدار علم کو ایک صحیح طریقہ تدریس کی مدد سے وہ بآسانی جذب کر سکے گا۔ اس نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو صاف ظاہر ہو جاتا ہے کہ کسی مضمون کے مبادیات سکھاتے وقت کوئی معلم اگر اس مضمون کے پیچیدہ ترین اور جدید ترین مسائل پر نظر نہ رکھتا ہو، اور نہ اُن کے متعلق اپنے کسی شاگرد کے سوال کا کوئی معقول جواب دے سکتا ہو، تو اس مضمون کی تدریس محض سعی عبث ہے۔ پر محدود ذخیرۂ معلومات بہت کم ذہنوں کی قوت تخیلہ کو تحریک کرتا ہے۔ اس قسم کے علم سے انسانی فطرت نہ کوئی لگاؤ رکھتی ہے اور نہ اس سے تخلیقی قوتوں کی نشوونما کا سامان ہی بہم پہونچ سکتا ہے۔ اگر پڑھانے کا انداز دلنشین ہو تو کسی مضمون کی ایسی تعلیم کہ جس میں انسانی ذہن علم کی لامتناہی شاہراہ سے روشناس ہو، تو یہ طالب علم کو خود بخود مبادیات کے اچھی طرح سمجھ کر ذہن نشین کرنے اور آگے بڑھنے کی جدوجہد پر ابھارتی ہے۔

اکثر نوجوان طالب علم اپنے بڑوں ۔ بزرگوں ۔ استادوں سے اس لیے نفرت کرتے ہیں کہ ان بڑوں کے ذہن جامد ہوتے ہیں، اور ان کے سوچنے اور سمجھنے کے مخصوص انداز پہلے ہی سے متعین ہو چکے ہوتے ہیں، اور وہ کسی قسم کی سرگرانی و قوت کا مظاہرہ کرنے سے سراسر عاری معلوم ہوتے ہیں۔ اس طرح کے جمود سے بچنے کے لیے معلم کو بھی اپنے مضمون کی دلچسپی اور قدر و قیمت کا ویسا ہی یقین ہونا چاہیے۔ جیسے ایک ڈاکٹر کو صحت؟ کے بارے میں ہوتا ہے۔

(۲) مضمون سے لگاؤ

دوسری چیز جو ایک معلم کو کامیاب بناتی ہے۔ وہ اس کا اپنے مضمون سے لگاؤ ہے۔ میٹھے ننھے اور معصوم بچے اپنے بڑوں کو ان کے جامد طرز فکر کی وجہ سے پسند نہیں کرتے۔ مگر اپنے مضمون کے بارے میں خلوص کے فقدان کی بدولت اکثر اساتذہ سے وہ اور بھی زیادہ نفرت کرنے لگتے ہیں۔ عدم اخلاص اُن کے نزدیک بہت ہی گھناؤنی خصلت ہے جسے وہ بھی دیکھتے

کہ غیر مخلص بچوں کا وجود اس دنیا میں بہت کم ملتا ہے، اور اگر کہیں ہوتا بھی ہے تو وہاں پر کہ جہاں انسانی شخصیت روحانی طور پر انتہائی پژمردہ اور تلاش واقع ہوتی ہے۔

بچے اس باپ اور معلم کو بخوشی اپنا سربراہ مان لیتے ہیں، جو سرگرم ہو، اور جو ہر کام کو تندہی سے انجام دیتا ہو۔ ایسی شخصیتیں بچے کے لیے نہ صرف قابلِ قبول ہوتی ہیں بلکہ وہ ان سے بہت کچھ سیکھتے بھی ہیں، لیکن اس کے برعکس وہ ہر اس شخص سے نفرت کرتے ہیں جس میں کچھ بھی بناوٹ پائی جاتی ہو، اور جس کی باتوں میں اخلاص کی کوئی جھلک تک نہ دکھائی دیتی ہو۔ جو معلم اپنے مضمون پر مکمل عبور حاصل کیے بغیر اسے پڑھاتا ہے، وہ بالآخر اسی نقلی اور پُرتصنع شخصیت کے روپ میں اُبھر کر سامنے آتا ہے۔ اپنے مضمون کو پڑھاتے وقت جو معلم خوشی محسوس کرتا ہے، وہی اپنے مضمون سے حقیقی شغف بھی رکھتا ہے۔ چھوٹے بچے اپنے کسی معلم سے یہ توقع نہیں رکھتے کہ وہ دنیا کے تمام علوم پر حاوی ہوگا، مگر یہ امید ضرور رکھتے ہیں کہ وہ کم از کم اپنے مضمون کے بارے میں پوری طرح مخلص ہو، اور اس سے حقیقی لگاؤ رکھتا ہو۔ اس لحاظ سے معلم کے لیے یہ امر انتہائی ضروری ہے کہ اپنے مضمون کا انتخاب کرتے وقت وہ پوری احتیاط سے کام لے اور پھر اسی کی مناسبت سے اپنی زندگی کا پروگرام مرتب کرے۔ معمولی درجے کے اکثر ماہرینِ علم اپنے ذہن کا اس وجہ سے ستیاناس کر لیتے ہیں کہ وہ اس کو پوری طرح صحیح نہج پر استعمال نہیں کر پاتے۔ جرمنی کے اہلِ علم حضرات کی مثال اس سلسلے میں اگر پیشِ نظر رہے تو بہت اچھا ہو۔ جب بھی کوئی جرمن اپنی باقاعدہ تعلیم سے فراغت حاصل کرتا ہے تو وہ اپنے مضمون کے کسی ایک مسئلے (جس سے اس کو زیادہ دلچسپی ہوتی ہے) کو لے کر اس پر باقاعدہ تحقیق کرتا ہے۔ جو مکمل ہونے پر ایک مقالے کی صورت میں شائع ہو جاتی ہے، پھر اسی مسئلے سے متعلق جو بہت سے اور مسائل اُبھرتے ہیں، اُن میں سے کسی ایک کو لے کر کام شروع کر دیتا ہے، اور اس طرح یہ سلسلہ چل نکلتا ہے۔ مگر اس طریقے سے جہاں اپنے مخصوص شعبۂ علم سے متعلق اس کی معلومات بڑھتی ہیں وہاں اس کے ساتھ ہی ساتھ دوسرے مضامین سے اس کے ربطِ باہمی کو اور بحیثیت مجموعی پوری انسانی زندگی میں اس مقام کو بھی اچھی طرح جان لیتا ہے، جس کی وجہ سے اسکی یہ معلومات گیرائی اور گہرائی ہر دو لحاظ سے ممتاز ہوتی ہیں۔ اس کے برعکس جو اہلِ علم بغیر کسی باقاعدہ لائحہ عمل کے طبیعت کے تقاضے سے مختلف اوقات میں مختلف قسم کے مضامین پر طبع آزمائی کرتے رہتے ہیں وہ معلومات کا محض منتشر مجموعہ ہی جمع کر کے رہ جاتے ہیں اور علمی دنیا میں اپنا کوئی مقام پیدا نہیں کر پاتے، اس نقطۂ نظر سے انتہائی ضروری ہو جاتا ہے،

ری احتیاط سے اپنے مضمون کا انتخاب کرکے کامیاب معلم اُس مخصوص شعبۂ علم کی طرف بھی متوجہ ہو، جو اُس کی
دلچسپیوں کا مرکز و محور ہے۔

۱) شاگردوں پر شفقت

اپنے شاگردوں سے لگاؤ بھی کامیاب معلم کی ایک اور امتیازی خصوصیت ہے۔ چھوٹے بچوں سے لگاؤ پیدا کرنا بہت آسان ہے۔ ان میں خرابیاں ہوتی ہیں اور خامیاں بھی۔ مگر یہ خرابیاں اور خامیاں وہی تو ہیں جن کو دور کرنے کے لیے وہ معلم کے پاس اس کی مدد چاہنے آتے ہیں۔ جہالت کوتاہ نظری، اور ناتجربہ کاری ان ننھے معصوم بچوں کی کوتاہیاں ہیں جن سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے وہ معلم کے پاس آتے ہیں۔ حقیقت میں قابل نفرت کوتاہیاں وہی ہوتی ہیں جو سالہا سال کی باقاعدہ پرورش کا نتیجہ ہوں۔ جن کو "احتیاط" سے پالا جائے، اور جو بڑی عمر کے مردوں اور عورتوں میں اکثر پائی جاتی ہیں۔

انفرادی طور پر اپنے ہر ایک شاگرد سے لگاؤ رکھنے کے ساتھ ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ معلم کو اُن کے اجتماعات سے بھی اُنس ہو، اور وہ اُن کے درمیان آکر خوشی محسوس کر سکے۔

چھوٹے بچوں کے درمیان آنے سے جو شخص گھبراتا ہے اور اپنا توازن ذہنی کھونے لگتا ہے وہ بھی معلم بن سکتا ہے بشرطیکہ اس کو اپنے مضمون کے ساتھ پُرخلوص لگاؤ ہو۔ جس شخص نے کسی خاص مضمون کے سیکھنے میں اپنی پوری عمر صرف کر دی ہو، ہو سکتا ہے کہ اس کو اس مضمون کے پڑھانے کا صحیح ڈھنگ نہ آتا ہو، اور وہ تدریس کے اصولوں سے ناواقف محض ہو۔ لیکن اگر اس کی شہرت اور علم کوئی امتیازی مقام رکھتے ہوں تو یہی دو چیزیں مل جل کر، جماعت کی توجہ کو کسی دوسری طرف منتقل ہونے سے روک سکتی ہیں، اس کی آواز اگر بہت ہی دھیمی ہو، اور اس کا انداز گفتگو بہت ہی بھدا اور غیر دلچسپ ہو، تب بھی اس کے علم اور شہرت کی امتیازی شان سننے والوں کو متوجہ رکھ سکتی ہے، اس قسم کے معلم کے شاگرد ایک نہایت اعلیٰ درجے کے ذہین ہو کر بلند تر فضاؤں میں پرواز کرنے کے قابل ہو جاتے ہیں۔ اور ایسے معلم کا تربیت یافتہ ہی ان کو صحیح قسم کے ذوق علم سے بہرہ ور کرتا ہے۔

ہر پیشے کی ایک مخصوص فضا ہوتی ہے اور اس کا اپنا ماحول ہوتا ہے جس میں آکر کوئی شخص اس کے لحاظ سے اپنے اندر ہم آہنگی پیدا نہ کر سکے تو وہ اُس پیشے میں خوش نہیں رہ سکتا۔ اگر کوئی شخص چھوٹے چھوٹے بچوں کے اجتماعات کا سامنا

کرنے سے گھبراتا ہو۔ اور کسی قسم کی خوشی کا احساس اس کے اندر پیدا نہ ہو۔ اگر کوئی شخص اپنے بچوں کے ان اجتماعات کے مقابلے میں کسی معمل میں شور و غل سے دور تجربے کرنے اور کسی لائبریری میں اطمینان سے مطالعہ کرنے کو ترجیح دیتا ہو، تو وہ شخص کبھی بھی ایک اچھا معلم نہیں بن سکے گا۔ مگر اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ کامیاب معلم ہر وقت بس بچوں ہی کے ہجوم میں گھرا رہتا ہو، نہیں بلکہ اس کے بالکل برعکس وہ اس اجتماعیت کے ساتھ خلوت کا طالب بھی ہوتا ہے۔ بچوں کے اس ہجوم سے علیحدہ ہو کر خلوت سے، کبھی کبھار لطف اندوز ہونا بھی معلم کی زندگی میں ایک اہم خوشی کا مقام ہے۔

اس موقع پر یہ اعتراض کیا جا سکتا ہے کہ تمام مدرسوں کے تمام بچوں سے لگاؤ پیدا کر لینا ممکن نہیں ہے۔ خصوصاً، جب کہ بگڑے ہوئے گھرانوں کے شریر اور ضدی بچے بھی پائے جاتے ہوں، اس قسم کے بگڑے ہوئے بچے اپنے ماحول کے ساتھ عدم تطابق کا نتیجہ ہوتے ہیں، ان کے لیے اگر معلم اور کچھ نہیں تو افسوس تو ضرور کر سکتا ہے، اور اس بدقسمت ننھی مخلوق کے لیے اس کے دل میں ہمدردی کے جذبات موجزن ہو سکتے ہیں۔ خصوصاً جب کہ وہ یہ بھی جانتا ہو کہ جیو نے ننھے، عمل نہیں، بلکہ ردِ عمل سے عبارت ہوتے ہیں۔ اُن کی پوری سیرت اسی ردِ عمل کا پرتو ہوتی ہے، اس لیے ان کے ساتھ برتاؤ کرنے وقت یہ اصول پیشِ نظر رکھنا چاہیے کہ یہ اپنے آپ کو کوئی نقصان پہنچا سکیں اور نہ ہی کسی دوسرے کے لیے مصیبت کا باعث بننے پائیں۔

(۴) چھوٹے بچوں کی نفسیات سے آگاہی

چھوٹے بچوں کی نفسیات سے واقفیت تدریس کی کامیابی کا ایک اہم لازمہ ہے، جس کے بغیر کسی تعلیمی عمل کی کامیابی ممکن نہیں ہے۔ اس سلسلے میں چند ایک باتیں تو ہر ایک معلم کو خصوصیت کے ساتھ پیشِ نظر رکھنی چاہئیں۔ اول یہ کہ بچے بالغ مرد اور عورتوں کی طرح نہیں سوچتے سمجھتے۔ بلکہ اپنے طرزِ فکر کے لحاظ سے وہ ان سے یکسر مختلف ہوتے ہیں۔ بچے، محض بچے ہی ہوتے ہیں، اور ان کو اسی حیثیت سے سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ دوم یہ کہ بچوں کو سمجھنا بہت حد تک آسان ہو جاتا ہے۔ اگر ان پر نظر ڈالتے وقت یہ امر یاد رہے کہ وہ اپنی بہت سی خصوصیات میں انسانوں سے زیادہ حیوانات سے ملتے جلتے ہیں۔ نو سے دس برس کی عمر کے بچے تو اس نقطۂ نظر سے اور بھی نمایاں نظر آتے ہیں۔ ان بچوں کے کسی گروہ کو کھیلتے، کودتے، اِدھر اُدھر بھاگتے دیکھیے۔ ان کی لامحدود قوت کو ان کے ہر ہر کام میں جھلکتے دیکھیے۔ ایک دوسرے کے ساتھ دھول دھپا کرتے دیکھیں۔ شرارت کے بعد ان کی آنکھوں سے پھوٹتی ہوئی مسرت و شادمانی کا جائزہ لیں تو اس وقت یہ

اپنی حرکات کے اعتبار سے حیوانات سے کس قدر قریب نظر آتے ہیں۔ لڑکوں کی طرح لڑکیوں کا بھی یہی حال ہے۔ لڑکے شکاری کتوں کی طرح شکار کا تعاقب کر کے خوشی کے احساس سے لبریز ہو جاتے ہیں تو لڑکیاں خصوصاً تیرہ سال اور بعد کے چند سالوں کے عرصے میں، گھوڑوں کی طرح ذکاوت اور قوی مگر جذباتی اور طرح طرح کے ناگہانی اور ناقابل ترجیح خوف کا شکار دکھائی دیتی ہیں، اگر ایک مخصوص انضباط کے اندر ہوں تو نہایت درجہ مشکل کام سرانجام دینے سے بھی تامل نہیں کرتیں۔ مگر فی الحقیقت ان کے خوشی کے لمحات وہی ہوتے ہیں، جب ہر طرح کے تکلفات سے خالی الذہن ہو کر سرپٹ دوڑتے ہوئے گھوڑے کی طرح جس کی ایال ہوا میں اڑی جا رہی ہو، یہ پوری طرح آزاد ہوں، جب کسی مسئلے پر ان کی توجہ مرکوز ہو کر رہ گئی ہو، شکاری کتے اور یہ گھوڑے ہر دو پیارے جانور ہیں، اور انسانی محبت کے پوری طرح اہل۔ ان کو سدھایا جا سکتا ہے، اور کامیابی سے پالا بھی جا سکتا ہے مگر ان بے زبان جانوروں کے ساتھ اس طرح کا معاملہ کرنا جس طرح کا سلوک انسانوں کے ساتھ کیا جاتا ہے، ایک سخت غلطی سے کسی طرح کم نہیں ہو سکتا۔ پھر کتوں کو گھوڑوں کی طرح یا گھوڑوں کو کتوں کی مانند رکھنا بھی ایک بہت بڑی غلطی ہے۔

بچوں کی نفسیات جاننے کے عملی ذرائع

کیسے اور کیوں کر بچوں کی نفسیات سے آگاہی حاصل کی جائے؟ ایک ایسا سوال ہے جس کے جواب میں صرف ایک ہی بات کہی جا سکتی ہے، اور وہ یہ کہ۔ تجربے اور مسلسل مشاہدے جاری رہیں۔ زندگی کے میدان میں یہ تجربے اور مشاہدے جن باتوں پر محیط ہو سکتے ہیں، وہ یہ ہیں:۔

(۱) بچوں کو اٹھتے، بیٹھتے، کھیلتے اور پڑھتے ہوئے غور سے دیکھیے۔ اُن کے قریب آ کر ان سے گفتگو کیجیے۔ ان کے اجتماعات میں شرکت کیجیے، اور سب سے زیادہ یہ کہ اپنا بچپن یاد کرنے کی کوشش کیجیے، اور اس کی روشنی میں اپنے ان شاگردوں کو سمجھنے کی کوشش کیجیے۔

(۲) چھوٹے بچوں کے نام اور چہرے یاد رکھیں کیوں کہ یہ انتہائی اہم ہے۔ ہر چھوٹا بچہ بنیادی طور پر آرزومند ہوتا ہے کہ وہ ایک اہم اور حقیقی شخصیت، جس کی اپنی کوئی انفرادیت ہو، میں نمودار ہو، اور دنیا اس کی طرف متوجہ ہو۔ خود نمائی کا بھی جذبہ ہوتا ہے جو بچے کو مجبور کرتا رہتا ہے کہ وہ ایک نمایاں انفرادیت کو اپنے اندر نشوونما دے۔ اس لحاظ سے ناگزیر ہے کہ اگر بچوں پر کسی طرح کا بھی اثر ڈالنا مقصود ہو۔ تو ہر بچے سے فرداً فرداً معلم متعارف ہو، اور ان کو یقین ہو جائے کہ ان کی انفرادی حیثیت معلم کے پیش نظر ہے۔

(۳) مختلف بچوں کی شخصیتوں میں پائے جانے والے مختلف اختلافات کو بھی نظر میں رکھنا ضروری ہے۔ علم النفس کے اصول مانند فنون تدریس بھی بہت حد تک ہر فرد کے طبعی میلانات اور گوناگوں اختلافات کے لحاظ سے مختلف ہو سکتا ہے جو اُن مخصوص اوصاف کے پیش نظر ترکیب پاتا ہے جو کسی ذہن میں نمایاں ہوتے ہیں۔

(۴) اپنے شاگردوں کو اُن کے ذاتی اوصاف کی حیثیت سے مختلف گروہوں میں تقسیم کر دیں تو معلم کے رستے سے بہت سی مشکلات خود بخود دور ہو جاتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ کسی معلم کی کامیابی کا بہت کچھ دارومدار اس بات پر ہوتا ہے کہ وہ کسی خاص فرد کے متعلق حاصل کردہ معلومات اور بصیرت کی بنا پر کوئی موزوں گروہ جو زیادہ سے زیادہ افراد پر منطبق ہو سکے وضع کرنے کی صلاحیت کس قدر رکھتا ہے۔ یہ چیز مشکل ضرور ہے مگر ناممکن ہرگز نہیں۔ اور ہر معلم اسے تھوڑی بہت محنت کے بعد اپنے اندر پیدا کر سکتا ہے۔ مگر اس سلسلے میں کسی بھی معلم کو یہ حقیقت اپنی نظروں سے اوجھل نہ ہونے دینا چاہیے کہ انسانوں میں کوئی تلے بندھے، اور کچھ مخصوص طرز کے گروہ نہیں پائے جا سکتے، اور نہ ہی کسی گروہ کی نشان دہی ہی کی جا سکتی ہے ماہرین نفسیات ابھی تک اپنی ان کوششوں میں کامیاب نہیں ہو سکے کہ انسانوں کو ان کی صفات و خصائل کے لحاظ سے کچھ تلے بندھے ضابطوں کے پابند گروہوں میں تقسیم کر سکیں جو قابل اطمینان بھی ہوں۔

مشکل بچے، اور اُن سے پیدا ہونے والے مسائل

وہ بچے جو کسی لحاظ سے اور کسی کلیے کے تحت بھی کسی گروہ بندی میں نہ آ سکیں، جن کی انفرادیت بہت زیادہ نمایاں ہو، اور جو اس طرح ایک مستقل مسئلہ بن کر رہ جائیں "مشکل بچے" کہلاتے ہیں۔ ان میں سے ہر بچہ اپنی جگہ پر ایک علیحدہ وحدت ہوتا ہے جس کی وجہ سے معلم کے لیے ناگزیر ہے کہ وہ ان میں سے ہر ایک سے فرداً فرداً اچھی طرح واقفیت رکھتا ہو اور انہیں پوری طرح جانتا ہو۔ ان کے مسائل اور مشکلات کو سمجھ چکا ہو۔ معلم کی زندگی کی مسرت و شادمانی اور غم و اندوہ بہت بڑی حد تک انہی جیسے بچوں پر منحصر ہوتی ہے۔ معلم کی زندگی میں ان کا مقام وہی ہوتا ہے جو گھوڑے کی زندگی میں گھوڑ کی مکھی کا ہوا کرتا ہے۔ ایسے بچوں کے مقابلے میں کامیابی کو پا لینے کا مفہوم، ان کی صحیح تربیت کرنے کے علاوہ کچھ اور نہیں۔ ان کے بارے میں اگر درج ذیل اصولوں کا لحاظ رکھا جائے تو بہت آسانی سے ان کو درست نہج پر لایا جا سکتا ہے۔

(۱) ہمیشہ اس بات کی توقع رکھیں کہ آپ کی جماعت میں کم از کم ایک یا دو تو ضرور ہی اس قسم کے مشکل بچے ہوں گے۔ گو کہ میں اُن کی موجودگی کافی دیر تک راز ہی راز رہے، اور اس قسم کی کوئی حرکات ان سے سرزد نہ ہوں۔

(۲) جب اس قسم کے بچوں کو پہچان لیں تو پھر ان کے ساتھ برتاؤ میں انتہائی حد تک احتیاط برتیں۔ اور کوئی ایسی بات کرنے سے حتی الوسع بچنے کی کوشش کریں جو ان آبگینوں کو ٹھیس پہنچا سکے۔ یہ قسم ایک ایسی دھاگو آمیز ہے جو ذرا سی چوٹ سے پھٹ سکتی ہے۔

(۳) ان بچوں کے ساتھ گفتگو میں اپنے الفاظ کو ابہام کے شائبے تک سے پاک رکھنے کی کوشش کریں، اور ان کے سامنے اپنی حرکات و سکنات پر پورا ضبط، تاکہ کسی طرح بھی ان کے دلوں میں کوئی غلطی راہ نہ پا سکے، یہ بچے بہت حساس ہوتے ہیں، اور عام طور پر زیادہ سوچنے کے عادی بھی، ان کی یہ سوچ بچار بعض اوقات کسی دماغی مرض کی سرحدوں سے جا کر مل جاتی ہے۔ معلم کی زبان سے نکلا ہوا کوئی اتفاقی کلمہ یا لفظ ایسے بچوں کی زندگی کو یکسر نئی صورت بھی عطا کر سکتا ہے، اور ان کو تباہی کے گہرے غاروں میں دھکیلنے کا سبب بھی بن سکتا ہے۔

(۴) ان بچوں کو بادی النظر میں دو بڑے بڑے گروہوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ کم زور اور کند ذہن بچے، جو حوصلہ افزائی اور مدد کے محتاج ہوتے ہیں۔ اور قوی اور ذہین بچے، جن کی برتر صلاحیتوں کے استعمال کے لیے ہدایت، اور رہنمائی کی ضرورت ہوتی ہے، تیزی سے اثر پذیر ذہین بچے کو ذہنی طور پر نا آسودگی کا شکار رکھنا جرم ہے۔ جس کا ارتکاب ہر سال نہ معلوم کتنے بہت سے اساتذہ محض کاہلی کی بنا پر کرتے چلے آتے ہیں۔

(۵) وہ مشکل بچے جو اس خبط کا شکار ہوتے ہیں کہ کوئی ان کو ہر دم آزار پہنچانے کے درپے ہے، وہ بڑے ہی مظلوم ہیں، اور کم زور بھی۔ ان کی حالت اور بھی نازک ہوتی ہے، اور نہایت درجہ کی احتیاط برتنے کا تقاضا کرتی ہے وہ خاموش اور کم گو بچہ جو اس قسم کے ذہنی عارضے کا شکار ہو، وہ آگے چل کر بہت خطرناک ثابت ہو سکتا ہے ان کے ساتھ اپنے تعلقات کو کبھی شخصی یا ذاتی رنگ نہ دیں۔ بلکہ ہمیشہ اپنے پیشے کی مقررہ حدود کے اندر رہیں۔ اور ان حدود سے باہر آنے کی غلطی کبھی نہ کریں۔ یہ بچے اگر کبھی بالمشافہ گفتگو کرنا چاہیں، تو ان سے انتہائی ٹھنڈے مزاج کے ساتھ گفتگو کریں۔ کسی قسم کے ڈرامائی انداز کو اپنی حرکات میں پیدا نہ ہونے دیں اور کمرے کے دروازے کھلے رکھیں۔

مشکل بچوں کی صف میں شامل ہونے سے نیک اطوار اور صحت مند دل و دماغ رکھنے والے بچوں کو محفوظ رکھنے کے لیے باقاعدہ جدوجہد کی ضرورت ہے۔ اس مقصد کے حصول میں مندرجہ ذیل عمومی اصول مفید ثابت ہو سکتے ہیں۔

(۱) کسی بھی ذہین طالب علم کو اپنی شخصیت کا پرتو بنانے کی کوشش نہ کریں۔ معلم کی شعوری یا غیر شعوری طور پر یہ کوشش کہ شاگرد اس کی شخصیت کا عکس بن کر رہ جائے، اور اس کی حیثیت ایک ضمیمے یا تتمے کی سی ہو کر رہ جائے۔ کوئی مستحسن اور صحیح کوشش نہیں ہے کیونکہ مختلف افراد آپس میں ایک دوسرے سے بہت مختلف ہوتے ہیں، اور ہر فرد ایک الگ وحدت ہوتا ہے۔ پھر ذہین افراد میں یہ باہمی اختلاف تو اور بھی زیادہ وسیع اور نمایاں ہوتا ہے اور اس ذہانت کے لحاظ سے ہی افراد کے درمیان اختلاف کے درجات متعین ہوتے ہیں۔

(۲) اپنے شاگرد کو ان تجربات اور ہنروں سے بہرہ ور کرنا جو معلم کے اپنے پاس موجود ہوتے ہیں، کسی معلم کا اصل کام ہے جو اگر کامیابی سے ہو جائے تو پھر کسی اور چیز کی ضرورت بہت کم باقی رہ جاتی ہے۔ زندگی میں شاگرد کی مدد اور قوت یہی دو چیزیں بنیں گی۔

(۳) اگر بچہ ذہین ہو۔ اور اس کی جسمانی صحت اچھی ہو، تو اس کی استعداد کے مطابق اسے زیادہ سے زیادہ کام کرنے کو بتائیں یہ کام اگر وہ پوری طرح نہ کر پائیں تو بھی اس کا اتنا فائدہ تو ضرور ہوگا کہ اس کو یہ خیال رہے کہ کرنے کا کام وہی کچھ نہیں جو وہ کر رہا ہے، بلکہ اس کے علاوہ بھی ہے، جسے کرنا باقی ہے۔

(۴) اس بات کا خاص خیال رکھیں کہ ذہین بچہ اپنے قیمتی وقت کو ادھر اُدھر کے فضول کاموں میں ضائع نہ کرتا پھرے، بلکہ اپنے اوقات سے وہ پورا پورا فائدہ اٹھا سکے، اس مقصد کے لیے بچے کو کام کرنے کا صحیح لائحہ عمل اور طریق کار سے روشناس کریں۔ اور ایک باقاعدہ مرتب شدہ پروگرام کے مطابق کام کرنے کا ڈھنگ بتائیں۔ بہتر ہو۔ اگر اس کام کو ایک مرتب صورت میں اس کے حوالے کریں۔

(۵) اپنی استعداد ذہنی و عملی کو بروئے کار لانے میں بچے نے اب تک جو منازل طے کی ہیں اور جن طویل راہوں پر اس کو سفر کرنا پڑا ہے۔ اگر پیچھے پلٹ کر کبھی کبھار ان کا مشاہدہ اس کو کرایا جائے تو یہ چیز اس کی ہمت افزائی کر سکتی ہے، اور آئندہ کے مراحل تک پہلے سے بھی زیادہ جوش و خروش کے ساتھ آگے بڑھ سکتا ہے۔ جن راہوں اور منزلوں سے ابھی اس کو گذرنا ہے، اُن کا علم آگے بڑھنے کے لیے ہرگز ضروری نہیں ہے۔ بعض حالتوں میں آگے کی دشوار اور کٹھن منزل کا مشاہدہ بچوں کو بددل بھی کر سکتا ہے۔ اور خطرہ ہوتا ہے کہ وہ ان کی دشواری کو دیکھ کر بدک نہ جائیں۔

(۶) پریشان خیالی کے شکار اور متذبذب طالب علم کو دلائل دے کر سمجھائیں، کہ ماضی میں اس نے اب تک جو کچھ حاصل

حاصل کیا ہے۔ وہ اس کی بلند دماغی کیفیت کو ظاہر کرتا ہے، اور اگر وہ چاہے تو آئندہ پہلے سے بھی زیادہ میدان مار سکتا ہے، اس لیے پریشانی اور ڈر کو اپنے دل سے نکال دینا چاہیے۔ چھوٹے بچے بہت آسانی سے کسی بات کے قائل ہو جاتے ہیں، اور ان کو آسانی سے کسی بھی سمت میں موڑا جا سکتا ہے۔ چناں چہ اسی وجہ سے وہ اپنے آپ کو مستقل مزاج اور کبھی تبدیل نہ ہونے کی صفات سے مزین افراد کی حیثیت سے ہم سے متعارف ہوتے ہیں۔ جو درحقیقت اپنی اس کمزوری کو چھپانے کی ایک ناکام کوشش ہوتی ہے۔

(۷) اپنے شاگردوں میں کبھی بھی یہ احساس پروان نہ چڑھنے دیں، کہ وہ محض ایک مخصوص گروہ کا جزو ہے، بلکہ ان کی شخصیت اور انفرادی اوصاف کو ابھارنے اور نکھارنے کا بھی خاص خیال رکھیں، تاکہ ان کو یہ شکایت پیدا نہ ہو کہ ان کی انفرادیت کی طرف کماحقہ توجہ نہیں دی جا رہی۔ اگر کوئی بچہ اپنی ذات کے متعلق آپ کی رائے یا نصیحت کا طالب ہو تو نہایت خندہ پیشانی سے اور بلا حیل وحجت اس کو اپنی رائے سے آگاہ کریں۔

(۵) ذہنی وعلمی وسعت

کسی بھی اچھے اور کامیاب معلم کو وسیع ترین ذہنی وعلمی وسعت کا مالک ہونا چاہیے۔ اس کی علمی دلچسپیوں کا دائرہ جتنا جتنا وسیع ہوگا، وہ اسی قدر کامیابی کے ساتھ اپنے فرائض کو بطریقِ احسن پورا کر سکے گا، اور طلبہ کے لیے اس کی شخصیت اتنی ہی پرکشش اور جامع ہوگی۔ کالجوں، اور مدرسوں میں پڑھانے والے اساتذہ کو اپنے اردگرد کے معاشرے کے ایک عام کارکن سے کہیں زیادہ۔ دیکھنا، سوچنا، اور سمجھنا چاہیے۔ ان تمام صفات سے اس کی ذات کو بدرجۂ اتم آراستہ ہونا چاہیے۔ تھوڑے سے غوروفکر کے بعد یہ بات خود بخود سمجھ میں آ سکتی ہے کہ مذکورہ بالا صفات کی عدم موجودگی میں کوئی بھی معلم کامیاب نہیں کہلا سکتا۔

معلم کے فرائض کو ہم دو حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ اوّل یہ کہ وہ مدرسہ یا کالج یا باہر کی دنیا کے درمیان ایک ذریعے کا کام دے۔ اس کا کام ایک ایسا پُل مہیا کرنا ہے جو مدرسہ کی فضا کو عملی زندگی کے ٹھوس حقائق کے ساتھ جوڑ دے تاکہ اس طرح اس کو حقیقت سے قریب تر کر سکے۔ اس مقصد کے حصول کی خاطر تدریسی مضامین کو روزمرہ زندگی کے ساتھ مربوط کرنے اور رکھنے کی ضرورت پیش آتی ہے، اس طرح کے ربط سے کوئی مضمون پہلے سے زیادہ دلچسپ اور جاندار نظر آنے لگتا ہے۔ ہر اچھا معلم خود ایک جاذب نظر اور جاندار شخصیت کا مالک ہوتا ہے، جو عکس فگن ہو کر

ہر اُس مضمون کو بھی دلچسپ بنا دیتی ہے، جو وہ پڑھاتا ہے۔ معلم کا دوسرا امتیازی کارنامہ ناپختگی فکر اور بلوغت ذہنی کے درمیان کا واسطہ مہیا کرنا ہے۔ ایک ایسا پل، اور ایک ایسی شاہراہ بننا جو بچپن کی خیالی فضا اور خام دماغی کیفیت سے پختگیٔ فکر و نظر کی منزل کی طرف لے جائے، اور اس کے بنانے کی کوشش کرنا معلم کا دوسرا اہم فرض ہے۔ بچپن اور بالغ النظری کے درمیان کی کڑیوں کو وہ مہیا کرتا ہے۔ اور ایک ایسی فضا تیار کرتا ہے جس میں بچپن کی ادھکچری دماغی حالت کی جگہ بتدریج بلوغت کی پختہ دماغی لے سکے۔ باہر کی زندگی کا مفہوم جس میں بالغ مرد اور عورت بستے ہیں بچوں کے ذہن نشین کرنے کے ضروری ہے کہ معلم بیک وقت دونوں دنیاؤں کا باشندہ ہو۔ اس کے لیے بچوں کی نفسیات جتنی اہمیت رکھتی ہے اسی قدر یہ ضروری ہے کہ وہ عملی زندگی کے ٹھوس حقائق سے بھی بخوبی واقف ہو۔ ہر اچھے معلم میں یہ صلاحیت ہوتی ہے کہ وہ اپنی ہی شخصیت کے ان اجزاء کو، جو بچپن کی تربیت اور یادوں سے عبارت ہوتے ہیں، کام میں لا کر پھر بچے اور نوجوان کی سی ذہنی و جذباتی کیفیت کا تجربہ خود اپنے اوپر اور اس کا مشاہدہ خود اپنے اندر کر سکے۔ اس کے ساتھ ساتھ ان صفات و خصوصیات کو بھی برقرار رکھ سکے جو مل جُل کر ایک بالغ النظر اور پختہ کار شخصیت کے نقوش اجاگر کرتی ہیں۔

(۶) مزاح

مزاح ہر اچھے معلم کی شخصیت کا ضروری حصہ ہوا کرتا ہے۔ اس کی بدولت جماعت متوجہ رہتی ہے، اور اس کے ذریعے بہت سے اہم مضامین کی صحیح شکل و صورت بچوں کے سامنے آسکتی ہے جس کی مدد سے وہ ان کو اپنانے میں زیادہ وقت بھی محسوس نہیں کرتا۔ بعض اساتذہ مزاح کے ذریعے جماعت کا نظم و ضبط قائم رکھنا چاہیے۔ مگر انضباطِ جماعت کی خاطر مزاح کا یہ استعمال کسی طرح بھی درست قرار نہیں دیا جا سکتا۔ تدریس میں مزاح کا اصل مقصد اس سے کہیں زیادہ اہم ہے مزاح کا حقیقی مقصد یہ ہے کہ مسرت و انبساط کے یکسانی جذبے کی بدولت معلم اور متعلم کو ایک دوسرے سے مربوط کر دیا جائے اور وہ ایک دوسرے سے اور زیادہ قریب تر ہو جائیں، اور اُن کا باہمی رابطہ زیادہ مضبوط ہو جائے۔ کیوں کہ جب کچھ افراد اکٹھے مل کر ہنستے ہیں تو وہ کچھ وقت کے لیے بھول جاتے ہیں کہ وہ چھوٹے ہیں یا بڑے۔ استاد یا شاگرد، اور مزدور یا آقا۔ اور ایک ہی گروہ انسانی میں سے ہونے کے جذبے سے سرشار ہو جاتے ہیں، اور زندگی کی مے سے مخمور نظر آتے ہیں۔ اس جذبۂ انسانی کو کھیل اور جماعت سے اُنسیت کی جبلت کا آئینہ دار کہا جا سکتا ہے۔ تین بچوں کی ایک جماعت میں

اگر یہ احساس اُجاگر کر دیا جائے کہ وہ سب ایک دوسرے سے متعلق ہیں، اور سب کے اشتراکِ عمل سے وہ جماعت وجود میں آتی ہے۔ پھر کسی طریقے سے اگر وہ اس احساس سے مُسرت بھی لینے لگیں تو ایسے بچے اس سے کہیں زیادہ مقدار میں اور زیادہ جوش وخروش کے ساتھ ہر کام کر جائیں گے، جو وہ مجبوری اور خوف کی حالت میں کر پاتے ہیں۔

(۷) انسانی اوصاف

بحیثیت انسان ہر اچھے معلم میں تین اوصاف پائے جانے چاہئیں۔

(۱) **قوتِ حافظہ**:۔ کسی خلّاق قوت کا مالک ہونا ایک ایسی صفت ہے جو ایک اچھے وکیل، ڈاکٹر اور معلم کو اپنے سے کم تر درجے کے افراد سے ممیز کرتی ہے۔ معلم کا فرض ہے کہ وہ حقائق، ٹھوس اور بے جان حقائق کے قالب بے حس میں ذوق وشوق اور سرگرمی کی حرارت سے وہ پگھل جائیں اور اس طرح آپس میں گھل مل کر یک جان ہو جائیں اور ان کی یہ ہم آہنگی ایک ایسے نقش کو اُبھار دے، جس کا ہر جزو دوسرے اجزاء سے مربوط ہو، جس میں زندگی جھانک سکے، اور جو بڑھ کر ذہن انسانی کا جزو لاینفک بن جائے، اس طرح کی قابلیت پیدا کرنے کے لیے مختلف حقائق کو ایک دوسرے سے ہم آہنگ کرکے ایک ہی تسلسل میں لے آئے، تو بہت آسانی ہو۔

(۲) **قوتِ ارادی**:۔ ہر اچھا معلم باعزم ہوتا ہے اور ایک مضبوط قوتِ ارادی کا مالک۔ چھوٹے بچے نئے اور مشکل کام سے گھبراتے ہیں۔ کام کو پسند کرنا ان کی فطرت سے لگا نہیں کھاتا۔ وہ کام سے خوش ہوتے ہیں، نہ کسی بالاتر قوت کی موجودگی سے، اور نہ ہی کسی ایک چیز پر اپنی توجہ کو کافی دیر تک مرکوز رکھنا ان کے لیے خوشی کا سامان بہم پہنچاتا ہے۔ کیوں کہ ارتکازِ توجہ فی الحقیقت ان کے لیے ایک بالکل نیا اور تکلیف دہ تجربہ ہوتا ہے، جو بچوں کے لیے اپنے اندر کشش سے کہیں زیادہ دور بھگانے کی خاصیت رکھتا ہے، پھر ان سب باتوں کے علاوہ بچے کسی ایک ہی ذہن کی برتری کو بھی اچھی نگاہوں سے نہیں دیکھ سکتے، اور تمام حالات سے عہدہ برآ ہونے اور کامیابی کی شاہراہ پر گامزن ہونے کے لیے قوتِ ارادی، ایک مضبوط اور توانا قوتِ ارادی پیدا کیے بغیر معلم کے لیے اور کوئی چارہ کار نہیں۔

(۳) **نرمی وشفقت**:۔ کامیاب تدریس میں ضروری ہے کہ شاگرد یہ محسوس کریں کہ استاد خلوصِ دل سے ان کی مدد کرنا چاہتا ہے۔ انھیں اس بات کا پورا پورا یقین ہونا چاہیے کہ استاد ان کی خامیوں کی اصلاح کرکے انھیں پہلے سے بہتر بنانا چاہتا ہے۔ وہ اُن کے بڑھنے، پھلنے اور پھولنے سے خوش ہوتا اور ان کی غلطیوں اور کوتاہیوں سے اس کو

افسوس اور دُکھ ہوتا ہے۔ اُن کی کامیابی اور کامرانی سے اس کا جی خوش ہوتا ہے، اور ان کی دقتوں میں ان کا سب سے بڑا ہمدرد ہے۔ ہر معلم اپنے عمل سے بچوں کو اس قسم کا یقین دلا سکتا ہے کہ وہ اُس کے متعلق اس طرح کے تصورات رکھنے لگیں، ورنہ جہاں بچوں کے ذہن میں یہ خیال بیٹھ جائے کہ استاد اُن کی بہتری و فلاح کا متمنی نہیں اور نہ ہی اُنکی کامیابیوں اور ناکامیوں سے اُسے کوئی سروکار ہے، تو پھر ان کی زندگیوں پر شاید کوئی بھی کامیاب اثر نہیں ڈالا جاسکتا۔

(باقی دارد)

معاشرے میں مدرس کا مقام

شاہد اشرف

یہ شکایت عام ہے کہ ہمارا معاشرہ مدرس کو اس کا موزوں مقام نہیں دیتا، اور جب تک یہ نہ ہو ہمارے نظامِ تعلیم کی خامیاں کبھی دور نہیں ہو سکتیں۔ شروع شروع میں یہ شکایت تعلیمی حلقوں تک ہی محدود تھی، مگر آج کیفیت یہ ہے کہ ملک بھر کے اخبارات و رسائل میں اس شکایت کا چرچا ہے، اور ہر کس و ناکس اس اہم قومی مسئلہ پر رائے زنی کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ عوام کو گلہ ہے کہ وہ بلند ذہنی اور اخلاقی معیار جو پہلے مدرسین کا طرۂ امتیاز ہوا کرتے تھے مسلسل روبہ انحطاط ہیں۔ ادھر مدرسین کی انجمنوں کا کہنا یہ ہے کہ مدرس کے مادی معاوضہ کی شرح اب اس حد تک پست ہو چکی ہے کہ یہ پیشہ جو کسی زمانے میں قوم کے بہترین دماغوں کو اپنی طرف کھینچا کرتا تھا، اب صرف ہر دروازے سے ٹھکرائے ہوئے لوگوں کی آخری جائے پناہ بن کر رہ گیا ہے۔

حال ہی میں پاکستان کی بعض صوبائی حکومتوں نے اساتذہ کی تنخواہوں پر نظرِ ثانی کر کے ان میں ایک کافی حد تک اضافہ کیا ہے۔ ان نئے گریڈوں کے متعلق گو یہ کہنا تو دشوار ہے کہ وہ قوم کے بہترین دماغوں کو پیشۂ معلمی کی طرف کھینچ لائیں گے تاہم ان سے اتنا ضرور ہو گیا ہے کہ اب ایک اوسط درجہ کے گریجوایٹ کے لیے محکمۂ تعلیم بھی کم از کم اتنی ہی جاذبیت رکھے گا جتنی کہ کوئی اور محکمہ۔

نتائجِ بعیدہ

اس میں شک نہیں کہ نتائجِ قریبہ کے اعتبار سے مادی معاوضہ کافی اہمیت رکھتا ہے۔ لیکن کیا محض اسی کے سہارے مدرس کو معاشرے میں ایک اونچا مقام مل سکتا ہے۔ بہت سے لوگ اس سوال کا جواب بلا تامل اثبات میں دیں گے۔ مگر حقیقت اس سے بہت مختلف ہے۔ ہمیں یہ بات کبھی نہ بھولنی چاہیے کہ محض اچھا مادی معاوضہ ہی کسی معاشرے میں بلند مقام کا ضامن نہیں ہو سکتا۔ ہر شخص کے ذہن میں فوراً کئی ایک ایسے پیشے آئیں گے جو مادی معاوضے کے لحاظ سے بڑے دلکش ہیں، مگر معاشرے میں انہیں کوئی بلند حیثیت حاصل نہیں۔ دراصل کسی پیشے کو اونچی سماجی حیثیت بخشنا اور اسے

برقرار رکھنا کلی طور پر رائے عامہ کا فعل ہے اور جب تک کوئی پیشہ رائے عامہ کو مسخر نہیں کر لیتا اسے کسی دیر پا بلند مقام کی امید نہ رکھنی چاہیے۔ یہاں لا محالہ یہ سوال پیدا ہوگا کہ کیا صرف مدرسوں کی تنخواہوں کے بڑھ جانے سے رائے عامہ انہیں کسی ارفع تر مقام کا حق دار خیال کرنے لگے گی؟ اس سوال کا جواب یقیناً نفی میں ہے۔ رائے عامہ کو جیتنے کے لیے فن تدریس میں انقلابی تبدیلیوں کی ضرورت ہوگی کیوں کہ ہماری تدریس خواہ لاکھ مؤثر ہو، جب تک عوام اس کی تاثیر اور اس کی افادیت کو اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھ لیتے، اس وقت تک مدرس کے لیے ان کے دلوں میں کوئی گہرا جذبۂ احترام پیدا نہیں ہو سکتا پس یہ امر بالکل ظاہر ہے کہ نتائج بعیدہ کے لحاظ سے ہم صرف اضافہ تنخواہ پر ہی قناعت نہیں کر سکتے۔

عدلیہ کا ایک اہم اصول

اس نکتہ کی وضاحت کے لیے عدلیہ کا ایک اہم اصول مفید ثابت ہوگا۔ یہ اہم اصول یہ ہے کہ عدلیہ کے لیے صرف اتنا ہی کافی نہیں کہ انصاف کرے، بلکہ اس کے ساتھ ہی یہ بھی ضروری ہے کہ یہ انصاف لوگوں کو نظر بھی آئے۔ اگر کوئی عدالت عوام الناس سے بالکل کٹ کر آنکھیں بند کیے ہوئے، عدل و انصاف کے ساتھ فیصلے صادر کرتی جائے تو گو وہ عدالت اپنے دل میں لاکھ مطمئن ہو، مگر قانون اور انصاف کا مقصد کلی طور پر پورا نہ ہوگا۔ صحیح مقصد اسی صورت میں پورا ہو سکے گا کہ عام لوگوں کو بھی عدالت کی حق گستری کا یقین ہو۔ قریباً قریباً یہی حال عمل تدریس کا ہے۔ ہمارے مدرس خواہ کتنے ہی محنتی اور پُر خلوص کیوں نہ ہوں جب تک عوام ان کے کام کو اپنی آنکھوں سے مشاہدہ نہیں کرتے، انھیں نہ تو اس کام کی مشکلات کا کوئی صحیح احساس ہو سکتا ہے اور نہ ہی اس کی افادیت کا۔ پس مدرسین کو صرف مدرسوں میں پڑھانے پر ہی اکتفا نہ کرنا چاہیے، بلکہ اس کے ساتھ ہی ساتھ عوام میں اس تدریس کو جانچنے کا شعور بھی پیدا کرنا چاہیے۔ نتائج بعیدہ کے اعتبار سے کام کا دوسرا جزو از بس اہم ہے۔

جدید جمہوری تقاضے

اکثر مدرسین سلاطین اسلام اور بالخصوص ہارون اور مامون کی علم دوستی اور معلم نوازی پر سر دھننے کے عادی ہیں، اور بڑی حسرت سے کہا کرتے ہیں کہ کاش دنیا کی سب سے بڑی اسلامی حکومت کو بھی شاہان سلف سے سبق سیکھنے کی توفیق نصیب ہو، یہ خواہش بالکل قدرتی ہے، مگر ہمارے یہ دوست اس معاملے میں ایک اہم چیز کو نظر انداز کر جاتے ہیں۔ خلافت راشدہ کے بعد دنیائے اسلام میں سیاسی اقتدار ہر جگہ خاندانی وراثت قرار پایا۔ اور شخصی حکومت ہو،

جہاں ہزاروں عیب تھے، وہاں چند خوبیاں بھی تھیں۔ ان میں سے ایک خوبی یہ تھی کہ اکثر اوقات تخت و تاج کا وارث ایک تربیت یافتہ فکر اور ایک بالغ و دقیق نگاہ سامنے لے کر آتا تھا، اور یہی چیز علم و فضل کی قدر دانی کی ضامن ہوتی تھی۔ آج کیفیت بالکل مختلف ہے۔ ہمارے ہاں سیاسی اقتدار کسی خاندان کی اجارہ داری نہیں۔ آج پاکستان کے اصل حکمران پاکستانی عوام ہیں، اور جب تک عوام کی نگاہ کسی خوبی اور اس کے حسن سے آشنا نہیں ہو جاتی، اس وقت تک اس سے سرپرستی اور حوصلہ افزائی کی امید کرنا عبث ہے۔ لہٰذا بجائے اس کے کہ ہم کسی ہارون الرشید یا مامون کے برسر اقتدار آنے کی آس لگائے رکھیں۔ ہمیں چاہیے کہ عوام کو عمل تدریس کے قریب سے دیکھنے کے مواقع بہم پہنچائیں۔ تاکہ ہمارے جمہوری معاشرے کے اصل حکمران ہمارے کام کی نوعیت اور اس کی اہمیت سے آگاہ ہو سکیں۔

چند دوسرے پیشوں سے موازنہ

کوئی شخص خواہ پڑھا لکھا ہو یا ان پڑھ ایک ڈاکٹر کے احترام میں پس و پیش نہیں کرے گا۔ آخر کیوں، صرف اس لیے کہ ہر آدمی نے بیسیوں دفعہ اپنی آنکھوں سے ڈاکٹروں کو شفاخانوں میں، اپنی دوکانوں پر اور لوگوں کے گھروں میں بیماروں کا علاج کرتے دیکھا ہے۔ انھوں نے دیکھا ہے کہ کس طرح پیچیدہ امراض میں مبتلا اور کراہتے ہوئے مریض ان کے ہاں سے شفایاب ہو کر جاتے ہیں۔ اکثر لوگوں نے بڑے بڑے خطرناک اپریشن اپنی آنکھوں کے سامنے ہوتے دیکھے ہیں اور جنھوں نے خود نہیں دیکھے انہوں نے عینی شاہدوں سے ان کا حال سنا ہے، دوسرے لفظوں میں یوں سمجھیے کہ طبی پیشہ عوام کی زندگی سے اس قدر قریب ہے کہ لوگ اس کی مشکلات اور اس کی افادیت کو اچھی طرح دیکھتے ہیں، اور یہی چیز بڑی حد تک اس پیشہ کی سربلندی کی موجب ہے۔

تقریباً یہی حال وکالت کا ہے۔ اکثر لوگوں کو یہ بات اچھی طرح معلوم ہے کہ کس طرح ایک نکتہ رس وکیل کے بروقت مشورہ نے ایک آدمی کو بھاری نقصان سے بچا لیا۔ ان پڑھ دیہاتی ہر روز عدالتوں میں وکیلوں کو بحث کرتے اور جرح کرتے سنتے ہیں۔ پڑھے لکھے عوام اخبارات میں مقدموں کی روئدادیں پڑھتے ہیں، ان تمام وسائل کے ذریعے وکالت کا پیشہ عوام کو اپنی افادیت کا قوی احساس دلاتا ہے، اور اس طرح معاشرے میں اپنے لیے ایک باوقار مقام پیدا کرتا ہے۔

قریباً قریباً یہی حال انجینئروں کا ہے۔ تعمیر عامہ کے جدید منصوبے جو انجینئروں کے دماغوں کی ہی اختراع

ہوتے ہیں، منظرِ عام پر آتے ہیں اور کافی عرصہ تک موضوعِ بحث بنے رہتے ہیں۔ پھر یہ منصوبے لوگوں کی نظروں کے سامنے عملی جامہ پہنتے ہیں، اور بالآخر ٹھوس۔ پُر ہیبت اور عظیم الشان عمارتوں۔ پلوں۔ نہروں۔ سڑکوں اور ریلوں کی شکل میں قومی دولت کا ایک قیمتی حصہ بن جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ عوام کو انجینیروں کے کام کی افادیت اور اس کی اہمیت کا اندازہ کرنے میں کبھی دقت پیش نہیں آتی۔

عملِ تدریس کے موجودہ خصائص

بادی النظر میں گو یہ بات عجیب معلوم ہو، مگر حقیقت یہ ہے کہ بہت کم لوگوں کو اس امر کا اتفاق ہوتا ہے کہ مدرس کو پڑھاتے ہوئے دیکھیں جس طرح وہ ایک ڈاکٹر کو یا ایک وکیل کو اپنے کام میں منہمک دیکھ سکتے ہیں، اس طرح وہ ایک مدرس کو غالباً بہت شاذ دیکھتے ہیں۔ اول تو بہت کم والدین یا دوسرے لوگ مدرسوں کا رُخ کرتے ہیں اور جب کبھی انھیں جانے کا اتفاق ہو بھی تو ان کی غایت کچھ ایسی ہوتی ہے جس سے تدریس کو کچھ واسطہ نہیں ہوتا اور اگر کوئی شخص دورانِ تدریس میں کمرۂ جماعت میں آ بھی جائے تو دستور یہی ہے کہ استاد تدریس کو چھوڑ کر اس کی طرف متوجہ ہو گا، اور جب تک اس سے فارغ نہ ہو لے گا تدریس کی طرف نہیں لوٹے گا۔

اس صورتِ حال کا نتیجہ یہ ہے کہ ایک استاد کی تدریسی زندگی کا بیشتر حصہ کامل تنہائی میں گذرتا ہے جب وہ سبق پڑھاتا ہے تو سوائے اس کے اور اس کے شاگردوں کے کوئی اور شخص کمرۂ جماعت میں موجود نہیں ہوتا۔ اور اکثر اساتذہ اس تدریسی تنہائی کے اس حد تک خوگر ہو جاتے ہیں کہ کبھی صدر معلم یا کوئی افسر معائنہ دورانِ تدریس میں ان کے کمرے میں آ جائے تو ان کے لیے اوسان بحال رکھنا مشکل ہو جاتا ہے۔

موجودہ صورتِ حال کے نتائج

متذکرہ صدر صورتِ حال کا سب سے اہم نتیجہ یہ ہے کہ عملِ تدریس کے حسن و قبح کی تمیز سرے سے غائب ہے۔ جو لوگ بُرا پڑھانے والے ہیں وہ مدت العمر جوں کے توں چلے جاتے ہیں کیوں کہ ان کی اصلاح کے امکانات اسی روز ختم ہو گئے تھے جس روز انھوں نے بطور مدرس کسی مدرسہ میں قدم رکھا تھا، اس کے برعکس وہ مدرس جو غیر معمولی تدریسی صلاحیت کے مالک ہوتے ہیں، یہ خداداد جوہر بھی ہمیشہ قدر شناسی سے محروم رہتا ہے۔ پس لامحالہ وہ اپنی ترقی کے لیے دوسرے راستے ڈھونڈتے ہیں۔ مثلاً مقالہ نگاری، علمی ادبی مجلسوں اور تحریک سکاؤٹ میں سرگرم حصہ، یونیورسٹی کے

امتحانات میں اچھے نتائج دکھانا وغیرہ، یہ سرگرمیاں بذات خود لائق ستائش سہی لیکن مصیبت یہ ہے کہ استاد کا اصل کام ان سے یکسر جداگانہ ہے، اور یہ چیزیں اس کا بدل قرار نہیں دی جا سکتیں۔

اس افسوس ناک صورت حال کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ ہمارے ہاں جو استاد بھی عوام میں کوئی مقام پیدا کرتا ہے وہ بطور معلم کے ایسا نہیں کرتا۔ لوگ اس کے تدریسی محاسن سے متعلق آگاہ نہیں ہو سکتے۔ وہ بطور ایک اچھے مقرر، ایک اچھے مقالہ نگار، ایک خوش گو شاعر یا ایک سرگرم سکاؤٹ ماسٹر یا ایک اچھا نتیجہ دکھانے والے کے طور پر تو مقبول ہو سکتا ہے، مگر بطور ایک اچھے پڑھانے والے کے اس کو بہت کم لوگ جانتے ہیں، جب صورت حال یہ ہو تو پھر عوامی زندگی میں مدرس کو کسی پائدار سربلندی حاصل کرنے کے مواقع کیا ہو سکتے ہیں۔

راقم الحروف کو خود ایک صدر معلم کا اچھی طرح علم ہے جو سٹاف کے جلسوں میں اکثر کہا کرتے تھے کہ جو اساتذہ اچھا پڑھانے والے ہیں انھیں محض اس بنا پر مجھ سے کسی مراعات کی امید نہ رکھنی چاہیے، یہ ان کا فرض منصبی ہے، جو انھیں بہر حال انجام دینا ہے۔ میں خاص رعایت صرف انہی لوگوں کی کروں گا جو پڑھانے کے علاوہ میرے لیے بھی کچھ کام کریں۔ چناں چہ ان کے ہاں قرب انہی لوگوں کے لیے مخصوص تھا جو تدریس کو پس پشت ڈال کر دن رات ان کے نجی کاموں میں لگے رہتے تھے، جب عمل تدریس سے جو ایک مدرس کا حقیقی کام ہے اس حد تک بے اعتنائی برتی جائے تو پھر بھلا معاشرے میں مدرس کو کوئی بلند مقام نصیب ہو تو کیوں کر؟

معاملہ کا ایک افسوس ناک پہلو

غرض مدرس کی تدریسی زندگی باقی دنیا سے اس قدر الگ تھلگ زندگی ہے کہ اس میں اور تو اور خود اس کے رفقائے کار کا گزر بھی ہونے نہیں پاتا۔ ایک مدرس کے کام پر نقد و تبصرہ کا زمانہ اس کی تربیتی درس گاہ کے زمانے کے ساتھ ہی ختم ہو جاتا ہے۔ جوں ہی اس نے بطور ایک باقاعدہ مدرس کے اپنا کام سنبھالا، اس کی تدریسی زندگی ایک ایسی راہبانہ تنہائی کی خوگر بن کر رہ جاتی ہے جس کی حد میں قدم رکھنا گویا اس کی شخصی آزادی پر حملہ کے مترادف سمجھا جاتا ہے۔ مدرسہ کے نظام اوقات میں کوئی ایسی گنجائش موجود نہیں ہوتی کہ اساتذہ ایک دوسرے کے اسباق کا مشاہدہ کر کے انداز تفہیم کے طریق سے استفادہ کر سکیں۔ اساتذہ اپنے ہم کاروں کے متعلق جو رائے قائم کرتے ہیں اس کا مدار کلی طور پر ان اطلاعات پر ہوتا ہے جو اتفاقیہ طور پر طلبہ کی وساطت سے ان تک پہنچتی ہیں یا ان چند جلسوں پر ہوتا ہے

جو کبھی کبھار کمرہ جماعت کے سامنے سے گزرتے وقت ان کے کانوں میں پڑ جاتے ہیں۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ نہ صرف مدرسین ایک دوسرے کے تدریسی محاسن سے کچھ اخذ کرنے کے مواقع سے محروم رہتے ہیں بلکہ وہ بسا اوقات اپنے رفقائے کار کے متعلق ایسے قیاسات بھی قائم کر لیتے ہیں جو سرتاپا غلط ہوتے ہیں اور جن سے کئی ایک غلط فہمیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔

صدر معلم کے فرائض میں سے غالباً ایک یہ بھی ہے کہ وہ وقتاً فوقتاً اساتذہ کے اسباق کو دیکھا کرے اور طلبہ کی میں انھیں قابل اصلاح خامیوں سے آگاہ کرے، مگر عملاً کتنے صدر معلم ایسے ہیں جو اس فریضہ کو سرانجام دیتے ہیں؟ راقم الحروف نے جس صدر معلم کا ذکر پہلے کیا ہے ان کا شیوہ تھا کہ اسباق کا ملاحظہ کرنے کے لیے صرف انھیں مدرسوں کو چنا کرتے تھے جن کے ساتھ انھیں کوئی خاص پرخاش ہو، اور پھر ان کے کام پر تنقید بھی اس قسم کی کرتے تھے جسے حقیقت سے دور کا واسطہ بھی نہ ہوتا تھا بلکہ وہ سراسر انتقامی جذبہ سے لبریز ہوتی تھی۔ اس کے برعکس اپنے منظورِ نظر دوستوں کے کمروں میں وہ کبھی قدم تک نہ دھرتے تھے، بلکہ طلبہ کی طرف سے اس مطلب کی تحریری درخواستیں موصول ہونے پر بھی کہ فلاں استاد تدریسی کام سے پرلے درجے کی بے اعتنائی برتتے ہیں ان کی حس محاسبہ بیدار نہ ہوتی تھی۔ ظاہر ہے کہ یہ صورت حال تدریسی کمالات کے لیے زہر ہلاہل سے کم نہیں۔

ایک غلط فہمی کا ازالہ

کئی ذہنوں میں شاید یہ شک پیدا ہو کہ یہ مفروضہ کہ عوام الناس عمل تدریس کے متعلق کوئی صحیح اور واضح معلومات نہیں رکھتے درست نہیں، کیوں کہ اول تو تمام پڑھے لکھے لوگوں کو خود اپنا طالب علمی کا زمانہ یاد ہوتا ہے۔ اور دوسرا یہ کہ تمام پڑھنے والے بچے گھروں میں جا کر اپنے مدرسوں کے متعلق باتیں کیا کرتے ہیں، اور اس طریق سے بھی والدین اور سرپرستوں کو مدرسین کے طریق تدریس کے متعلق واقفیت حاصل ہوتی رہتی ہے۔

معمولی واقفیت کی یہ دونوں صورتیں بظاہر قابل اعتماد نظر آتی ہیں، لیکن کیا وہ فی الحقیقت قابل اعتنا ہیں! یہ ٹھیک ہے کہ ہم میں سے ہر ایک کو اپنا طالب علمی کا زمانہ اکثر یاد رہتا ہے۔ لیکن اس کا جو تصور ہمارے اذہان میں باقی ہوتا ہے کیا وہ اس کے صحیح خدوخال کی ترجمانی کرتا ہے؟ بچپن اور آغاز بلوغت کے زمانے ذہنی عدم پختگی کے زمانے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ سن رشد کے ساتھ جب نگاہ میں پختگی آنے لگتی ہے، تو بچپن کی تمام دلچسپیاں ایک مضحکہ خیز رنگ میں جلوہ گر نظر آتی ہیں۔ پس بچپن کے تاثرات کو بنا قرار دے کر جس چیز کے متعلق بھی کوئی رائے

قائم کی جائے گی وہ رائے غالباً کبھی زیادہ وقیع نہیں ہو گی۔ بالکل یہی حال اس رائے کا ہے جو بچوں سے سنی سنائی باتوں پر قائم کی جائے۔ اول تو بچے تدریسی محاسن کو سمجھنے اور ان کا سواد دکرنے کی صلاحیت ہی نہیں رکھتے۔ پھر اس پر طرّہ یہ کہ جو باتیں بالعموم ان کی نگاہوں کو جذب کرنے والی ہوتی ہیں، وہ اُستاد کی خلاف معمول اور عجیب و غریب حرکات ہوتی ہیں نہ کہ اس کے فنی کمالات۔ بچے اکثر انھیں دل چسپ لطیفوں کو مزے لے لے ایک دوسرے سے بیان کرتے ہیں اور گھروں پر بھی دہراتے ہیں۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ بچے استاد کے حسن سلوک اور اس کے اچھے اوصاف سے متاثر نہیں ہوتے۔ بلکہ یہاں صرف یہ جتلانا مقصود ہے کہ یہ چیزیں انھیں اس طرح نمایاں طور پر اُبھری ہوئی نظر نہیں آتیں کہ وہ انھیں خصوصیت کے ساتھ دوسروں کے سامنے بیان کریں۔

اِصلاحِ حال کے ذرائع

غرض نتائج بعیدہ کے اعتبار سے پیشۂ معلمی کی سب سے بڑی بدنصیبی یہ ہے کہ عمل تدریس کے متعلق لوگوں کو درست اور بلا واسطہ واقفیت کے ذرائع میسر نہیں، اگر مدرسین یہ چاہتے ہیں کہ طب اور وکالت کی طرح ان کے پیشے کو بھی معاشرے میں مستقل طور پر ایک ممتاز مقام حاصل ہو تو انھیں فن تدریس کو اس دوہری بدنصیبی سے نجات دلانا ہوگی۔ آج کیفیت یہ ہے کہ عام جلسوں، مدرسوں کی تقریبوں، میونسپل بورڈ یا ڈسٹرکٹ بورڈ کے جلسوں، غرضیکہ ہر قسم کے رسمی یا غیر رسمی اجتماعات میں استاد کا جو تصور مقررین کے ذہنوں میں ہوتا ہے، وہ حقیقت سے عموماً بہت مختلف ہوتا ہے اور ایسا کیوں کر نہ ہو کیوں کہ اس تصور کے خدوخال یا تو بچپن کے تاثرات سے اخذ کیے گئے ہوتے ہیں اور یا غیر ثقہ روایتوں سے جمع کیے گئے ہوتے ہیں۔ اس مصیبت کا علاج رائے عامہ میں انقلاب کے سوا، اور کچھ نہیں۔ خواہ اس انقلاب کو پیدا کرنے میں کتنا ہی عرصہ کیوں نہ لگے۔ یہاں قدرتی طور پر یہ سوال پیدا ہوگا، کہ اس قسم کا انقلاب پیدا کرنے کی عملی ترکیب کیا ہونی چاہیے۔ یہ مسئلہ خاصہ بحث طلب ہے۔ تاہم مندرجہ ذیل اقدامات اس سلسلے میں بہت مفید ثابت ہوں گے۔

(۱) کسی نہ کسی صورت میں عوام کو یہ اجازت ہونی چاہیے کہ جب جی چاہے مدرسوں میں آئیں اور کمرۂ جماعت میں بیٹھ کر عملی تدریس کا مشاہدہ کریں۔ آج کل ہمارے مدارس میں طلبہ کی جو بھیڑ ہے، اس کو دیکھتے ہوئے یہ مشورہ ناقابلِ عمل نظر آنے لگا کیوں کہ جہاں کمرہ جماعت میں ہجوم کا یہ عالم ہو کہ بے چارہ استاد بھی معقول کے

درمیان چل پھر نہ سکے، وہاں کسی بیرونی اشخاص کے بیٹھنے کے لیے جگہ نکالنا محال ہے۔ تاہم ہمیں امید رکھنی چاہیے کہ موجودہ صورت حال بالکل ہنگامی ہے۔ اس کے ساتھ ہی یہ نکتہ بھی قابل لحاظ ہے کہ اصل چیز بیرونی اشخاص کے لیے بیٹھنے کی سہولتیں نہیں بلکہ اس اصول کا تسلیم کرنا ہے کہ والدین یا جائز سرپرست جب چاہیں مدرسہ میں آکر اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کر سکیں کہ ان کے بچوں کی تعلیم و تربیت کس طریق پر ہو رہی ہے۔

(۲) مدرسوں کی طرف سے اکثر ایسی نمائشوں اور دوسری تقریبوں کا اہتمام ہونا چاہیے۔ جن میں عوام زیادہ سے زیادہ شریک ہو سکیں۔ تاکہ انھیں مدرسہ کی زندگی کو قریب سے دیکھنے کے مواقع ملتے رہیں، اور اس طرح وہ اس کی سرگرمیوں میں دلچسپی لینے کے خوگر ہو جائیں۔

(۳) والدین اور اساتذہ کی مشترکہ انجمنیں قائم کر کے انھیں ہردل عزیز بنانا چاہیے۔ اور ان کا دائرہ عمل اس حد تک وسیع کر دینا چاہیے کہ ہر آئندہ ہفتہ کا تعلیمی لائحہ عمل پہلے ان انجمنوں کے سامنے پیش ہو، اور پھر اس پر عمل شروع کیا جائے۔ تاکہ مدرسہ کا تعلیمی بندوبست بالکل انھی بنیادوں پر قائم ہو جائے جن پر مشترکہ صنعتی ادارے کام کر رہے ہیں۔

(۴) انتظامی حکام اور بالخصوص صدر معلم کو اس بات کا اہتمام کرنا چاہیے کہ نہ صرف ایک سکول کے مدرسین بلکہ تمام مقامی سکولوں کے اساتذہ ایک دوسرے کے تدریسی کام کو آزادانہ دیکھ سکیں۔ اس جذبے کا سرے سے خاتمہ کر دینا چاہیے کہ کمرۂ جماعت میں استاد ایک مطلق العنان آمر کی حیثیت رکھتا ہے اور کسی کو مجال نہیں کہ اس کے اس خلوت کدہ میں قدم دھرے۔ غالباً اس جذبے نے پیشۂ معلمی کے وقار کو سب سے بڑا صدمہ پہنچایا ہے، اور اب بدلے ہوئے حالات میں اس مذموم روایت کا زندہ رہنا اس فن کے لیے ایک مستقل خطرہ ہے جس کا جلد از جلد خاتمہ ہو جانا چاہیے۔

خاتمہ کلام

شاید بعض اصحاب یہ اعتراض کریں کہ تدریس ایک نازک ذہنی عمل ہے جو پُر تاثیر ہونے کے لیے ایک سرگرم جذبۂ عمل اور بے پناہ خلوص کا مطالبہ کرتا ہے، اور خطرہ یہ ہے کہ یہ لطیف جذبات خطرِ علم کی تاب نہ لا سکیں گے اور ان کی جگہ محض نمائش اور ظاہر داری لے لے گی اور اس طرح بجائے فائدہ کے الٹا نقصان پہنچے گا۔ اس میں

۔اس اعتراض میں کافی وزن موجود ہے۔ لیکن جیسا پہلے بیان کیا جا چکا ہے، ایک طبیب، ایک وکیل یا ایک انجینئر کا جذبۂ عمل اور جذبۂ خلوص منظرِ عام پر آنے سے مدھم پڑنے کی بجائے اور زیادہ چمک اٹھتا ہے۔ ہمارے ہاں یہ کھٹکا محض اس لیے دکھائی دیتا ہے کہ ہم صدیوں سے تنہائی کی روایات کے عادی ہیں۔ تاہم محض روایات کسی مفید اصلاح کے راستے میں دیر تک حائل نہیں رہ سکتیں، پھر اس کے ساتھ ہی یہ امر بھی قابلِ لحاظ ہے کہ جوں جوں رائے عامّہ فنِ تدریس کو زیادہ گہری ناقدانہ نگاہ سے دیکھنے کے قابل ہوتی جائے گی، نمائش اور خلوص میں امتیاز کرنا آسان ہوتا جائے گا۔ اسی طرح خود مدرسین بھی بہت جلد اپنے آپ کو نئے تقاضوں کے مطابق ڈھالنے پر مجبور پائیں گے کیوں کہ انھیں صاف نظر آنے لگے گا کہ ان کی کامیابی محض ٹھوس کام پر ہی نہیں بلکہ عوام کو اس ٹھوس کام کا یقین دلانے پر بھی ہے۔

آخر میں اس نکتہ کی دوبارہ وضاحت کی جاتی ہے کہ اوپر کی بحث میں صرف نتائج بعیدہ کو پیشِ نظر رکھا گیا ہے اگر فنِ تدریس کو معاشرے میں ایک پائدار وقار حاصل کرنا ہے تو اس کے لیے ضروری ہے کہ عوام کو اس فن سے قریب تر لایا جائے۔ اس جمہوری دور میں اس کے سوا کوئی چارہ نہیں ٭

ابتدائی جماعتوں میں لکھائی

انور علی قریشی

ابتدائی جماعتوں میں پڑھنا سکھانے کے ساتھ ہی جماعت اول سے ہی لکھائی کی طرف بھی توجہ ہونی چاہیے۔ لکھائی کے سامان مثلاً قلم، دوات، تختی کی دیکھ بھال کرنی چاہیے، کیوں کہ اکثر مدرسین ان چیزوں کی طرف توجہ نہیں دیتے کیوں کہ بعض مدرسین کو تو قلم ہی نہیں بنانی آتی اور بعض لکھائی کے اصولوں سے بھی ناواقف ہوتے ہیں جس سے طلبہ میں خوش خطی کا ملکہ پیدا نہیں ہوتا۔ قلم گھسا ہوا، اور ٹوٹا ہوا نوک والا ہوتا ہے جس سے قلم کا قط ٹھیک نہیں ہوتا۔ جب بچے ایسی قلم سے لکھتے رہتے ہیں تو ان کی لکھائی بدخط ہو جاتی ہے جو کبھی بھی درست ہونے میں نہیں آتی۔

لکھنا شروع کرانے سے پہلے تمام طلبہ کی قلموں کو دیکھا جائے جس کی قلم خراب ہو اس کی نئی قلم بنا دی جائے۔ بہتر تو یہی ہے کہ تمام طلبہ کو ہر روز نئی قلمیں بنا کر دی جائیں، میں نے کام خود کر کے دیکھا ہے جو چند منٹ میں ہو جاتا ہے جب طلبہ ہر روز نئی قلموں سے لکھیں گے تو چند مہینوں میں ان کی لکھائی نہایت خوش خط ہو جائے گی۔

دوات کی حالت قلم سے بھی خراب اور بدتر میرے دیکھنے میں آئی ہے، مٹی کی کچی دواتیں چھوٹے چینیدے کی بعض کی سیاہی اس قدر گاڑھی کہ قلم کی زبان سیاہی سے لت پت ہو جاتی ہے اور بعض کی اس قدر پتلی کہ بچے قلم چھڑک چھڑک کر فرش ٹاٹ اور کپڑے خراب کر دیتے ہیں بعض طلبہ کی دواتوں میں صوف نہیں ہوتا، اور جن کی دواتوں میں صوف ہوتا ہے تو وہ ایسے خراب اور پرانے کپڑے کا کہ ہر بار سیاہی میں قلم لگاتے وقت دو دھاگے نہیں تو ایک دھاگہ ضرور قلم کے شگاف میں پھنس جاتا ہے اور گھسٹتا ہوا دوات سے تختی تک چلا آتا ہے، جب مجھے اندازہ ہوا، تو میں نے جماعت کے تمام بچوں کو ایک دفعہ سمجھا دیا کہ سیاہی نہ گاڑھی ہو، نہ پتلی، بلکہ رواں ہو، دوات لکھنے والے کے دائیں طرف ہو۔ کیوں کہ اکثر بچے دواتوں کو سامنے یا بائیں طرف بھی رکھ لیتے تھے۔ قلم دوات میں ڈبو کر نہ چھڑکو۔ قلم کو اتنی سیاہی لگاؤ جتنی ضرورت ہے۔ تاکہ فرش اور ٹاٹ پر چھینٹیں نہ پڑیں۔ اس طرح کی ہدایات دیتے رہنے سے بچے چند دنوں میں ان اصولوں پر کاربند ہو گئے۔ جس سے میرے کمرے کا فرش اور ٹاٹ صاف ستھرا رہنے لگے۔ بچوں کو تختیوں پر گاچنی لگانے کا طریقہ

بھی بتانا چاہیے۔ کیوں کہ بعض بچے تختی پر گاچنی کی اس قدر موٹی تہ جما لیتے ہیں کہ قلم چلنا دشوار ہو جاتا ہے۔

جب بچے لکھنے کے لیے بیٹھیں، تو دائیاں گھٹنہ کھڑا کر کے اور بائیاں گھٹنہ زمین پر ٹیک کر بیٹھیں۔ اس سے ریڑھ کی ہڈی سیدھی رہنے کی وجہ سے بچے زیادہ دیر تک آرام سے لکھ سکیں گے۔ تختی اور نظر کا درمیانی فاصلہ ایک فٹ کا ہونا چاہیے، اور اس بات کا خیال رکھنا بھی ضروری ہے کہ روشنی پیچھے سے یا بائیں جانب سے آتی ہو۔ اس سے نظر کمزور نہیں ہوگی۔ بچے جھک کر نہ لکھیں، بلکہ چھاتی سیدھی اور تنی ہوئی ہو۔ اگر بچوں کو بیٹھ کر لکھنے کا ذکر بالا طریقہ نہ بتایا جائیگا تو بعض بچے چوکڑی لگا کر بعض دونوں گھٹنے کھڑے کر کے اور کئی ٹانگیں پھیلا کر لکھیں گے، جس سے ان کی لکھائی ٹھیک نہ ہوگی۔

بچوں کو پہلے قلم پکڑنے کا نمونہ دیا جائے اور بعد میں لڑکے قلمیں لکھنے کے لیے پکڑیں، اور استاد جماعت کے تمام بچوں کی پکڑی ہوئی قلمیں دیکھے، بعد میں طلبہ لکھنا شروع کریں، جس کا طریق یہ ہے۔

بچوں کو جو حروف یا الفاظ صبح کو استاد نے پڑھائے ہیں، انہیں استاد موٹی قلم سے خوش خط لکھ دے، جب وہ لکھے ہوئے حروف خشک ہو جائیں تو بچوں سے ان حروف پر خشک قلم (بغیر سیاہی) سے لکھنے کے لیے کہے، اور خود استاد جماعت میں پھر کر نگرانی کرے، تاکہ تمام بچے ان حروفوں پر قلم پھیرتے رہیں، اور جو بچہ غلط طریق سے قلم پھیر رہا ہو، اس کا فوراً اصلاح کر دے۔ اگر استاد نگرانی نہیں کرے گا تو کئی بچے حروف پر قلم دائیں جانب کی بجائے بائیں طرف سے اور نیچے کی بجائے اوپر سے لکھنا شروع کر دیں گے، جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ حروف کی بناوٹ کی حرکات بچے کے دماغ میں پختہ نہیں ہوگا اور تمام حروف پر اس قدر پھیروائی جائے کہ حروف کی سیاہی اتر جائے۔ بچے ان حروفوں کی سیاہی قلم سے کرید کر نہ اتاریں اور نہ قلم اس قدر دبا کر پھیریں کہ قلم ٹوٹ جائے۔ زیادہ سے زیادہ دو دن میں سیاہی اتر جائے گی، اور تختیوں پر سفید سے خوشخط لکھے ہوئے حروف دکھائی دیں گے۔

دوسرا طریقہ یہ بھی ہے کہ جب بچے تختیاں دھو کر گاچنی لگا لیں تو گیلی تختیوں پر موٹی قلم سے بغیر سیاہی کے استاد حروفوں کو لکھ دے، جب تختیاں خشک ہو جائیں تو پھر لڑکوں کو ان سفید حروفوں پر قلم کو سیاہی لگا کر لکھنے کے لیے کہا جائے تو انہیں لکھائی کا ڈھنگ آ جائے گا۔ مگر پہلا طریقہ زیادہ اچھا ہے، کیوں کہ اس سے طلبہ کی خوش خطی بہت جلد ٹھیک ہو جائے گی۔ طلبہ کے لیے اس کے اصولوں کا سمجھنا بہت مشکل ہے۔ بعض استاد بھی ان اصولوں سے ناواقف ہیں۔

خواہ پڑھنا ہو یا لکھنا استاد کا نمونہ نہایت ضروری ہے اس لیے کہ بچوں میں تقلید کا مادہ ہوتا ہے۔ وہ جس طرح استاد کو کرتا ہوا دیکھیں گے اسی طرح کرنے کی کوشش کریں گے تو اس کے لیے استاد کو چاہیے کہ تختہ سیاہ پر تمام جماعت کے سامنے وہی لفظ جو اس نے تختیوں پر لکھ کر دیے ہیں، تختہ سیاہ پر ایک لکیر لگا کر وہ حروف لکھ دے۔ طلبہ کی توجہ حروف کی بناوٹ کی طرف دلائے، اور اچھی طرح ان کے ذہن نشین کرے تاکہ بچے غلط حرکت نہ کریں، جب بچوں کو ذرا لکھنا آ جائے تو بعد میں نقل نویسی شروع کر دی جائے۔

جب بچے قاعدے کا کچھ حصہ پڑھ چکیں تو اپنے اسباق کا صرف اتنا حصہ لکھیں جو ان کی تختی کی پہلی سطر میں آ سکے اس کے بعد استاد وہی حروف جو بچے نے پہلی سطر میں لکھے ہیں تختی پر دوسری سطر میں خوش خط لکھ دے۔ بعد میں لڑکا اپنی جگہ پر جا کر استاد کے لکھے ہوئے حروف دیکھ کر تختی پر باقی سطروں میں لکھے، اسی طرح تمام جماعت کو باری باری لکھ دیا جائے، جب تمام لڑکے اپنی تختیاں لکھ چکیں تو پھر بعد میں استاد اپنی لکھی ہوئی سطر کے حروفوں پر خشک قلم طلبہ سے ان حروفوں پر پھرائے تاکہ خوش خطی اور حروفوں کی بناوٹ کی حرکات کی اچھی طرح مشق ہو جائے۔

جب تمام طلبہ کو سکول بند کرتے وقت چھٹی دی جائے تو انہیں کہا جائے کہ ہر ایک بچہ اپنے گھر سے اس سبق کو تختی پر لکھ کر لائے، جو انہوں نے سکول میں لکھی ہے، اور اگلے روز سکول کھلتے ہی تمام بچوں کی گھر سے لکھی ہوئی تختیاں دیکھے، اس کام کے لیے بچوں کے پاس دو تختیاں ہونی چاہئیں۔ ایک تختی بچے گھر سے لکھ کر لائیں اور ایک سکول میں لکھیں، جو گھر سے صاف کر کے لائے ہیں۔ اس طرح گھر جا کر بچوں میں آوارگی پیدا نہیں ہوگی وہ گھر جا کر بھی اپنے تعلیمی کام میں مصروف رہتے ہیں۔

جب بچے قاعدے کا کچھ حصہ پڑھ چکے ہوں تو انہیں املا بھی لکھائی جا سکتی ہے، پڑھے ہوئے اسباق چھوٹے چھوٹے آسان فقرے لکھوائے جائیں جن کی تعداد بہت کم ہو، تاکہ لکھوانے میں بہت کم وقت صرف اور ان کی اصلاح کے لیے وقت بھی مل سکے، اور بعد میں طلبہ اپنی غلطیوں کی کافی مشق کر سکیں، املا لکھانے سے بچوں کی قطاریں سیدھی کر لی جائیں تاکہ بچے ایک دوسرے کی نقل نہ کر سکیں۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ بچوں کو سلیٹوں یا تختیوں پر پنسل سے لکھنے کی مشق کرانی چاہیے تاکہ بچوں کے کپڑے اور فرش سیاہی سے خراب نہ ہوں، یہ خیال بالکل غلط ہے، مگر انہیں یہ معلوم نہیں کہ خوش نویسی بچوں کا وہ خود

زیور ہے، جو ان کی ترقی میں مددگار ثابت ہو سکتا ہے، اور پنسل سے لکھائی کی مشق کرانا گویا بدخطی کو ترقی دینا ہے ۔

گو آج خوش خطی کی قدر نہیں، مگر پھر بھی فائدے سے خالی نہیں، کیوں کہ آج بھی خوش نویس طلبہ امتحان میں بدخط طلبہ سے زیادہ نمبر حاصل کر جاتے ہیں، اور جب امیدوار اپنے ہاتھ کی لکھی ہوئی درخواستیں دفتروں میں بھیجتے ہیں تو ان کے خط سے ان کی قابلیت کا کچھ نہ کچھ اندازہ لگایا جاتا ہے، خواہ وہ اردو میں لکھیں یا انگریزی میں۔

جماعت دوم میں املا نویسی کے لیے انہی پڑھے ہوئے سبق کا جو بہت چھوٹا پیرا ہو، اور آسان ہو طلبہ سے املا لکھایا جائے۔ نقل نویسی اور خوش خطی کا طریقہ وہی ہو جو جماعت اول میں بتایا گیا ہے، البتہ جماعت سوم، چہارم یا پنجم میں قدرے مشکل املا لکھائی جائے، کیوں کہ طلبہ لکھنے میں کچھ نہ کچھ ترقی کر چکے ہیں، ان کے لیے صرف پہلے یہ ہوتا ہے کہ پڑھے ہوئے سبق سے ایک پیرا منتخب کر دیا، اور لڑکے اس کو اچھی طرح دیکھ لیں، بعد میں وہی پیرا لکھوا دیا۔ سال کی دوسری سہ ماہی میں املا لکھوانے سے پہلے وہ عبارت طلبہ کے سامنے ایک دفعہ خود پڑھ کر سنا دو، اور بعد میں لکھوا دیا۔ مگر املا لکھوانے سے پہلے ان کی قطاریں سیدھی کر لی جائیں اور ان کے سامان کی پڑتال کر لینی چاہیے۔ پھر فقرے کے مناسب ٹکڑے صاف اور واضح الفاظ میں بول کر لکھوائے جائیں، اور انہیں بتا دیا جائے، کہ جب وہ بولے ہوئے الفاظ لکھیں تو استاد کی طرف دیکھیں۔ آخر میں پھر ساری عبارت ایک دفعہ پڑھ کر سنا دی جائے، کیوں کہ کئی بچے املا لکھتے وقت کئی لفظ لکھنے چھوڑ جاتے ہیں وہ اس طرح دوبارہ لکھ سکیں گے ۔

اس کے بعد غلطیاں درست کرنے کی باری آتی ہے۔ اس کے طریقے تو کئی ہیں، مگر بہتر طریقہ یہی ہے کہ لڑکوں کی تختیاں تبدیل کی جائیں اور وہ ایک دوسرے کی غلطیوں پر نشان لگائیں، اس میں وقت بہت کم خرچ ہوتا ہے، غلطیوں کی مشق کے لیے کافی وقت مل سکتا ہے، کبھی کبھی مدرس کو چاہیے کہ وہ خود ایک ایک لڑکے کی غلطیوں پر نشان لگائے اور ان کو درست کرے، اپنی مدد کے لیے دو تین ہوشیار طلبہ کو بھی لگا لے جن کی کوئی غلطی نہ ہو۔

اصلاح خواہ کسی طریقہ سے کی جائے، مدرس کی نگرانی کی بہت ضرورت ہے، اصلاح کے بعد درست کردہ الفاظ کی کافی مشق کرنا چاہیے، تاکہ درستی ذہن نشین ہو جائے ۔

مضمون نویسی تحریری کام ہے۔ پہلے زبانی گفتگو کرانا یا فقرات بنوانا نہایت ضروری ہے، تقریری کام کی طرح مضمون نویسی کی مشق بھی بتدریج ہونی چاہیے۔ نامکمل فقرات مکمل کرانا، چھوٹی چھوٹی کہانیاں لکھوانا، فقرات کا

ترتیب وار لکھنا وغیرہ، جب بچے اس قابل ہو جائیں کہ کسی موضوع پر مسلسل فقرات بالترتیب لکھ سکیں، تو پھر برسات کا سماں چشم دید واقعات لکھوائے جائیں۔ نامکمل کہانیاں مکمل کرائی جائیں۔ مضمون نویسی میں موزوں وقفے دینے کا طریقہ بھی بتایا جائے اور مختلف علامات ذہن نشین کرائی جائیں، مثلاً مکمل جملے کی علامات یا سوالیہ علامات؛ وغیرہ۔

مضمون نویسی کے علاوہ عام سادہ اور کاروباری خط لکھنا بتایا جائے۔ مختلف قسموں کے خطوط اور درخواستوں میں فرق بتایا جائے۔ بڑے بڑے القابات سے پرہیز کیا جائے۔ اس کے علاوہ، راہداری رسیدات کے لکھنے کے طریقے سے واقف کرایا جائے۔

مضمون نویسی کی کاپی ہر ایک لڑکے کے پاس ہونی چاہیے۔ جوں جوں مضامین یا خطوط لکھے جائیں، ان کا اندراج انڈکس میں کرایا جائے۔ بچوں کو حاشیہ چھوڑ کر خوش خط لکھنے کے لیے کہا جائے۔ بچوں کو گھر پر لکھنے کے لیے مضمون نہ دیا جائے، بلکہ اپنے سامنے لکھوایا جائے۔ اور لکھنے سے پہلے قلم دوات، کاپی کی پڑتال کی جائے۔ خطوط نویسی یا مضمون نویسی کی اصلاح طلبہ کے سامنے کرنی چاہیے۔

بچوں کی عام تعلیمی خامیاں

پرائمری مدارس میں تعلیمی کام کراتے وقت بچوں میں کچھ نقائص میرے دیکھنے میں آئے ہیں:-

(۱) بچوں کی تعلیمی کام میں لاپرواہی
(۲) بچوں میں جھوٹ بولنے کی عادت۔
(۳) بچوں کا تعلیمی حالت میں کمزور ہونا
(۴) بچوں میں چوری نقل کرنے کی عادت
(۵) بچوں کا استاد سے نفرت۔
(۶) بچوں میں غیر حاضری کی عادت۔
(۷) بچوں کا تعلیم حاصل کیے بغیر سکول چھوڑ جانا۔

<u>بچوں میں لاپرواہی</u>:- جب بچوں کو گھر میں کام کرنے کے لیے دیا جاتا ہے۔ جو سکول میں نہیں کرایا گیا تو اکثر بچوں کے لیے مشکلات پیدا ہو جاتی ہیں، جن کا وہ حل گھر پر نہیں کر سکتے کیوں کہ اکثر بچوں کے باپ یا بڑے بھائی تعلیم یافتہ نہیں ہوتے کہ وہ اپنے بچوں کی گھر پر مدد کر سکیں۔ کئی بچوں کے باپ یا بڑے بھائی تعلیم یافتہ تو ضرور ہیں مگر انہیں بچوں کی مدد کرنے کا موقعہ ہی نہیں ملتا، وہ اپنے کام کاج میں مصروف رہتے ہیں، اس وجہ سے بچے گھر پر سکول کا کام نہیں کر سکیں گے، اور صبح سکول میں آتے ہی اپنے استاد کو گھر کا کام دکھاتے وقت کوئی نہ کوئی

جھوٹا بہانہ بنائیں۔ تاکہ استاد کی ڈانٹ سے بچ سکیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ بچوں میں لاپرواہی کی عادت دن بہ بڑھتی چلی جائے گی۔

<u>جھوٹ بولنا</u>:۔ کئی بچے تو پہلے ہی جھوٹ بولنے کے عادی ہوتے ہیں۔ مگر گھر پر تعلیمی کام نہ کرنے کی وجہ سے کوئی نہ کوئی جھوٹا بہانہ بنانا شروع کر دیتے ہیں، اس طرح ہر روز جھوٹ بولنے سے جھوٹ کی عادت پختہ تر ہوتی جاتی ہے اور استاد ایسے بچوں سے تنگ آجاتا ہے۔

<u>بچوں میں تعلیمی کمزوری</u>:۔ بچوں کی تعلیمی کمزوری کی کئی وجوہ ہیں۔ مثلاً غیر حاضری۔ تعلیم کا دلچسپ نہ ہونا وغیرہ مگر ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ سکول میں بچوں کی پیش آمدہ مشکلات حل نہیں کی جاتیں، اور گھر پر کرنے کے لیے دیا جاتا ہے وہ، اور مشکلات میں اضافہ کرتا ہے، ہر روز اس طرح ہوتے رہنے سے بچوں کی تعلیمی ترقی کی بجائے تعلیمی کمزوری دن بدن بڑھتی رہتی ہے۔

<u>کاپیوں سے چوری نقل کرنا</u>:۔ جماعت کے وہ لڑکے جو گھر سے کام کر کے لاتے ہیں، جب وہ استاد کو اپنا کام دکھاتے ہیں تو لاپرواہ اور کمزور بچوں کو اپنے ساتھیوں کے سامنے ندامت اٹھانی پڑتی ہے، اب وہ موقعہ پا کر ان لڑکوں کی کاپیاں چرانے کی کوشش کرتے ہیں جو گھر سے مدرسہ کا کام کر کے لاتے ہیں، اس طرح وہ چوری کاپیوں سے نقل کرنے کے عادی ہو جاتے ہیں اور یہ بدعادت دن بدن بڑھتی جاتی ہے۔

<u>بچوں کو استاد سے نفرت</u>:۔ جب بچوں میں۔ لاپرواہی، تعلیمی کمزوری، اور چوری نقل کرنے کی بری عادات ہو جاتی ہیں، تو استاد ان کی ان بری عادات کو صحیح طریقے سے رفع کرنے کی کوشش نہیں کرتا، بلکہ ایسے بچوں کو ڈانٹ ڈپٹ اور لعن طعن شروع کر دیتا ہے، جس کی وجہ سے وہ استاد کو بجائے ہمدرد خیال کرنے کے دشمن سمجھنے لگتا ہے اور اس طرح بچوں کے دلوں میں استاد کے خلاف نفرت ہونے لگتی ہے اور تعلیمی کاموں سے بھی چرانے لگتے ہیں۔

<u>بچوں میں غیر حاضری کی عادت</u>:۔ اب بچوں میں استاد سے نفرت۔ ڈانٹ ڈپٹ کا ڈر۔ گھر سے کام نہ کرنے کا خوف پیدا ہو جانے سے بچے اکثر سکول سے غیر حاضر رہنے لگتے ہیں۔ جس سے ان میں آوارگی اور بے خوفی ہونی شروع ہو جاتی ہے۔ اور یہ عادت آخر کار ان کی تباہی کا باعث بن جاتی ہے۔

عث

بچے کا تعلیم حاصل کیے بغیر سکول چھوڑ جانا :- بچوں میں لاپرواہی کی عادت بڑھ چکی ہے۔ بہت سی تعلیمی کمزوریاں پیدا ہو چکی ہیں۔ جھوٹ بولنے کی کافی مہارت پیدا ہو چکی ہے۔ غیر حاضر رہ کر آوارگی پیدا ہو چکی ہے، استاد کی شکل تک دیکھنا پسند نہیں کرتے۔ سکول ڈراؤنا معلوم ہوتا ہے۔ اب بچوں کے بس کا روگ نہیں رہا جس کا وہ علاج کر سکیں، اس صورت میں بچے تعلیم حاصل کیے بغیر سکول چھوڑ جاتے ہیں، اور ہمیشہ کے لیے علم کے زیور سے محروم ہو جاتے ہیں۔

تدارک | اول تو بچوں میں کوئی نقص ہی پیدا نہیں ہونے دینا چاہیے، اور اگر بچوں میں ایسے نقائص پیدا ہو گئے ہوں، تو ان سے نفرت نہ کی جائے بلکہ ان سے محبت کی جائے، اور اچھے طریقے سے ان کے نقائص کے بُرے نتائج بتائے جائیں۔ اور نقائص پیدا ہونے کی وجوہ کا انسداد کیا جائے۔ تاکہ وہ دولت علم سے محروم نہ رہ جائیں، اور صحیح طور پر تعلیم حاصل کر سکیں۔ استاد اچھے سے اچھے طریقے خود سوچ سکتا ہے کیوں کہ کام ہی ایک بڑا معلم ہے۔ وہ خود استاد کو کئی طریقے سکھا دے گا، مجھے تجربہ ہے کہ :-

بچوں کے دماغ کوری (صاف) تختی کی طرح ہوتے ہیں، جو بات بچوں کے ذہن نشین کر دی جائے، وہ ان کے دماغ میں اسی وقت نقش ہو جاتی ہے، جو انھیں کبھی نہیں بھولتی۔ اور جو بات ان کے دماغ سے شائع کی جائے وہ فوراً مٹ جاتی ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ بچوں میں سب سے پہلے سچ بولنے کی عادت پیدا کی جائے، خواہ وہ گھر سے کام کر کے لائیں، یا نہ لائیں۔ جو لڑکے گھر سے کام کر کے نہ لائے ہوں، انھیں ڈانٹ نہ پلائی جائے، بلکہ یہ کہہ دیا جائے کہ تم نے سچ بولا ہے، اس لیے تمہیں معاف کیا جاتا ہے، تاکہ دوسرے لڑکوں پر بھی سچ بولنے کا زیادہ اثر پڑے، اور جو لڑکے گھر سے کام کر کے لائے ہوں، انھیں شاباش دی جائے، بلکہ ان کی کام والی کاپیوں پر شاباش لکھ دی جائے، تاکہ ان کی حوصلہ افزائی ہو سکے، کام دیکھنے کے بعد ایک دو دن تک کام نہ کرنے کے نقصانات لڑکوں کے سامنے بیان کر دیے جائیں۔ اور ہر روز کام کرنے کے فوائد بتا دیے جائیں، تو کام نہ کرنے والے طلبہ بھی خود بخود کام کرنے لگیں گے، اور ان میں شاباش حاصل کرنے کا شوق پیدا ہو جائے گا۔

گھر پر کام دینے کا طریقہ | جو کام بچوں کو گھر پر کرنے کے لیے دیا جائے، وہ پہلے سکول میں اسی روز کرا دینا چاہیے، تاکہ بچے کی مشکلات حل ہو جائیں، اور جو بات ان کی سمجھ میں نہ آئے وہ اپنے استاد سے پوچھ سکیں

کیوں کہ استاد بچوں کے لیے ایک رہنما ہے۔ یا بے آب وگیا صحرا میں ایک ایسا چشمہ ہے جو اس بے آب وگیاہ صحرا کو سیراب کر کے سرسبز و شاداب کر سکتا ہے۔ تو طلبہ کی مشکلات کو حل نہیں کر سکتا۔ غرضیکہ استاد میں بہت سی خوبیاں پیدا ہو سکتی ہیں۔ جب استاد اپنے بچوں کی مشکلات کو سکول ہی میں حل کر دے گا تو وہ گھر میں جا کر آسانی سے کام کر سکیں گے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ بچوں میں لاپرواہی کی عادت نہیں پڑے گی۔

بچوں کو گھر کے لیے اتنا کام دیا جائے جتنا وہ گھر پر آسانی سے کر سکیں۔ کام نہ تو بہت زیادہ ہو کہ بچے گھر جا کر پورا کام نہ کر سکیں اور نہ اتنا کم، کہ بچوں کو کام کرنے کے بعد آوارہ پھرنے کے لیے زیادہ وقت مل سکے، جب بچے ہر روز اپنا کام گھر سے کر کے لائیں گے تو ان میں لاپرواہی پیدا نہیں ہوگی اور نہ ہی جھوٹ بولنے کا سوال پیدا ہوگا۔

بچوں کی کمزوری کی وجہ غیر حاضری بھی ہوتی ہے، یا جب بچے دیر سے سکول میں حاضر ہوتے ہیں تو اس سے بھی بچوں میں کمزوری پیدا ہونے کا امکان ہوتا ہے۔ کیوں کہ جو کام ان بچوں کی موجودگی میں نہیں ہوا، جو دیر سے آئے یا غیر حاضر رہے ہیں تو وہ کام لازمی طور پر نہیں کر سکتے جو ہو چکا کیوں کہ ان کے لیے اس کام میں کئی مشکلات پیدا ہو گئی ہوں گی۔ جب انھیں غیر حاضری یا دیر سے آنے کے نقصانات اور وقت پر حاضر ہونے کے فوائد بتائے جائیں گے تو وہ وقت پر حاضر ہونے کی کوشش کریں گے، اور کبھی غیر حاضر نہ ہوں گے، اور تعلیمی کمزوری کے پیچھے نہیں دیں گے۔

اب گھر پر کام دینے سے پہلے ان کی مشکلات دور ہو رہی ہیں۔ وہ ہر روز گھر سے باقاعدہ کام کر کے لائیں گے جس سے ان میں کاپیاں چوری کر کے یا اپنے ساتھیوں کی کاپیاں لے کر نقل کرنے کی عادت پیدا نہیں ہوگی۔ اور دن بدن ان کی تعلیمی حالت بہتر ہوتی جائے گی، جو لڑکے کمزور ہیں، وہ بھی ہر روز کام کرنے سے تعلیمی حالت میں اچھے ہو جائیں گے اور استاد کو اپنا ہمدرد سمجھ کر اپنی مشکلات استاد کے سامنے پیش کرنے سے نہیں جھجکیں گے۔ استاد اور شاگرد کے درمیان نفرت پیدا نہیں ہوگی۔ بچے اپنے والدین سے استاد کی زیادہ عزت کریں گے۔

جب لڑکوں میں کام کرنے کی باقاعدگی پیدا ہو جائے گی تو ان کی تعلیمی حالت خود بخود بہتر ہوتی جائے گی کیوں کہ ان کی تعلیمی مشکلات سکول میں ہی استاد دور کر رہا ہے۔ وہ تعلیم سے اکتا کر سکول چھوڑ کر کبھی بھی بھاگنے کا نام نہ لیں گے۔ جو لڑکے سکول سے کسی وجہ سے سکول سے بھاگ چکے تھے، وہ بھی دوبارہ سکول آ کر دوبارہ داخل ہونا شروع کر دیں گے اور نئے لڑکے بھی دھڑا دھڑ داخل ہونے لگیں گے جس سے سکول میں طلبہ کی تعداد میں اضافہ ہونا شروع ہو جائیگا۔

گھر کے لیے کام دیتے وقت تمام مضامین کا کام دینا چاہیے۔ مثلاً خوش خطی: بچے گھر جاکر پڑھا ہوا سبق جو کہ منتخب کیا جائے خوش خط لکھ کر سکول میں لائیں، یا جو املا سکول میں لکھائی گئی ہو، اسے تختی پر خوش خط لکھ کر گھر سے سکول میں لائیں۔ تاکہ ان کی غلطیوں کی اصلاح کی کافی مشق ہو جائے، اور زیادہ لکھائی کرنے سے خوش خطی بھی پیدا ہو گی، جیسا کہ ایک مقولہ ہے۔

اگر خواہی کہ باشی خوش نویس ✦ می نویس و می نویس و می نویس

اگلے روز لکھائی کا کام سکول میں دیکھا جائے، تاکہ بچوں میں لاپرواہی کی عادت ہی پیدا نہ ہو۔ صرف خطوط نویسی کا کام سکول میں استاد اپنی زیرِ نگرانی کرائے، اور ساتھ ساتھ ہی طلبہ کی غلطیوں کی اصلاح کرتا جائے تاکہ ان کی غلطیوں کی اصلاح بچوں کے سامنے ہی ہوتی جائے، یا ہوشیار طلبہ کی کاپیاں پہلے دیکھی جائیں اور بعد میں ہوشیار طلبہ کی مدد سے جماعت کے تمام طلبہ کی کاپیوں کی اصلاح کی جائے۔ اس طرح ہوشیار طلبہ کی تعلیم میں اضافہ بھی ہو گا کیوں کہ وہ بہت سے لڑکوں کی کاپیوں پر سے کئی نئے فقرات پڑھیں گے اور ان کو درست کریں گے۔ یا ہوشیار طلبہ دوسرے لڑکوں کی کاپیوں پر غلط الفاظ پر غلطی کا نشان لگا دیں، اور بعد میں استاد خود ان الفاظ کی اصلاح کر دے جو غلط الفاظ بچوں نے لکھے ہیں۔ یہ کام گروپ بندی میں ہو سکتا ہے۔ اس طریق سے ہائی سکولوں میں بڑی جماعتوں کی انگلش کاپیوں پر بھی ان کے خطوط یا مضمون نویسی کی اصلاح کی جا سکتی ہے جو بہت کم وقت میں ان کی اصلاح ہو جائے گی اور کام بھی زیادہ ہو گا۔ خواہ طلبہ کی تعداد کتنی ہی زیادہ ہو۔

(۲) جغرافیہ:۔ پرائمری میں بچوں کو جغرافیہ کے ایک سبق کے ہر روز ایک یا دو سوال ہی دینے کافی ہیں۔ اور وہ اگلے روز ہر طالب علم سے سُن لیے جائیں۔ اور دوسرے روز کے لیے پھر اسی سبق کے ایک یا دو سوال دے دیے جائیں۔ اس طرح جب ایک مضمون کے سوال یاد ہو جائیں تو پھر دوسرے مضمون کے سوالات اسی طرح یاد کرانے شروع کر دیے جائیں۔

اس جماعت کے جتنے طلبہ ہیں اتنے ہی سوال ہر روز جماعت میں یاد کرنے کے لیے دیے جا سکتے ہیں جس کا طریقہ یہ ہے کہ ایک سوال ایک لڑکے کو، دوسرا سوال دوسرے لڑکے کو، تیسرا سوال تیسرے لڑکے کو حتیٰ کہ آخری سوال آخری لڑکے کو یاد کرنے کے لیے دیا جائے، اور اگلے روز ان لڑکوں سے ترتیب وار وہی سوال سنا جائے جو انھیں یاد

رنے کے لیے دیا گیا تھا۔ اس طرح تمام جغرافیہ کے سوالات ایک ہی دن میں سنے جائیں گے۔ دوسرے روز پہلا ال
دوسرے لڑکے کو دوسرا سوال تیسرے لڑکے کو تیسرا سوال چوتھے لڑکے کو، اور آخری سوال کی باری پہلے لڑکے پر آئے گی
اس طرح تمام طلبہ کو جغرافیہ کے تمام سوالات یاد بھی ہو جائیں گے، اور جغرافیہ کا اعادہ بھی ہر روز ہوتا جائے گا، اور لڑکوں
کو یاد کرنا مشکل بھی نہ ہوگا، بلکہ آسانی سے تمام سوالات یاد ہو جائیں گے کیوں کہ ہر ایک لڑکا ہر ایک سوال سکول میں ہی
دوسرے لڑکوں سے سن رہا ہے۔ اس طرح سننے سنانے سے ہی کئی سوال سکول میں ہی یاد ہو جائیں گے۔

حساب :- حساب کے سوالات جو گھر پر حل کرنے کے لیے دیے جائیں، ان کی اگلے روز پڑتال بھی کی جائے۔
جس کے کئی طریقے ہیں۔ مثلاً پانچ سات ہوشیار طلبہ کے حساب کے سوالات کی کاپیاں استاد دیکھے، اور پھر ان ہوشیار
طلبہ کی مدد سے تمام طلبہ کے حساب کے سوالات کی کاپیاں دیکھ لیں، اور کمزور طلبہ کی کاپیاں بھی خود استاد دیکھے تاکہ
وہ نظر انداز نہ ہو جائیں۔ نمبر ۲- لڑکوں کو سیدھی قطار میں بٹھا لیا جائے۔ پھر حساب کے جو سوالات گھر پر حل کرنے
کے لیے پہلے دن دیے گئے تھے۔ انھیں سوالوں میں سے ایک ایک کر کے سوال جماعت کے تمام طلبہ کو لکھا دیا جائے۔
جب لڑکے اپنی سلیٹوں پر سوال حل کرنا شروع کر دیں تو استاد ان کی نگرانی کرتا رہے تاکہ کوئی لڑکا کسی لڑکے کی نقل نہ
کر سکے۔ جب جماعت کے تمام لڑکے سوال حل کر لیں، تو تمام طلبہ کے سوال امتحانی طور پر باری باری دیکھا جائے۔ جن
لڑکوں کا سوال غلط ہوگا، یا کسی نے سوال حل نہ کیا ہوگا تو ان طلبہ کی کاپیاں جن پر وہ گھر سے سوال حل کر کے لائے
ہیں دیکھے، اگر ان کی کاپیوں پر وہ سوال صحیح حل کیا ہوا ہے تو نتیجہ صاف ظاہر ہے کہ لڑکے نے اپنے کسی ساتھی کی کاپی
سے سوالات نقل کیے ہیں، اور جن لڑکوں کا سوال ٹھیک ہوگا، وہ گھر سے درست سوال حل کر کے لائے ہیں۔
اس طرح نقل کرنے والے کمزور طلبہ کی تعداد کا پتہ چل جائے گا۔ اب ان کی اصلاح کا طریقہ سوچنا چاہیے۔
نمبر ۳- جماعت کے تمام طلبہ کو بلیک بورڈ کے سامنے بٹھا لیا جائے۔ اور جو کام حساب کا گھر کے لیے دیا گیا تھا، اس
میں سے ایک سوال طلبہ کو پڑھ کر سنا دیا جائے، اور پوچھا جائے کہ کون سے لڑکے اس سوال کو بلیک بورڈ پر حل کریں گے۔
اب وہ لڑکے جنہوں نے گھر پر خود کام کیا ہے۔ فوراً حل کرنے کے لیے تیار ہو جائیں گے، اور جن لڑکوں نے گھر پر خود کام
نہیں کیا، کسی کی کاپی سے سوال حل کر کے لائے ہیں، استاد کو ان طلبہ کا فوراً پتہ چل جائے گا۔ اب ان سے گھر پر کام
نہ کرنے کی وجہ معلوم کر کے ان کی مشکلات کو حل کرنے کی طرف توجہ کی جائے۔

تعلیمی دنیا پر ایک نظر

بچوں سے متعلق ڈینی کے کا نیا فلم

مشہور فلمی اداکار مسٹر ڈینی کے نے اقوام متحدہ کے بچوں کے فنڈ یونی سیف کے سیاح سفیر کی حیثیت سے یورپ، مشرق وسطیٰ اور افریقہ کے ملکوں کا سات ہفتے تک دورہ کرتے ہوئے یونی سیف کی کارگزاریوں کی رپورٹ کا فلم تیار کیا جو ۲ دسمبر کو بیک وقت ۲۸ ملکوں میں سینما اور ٹیلی وژن کے پردوں پر دکھایا گیا اور اسے اتنے لوگوں نے دیکھا کہ شاید اتنی تعداد میں اور کوئی فلم نہ دیکھا گیا ہوگا۔

دنیا بھر کے بیمار اور بھوکے بچوں کی امداد کے لیے یونی سیف کی کوششوں کی یہ روئداد کولمبیا براڈکاسٹنگ سسٹم کے ایک کیمرہ مین نے تیار کی ہے جو مسٹر ڈینی کے کے شریک سفر تھے۔ اصل فلم بیں گھنٹے کی مدت کا تیار ہوا تھا لیکن ٹیلی وژن کے لیے اسے مختصر کر کے صرف ۹ منٹ کا بنا لیا گیا۔ اسے ریاست ہائے متحدہ کے علاوہ ۲۷ اور ملکوں میں دکھایا گیا۔

ڈینی کے کی یہ کہانی جو ۲ دسمبر کو پردہ سیمیں پر دیکھی گئی، دنیا کے پس ماندہ بچوں کی ایک دلدوز داستان ہے اس میں قہقہوں اور آنسوؤں کو، بیماری اور تندرستی کو اس طرح سمو گیا ہے کہ درمیانی تفاوت پنسلین کے ایک انجکشن مرہم کی ایک ڈبیہ یا گرم دودھ کے ایک پیالے کے برابر رہ جاتا ہے۔

مسٹر ڈینی کے ایک مزاحیہ اداکار ہیں۔ انھوں نے اپنی اسی غیر معمولی صلاحیت سے کام لے کر اور بچوں کے ساتھ بالکل ایک بچہ بن کر ان کی ضرورتوں کو سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ نائیجیریا میں وہ کوڑھی بچوں سے ملے جو اب صحت یاب ہو چکے ہیں۔ مراقش میں انھوں نے امراض چشم کے استیعال کی تدابیر کا جائزہ لیا۔ اس ملک کے اکثر دیہات میں سارے بچے آنکھوں کے مریض ہوتے ہیں۔ اسی طرح انھوں نے ہر ملک میں ایک نیا تجربہ کیا اور نئی معلومات حاصل کیں۔

مسٹر ڈینی کے نے اپنا پہلا ۲۰ منٹ کا رنگین فلم "ایسائنمنٹ چلڈرن" کے نام سے تیار کیا تھا۔ اس میں

ہانگ کانگ، بھارت، کوریا، جاپان، اور تھائی لینڈ کے مختلف مناظر کی عکاسی کی گئی ہے۔ اس فلم کو جو ۲۳ زبانوں میں تیار ہوا ہے، تقریباً دس کروڑ انسان دیکھ چکے ہیں۔

ان دونوں فلموں کی آمدنی یونیسف کو دی گئی ہے، تاکہ اس رقم سے بچوں کو بیماریوں سے محفوظ رکھنے اور ان کی صحت کو بہتر بنانے کے منصوبے عمل میں لائے جاسکیں۔

یونیسکو کا پروگرام

یونیسکو کے لائحہ عمل میں ہر سال اضافہ ہو رہا ہے۔ اب تک اس کے پروگرام میں یہ موضوعات شامل رہے ہیں صحرائی نباتات (۵۳ - ۱۹۵۲ء) پودوں کی ماہیت (۵۴ - ۱۹۵۳ء) ہوا اور سورج کی توانائی (۵۴ - ۱۹۵۳ء) انسان اور جانوروں کے فطری خواص (۵۵ - ۱۹۵۴ء) اور بنجر علاقوں کی موسمیات (۵۶ - ۱۹۵۵ء) اس سال یونیسکو کی جنرل کانفرنس سے جس کا اجلاس نئی دہلی میں منعقد ہوا تھا، درخواست کی گئی کہ وہ خشک اور بنجر علاقوں کی تحقیقات کا ایک مبسوط پروگرام تیار کرے جسے چھے سال میں عملی جامہ پہنایا جائے۔

یونیسکو نے کانفرنسوں، علمی اجتماعوں اور تحقیقاتی منصوبوں کا انتظام کیا۔ عوام الناس کی نظر میں ان کا موضوع خود صحراؤں کی طرح دور افتادہ اور خشک کہا جاسکتا ہے۔ لیکن نخلستانوں پر گرد و غبار کے بادل چھا رہے ہیں اور سبزہ زار ریت کے ٹیلوں میں بدلتے جا رہے ہیں۔ جہاں برساتی نالوں کے دھارے اور ٹھنڈے چشموں کے نغمے سنائی دیتے تھے۔ زمین خشک ہو کر تڑاختی دکھائی دیتی ہے۔ گویا قدرت صدیوں پرانی تہذیب کی ارضی سطح پر انسانی غلطیوں کا انتقام لے رہی ہے۔

یونیسکو کا فرض ہے کہ وہ ان غلطیوں کا ازالہ کرے۔ اب تک چند رپورٹیں تیار کی جاچکی ہیں۔ ان لوگوں کے لیے جو دنیا کی بڑھتی ہوئی آبادی کا پیٹ بھرنے کے لیے مختلف امکانات پر غور کر رہے ہیں۔ بہت سا مواد موجود ہو گیا ہے۔

کیڑوں سے پھیلنے والی بیماریوں کے خلاف مہم

عالمی ادارۂ صحت نے کیڑوں سے پھیلنے والی بیماریوں کے خلاف دنیا بھر میں جو مختلف مہمیں شروع کر رکھی ہیں، انھیں کامیاب بنانے کی خاطر تیل مادے اور خشک سفوف چھڑکنے کے لیے وضع وضع کے آلات کئی سال سے

استعمال کیے جارہے ہیں۔ خیال ہے کہ ایسی پچکاریوں وغیرہ کا رواج ابھی بہت عرصے تک جاری رہے گا۔ اور ہر مہم کی کامیابی کا انحصار ان آلات کی وضع قطع۔ طریقۂ استعمال اور صلاحیتِ کار پر ہوگا۔ جو مہم سر کرنے میں کام آئیں — عالمی ادارۂ صحت نے ایسی مہموں کو کامیاب بنانے کی غرض سے سنہ ۱۹۵۰ء اور سنہ ۱۹۵۱ء میں تین قسم کی پچکاریوں کو رواج دیا تھا۔ چھوٹی قسم کی پچکاریاں ہاتھ میں لے کر واشر لگی ہوئی نالیوں کے ذریعے سیال مادہ چھڑکنے کے کام آتی ہیں۔ بڑے پیمانے پر بنی ہوئی پچکاریوں کو پاؤں سے دبا کر موٹی نلکیوں اور ہوا کے دباؤ سے اسی سیال مادہ کو زیادہ وسیع رقبے میں چھڑکنا ممکن ہوگیا۔ تیسری قسم اس سے بھی زیادہ بڑی ہوتی ہے، اور اسے بالکل انجن کی طرح چلایا جاتا ہے۔ تاہم دورانِ استعمال میں ادارے کے ماہرین نے جو تجربات کیے ان کی بنیاد پر مزید سہولتوں کا امکان پیدا ہوگیا، اور جب ان نظریات کو عملی جامہ پہنایا تو بڑی کامیابی ہوئی، چناں چہ ماہرین کی چھٹی رپورٹ میں جو حال میں شائع ہوئی ہے۔ نئی وضع کی پچکاریوں اور ان کی ساخت کا مفصل ذکر درج ہے، اور بنانے کے طریقے بھی بیان کیے گئے ہیں۔

ماہرین کے اندازے کے مطابق چوں کہ کیڑے مار سفوف چھڑکنے کے آلات ابھی اور فروغ پائیں گے۔ اس لیے ضرورت ہے کہ جدید ترین وضع قطع اور ساخت کے نمونے اختیار کیے جائیں، اور انھیں ہر وقت کارآمد رکھنے کی تدابیر پر بھی غور کیا جائے۔ اس لحاظ سے ماہرین کی رپورٹ بہت ہی مفید ثابت ہوسکتی ہے۔ اس رپورٹ میں پچکاریوں کی مرمت اور ان کے فالتو پرزوں کا بھی ذکر ہے۔

کیڑے مار ادویات میں چونکہ زہریلے اجزا شامل ہوتے ہیں اور وہ انسانی صحت کے لیے بھی مضر ثابت ہوسکتے ہیں، اس لیے رپورٹ میں ایسے اثرات سے بچنے کے مختلف طریقوں پر روشنی ڈالی گئی ہے، اور خاص قسم کے لباس پہننے کے مشورے دیے گئے ہیں۔

رپورٹ میں لکھا ہے کہ لباس اور بستر پر بھی سفوف چھڑکا جائے اور خانہ بدوش لوگوں کے خیمے بھی نظرانداز نہ کیے جائیں جو ملیریا پھیلانے والے مچھروں کے گھر بن سکتے ہیں۔ اس ضمن میں کچھ اور سفارشات بھی رپورٹ میں درج ہیں۔

روسی کتب خانوں کے متعلق

سید بشیر الدین صاحب یونی ورسٹی لائبریرین مطلع فرماتے ہیں کہ :-

گذشتہ ہفتہ مرکزی وزارت تعلیم بھارت کے شعبۂ سماج سدھار کے ناظم سردار سوہن سنگھ حال ہی میں روس کے مطالعاتی دورے سے واپس تشریف لائے ہیں۔ اسی لحاظ سے انہوں نے روس میں لائبریری تنظیم پر اظہار تاثرات کیا آپ نے بتایا کہ ایک منظم لائبریری سروس روس کے علاوہ شاید کسی اور ملک میں نہیں۔ ہر گاؤں، ہر قصبے اور ہر شہر میں کتب خانے موجود ہیں۔ مجموعی طور پر چار لاکھ کتب خانے طول و عرض روس میں موجود ہیں۔ ان میں سے ساٹھ ہزار صرف بچوں کے لیے مخصوص ہیں۔ مرکز کے علاوہ روس کی تمام جمہوریتوں میں بچوں کے لیے کتابیں شائع کرنے کا نہایت عمدہ انتظام ہے اور ان اشاعتی اداروں سے کتابیں ہر لائبریری میں بلا تفریق پہنچ جاتی ہیں۔ بچے کتابوں کے مصنفین کو اپنی لائبریری میں آنے کی دعوت دیتے ہیں اور اس طرح مصنف بچوں کی دلچسپیوں اور ذہنی وابستگیوں سے بخوبی واقف ہو جاتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ بچوں کے لیے خاص کتابیں چھاپنے میں روس کا مقابلہ دنیا کا کوئی اور ملک نہیں کر سکتا۔

روس میں کتب خانوں کی علمی حیثیت سے کہیں زیادہ ان کی تہذیبی اور تمدنی اہمیت تسلیم کی جاتی ہے، اس بنا پر پورے ملک میں پھیلے ہوئے کتب خانوں کے جال پر وزارت تعلیم کا نہیں بلکہ وزارت ثقافت کا اختیار ہے مرکز میں سب سے بڑی لینن لائبریری ہے۔ جو ممکن ہے کتابوں کی تعداد کے لحاظ سے دنیا کی دوسری بڑی لائبریری ہو لیکن اپنی منظم سروس اور کتابوں کے استعمال کی بنیاد پر دنیا کی سب سے بڑی لائبریری قرار دی جا سکتی۔

روس کی تمام جمہوریوں کے صدر مقاموں میں ایک بڑی لائبریری موجود ہے، جو اس جمہوریہ کے کتب خانوں کی نگرانی کرتی ہے۔ جمہوریہ کے تمام صوبوں میں صوبائی کتب خانے موجود ہیں جو کتابوں کی فراہمی کی ذمہ دار ہیں۔ ان کتب خانوں کے تحت ہر صوبہ کے تمام ضلعے اور ہر ضلع کے شہر، قصبے اور گاؤں میں موجود کتب خانوں کو کتابیں فراہم کرنے کا عمدہ انتظام کیا گیا ہے۔ چونکہ روس میں کتابوں کی اشاعت اور فراہمی حکومت کی زیر نگرانی ہوتی ہے، اس لیے ہر لائبریری کو کتابیں سرکاری طور پر پہنچائی جاتی ہیں۔ یہ کام جس قدر جلد ہوتا ہے قابل تعریف ہے۔ ہر گاؤں اور ضلع کے کتب خانوں کا تعلق جمہوریہ کی مرکزی لائبریری سے ہے اور لینن لائبریری ان سب سے تعلق رکھتی ہے۔ اس بنا پر ہر مطلوبہ کتاب روس کے کسی بھی کونے میں پہنچا دیتی ہے۔

سرکاری کتب خانوں کے علاوہ روس کے ہر صنعتی ادارے ہر کارخانے ہر زراعتی فارم پر تفریحی کلب

سی مجلس، ادبی انجمن، غرض ہر چھوٹے بڑے ادارے میں ایک عمدہ کتب خانہ موجود ہے۔ کتب خانوں کے بہتر انتظام کے لیے لائبریری کی تربیت کا بھی کافی عمدہ انتظام ہے۔ پانچ یونی ورسٹیوں اور اکسٹھ اداروں میں تربیت کا انتظام ہے۔ علاوہ ازیں ہر بڑی لائبریری میں عملی تربیت دی جاتی ہے۔ اور اگر کسی کے لیے یہ بھی ممکن نہیں تو اسے خط و کتابت کے ذریعے تعلیم دی جاتی ہے۔ تربیت کا یہ انتظام مرکزی اور جمہوری وزارت تعلیم کے تحت لینن لائبریری کی نگرانی میں ہے۔ ایک تربیت یافتہ لائبریرین کے لیے روس میں یہ کہاوت موجود ہے کہ جنگل میں منگل بنا دینا اس کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ اسے صرف یہ معلوم ہونا چاہیے کہ کس جگہ لائبریری کے قیام کی ضرورت ہے۔ عمارت کتابیں اور پڑھنے والے وہ خود مہیا کر لیتا ہے۔

روسی حکومت بیرون ممالک سے زیادہ تر سائنس کی کتابیں منگواتی ہے۔ علاوہ ازیں دنیا کے ہر بڑے علمی ادارے سے ان کا لین دین ہے۔ صرف ہندوستان میں پچاس اداروں سے تبادلۂ کتب کا انتظام ہے (علی گڑھ یونی ورسٹی لائبریری میں دو ہزار سے زائد روسی کتب مطبوعہ تبادلہ و تحفہ میں وصول ہوتی ہیں)

(مسلم یونی ورسٹی گزٹ)

ایران کا تعلیمی نظام

عہد قدیم ہی سے ایرانیوں کو حصول علم اور اس کی ترویج سے ایک گونا شغف رہا ہے۔ اور دنیا کے کلچر کو سنوارنے میں ان کا کافی حصہ ہے۔ پہلوی زبان کی لغت ایرانیوں نے مدون کی تھی، وہ دنیا کی قدیم ترین لغات میں شمار ہوتی ہے۔ ظہور اسلام کے فوراً بعد ایرانی قوم اسلامی علوم و فنون سیکھنے کی طرف متوجہ ہوئی، اور اس میدان میں وہ کسی لحاظ سے بھی پیچھے نہ رہی۔ اسلامی علم و فن، ایرانی دانش وروں کی کوششوں کا بہت حد تک رہین منت ہے، اسلامی علوم کی تحصیل، تعلّم اور تعلیم کے باہمی رشتہ کو استوار کرنے کے لیے ملّتِ ایرانی نے قرون اُولیٰ میں ہی مدرسے جاری کرنے شروع کر دیے تھے۔ ان مدرسوں میں فلسفہ الٰہیات۔ ریاضی اور نجوم بحیثیت علوم متداولہ پڑھائے جاتے تھے۔ ان تمام درس گاہوں میں سے شہرۂ آفاق مدرسہ نظامیہ تھا۔ اس کی بنیاد مشہور سیاسی مفکر اور دانشور نظام الملک طوسی نے نیشاپور کے مقام پر رکھی تھی۔ بعد ازاں رفتہ رفتہ اس قسم کی اور درس گاہیں ایران کے دوسرے شہروں مثلاً ہرات، مرو، بلخ اور اصفہان میں بھی قائم کی گئی تھیں۔

یاد رہے کہ اسلامی کلچر کی تعلیم صرف انہی متذکرۃ الصدر مدرسوں تک محدود نہ تھی۔ بلکہ تشنگان علم پرائیویٹ اساتذہ کے یہاں سے بھی اپنی پیاس بجھاتے تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب طلبائے ایران دور افتادہ علاقوں میں علم کی تلاش میں نکل پڑتے تھے۔ اور مصر جیسے دور دراز ممالک میں پہنچ کر اپنی تعلیم مکمل کرتے تھے۔ اسی طرح ایران میں بھی بیرونی ممالک کے طلبہ آتے اور یہاں کے شہرۂ آفاق علما و اساتذہ کے سامنے زانوئے ادب تہ کرتے۔

غرض اس زمانے میں ایرانیوں نے ہر شعبۂ علم کو بام عروج پر پہنچایا تھا۔ خاص کر فقہ، اسلامی الٰہیات فلسفہ۔ تفسیر۔ تاریخ، جغرافیہ۔ ریاضی۔ نجوم، طب اور طبیعات میں انتہائی کمال حاصل کر لیا ہوا تھا۔ اس دوران میں ایران نے وہ وہ عظیم محققین اور دانش ور پیدا کیے جن کی تصانیف اور علمی کارنامے دوسرے لوگوں کے لیے ہمیشہ چراغ راہ بنے رہے ہیں۔

مثال کے طور پر عربی نثر نگاروں میں عبداللہ بن المقفع کا نام لیا جا سکتا ہے۔ اس نے ایران قدیم کے پہلوی ادب کا کافی حصہ عربی میں منتقل کیا، اور عربی نثر نویسی میں ایک اثر پیدا کی۔ اس کی طرز نگارش انوکھی اور دلنشین تھی، اور کئی ایک ادبا نے اس کے اسلوب کی پیروی کی۔ اسلامی دور کے عربی شعرا میں بدیع الزمان ابونواس بہت مشہور تھے۔ ان کے علاوہ فارسی زبان کے بھی کئی ایک ایسے شعرا تھے جنہوں نے اپنے زمانے میں نام پیدا کیا عربی ادب اور ادبی صرف و نحو کو ایرانی علما نے بھی بہت ترقی دی، اور ان کی تصانیف و تالیف سے عربی عالموں نے کافی استفادہ کیا۔ اس ضمن میں صاحب ابن، ثعالبی کسائی اور ابن خلویہ قابل ذکر ہیں۔

تفسیر قرآنی کے سلسلہ میں نیشاپوری۔ سلامی۔ بیضاوی۔ زمخشری جیسے ایرانی مفسرین کے نام لیے جا سکتے ہیں۔ فقہ اور الٰہیات میں امام غزالی۔ جوینی۔ مروزی۔ بیہقی۔ شیخ طوسی، طبری اور دوسرے بزرگان دین اپنا جواب نہ رکھتے تھے۔ اسلامی فلسفیوں میں ابونصر فارابی اور محمد ابن ذکریا رازی۔ ابن سینا۔ فخری رازی نصیرالدین طوسی۔ قطب الدین شیرازی خالص ایرانی تھے۔

ریاضی اور نجوم کی ترقی و ترویج میں ایرانی مفکرین کا بہت بڑا حصہ ہے۔ محمد ابن موسیٰ خوارزمی الجبرا کے دریافت کرنے والوں میں ایک بہت بڑا ریاضی دان تھا۔ اس قبیل میں خیلی اور مشہور منجم و حکیم عمر خیام ابوریحان البیرونی۔ غیاث الدین جمشید کاشانی اور دوسرے حکما قابل ذکر ہیں۔ تاریخ و جغرافیہ میں محمد ابن جریر طبری۔ اصطخری

مسعودی۔ ابو علی مسکویہ۔ ابوالحسن بیہقی اور سلامی کے نام مشہور ہیں۔ طبعیات میں صرف محمد ابن زکریا رازی کا نام ہی کافی ہے۔ میں طوالت کے خوف سے ان تمام مشاہیر کا ذکر کرنے سے قاصر ہوں۔ جنہوں نے فارسی زبان اور ادب کی بیش بہا خدمت کی۔ بے شک وہ زمانہ بیت چکا ہے۔ لیکن ان مفکرین اور دانشوروں کے اسلامی کلچر کو ترقی و عروج پر لے جانے والے کارنامے اب تک زندہ ہیں۔ اور ایک دنیا ان کی خوشہ چینی کر رہی ہے

جدید تعلیمی نظام

مغرب میں صنعتی اور سائنسی ارتقا اور طریقۂ تعلیم میں نئے تغیرات کی پیروی میں ایران نے بھی اپنی تعلیمی روش کو بدل لیا ہے، اور مغربی ممالک کی درسگاہوں کے نمونے پر اپنے یہاں مدارس کھولے ہیں۔

ایک صدی پہلے امیر کبیر کے عہد وزارت میں طہران میں جو کالج کھولا گیا وہ ایران میں جدید طرز کا پہلا کالج تھا۔ یہ درسگاہ دارالفنون کے نام سے مشہور تھی۔ اس میں ایرانی زبان و ادب۔ غیر ملکی زبانیں۔ ریاضی۔ طب جدید اور ملٹری سائنس کی تعلیم دی جاتی تھی۔ رفتہ رفتہ پرائمری اور ہائی سکول نیز مزید کالج کھلتے گئے۔ چناں چہ ایران کے قریباً تمام شہروں اور قصبوں میں لڑکوں اور لڑکیوں کے پرائمری مدارس قائم ہو چکے ہیں۔ ۱۹۱۵ء میں طہران میں پہلا کنڈرگارٹن سکول کھولا گیا۔ یہاں چار سے سات سال تک کے بچوں کو داخل کیا جاتا ہے، اور چار پانچ گھنٹے روزانہ کھیلوں۔ موسیقی اور قراءت کی تربیت دی جاتی ہے، اور آخری سال میں حروف ابجد اور ہجے سکھائے جاتے ہیں۔ لڑکوں اور لڑکیوں کے لیے ہر شہر اور ہر قریہ میں ثانوی تعلیم کے لیے مدرسے ہیں۔ طہران۔ تبریز۔ مشہد۔ اصفہان اور شیراز میں یونیورسٹیاں قائم کی گئی ہیں۔ طہران یونیورسٹی کی تاسیس اور تکمیل مرحوم رضا شاہ پہلوی کے دور حکومت میں کی گئی تھی۔ یہاں طب۔ سائنس۔ آرٹ۔ قانون۔ زراعت۔ فنون لطیفہ۔ انجینیرنگ۔ دندان سازی۔ ادویات سازی۔ نیشنل ٹیچر کالج جیسے شعبہ جات موجود ہیں۔ اور یہ شعبہ جات ہر لحاظ سے مکمل ہیں۔ وہ نئی یونیورسٹیاں جو صوبوں میں موجودہ ہز میجسٹی محمد رضا شاہ کے عہد میں قائم کی گئی ہیں، ابھی زیر تکمیل ہیں اور آہستہ آہستہ ان یونیورسٹیوں میں ہر قسم کے شعبہ جات کا اضافہ کر کے انھیں مکمل کیا جا رہا ہے ۔

کرنے کے لیے دیا گیا تھا۔ اس طرح تمام جغرافیہ کے سوالات ایک ہی دن میں سنے جائیں گے۔ دوسرے روز پہلا سوال دوسرے لڑکے کو دوسرا سوال تیسرے لڑکے کو تیسرا سوال چوتھے لڑکے کو، اور آخری سوال کی باری پہلے لڑکے پر آئے گی اس طرح تمام طلبہ کو جغرافیہ کے تمام سوالات یاد بھی ہو جائیں گے، اور جغرافیہ کا اعادہ بھی ہر روز ہوتا جائے گا، اور لڑکوں کو یاد کرنا مشکل بھی نہ ہوگا، بلکہ آسانی سے تمام سوالات یاد ہو جائیں گے کیوں کہ ہر ایک لڑکا ہر ایک سوال سکول میں ہی دوسرے لڑکوں سے سن رہا ہے۔ اس طرح سننے سنانے سے ہی کئی سوال سکول میں ہی یاد ہو جائیں گے۔

حساب :- حساب کے سوالات جو گھر پر حل کرنے کے لیے دیے جائیں، ان کی اگلے روز پڑتال بھی کی جائے جس کے کئی طریقے ہیں۔ مثلاً پانچ سات ہوشیار طلبہ کے حساب کے سوالات کی کاپیاں استاد دیکھے، اور پھر ان ہوشیار طلبہ کی مدد سے تمام طلبہ کے حساب کے سوالات کی کاپیاں دیکھ لیں، اور کمزور طلبہ کی کاپیاں بھی خود استاد دیکھے تاکہ وہ نظر انداز نہ ہو جائیں۔ نمبر ۲- لڑکوں کو سیدھی قطار میں بٹھا لیا جائے۔ پھر حساب کے جو سوالات گھر پر حل کرنے کے لیے پہلے دن دیے گئے تھے۔ انھیں سوالوں میں سے ایک ایک کر کے سوال جماعت کے تمام طلبہ کو لکھوا جب لڑکے اپنی سلیٹوں پر سوال حل کرنا شروع کر دیں تو استاد ان کی نگرانی کرتا رہے تاکہ کوئی لڑکا کسی لڑکے کی نقل نہ کر سکے۔ جب جماعت کے تمام لڑکے سوال حل کر لیں، تو تمام طلبہ کے سوال امتحانی طور پر باری باری دیکھا جائے۔ جن لڑکوں کا سوال غلط ہوگا یا کسی نے سوال حل نہ کیا ہوگا تو ان طلبہ کی کاپیاں جن پر وہ گھر سے سوال حل کر کے لائے ہیں دیکھے، اگر ان کی کاپیوں پر وہ سوال صحیح حل کیا ہوا ہے تو نتیجہ صاف ظاہر ہے کہ لڑکے نے اپنے کسی ساتھی کی کاپی سے سوالات نقل کیے ہیں، اور جن لڑکوں کا سوال ٹھیک ہوگا، وہ گھر سے درست سوال حل کر کے لائے تھے۔ اس طرح نقل کرنے والے کمزور طلبہ کی تعداد کا پتہ چل جائے گا۔ اب ان کی اصلاح کا طریقہ سوچنا چاہیے۔

نمبر ۳- جماعت کے تمام طلبہ کو بلیک بورڈ کے سامنے بٹھا لیا جائے۔ اور جو کام حساب کا گھر کے لیے دیا گیا تھا، اس میں سے ایک سوال طلبہ کو پڑھ کر سنا دیا جائے، اور پوچھا جائے کہ کون سے لڑکے اس سوال کو بلیک بورڈ پر حل کریں اب وہ لڑکے جنھوں نے گھر پر خود کام کیا ہے۔ فوراً حل کرنے کے لیے تیار ہو جائیں گے، اور جن لڑکوں نے گھر پر خود نہیں کیا، کسی کی کاپی سے سوال حل کر کے لائے ہیں، استاد کو ان طلبہ کا فوراً پتہ چل جائے گا۔ اب ان سے گھر پر نہ کرنے کی وجہ معلوم کر کے ان کی مشکلات کو حل کرنے کی طرف توجہ کی جائے ۔

تعلیمی دنیا پر ایک نظر

بچوں سے متعلق ڈینی کے کا نیا فلم

مشہور فلمی اداکار مسٹر ڈینی کے نے اقوام متحدہ کے بچوں کے فنڈ یونی سیف کے سیاح سفیر کی حیثیت سے یورپ، مشرق وسطیٰ اور افریقہ کے ملکوں کا سات ہفتے تک دورہ کرتے ہوئے یونی سیف کی کارگزاریوں کی رپورٹ کا فلم تیار کیا جو ۲ دسمبر کو بیک وقت ۲۸ ملکوں میں سینما اور ٹیلی وژن کے پردوں پر دکھایا گیا اور اسے اتنے لوگوں نے دیکھا کہ شاید اتنی تعداد میں اور کوئی فلم نہ دیکھا گیا ہوگا۔

دنیا بھر کے بیمار اور بھوکے بچوں کی امداد کے لیے یونی سیف کی کوششوں کی یہ روئداد کولمبیا براڈکاسٹنگ سسٹم کے ایک کیمرہ مین نے تیار کی ہے جو مسٹر ڈینی کے کے شریک سفر تھے۔ اصل فلم بیس گھنٹے کی مدت کا تیار ہوا تھا لیکن ٹیلی وژن کے لیے اسے مختصر کر کے صرف ۹ منٹ کا بنا لیا گیا۔ اسے ریاست ہائے متحدہ کے علاوہ ۲۷ اور ملکوں میں دکھایا گیا۔

ڈینی کے کی یہ کہانی جو ۲ دسمبر کو پردہ سیمیں پر دیکھی گئی، دنیا کے پس ماندہ بچوں کی ایک دلدوز داستان ہے اس میں قہقہوں اور آنسوؤں کو، بیماری اور تندرستی کو اس طرح سمویا گیا ہے کہ درمیانی تفاوت پنسلین کے ایک انگشتو مرہم کی ایک ڈبیہ یا گرم دودھ کے ایک پیالے کے برابر رہ جاتا ہے۔

مسٹر ڈینی کے ایک مزاحیہ اداکار ہیں۔ انھوں نے اپنی اسی غیر معمولی صلاحیت سے کام لے کر اور بچوں کے ساتھ بالکل ایک بچہ بن کر ان کی ضرورتوں کو سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ نائجیریا میں وہ کوڑھی بچوں سے ملے جو اب صحت یاب ہو چکے ہیں۔ مراکش میں انھوں نے امراض چشم کے استیصال کی تدابیر کا جائزہ لیا۔ اس ملک کے دیہات میں سارے بچے آنکھوں کے مریض ہوتے ہیں۔ اسی طرح انھوں نے ہر ملک میں ایک نیا تجربہ کیا اور نئی معلومات حاصل کیں۔

مسٹر ڈینی کے نے اپنا پہلا ۲۰ منٹ کا رنگین فلم "اسائنمنٹ چلڈرن" کے نام سے تیار کیا تھا۔ اس

ہانگ کانگ، بھارت، کوریا، جاپان، اور تھائی لینڈ کے مختلف مناظر کی عکاسی کی گئی ہے۔ اس فلم کو جو ۲۳ زبانوں میں تیار ہوا ہے، تقریباً دس کروڑ انسان دیکھ چکے ہیں۔

ان دونوں فلموں کی آمدنی یونی سیف کو دی گئی ہے، تاکہ اس رقم سے بچوں کو بیماریوں سے محفوظ رکھنے اور ان کی صحت کو بہتر بنانے کے منصوبے عمل میں لائے جا سکیں۔

یونیسکو کا پروگرام

یونیسکو کے لائحہ عمل میں ہر سال اضافہ ہو رہا ہے۔ اب تک اس کے پروگرام میں یہ موضوعات شامل رہے ہیں: صحرائی مائیات (۵۳ - ۱۹۵۲ء) پودوں کی ماہیت (۵۴ - ۱۹۵۳ء) ہوا اور سورج کی توانائی (۵۴ - ۵۵) انسان اور جانوروں کے فطری خواص (۵۵ - ۱۹۵۴ء) اور بنجر علاقوں کی سومیات (۵۶ - ۱۹۵۵ء)۔ اس سال یونیسکو کی جنرل کانفرنس سے جس کا اجلاس نئی دہلی میں منعقد ہوا تھا، درخواست کی گئی کہ وہ خشک اور بنجر علاقوں کی تحقیقات کا ایک مبسوط پروگرام تیار کرے جسے چھ سال میں عملی جامہ پہنایا جائے۔

یونیسکو نے کانفرنسوں، علمی اجتماعوں اور تحقیقاتی منصوبوں کا انتظام کیا۔ عوام الناس کی نظر میں یہ موضوع خود صحراؤں کی طرح دور از کار اور خشک کہا جا سکتا ہے۔ لیکن نخلستانوں پر گرد و غبار کے بادل چھا رہے اور سبزہ زار ریت کے ٹیلوں میں بدلتے جا رہے ہیں۔ جہاں برساتی نالوں کے دھارے اور ٹھنڈے چشموں کے سائے دیتے تھے۔ زمین خشک ہو کر تراختی دکھائی دیتی ہے۔ گویا قدرت صدیوں پرانی تہذیب کی ارضی سیاسی انسانی غلطیوں کا انتقام لے رہی ہے۔

یونیسکو کا فرض ہے کہ وہ ان غلطیوں کا ازالہ کرے۔ اب تک چند رپورٹیں تیار کی جا چکی ہیں۔ اا کے لیے جو دنیا کی بڑھتی ہوئی آبادی کا پیٹ بھرنے کے لیے مختلف امکانات پر غور کر رہے ہیں۔ بہت موجود ہو گیا ہے۔

کیڑوں سے پھیلنے والی بیماریوں کے خلاف مہم

عالمی ادارۂ صحت نے کیڑوں سے پھیلنے والی بیماریوں کے خلاف دنیا بھر میں جو مختلف مہمیں شروع کی ہیں، انھیں کامیاب بنانے کی خاطر تیار مادے اور خشک سفوف چھڑکنے کے لیے وضع وضع کے آلات

استعمال کیے جا رہے ہیں۔ خیال ہے کہ ایسی پچکاریوں وغیرہ کا رواج ابھی بہت عرصے تک جاری رہے گا۔ اور ہر مہم کی کامیابی کا انحصار ان آلات کی وضع قطع، طریقۂ استعمال اور صلاحیت کار پر ہوگا۔ جو مہم سر کرنے میں کام آئیں ۔ عالمی ادارۂ صحت نے ایسی مہموں کو کامیاب بنانے کی غرض سے ۱۹۵۰ء اور ۱۹۵۱ء میں تین قسم کی پچکاریوں کو رواج دیا تھا۔ چھوٹی قسم کی پچکاریاں ہاتھ میں لے کر واشر لگی ہوئی نالیوں کے ذریعے سیال مادہ چھڑکنے کے کام آتی ہیں۔ بڑے پیمانے پر بنی ہوئی پچکاریوں کو پاؤں سے دبا کر موٹی نلکیوں اور ہوا کے دباؤ سے اسی سیال مادہ کو زیادہ وسیع رقبے میں چھڑکنا ممکن ہو گیا۔ تیسری قسم اس سے بھی زیادہ بڑی ہوتی ہے، اور اسے بالکل انجن کی طرح چلایا جاتا ہے۔ تاہم دوران استعمال میں ادارے کے ماہرین نے جو تجربات کیے ان کی بنیاد پر مزید سہولتوں کا امکان پیدا ہو گیا، اور جب ان نظریات کو عملی جامہ پہنایا تو بڑی کامیابی ہوئی، چنانچہ ماہرین کی چھٹی رپورٹ میں جو حال میں شائع ہوئی ہے۔ نئی وضع کی پچکاریوں اور ان کی ساخت کا مفصل ذکر درج ہے، اور بنانے کے طریقے بھی بیان کیے گئے ہیں۔

ماہرین کے اندازے کے مطابق یوں کہ کیڑے مار سفوف چھڑکنے کے آلات ابھی اور فروغ پائیں گے ۔ اس لیے ضرورت ہے کہ جدید ترین وضع قطع اور ساخت کے نمونے اختیار کیے جائیں، اور انھیں ہر وقت کارآمد رکھنے کی تدابیر پر بھی غور کیا جائے۔ اس لحاظ سے ماہرین کی رپورٹ بہت ہی مفید ثابت ہو سکتی ہے۔ اس رپورٹ میں پچکاریوں کی مرمت اور ان کے فالتو پرزوں کا بھی ذکر ہے ۔

کیڑے مار ادویات میں چونکہ زہریلے اجزا شامل ہوتے ہیں اور وہ انسانی صحت کے لیے بھی مضر ثابت ہو سکتے ہیں، اس لیے رپورٹ میں ایسے اثرات سے بچنے کے مختلف طریقوں پر روشنی ڈالی گئی ہے، اور خاص قسم کے لباس پہننے کے مشورے دیے گئے ہیں۔

رپورٹ میں لکھا ہے کہ لباس اور بستر پر بھی سفوف چھڑکا جائے، ورنہ خانہ بدوش لوگوں کے خیمے بھی نظر انداز نہ کیے جائیں جو ملیریا پھیلانے والے مچھروں کے گھر بن سکتے ہیں۔ اس ضمن میں کچھ اور سفارشات بھی رپورٹ میں درج ہیں۔

روسی کتب خانوں کے متعلق

سید بشیر الدین صاحب یونیورسٹی لائبریرین مطلع فرماتے ہیں کہ :۔

گزشتہ ہفتہ مرکزی وزارت تعلیم بھارت کے شعبۂ سماج سدھار کے ناظم سردار موہن سنگھ حال ہی میں روس کے ماناتی دورے سے واپس تشریف لائے ہیں۔ اسی لحاظ سے انہوں نے روس میں لائبریری تنظیم پر اظہار تاثرات کیا۔ آپ نے بتایا کہ ایک منظم لائبریری سروس روس کے علاوہ شاید کسی اور ملک میں نہیں۔ ہر گاؤں، ہر قصبے اور ہر شہر میں کتب خانے موجود ہیں۔ مجموعی طور پر چار لاکھ کتب خانے طول و عرض روس میں موجود ہیں۔ ان میں سے ساٹھ ہزار صرف بچوں کے لیے مخصوص ہیں۔ مرکز کے علاوہ روس کی تمام جمہوریتوں میں بچوں کے لیے کتابیں شائع کرنے کا نہایت عمدہ انتظام ہے اور ان اشاعتی اداروں سے کتابیں ہر لائبریری میں بلا تفریق پہنچ جاتی ہیں۔ بچے کتابوں کے مصنفین کو اپنی لائبریری میں آنے کی دعوت دیتے ہیں اور اس طرح مصنف بچوں کی دلچسپیوں اور ذہنی وابستگیوں سے بخوبی واقف ہو جاتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ بچوں کے لیے خاص کتابیں چھاپنے میں روس کا مقابلہ دنیا کا کوئی اور ملک نہیں کر سکتا۔

روس میں کتب خانوں کی علمی حیثیت سے کہیں زیادہ ان کی تہذیبی اور تمدنی اہمیت تسلیم کی جاتی ہے۔ اس بنا پر پورے ملک میں پھیلے ہوئے کتب خانوں کے جال پر وزارت تعلیم کا نہیں بلکہ وزارت ثقافت کا اختیار ہے۔ مرکز میں سب سے بڑی لینن لائبریری ہے۔ جو ممکن ہے کتابوں کی تعداد کے لحاظ سے دنیا کی دوسری بڑی لائبریری ہو۔ لیکن اپنی منظم سروس اور کتابوں کے استعمال کی بنیاد پر دنیا کی سب سے بڑی لائبریری قرار دی جا سکتی۔ روس کی تمام جمہوریوں کے صدر مقاموں میں ایک بڑی لائبریری موجود ہے اور اس جمہوریہ کے کتب خانوں کی نگرانی کرتی ہے۔ جمہوریہ کے تمام صوبوں میں صوبائی کتب خانے موجود ہیں جو کتابوں کی فراہمی کی ذمہ دار ہیں۔ ان کتب خانوں کے تحت ہر صوبہ کے تمام ضلعے اور ہر ضلع کے شہر، قصبے اور گاؤں میں موجود کتب خانوں کو کتابیں فراہم کرنے کا عمدہ انتظام کیا گیا ہے۔ چونکہ روس میں کتابوں کی اشاعت اور فراہمی حکومت کی زیر نگرانی ہوتی ہے اس لیے ہر لائبریری کو کتابیں سرکاری طور پر پہنچائی جاتی ہیں۔ یہ کام جس قدر جلد ہوتا ہے قابل تعریف ہے۔ ہر گاؤں اور ہر ضلع کے کتب خانوں کا تعلق جمہوریہ کی مرکزی لائبریری سے ہے اور لینن لائبریری ان سب سے تعلق رکھتی ہے۔ اس بنا پر ہر مطلوبہ کتاب روس کے کسی بھی کونے میں پہنچا دیتی ہے۔

سرکاری کتب خانوں کے علاوہ روس کے ہر صنعتی ادارے، ہر کارخانے، ہر زراعتی فارم، ہر تفریحی کلب

علمی مجلس، ادبی انجمن، غرض ہر چھوٹے بڑے ادارے میں ایک عمدہ کتب خانہ موجود ہے۔ کتب خانوں کے بہتر انتظام کے لیے لائبریری کی تربیت کا بھی کافی عمدہ انتظام ہے۔ پانچ یونیورسٹیوں اور اکسٹھ اداروں میں تربیت کا انتظام ہے۔ علاوہ ازیں ہر بڑی لائبریری میں عملی تربیت دی جاتی ہے۔ اور اگر کسی کے لیے یہ بھی ممکن نہیں تو اسے خط و کتابت کے ذریعے تعلیم دی جاتی ہے۔ تربیت کا یہ انتظام مرکزی اور جمہوری وزارت تعلیم کے تحت لینن لائبریری کی نگرانی میں ہے۔ ایک تربیت یافتہ لائبریرین کے لیے روس میں یہ کہاوت موجود ہے کہ جنگل میں منگل بنا دینا اس کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ اسے صرف یہ معلوم ہونا چاہیے کہ کس جگہ لائبریری کے قیام کی ضرورت ہے۔ عمارت کتابیں اور پڑھنے والے وہ خود مہیا کر لیتا ہے۔

روسی حکومت بیرون ممالک سے زیادہ تر سائنس کی کتابیں منگواتی ہے۔ علاوہ ازیں دنیا کے ہر بڑے علمی ادارے سے ان کا لین دین ہے۔ صرف ہندوستان میں پچاس اداروں سے تبادلۂ کتب کا انتظام ہے (علی گڑھ یونیورسٹی لائبریری میں دو ہزار سے زائد روسی کتب مطبوعہ تبادلہ و تحفہ میں وصول ہوتی ہیں)

(مسلم یونیورسٹی گزٹ)

ایران کا تعلیمی نظام

عہد عتیق ہی سے ایرانیوں کو حصول علم اور اس کی ترویج سے ایک گونا شغف رہا ہے۔ اور دنیا کے کلچر کو سنوارنے میں ان کا کافی حصہ ہے۔ پہلوی زبان کی لغت ایرانیوں نے مدون کی تھی، وہ دنیا کی قدیم ترین لغات میں شمار ہوتی ہے۔ ظہور اسلام کے فوراً بعد ایرانی قوم اسلامی علوم و فنون سیکھنے کی طرف متوجہ ہوئی۔ اور اس میدان میں وہ کسی لحاظ سے بھی پیچھے نہ رہی۔ اسلامی علم و فن ایرانی دانش وروں کی کوششوں کا بہت حد تک رہین منت ہے، اسلامی علوم کی تحصیل، تعلم اور متعلم کے باہمی رشتہ کو استوار کرنے کے لیے ملت ایرانی نے قرون اولیٰ میں ہی مدرسے جاری کرنے شروع کر دیے تھے۔ ان مدرسوں میں فلسفہ الٰہیات۔ ریاضی اور نجوم بحیثیت علوم متداولہ پڑھائے جاتے تھے۔ ان تمام درسگاہوں میں سے شہرہ آفاق مدرسہ نظامیہ تھا۔ اس کی بنیاد مشہور سیاسی مفکر اور دانشور نظام الملک طوسی نے نیشاپور کے مقام پر رکھی تھی۔ بعد ازاں رفتہ رفتہ اس قسم کی اور درسگاہیں ایران کے دوسرے شہروں مثلاً ہرات، مرو۔ بلخ اور اصفہان میں بھی قائم کی گئی تھیں۔

یاد رہے کہ اسلامی کلچر کی تعلیم صرف انہی متذکرۃ الصدر مدرسوں تک محدود نہ تھی۔ بلکہ تشنگان علم پرائیویٹ اساتذہ کے یہاں سے بھی اپنی پیاس بجھاتے تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب طلبائے ایران دور افتادہ علاقوں میں علم کی تلاش میں نکل پڑتے تھے۔ اور مصر جیسے دور دراز ممالک میں پہنچ کر اپنی تعلیم مکمل کرتے تھے۔ اسی طرح ایران میں بھی بیرونی ممالک کے طلبہ آتے اور یہاں کے شہرۂ آفاق علما و اساتذہ کے سامنے زانوئے ادب تہ کرتے۔

غرض اس زمانے میں ایرانیوں نے ہر شعبۂ علم کو بام عروج پر پہنچایا تھا۔ خاص کر فقہ اسلامی۔ الٰہیات فلسفہ۔ تفسیر۔ تاریخ، جغرافیہ۔ ریاضی۔ نجوم۔ طب اور طبیعیات میں انتہائی کمال حاصل کر لیا ہوا تھا۔ اس دوران میں ایران نے وہ وہ عظیم شخصیتیں اور دانش ور پیدا کیے جن کی تصانیف اور علمی کارنامے دوسرے لوگوں کے لیے ہمیشہ مشعل راہ بنے رہے ہیں۔

مثال کے طور پر عربی نثر نگاروں میں عبداللہ بن المقفع کا نام لیا جا سکتا ہے۔ اس نے ایران قدیم کے پہلوی ادب کا کافی حصہ عربی میں منتقل کیا، اور عربی نثر نویسی میں ایک انداز پیدا کی۔ اس کی طرز نگارش انوکھی اور دلنشین تھی، اور کئی ایک ادبا نے اس کے اسلوب کی پیروی کی۔ اسلامی دور کے عربی شعرا میں بدیع الزمان ابو نواس بہت مشہور تھے۔ ان کے علاوہ فارسی زبان کے بھی کئی ایک ایسے شعرا تھے جنہوں نے اپنے زمانے میں نام پیدا کیا عربی ادب اور ادبی صرف و نحو کو ایرانی علما نے بھی بہت ترقی دی، اور ان کی تصانیف و تالیف سے عربی عالموں نے کافی استفادہ کیا۔ اس ضمن میں صاحب اطہری کسائی اور ابن خلویہ قابل ذکر ہیں۔

تفسیر قرآنی کے سلسلہ میں نیشاپوری۔ سلابی۔ بیضاوی۔ زمخشری جیسے ایرانی مفسرین کے نام لیے جا سکتے ہیں۔ فقہ اور الٰہیات میں امام غزالی۔ جوینی۔ مروزی۔ بیہقی۔ شیخ طوسی، طبری اور دوسرے بزرگان دین اپنا جواب نہ رکھتے تھے۔ اسلامی فلسفیوں میں ابو نصر فارابی اور محمد ابن زکریا رازی۔ ابن سینا۔ فخر رازی نصیر الدین طوسی۔ قطب الدین شیرازی خالص ایرانی تھے۔

ریاضی اور نجوم کی ترقی و ترویج میں ایرانی مفکرین کا بہت بڑا حصہ ہے۔ محمد ابن موسیٰ خوارزمی الجبرا کے دریافت کرنے والوں میں ایک بہت بڑا ریاضی دان تھا۔ اس قبیل میں نیلی اور مشہور منجم و حکیم عمر خیام ابو ریحان البیرونی۔ غیاث الدین جمشید کاشانی اور دوسرے حکما قابل ذکر ہیں۔ تاریخ و جغرافیہ میں محمد ابن جریر طبری۔ اصطخری

مسعودی۔ ابو علی سکویہ۔ ابوحسن بہتی اور سلآنی کے نام مشہور ہیں۔ طبعیات میں صرف محمد ابن ذکریا رازی کا نام ہی کافی ہے۔ میں طوالت کے خوف سے ان تمام مشاہیر کا ذکر کرنے سے قاصر ہوں۔ جنہوں نے فارسی زبان اور ادب کی بیش بہا خدمت کی۔ بے شک وہ زمانہ بیت چکا ہے۔ لیکن ان مفکرین اور دانشوروں کے اسلامی کلچر کو ترقی و عروج پر لے جانے والے کارنامے اب تک زندہ ہیں۔ اور ایک دنیا ان کی خوشہ چینی کر رہی ہے

جدید تعلیمی نظام

مغرب میں صنعتی اور سائنسی ارتقا اور طریقہ تعلیم میں نئے تغیرات کی پیروی میں ایران نے بھی اپنی تعلیمی روش کو بدل لیا ہے۔ اور مغربی ممالک کی درس گاہوں کے نمونے پر اپنے یہاں مدارس کھولے ہیں۔

ایک صدی پہلے امیر کبیر کے عہد وزارت میں طہران میں جو کالج کھولا گیا وہ ایران میں جدید طرز کا پہلا کالج تھا۔ یہ درس گاہ دارالفنون کے نام سے مشہور تھی۔ اس میں ایرانی زبان و ادب۔ غیر ملکی زبانیں۔ ریاضی۔ طب جدید اور ملٹری سائنس کی تعلیم دی جاتی تھی۔ رفتہ رفتہ پرائمری اور ہائی سکول نیز مزید کالج کھلتے گئے۔ چنانچہ ایران کے قریباً تمام شہروں اور قصبوں میں لڑکوں اور لڑکیوں کے پرائمری مدرسے قائم ہو چکے ہیں۔ ۱۹۱۵ء میں طہران میں پہلا کنڈر گارٹن سکول کھولا گیا۔ یہاں چار سے سات سال تک کے بچوں کو داخل کیا جاتا ہے۔ اور چار یا پانچ گھنٹے روزانہ کھیلوں۔ موسیقی اور قرأت کی تربیت دی جاتی ہے۔ اور آخری سال میں صرف ابجد اور ہجے سکھائے جاتے ہیں۔ لڑکوں اور لڑکیوں کے لیے ہر شہر اور ہر قریہ میں ثانوی تعلیم کے لیے مدرسے ہیں۔ طہران۔ تبریز۔ مشہد۔ اصفہان اور شیراز میں یونیورسٹیاں قائم کی گئی ہیں۔ طہران یونیورسٹی کی تاسیس اور تکمیل مرحوم رضا شاہ پہلوی کے دور حکومت میں کی گئی تھی۔ یہاں طب۔ سائنس۔ آرٹ۔ قانون۔ زراعت۔ فنون لطیفہ انجینئرنگ۔ دندان سازی۔ ادویات سازی۔ ٹیچرز ٹریننگ کالج جیسے شعبہ جات موجود ہیں۔ اور یہ شعبہ جات ہر لحاظ سے مکمل ہیں۔

دوسری یونیورسٹیاں جو صوبوں میں موجودہ ہز مجسٹی محمد رضا شاہ کے عہد میں قائم کی گئی ہیں، ابھی زیر تکمیل ہیں اور آہستہ آہستہ ان یونیورسٹیوں میں ہر قسم کے شعبہ جات کا اضافہ کر کے انہیں مکمل کیا جا رہا ہے۔

آموزش

شمارہ ۱] لاہور [اپریل ۵۸

اس شمارہ میں

تحریر { پروفیسر سراج الدین
پروفیسر ایم ۔ اے ۔ مخدومی

معاونین { عبدالغفور چوہدری
فضل احمد

تعلیمی ماہ نامہ

آموزش

لاہور

اپریل ۱۹۵۷ء

جلد ——————— ۱۰
شمارہ ——————— ۱

سالانہ چندہ

پاکستان کے لیے ۶ روپے
غیر ممالک کے لیے ۸ روپے

قیمت فی پرچہ دس آنے

پبلشرز

یونی ورسٹی بک ایجنسی لاہور

آر۔ ایچ۔ ڈی خالد پرنٹر پبلشر نے دین محمدی پریس لاہور میں طبع کرا کے
یونیورسٹی بک ایجنسی ۲ کچہری روڈ لاہور سے شائع کیا

قومی استحکام اور طلبہ

۲۳ مارچ ۱۹۵۷ء کو اسلامی جمہوریہ پاکستان نے اپنی زندگی کا پہلا سال پورا کرلیا، یہ سال ملکی اور عالمی حالات میں ہنگامہ خیز تبدیلیوں کا سال ثابت ہوا، مگر ان پرآشوب اور صبر آزما حالات کے باوجود جمہوریہ پاکستان نے قومی زندگی کے ہر میدان میں ترقی کی بین الاقوامی برادری میں اس ملک کی ساکھ پہلے سے بہت بڑھ گئی، غرض جمہوریہ کی زندگی کا پہلا سال بڑے خوش گوار نتائج کے ساتھ ختم ہوا۔

مگر کامیابی کے اس احساس کے ساتھ ان بھاری ذمہ داریوں اور مشکل مسائل کا احساس بھی ہونا چاہیے جو مستقبل کے ساتھ وابستہ ہیں۔ جمہوریہ پاکستان اس وقت بڑے کٹھن معاشی مسائل سے دوچار ہے۔ ناتسلی بخش غذائی صورتِ حال اور بڑھتی ہوئی بے کاری آج ہمارے سب سے اہم مسائل ہیں۔ ہمیں ان مسائل کے فوری اور شافی حل تلاش کرنا ہوں گے۔ ملکی استحکام اور قومی آبرو کے بقاء و تحفظ کے لیے ان مسائل کے تسلی بخش حل تلاش کرنا ضروری ہے۔

لیکن ایک مسئلہ ان سے بھی بنیادی ہے اور وہ ہے قومی اتحاد و یک جہتی۔ وزیراعظم پاکستان نے حال ہی میں ڈھاکہ میں تقریر کرتے ہوئے بجا طور پر کہا تھا کہ آج ہمیں سب سے زیادہ خطرہ بیرونی دشمنوں سے نہیں بلکہ ان انتشار پسند عناصر سے ہے جو بیرونی دشمنوں کا آلۂ کار بن جاتے ہیں۔ ملکی استحکام و سالمیت کو جو گزند یہ اندرونی دشمن پہنچا سکتے ہیں اس کے مقابلے میں بیرونی دشمنوں کا خطرہ ہیچ ہے۔

وزیراعظم نے طلبہ سے اپیل کی ہے کہ وہ ملکی اتحاد و یگانگت کو ترقی دینے کی مہم میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیں، اور انتشار پسند قوتوں کو سر اٹھانے سے پہلے کچل دیں۔ وزیراعظم کا یہ انتباہ بہت بروقت ہے۔ ملک دشمن عناصر جنہیں جمہوریہ پاکستان کی ترقی ایک آنکھ نہیں بھاتی۔ کچھ عرصہ سے علاقائی اور صوبائی مفاد کے تحفظ کے راگ الاپ رہے ہیں۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ ان تخریب پسندوں کے چہروں سے حسین وجمیل الفاظ کے نقاب اتار پھینکے جائیں تاکہ لوگ ان کو ان کے اصلی روپ میں دیکھ سکیں۔

جمہوری ملکوں میں یونیورسٹیوں اور کالجوں کو بجا طور پر رائے عامہ کی تربیت کے گہوارے خیال کیا جاتا ہے۔ کیونکہ روشن خیال طبقہ ان ہی دانش گاہوں سے فکر و نظر کی رہنمائی حاصل کرتا ہے۔ ایک آزاد جمہوری معاشرے میں اعلیٰ تعلیمی ادارے ہی وہ مرکز ہوا کرتے ہیں جہاں ذہنی مسائل پر بے لاگ نقد و تبصرہ ہوتا رہتا ہے۔ اس اعتبار سے ان اداروں کے اساتذہ اور طلبہ کی ذمہ داری بے حد اہم ہے۔ ان کے ذمہ نہ صرف یہ فرض عائد ہوتا ہے، کہ علم اور سائنس کے میدانوں میں تحقیق و انکشاف کی راہ پر چلتے رہیں، بلکہ اہم ملکی مسائل کے بارے میں رائے عامہ کی صحیح تربیت کی خدمت بھی بہت کچھ انھی کو انجام دینا پڑتی ہے۔

جمہوریہ پاکستان کے اعلیٰ تعلیمی اداروں کو بھی اپنا یہ فرض پہچاننا چاہیے۔ پاکستانی یونیورسٹیوں اور کالجوں کے طلبہ کا فرض ہے کہ وہ جذبات سے کھیلنے والے سیاسی شعبدہ بازوں کو نظر انداز کر کے بلند تر قومی اور ملکی مفاد کا تحفظ کرنا سیکھیں۔ آج پاکستان کی سب سے بڑی ضرورت ایسے شہری ہیں جو وسیع تر قومی مفاد کو ہر دوسری چیز پر مقدم رکھتے ہوں۔ اس ایک ضرورت کے پورا ہو جانے سے دوسرے ملکی مسائل، خواہ وہ کیسے ہی پیچیدہ اور دشوار کیوں نہ ہوں، از خود حل ہو سکتے ہیں۔ وزیراعظم پاکستان نے طلبہ سے پُر زور اپیل کی ہے کہ وہ ملکی خدمت کے میدان میں اپنا صحیح کردار ادا کریں۔ امید رکھنی چاہیے کہ نوجوان طلبہ اس اپیل پر سرگرمی سے لبیک کہیں گے۔

سیرت پر ایک تدریسی وحدت

فضل احمد

حل مسائل کا طریق

بچوں کی فکری نشوونما کا ذکر کرتے ہوئے مشہور امریکی ماہر تعلیم جان ڈیوی لکھتا ہے، "ایک چھوٹے بچے کے سامنے سب سے پہلا سوال یہ ہوتا ہے کہ اپنے جسمانی اعضا سے کس طرح کام لے۔ تاکہ مادی اور مجلسی ماحول کے ساتھ آرام دہ طور پر نباہ ہو سکے۔ بچے کو تقریباً تقریباً ہر چیز سیکھنا پڑتی ہے۔ اسے دیکھنا۔ سننا۔ ہاتھ پھیلانا۔ ہاتھ سے چیز پکڑنا۔ جسم کا توازن قائم رکھنا۔ رینگنا۔ چلنا۔ غرض سب کچھ سیکھنا پڑتا ہے۔ ان حرکات سے سوجھ بوجھ کے ساتھ خدمت لینے کے لیے ذہنی کاوش کی ضرورت پیش آتی ہے۔ گو یہ فکر بہت ادنیٰ قسم کا ہوتا ہے۔ مگر اس فکری کاوش کے وجود میں کلام نہیں۔"

سچ یہ ہے کہ دنیا میں قدم رکھنے کے وقت سے ہر شخص اپنے آپ کو طرح طرح کے مسائل سے دوچار پاتا ہے۔ اس کی زندگی کی راحت کا مدار صرف ایک بات پر ہوتا ہے کہ وہ ان مسائل کو تسلی بخش طور پر حل کر لے۔ حل مسائل کی یہ ضرورت ہر زمانے اور ہر عمر میں موجود رہتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مسائل کو کامیابی کے ساتھ حل کرنے سے ایک پر کیف طمانیت حاصل ہوتی ہے۔ اسی بنا پر ایک عالم نے کہا ہے کہ "اچھی زندگی صرف وہی زندگی ہے جس میں مسائل موجود ہوں۔ جو زندگی آرزو اور تمنا سے خالی ہو وہ ایک ادھوری زندگی ہے۔"

اس نکتے کی شرح بیان کرتے ہوئے آگے چل کر یہی عالم لکھتا ہے:-

اکثر لوگوں کی زندگیوں میں طرح طرح کے مسائل پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ لہٰذا مدرسے کے بلند ترین مقاصد میں سے ایک مقصد یہ بھی ہونا چاہیے کہ تدبر اور تفکر کے طریق پر زور دے اور اس کا احترام کرے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ مستقبل کے مسائل حل کرنے والوں کو نہ صرف سوجھ بوجھ اور تفکر کے ساتھ کسی نتیجے پر پہنچنے کا ڈھنگ آجائے گا، بلکہ انھیں اس طریق کار میں لذت اور راحت بھی محسوس ہونے لگے گی۔ کوئی شخص ناتجربہ کار ہو، یا

پختہ کار، اس کے احترام نفس اور عزت نفس کو سب سے زیادہ سہارا دینے والی چیز وہ فخر ہے جو وہ کسی اہم ذاتی مسئلہ کے کامیاب حل کے بعد محسوس کرتا ہے۔"

یہ ایک طے شدہ حقیقت ہے کہ انسان کا امتیازی شرف تدبر اور تفکر کی صلاحیت ہے۔ تدبر اور حل مسائل فی الحقیقت ایک ہی تصویر کے دو رُخ ہیں۔ تفکر کسی مسئلے کی آخری منزل پر تعین کرتا ہے، اور یہ منزل تفکر کی سمت کا فیصلہ کرتی ہے۔ غرض تدبر اور تفکر کو تعلیم کا بنیادی مقصد قرار دیا گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تمام جدید تعلیمی طریقے حل مسائل کو ہی اپنا محور قرار دیتے ہیں۔

حل مسائل کے لیے کسی ذہنی الجھن، شک یا تلاش کا پیدا ہونا پہلی شرط ہے۔ جہاں کہیں ذہن میں کسی قسم کا خلجان موجود ہو سمجھ لینا چاہیے کہ وہاں کوئی نہ کوئی مسئلہ موجود ہے۔ اس کے آگے اس کے حل کی منزل شروع ہوتی ہے۔ یہ منزل چند واضح مراحل میں سے گزرتی ہے۔ یہ مرحلے ذہنی کاوش و جستجو کے وہی مشہور مرحلے ہیں جن میں سے تمام انسانی دریافتیں اور ایجادیں گزری ہیں۔ یعنی پہلے مسئلہ کے متعلق پوری طرح ذہن کا صاف کرنا۔ اس کے بعد استخراجی یا استقرائی طریق استدلال میں سے کسی ایک کو یا بالعموم دونوں کو کام میں لاکر مسئلہ کو حل کرنا۔

تدریس سے مطلوبہ ذہنی نشوونما حاصل کرنے یعنی تدبر اور تفکر کی عادات کو ترقی دینے کے لیے ضروری ہے کہ تدریسی مواد کو روایتی طریق پر پیش کرنے کی بجائے اسے مسائل کی صورت میں پیش کیا جائے۔ جو تدریس صرف اسی بات پر ختم ہو جائے کہ استاد نے کچھ باتیں بتا دیں۔ طلبہ کے ذمے کچھ یاد کرنے کا کام لگا دیا۔ اور اگلے دن یہ آموختہ سن لیا، وہ تدبر اور تفکر کے بلند ذہنی عمل کو ترقی نہیں دے سکتی۔ اپنے طور پر سوچنے کی صلاحیت اسی وقت ترقی پائے گی، جب طلبہ کے دلوں میں کسی مسئلے کے متعلق پہلے تجسس پیدا کیا جائے۔ بعد ازاں استاد اور طلبہ مل کر اس کے مختلف پہلوؤں کا مطالعہ کریں، اور مطالعہ کے خاتمہ پر اپنی جستجو کے نتائج کو یکجا کر کے ان پر ایک تنقیدی نگاہ ڈالیں۔

وحدتی طریق تدریس

جدید تعلیمی فکر جہاں بچے کی انفرادیت پر زور دیتا ہے وہاں وہ اس بات پر بھی زور دیتا ہے کہ زندگی ایک ناقابل تقسیم وحدت ہے۔ اس کا صحت مند فہم حاصل کرنے کے لیے اس کے مختلف پہلوؤں پر ایک ساتھ نگاہ ڈالنی

پا ہیے۔ اگر اس کے مختلف پہلوؤں کو الگ الگ کر کے دیکھا جائے گا تو مشاہدہ کرنے والی نگاہ کل کے حسین تناسب اور لطیف توازن کو کبھی نہ دیکھ سکے گی، اور اس طرح مشاہدہ کا سب سے بڑا مقصد فوت ہو جائے گا۔ یہ اسی احساس کا نتیجہ ہے کہ اب مغرب میں بھی لادینی تعلیم کو ناکافی سمجھا جانے لگا ہے، اور یہ کہا جانے لگا ہے کہ جو تعلیم مذہب جیسی ابدی حقیقت کو نظر انداز کر دے وہ جامعیت کا دعویٰ نہیں کر سکتی۔ وہ یہ دعویٰ کس طرح کر سکتی ہے کہ اس نے بچے کی پوری ہستی کی تربیت کی ہے؟

زندگی کو ایک ناقابل تقسیم وحدت تسلیم کر لینے کا ایک اور منطقی نتیجہ یہ بھی ہے کہ نصاب کے مختلف مضامین کو ایک دوسرے سے الگ تھلگ اشیاء تصور نہ کیا جائے۔ روایتی نصاب میں مختلف مضامین کی حد بندیاں اس طور پر کی گئی تھیں، گویا ہر مضمون اپنی جگہ ایک مکمل شے ہے، جو دوسرے مضامین سے قریباً قریباً بے نیاز ہے۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کا خیال سرے سے لغو ہے۔ نصاب کے مختلف مضامین نوع انسان کی ان تھک تحقیق و جستجو کی عکاسی کرتے ہیں اور بس۔ طلب و تلاش کی یہ کہانی اگرچہ بہت لمبی چوڑی ہے، مگر اس داستان کا ہر حصہ باقی تمام حصوں کے ساتھ اس طور پر مربوط ہے کہ کل سے بالکل علیحدگی میں اس کا صحیح مفہوم سمجھا ہی نہیں جا سکتا۔

انسانی علم و تجربہ کی اس ناگزیر وحدت نے جدید تعلیمی فکر کو پوری طرح متاثر کیا ہے۔ جدید تعلیمی فکر اس بات کا مطالبہ کرتا ہے کہ مختلف مضامین کی رسمی حد بندیوں کو حتی الامکان اڑا دیا جائے، یا انہیں امکانی حد تک گھٹا دیا جائے۔ تمام نئے تعلیمی طریقے اس اصول کو اپنے طریق کار میں مرکزی جگہ دیتے ہیں۔ اس اصول کی ایک عملی کارفرمائی وحدتی طریق تدریس میں دیکھی جا سکتی ہے۔

وحدتی طریق سے مراد تدریس کی اس تنظیم کا نام ہے جس کا مرکز زندگی کا کوئی تجربہ ہو، اور جو طلبہ کی ہر طرح کی معلومات سے ——— خواہ مدرسے کی زندگی سے تعلق رکھتی ہوں یا بیرون مدرسہ کی زندگی سے ——— کام لے

وحدتی طریق تدریس کی ایک جامع تعریف یوں کی گئی ہے:-

تدریسی وحدت سے مراد مربوط اور بامعنی سرگرمیوں کا ایک ایسا جامع سلسلہ ہے، جس کی بدولت نہ صرف طلبہ کے اپنے مقاصد پورے ہوں، بلکہ اس کے ساتھ ہی انہیں معنی خیز تعلیمی تجربہ حاصل ہو، اور ان کے طور طریقوں میں موزوں تبدیلیاں پیدا ہوں۔

اس تعریف سے ظاہر ہے کہ وحدتی طریق طلبہ کے مقاصد سے آغاز کر کے پسندیدہ اوضاع و اطوار کی منزل پر پہنچنا چاہتا ہے۔ اس منزل پر پہنچنے کے لیے تدریسی مواد کو خالصتہً طلبہ کے نقطۂ نگاہ سے مرتب کیا جاتا ہے۔ منصوبہ بندی کے اس کام میں طلبہ برابر کے شریک ہوتے ہیں۔ علم کی مصنوعی حدبندیاں تحقیق و تلاش کا راستہ روکنے نہیں پاتیں۔ اس سے یہ مراد نہیں کہ درسی کتابوں کو خیرباد کہہ دیا جائے یا مقررہ نصاب نہیں کی جاتی۔ یہ چیزیں اپنی جگہ باقی رہتی ہیں، البتہ انھیں اس بات کی اجازت نہیں دی جاتی کہ وہ علم کے چھوٹے سے چھوٹے بے معنی ذروں میں بانٹ دیں۔

دوسرے ترقی پسند طریقہ ہائے تدریس کی طرح وحدتی طریق بھی دو اہم اصولوں پر مبنی ہے۔

(۱) ہر بچہ ایک یگانہ انفرادیت کا مالک ہوتا ہے۔ اسے یہ حق حاصل ہونا چاہیے کہ اپنی انفرادیت کو ترقی دے۔ اسے اس بات پر مجبور کرنا غلط ہے کہ وہ باقی ساتھیوں کی سی دل چسپیوں کا مالک ہو۔ یا ان کی رفتار پر چلے۔

(۲) مختلف علوم ایک ہی حقیقت کے مختلف رُخ ہیں۔ ان سے استفادہ کی بہترین صورت یہ ہے کہ ان کا مطالعہ نہ صرف حقیقی ضرورت کے تحت کیا جائے، بلکہ یہ مطالعہ حتی الامکان ایک ہی ساتھ کیا جائے۔

ایک تجربہ

تدریسی وحدت کا ایک مفید تجربہ چند ماہ گذرے ملت ہائی سکول ملتان میں کیا گیا تھا۔ ربیع الاول کا مہینہ حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت باسعادت کا مہینہ ہے۔ یہ وہ مبارک مہینہ ہے جب دنیا بھر کے مسلمانوں کی گردنیں بارگاہ ایزدی میں اس احسان عظیم کے شکریے میں جھک جاتی ہیں جو رحمۃ اللعالمینؐ کی ذات بابرکات کی شکل میں دنیا پر کیا گیا۔ تاریخ عالم کا یہ معرکتہ الآرا واقعہ قدرتی طور پر مسلمان بچوں کے دلوں کو ہر سال گرماتا ہے۔ ملت ہائی سکول نے اس موقع سے فائدہ اٹھا کر ایک تدریسی وحدت مرتب کی۔ اس تدریسی وحدت نے دو ہفتے تک کفایت کی، یعنی دو ہفتے تک چھٹی سے لے کر دسویں تک تمام جماعتوں کو مختلف مضامین اسی وحدت کے ضمن میں پڑھائے گئے۔ ذیل میں انگریزی کو چھوڑ کر اس وحدت کے باقی تمام حصے درج کیے جاتے ہیں۔ انگریزی میں سے صرف ترجمے کا حصہ درج ہے۔

اُردو

ششم ——— ہفتم

پڑھنا:- کتاب "پیارے رسولؐ"۔ از افضل حسین ایم اے۔ بی۔ ٹی۔

نبی کسے کہتے ہیں۔ آپ سے پہلے۔ خاندان۔ پیدائش اور بچپن۔ جوانی۔ نبی ہوتے ہیں۔ ستایا جانا۔ حبشہ کی ہجرت۔ جعفر کی تقریر۔ مکے سے مدینے۔ لڑائیاں۔ فتح مکہ۔ آپ کیسے تھے۔ بچوں سے پیار۔ پیارے رسولؐ کی پیاری باتیں۔ آپ کا ہم پر حق۔

نعت ——— ہیں سب کے غمخوار محمد صلی اللہ علیہ وسلم

سبق ——— پیدائش اور بچپن میں سے ماضی استمراری اور ماضی بعید کے صیغے اور ان کی شناخت۔

لکھنا:- (۱) آپؐ سے پہلے دنیا کا کیا حال تھا (۲) اپنے دوست کو مدرسہ کے جلسۂ سیرت میں شریک ہونے کی دعوت دیجیے (۳) مجلس ادب کے معتمد کے نام درخواست میں جلسۂ سیرت میں "فتح مکہ" پر تقریر کرنے کی اجازت دیجیے (۴) حبشہ کی ہجرت کا حال لکھیے (۵) پیارے رسولؐ کی پیاری باتیں۔ اس عنوان پر ایک مضمون لکھیے (۶) بچوں کے ساتھ آپ کس طرح پیش آتے تھے (۷) اسلام۔ ایمان۔ بعثت۔ ہجرت۔ وداع۔ وحی۔ الہام۔ معجزہ۔ کرامت۔ خرق عادت وغیرہ الفاظ کی تشریح اور ان کا استعمال۔

بولنا:- (۱) اسلام سے پہلے عرب کی حالت اپنے ساتھیوں کو سنائیے۔ (۲) حجر اسود کا معاملہ آپ نے کس طرح نپٹایا۔ زبانی بتائیے (۳) آپؐ کے ساتھیوں کو کافروں نے کس طرح ستایا، ایک منٹ کی تقریر کیجیے (۴) آپؐ سے محبت کرنے کا کیا طریقہ ہے، چند جملوں میں بتائیے (۵) اپنا کام آپؐ کس طرح کر لیتے تھے (۶) پڑھی ہوئی نعت خوش الحانی سے اپنے ساتھیوں کو سنائیے۔

ہشتم ———————

پڑھنا:- کتاب پیارے رسولؐ (خواجہ عبدالغنی فاروقی)

از پیدائش تا ہجرت (صفحہ ۵ تا ۷۵) تجارت۔ امن کی کوشش۔ پہلی وحی۔ پہلے مسلمان۔ قریش کی ضد۔ حبشہ کی ہجرت۔ طائف کا سفر۔ اسلام کا مرکز۔ صہیب رومیؓ۔ قتل کا مشورہ۔ ہجرت۔ بھائی چارہ۔ جنگ بدر۔ اذان۔ جنگ احد۔ صلح حدیبیہ۔ بادشاہوں کے نام خط۔ فتح مکہ۔ حیرت انگیز ایثار۔ حجۃ الوداع

وفات۔ شمائل نبوی۔ نعت ظفر علی خاں، وہ شمع اجالا جس نے کیا چالیس برس تک غاروں میں۔

لکھنا:۔ (۱) اپنے چھوٹے بھائی کو ایک خط کے ذریعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی کی ترغیب دیجیے۔ (۲) ڈپٹی کمشنر کے نام درخواست میں جلسۂ سیرت منعقد کرنے کی اجازت طلب کیجیے (۳) جلسۂ سیرت کے لیے ایک پوسٹر کا مضمون بنائیے (۴) رسول کریمؐ نے حجۃ الوداع کے موقع پر جو تقریر ارشاد فرمائی اس کو سلیس اردو میں لکھیے (۵) رسول اکرمؐ کے پڑھے ہوئے حالات سے استفادہ کرتے ہوئے استقلال پر مضمون لکھیے (۶) صحابہ کی جاں نثاری کے دو واقعات مؤثر انداز میں حوالۂ قلم کیجیے جلسۂ سیرت پر رپورٹ کی روئداد لکھ کر اخبارات کے نام بھجوائیے۔

مشرک۔ منافق۔ سنت۔ اسوہ۔ دور جاہلیت۔ بعثت۔ مومن۔ ہجرت۔ معجزہ۔ خرق عادت۔ کرامت۔ استدراج۔ غزوہ۔ سریہ۔ انصار۔ بیت الشجر۔ بیت الرضوان وغیرہ الفاظ کی تشریح۔ مرکب اضافی و توصیفی کی مثالیں شمائل نبوی میں سے چنیے۔

بولنا:۔ (۱) اپنے ساتھیوں سے خطاب کر کے نجاشی کے دربار میں حضرت جعفر کی کی ہوئی تقریر سنائیے (۲) رسول اکرم کی پیروی لازمی ہے، اس عنوان پر دو منٹ تقریر کیجیے (۳) لالچ حق سے نہیں روک سکتا! رسول اکرم کی زندگی سے کوئی مثال اپنے ساتھیوں کو بتائیے۔ حجۃ الوداع کی تقریر کا خلاصہ زبانی بتائیے۔ جلسۂ سیرت کے لیے جو اشتہار آپ نے لکھا ہے اس کا مضمون لو لیجیے۔ نعت سنائیے۔

نہم و دہم

کتاب:۔ رحمت عالم (سید سلیمان ندوی)

اسماعیلؑ کا گھرانا۔ قریش۔ بنی ہاشم۔ ولادت۔ پرورش۔ فجار کی لڑائی۔ مظلوموں کی حمایت کا معاہدہ۔ کعبہ کی تعمیر۔ تجارتی سفر۔ رسول ہوتے ہیں۔ پہلے مسلمان ہونے والے۔ عام تبلیغ۔ ہجرت۔ مسلمانوں کے تین دشمن۔ جنگ بدر۔ جنگ اُحد۔ صلح حدیبیہ۔ دنیا کے بادشاہوں کو اسلام کی دعوت۔ فتح مکہ، عرب کے صوبوں میں اسلام کی عام منادی۔ دین کی تکمیل اور اسلامی نظام کی تاسیس۔

نماز۔ زکوٰۃ۔ روزہ۔ حج۔ حجۃ الوداع۔ وفات۔ اخلاق و عادات۔

آموزش

II

انشا :- جناب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مکی زندگی کے حالات قلم بند کیجیے (۲) صلح حدیبیہ کے واقعات لکھیے (۳) فتح مکہ کے واقعات مضمون کی صورت میں قلم بند کیجیے (۴) رسول اکرم کے اخلاق و عادات پر مضمون لکھیے (۵) اپنے دوست کو خط لکھیے اور انھیں نماز کی پابندی کی ترغیب دیجیے۔

ہفتم ۷ عربی

"من الدین والتاریخ" (للحاج عباس کہارہ)

مولد النبی صلی اللہ علیہ وسلم - نسب النبی صلی اللہ علیہ وسلم - عودتہ لامامہ بعد تمام الرضاعۃ - حالۃ العرب الاجتماعیہ قبیل ظہور النبی صلی اللہ علیہ وسلم بعثۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم - ابنداء القریبین الدعوۃ الی الاسلام سراً - اول ما فرض من ارکان الاسلام - اسلام عمر بن الخطاب - ہجرۃ الحبشۃ الاولی ہجرۃ الی یثرب - اول خطبۃ فی المدینۃ - تعالیم الرسول فی الجہاد غزوۃ حنین - غزوۃ تبوک - وفاۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم -

ترجمہ کرو :- رسول کریم مکہ میں پیدا ہوئے۔ آپ ہمیشہ سچ بولتے تھے۔ آپ نے کبھی گالی نہیں دی۔ آپ کے چچا کا نام ابوطالب تھا۔ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی کرتے ہیں۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم بہت رحم دل تھے۔ آپ بیماروں کو تسلی دیتے تھے۔

(۲) آپ یتیموں سے محبت کرتے تھے۔ آپ بڑے سخی تھے۔ آپ بڑے شرمیلے تھے۔ آپ صفائی کو پسند فرماتے تھے۔ اپنا کام ہاتھ سے کرتے تھے۔ آپ ہر ایک کی مدد کرتے تھے۔

(۳) بدر ایک گاؤں کا نام ہے۔ یہاں ہر سال میلہ لگتا تھا۔ مدینہ میں منافقوں کا ڈر تھا۔ یہ کافروں کی پہلی لڑائی تھی۔ کافروں کے ساتھ ایک ہزار سپاہی تھے۔ مسلمان تین سو تیرہ تھے۔ عتبہ اور ابوجہل اس لڑائی میں مارے گئے۔ ابوجہل کا سر کاٹا گیا۔ مکہ کے رئیس گرفتار کیے گئے۔

(۴) حضرت عمر کے اسلام لانے کا واقعہ عربی میں لکھئے۔

(۵) اسلام سے پہلے عرب کی حالت ماضی استمراری کے صیغوں میں تحریر کیجیے۔

عربی — ہشتم تا دہم

اسباق:- قل ان کنتم تحبون الله فاتبعونی یحببکم الله ویغفر لکم ذنوبکم والله غفور رحیم (آل عمران) من یطع الرسول فقد اطاع الله (نساء) لقد کان لکم فی رسول الله اسوۃ حسنۃ (احزاب) لقد من الله علی المومنین اذ بعث فیہم رسولاً من انفسہم یتلو علیہم اٰیتہ ویزکیہم ویعلمہم الکتب والحکمۃ وان کانوا من قبل لفی ضلال مبین (آل عمران)

(۲) یعمل بیدہ فینفع نفسہ ویتصدق (بخاری) من لبس شہرۃ فی الدنیا. البسہ الله ثوب مذلۃ فی القیامۃ (ترمذی) والله لا یومن والله لا یومن. قیل ومن یا رسول الله. قال الذی لا یأمن جارہ بوائقہ (بخاری) من فارق الجماعۃ شبراً فقد خلع ربقۃ الاسلام من عنقہ (ابوداؤد) ایاکم والحسد فان الحسد یاکل الحسنات کما تاکل النار الحطب- (ابوداؤد)

(۳) عن عائشۃ رضی الله عنہا قالت ما کان احد احسن خلقاً من رسول الله صلی الله علیہ وسلم ما دعاہ احد من اصحابہ ولا اہل بیتہ الا قال لبیک (بخاری) قال انس رضی الله عنہ خدمت رسول الله صلی الله علیہ وسلم عشر سنین فما قال اُف قط وما قال لشی لم صنعتہ ولا لشی ترکتہ لم ترکتہ- انک لعلی خلق عظیم (ن)

(۴) بلغ العلیٰ بکمالہ — کشف الدجیٰ بجمالہ
حسنت جمیع خصالہ — صلو علیہ و آلہ
طلع البدر علینا — من ثنیات الوداع

وجب الشکر علینا ما دعا للہ داع
ایہا المبعوث فینا جئت بالامر المطاع

قواعد:- حروف جار کا استعمال (سبق نمبر ۱، ۲ سے) افعال ۔ ماضی ۔ مضارع ۔ معروف ۔ مجہول ۔ منفی ۔ مثبت کی شناخت ۔ افعال ناقصہ کی شناخت ۔ ضمائر ۔ واحد جمع کی تفصیل ۔

ترجمہ:- (۱) اے لوگو! اپنے رب کی عبادت کرو۔ اللہ کے رسول سچے ہیں ، ان کے حکم کو مانو ۔ جو رسول کا فیصلہ نہیں مانتے وہ مومن نہیں ۔ خدا کا رسول تمہاری بھلائی چاہتا ہے ۔ اسے مومنوں کے ساتھ ہمدردی ہے ۔ خدا نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو رسول بنا کر بھیجا ۔

(۲) محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں نیک کام کرنے کی ہدایت فرمائی ۔ آپ کی پیروی میں نجات ہے ۔ آپ خدا کے آخری نبی ہیں ۔ تم خدا کی نافرمانی مت کرو ۔ رسول اللہ ہجرت کے وقت غار ثور میں تھے ۔ حضرت ابوبکر آپ کے ساتھ تھے ۔ مدینہ میں بچوں اور عورتوں نے آپ کا استقبال کیا ۔ ہجرت سے اسلام کو بڑی قوت حاصل ہوئی ۔

(۳) نبی کریم بہت بہادر تھے ، وہ دشمن کا دلیری سے مقابلہ کرتے تھے ۔ جنگ احد میں آپ کے دندان مبارک شہید ہوئے ۔ آپ بڑے مستقل مزاج تھے ۔ رسول اکرم کی زندگی سے شجاعت کا سبق حاصل کرو ، ہر کام استقلال سے کرنے کی عادت ڈالو ۔ رسول اللہ امیر اور غریب میں کوئی امتیاز نہیں فرماتے تھے ۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث کا اردو ترجمہ کیجیے ۔

(۲) قُلْ اِنْ کُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰہَ والی آیت کی تشریح میں پانچ عربی جملے لکھیے ۔

(۳) پڑھے ہوئے اشعار کا سلیس اردو میں ترجمہ کیجیے ۔

(۴) " " اخلاق کے عنوان پر دس جملوں کا مضمون لکھیے

(۵) حضرت انس کی روایت سے کیا سبق ملتا ہے ۔

انگریزی ——————— نہم دہم

ترجمہ :- ملک عرب کے لوگ قبیلوں میں بٹے ہوئے تھے ۔ ہر قبیلہ برسرپیکار رہتا تھا ۔ ان میں بہت سی برائی

عادات تھیں۔ شراب پیتے۔ جوا کھیلتے۔ اپنی لڑکیوں کو زندہ دفن کر دیتے۔ وہ توحید پر یقین نہیں رکھتے۔ بت بناتے اور ان کی پوجا کرتے۔ بتوں کو خانہ کعبہ میں رکھتے۔

(۲) محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہم سب کے لیے نمونہ تھے۔ آپ ہمیشہ اللہ تعالےٰ کا حکم مانتے تھے۔ نبی اکرم ملنسار اور رحم دل تھے۔ آپ بہت سخی تھے۔ مسلمانوں کی بڑی خاطر کرتے تھے۔ آپ سادہ زندگی بسر کرتے۔ آپ بازار سے سودا لے آتے۔ غلاموں اور مسکینوں کے ساتھ بیٹھ جاتے۔ اُن کے ساتھ کھانا کھاتے اور ہمیشہ خندہ پیشانی سے گفتگو فرماتے۔

(۳) مکہ مکرمہ کے پاس ایک میدان ہے۔ اسے عرفات کہتے ہیں۔ محمد صلعم اونٹنی پر سوار ہو کر عرفات میں تشریف لائے اور مسلمانوں کو ایک خطبہ دیا۔ آپ نے فرمایا۔ لوگو! بے شک تمہارا رب ایک ہے۔ اور ہر مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے۔ غلاموں کا دھیان رکھو۔ جو خود کھاؤ وہی ان کو کھلاؤ۔ پانچ وقت کی نماز ادا کرو۔ اگر تم نے قرآن پر عمل کیا تو گمراہ نہ ہو گے۔ اے مسلمانو! میں نے اپنا فرض ادا کر دیا ہے۔ خدا کے حضور میں تم گواہ رہنا۔ جو لوگ یہاں نہیں۔ ان تک میرا پیغام پہنچا دو۔

(۴) طائف، مکہ کے قریب ایک بستی ہے۔ رسول کریمؐ چاہتے تھے کہ طائف کے لوگوں میں تبلیغ کریں۔ لہٰذا آپ وہاں تشریف لے گئے۔ آپ نے اپنا پیغام دیا، مگر انھوں نے کوئی توجہ نہ دی۔ آپ کے ساتھ برا سلوک کیا۔ گالیاں دیں شریک راستہ کے دونوں طرف کھڑے ہو گئے۔ آپ پر پتھر برسائے، آپ لہولہان ہو گئے۔ آپ کے جوتے خون سے بھر گئے۔ لیکن آپ نے بد دعا نہ کی، بلکہ اللہ تعالےٰ سے ان کے لیے ہدایت کی دعا کرتے رہے۔

تاریخ

ششم (VI) تا ہشتم (VIII)

عرب کا ملک۔ حجاز۔ پیغمبروں کا سلسلہ۔ ابراہیم کی نسل۔ کعبہ۔ اسمٰعیل کا گھرانہ۔ قریش۔ بنی ہاشم قبل از اسلام عرب کی سیاسی معاشرتی اور اخلاقی حالت۔ حضور کی پیدائش اور بچپن۔ بعثت۔ ہجرت۔ غزوات

نہم (IX) و دہم (X)

اسلام سے پہلے عرب کی حالت۔ حضور کی پیدائش۔ بعثت۔ دعوت۔ طائف کا سفر۔ ہجرت مدینہ۔ غزوات۔ حجۃ الوداع۔

جغرافیہ — ششم تا دہم ×

عرب کا محل وقوع ۔ حدود اربعہ ۔ آب و ہوا ۔ پیداوار ۔ آب و ہوا کا باشندوں پر اثر ۔ خطائے جغرافیہ میں عرب کا مقام اور خصوصیات ۔ عرب کے نقشہ کا مطالعہ اور مندرجہ ذیل مقامات کا تعین اور ان کی تاریخی اہمیت ۔
مدینہ منورہ ۔ مکہ معظمہ ۔ طائف ۔ عرفات ۔ خیبر ۔ احد ۔ مزدلفہ ۔ صفا ۔ مروہ ۔ عرب کے گردونواح کے ممالک ۔

شہریت — ششم تا ہشتم

(۱) انسانی برادری ۔ الناس کلہم کاسنان المشط ۔

(۲) میل جول ۔ ہمسایوں کے حقوق ۔ قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم ۔ واللہ لا یؤمن ۔ واللہ لا یؤمن ۔ قیل ومن یا رسول اللہ ۔ قال الذی لا یامن جارہ بوائقہ ۔

(۳) مسلمان بھائی بھائی ہیں ۔ کل مومن اخوۃ

(۴) اطاعت امیر ۔ پابندی اوقات ۔ مساوات ۔ بصورت نماز با جماعت ۔

حفظانِ صحت — دہم ×

شخصی حفظان صحت کے متعلق نبی کریم کی تلقین و عمل ۔ طہارت جسمانی ۔ دانتوں کی صفائی ۔ غسل وضو ۔ مثلاً الطہور شطر الایمان ۔ معتدل غذا ۔ خوراک ۔ روزہ کا فلسفہ ۔ خالی معدہ ۔ احادیث کی روشنی میں ۔

سائنس — ششم VI

سبق :- پانی کی صفائی ۔ عمل تقطیر

اسلام میں صاف پانی کی تعریف ۔ عن ابی امامۃ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ۔ ان الماء طہور ۔ لا ینجسہ الا ما غلب علی ریحہ و طعمہ و لونہ ۔ (ابن ماجہ)

ترجمہ تشریح :- تجربہ گاہ میں پانی کی ناصاف پذیر کثافتوں کو دور کرنے کے لیے فلٹر پیپر سے عمل تقطیر کو واضح کیا جائیگا ۔

سبق ______ ہفتم VII

مقناطیس ۔ مقناطیسی سوئی سے رخ معلوم کرنا ۔

ومن حیث خرجت فول وجہک شطر المسجد الحرام (بقرہ)

اسلام میں کعبہ کی اہمیت، اور مقناطیسی سوئی کی افادیت۔

سبق۔ ——————— ہشتم و نہم

موسمیات ۔ بادل۔ بارش ۔ اولے۔ شبنم ۔ پالا ۔ کہر۔

سمندروں سے آبی بخارات کا بننا۔ ہوا کا بننا۔ ہوا کا انہیں بادلوں کی صورت میں ادھر ادھر لے جانا۔ پھر ان کا پانی کی شکل میں برسنا۔ قرآن اور سائنس کے تطابق کے ساتھ واضح کیا جائے گا۔

واللہ الذی ارسل الریاح فتثیر سحابا فسقناہ الی بلد میت فاحیینا به الارض بعد موتھا کذالک النشور ۔ (سورۃ فاطر)

سبق ——————— دہم

روشنی (اللہ نور السموات والارض)

روشنی خود نظر نہیں آتی لیکن جن چیزوں پر پڑتی ہے وہ چیزیں نظر آتی ہیں۔ اسی طرح خدا کی ذات خود تو دیکھی نہیں جاتی۔ لیکن ہر ذرہ میں اس کا جلوہ دیکھا جا سکتا ہے۔

ریاضی ——————— ششم

سبق:۔ کسور اعشاریہ پر عبارتی سوالات کرائے جائیں گے ۔ مثلاً

(۱) آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی کل عمر کا ۲۵ء۰ حصہ گذر نے پر حضور کو نبوت ملی۔ اس کے بعد باقی عمر کا ۵ء۰ آپ نے مکہ میں گذارا اور باقی دس سال آپ نے مدینہ منورہ میں گذارے بتاؤ حضور کی عمر کتنے سال کی تھی۔

(۲) فتح مکہ کے موقع پر آنحضرتؐ کے ساتھ دس ہزار صحابہ تھے۔ یہ تعداد صحابہ کی اس تعداد کا ۰۸ء۰ حصہ تھی جو حجۃ الوداع کے موقع پر آنحضرت کے ساتھ تھی۔ بتاؤ حجۃ الوداع کے موقع پر حضور کے ساتھ کتنے صحابہ تھے۔

سبق :۔ نفع نقصان ——————— ہفتم

تعارف :۔ تجارت اور سود کا فرق، نفع اور نقصان کی حقیقت مادی اور روحانی نقطۂ نظر سے۔ سوالات کی نوعیت

اس طرح ہوگی۔

(۱) ایک خدا ناشناس شخص نے فصل کی ابتدا میں ۱۰۰ من گندم آٹھ روپے من کے حساب سے خرید کر اسٹاک کرلی اور نئی فصل آنے سے کچھ عرصہ پیشتر ۲۰ روپے فی من کے حساب سے فروخت کر دی۔ بتاؤ اس نے کتنا نفع فی صد ناجائز طور پر کمایا۔

(۲) ایک شخص نے ۸۰۰ روپے کی کتابیں خرید کر ۱۰۰۰ روپے میں فروخت کردیں۔ اس کا نفع فیصد معلوم کرو۔ نیز اگر وہ کل نفع میں سے ۱۵۰ روپے سیرت کمیٹی کو عطیہ دے تو اس کے نفع اور بچت کے متعلق اپنی رائے میں اظہار کرو۔

سبق :- تقویم کا نامہ (Calendar) ہشتم نہم

تعارف :- سن عیسوی - ہجری - آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت - شمسی اور قمری سال کا فرق آں حضرت کی زندگی کے اہم واقعات کی تاریخیں اور ان کے مطابق ہفتہ کا دن معلوم کرنا۔ مثلاً۔

(۱) ۲۲ اپریل ۵۷۱ء	یوم ولادت
(۲) ۱۲ فروری ۶۱۰ء	نزول وحی
(۳) ۱۲ ستمبر ۶۲۲ء	ہجرت
(۴) ۸ جون ۶۳۲ء	یوم وفات

سبق :- سود مفرد ———— جماعت دہم

تمہید :- دنیا کے تین بڑے معاشی نظام - سرمایہ داری نظام - اشتراکی نظام - اسلامی نظام - جدید بنکنگ کی ابتدائی تاریخ اور اس کا ارتقا۔

ربوا کا مفہوم :- قرآن مجید کی روشنی میں (الروم ۴، البقرہ ۳۸) جاہلیت کا ربوا (مطابق تحقیق قتادہ مجاہد - جصاص اور امام رازی) بیع اور ربوا میں اصولی فرق - ربوالفضل (مسلم - بخاری - ابن ماجہ) سود کے اجزائے ترکیبی :- راس المال پر اضافہ - اضافے کی تعیین بلحاظ مدت - معاملے میں اس کا مشروط ہونا سود کی علت تحریم - حرمت سود کی شدت (البقرہ ۳۸) سود، ہرجانہ نہیں - سود کرایہ نہیں - سود، دائن کا

خطرہ مول لینے کا معاوضہ نہیں ۔ سود دائن کے ایثار کا معاوضہ نہیں ۔

شرح سود :- معقول شرح سود، کوئی چیز دنیا میں ہے ہی نہیں۔ قدیم ہندوؤں ۱۵ سے ۶۰ فی صد سالانہ انگلستان کے ۱۹۲۷ء کے منی لینڈرس ایکٹ کی رو سے جائز شرح ۴۸ فی صد سالانہ۔ امریکہ کی عدالتوں میں سود خور مہاجنوں کے لیے جائز شرح ۳۰ سے ۶۰ فی صد سالانہ۔ شرح فی صد سالانہ اور شرح فی روپیہ ماہوار وغیرہ وغیرہ

مثالیں :- (۱) زید نے ایک عربی گھوڑا ۱۲۰۰ روپے کو خریدا۔ بکر کے ہاتھ ۱۳۰۰ روپے کو بیچ دیا۔ بتاؤ زید کو کتنے روپے زیادہ ملے۔ (سود)

(۲) اللہ دین نے الٰہی بخش سے ایک من کھجور کے بدلے ۴۲ سیر لینے کا سودا کیا۔ بتاؤ الٰہی بخش کو ۱۲ من کھجوروں کے بدلے کتنی زائد کھجوریں ملیں گی۔ (۲۴ من ربوالفضل)

(۳) اسلم نے حمید کو ۵۰۰ روپے ۲ سال کے لیے اس شرط پہ قرض دیے کہ حمید اسے اس کے راس المال پہ ۵ فی صد سالانہ شرح سے زائد رقم ادا کرے گا۔ بتاؤ ۲ سال بعد اسلم کو اپنے راس المال پہ کتنے روپے زیادہ ملے (۵۰ روپے سود)

(۴) ۲۰۰۰ ہزار روپے کا سود مفرد ۲ فی صد سالانہ شرح سے ۲ سال کا معلوم کرو۔ (۸۰ روپے)

نتائج

اس تدریسی وحدت کا تفصیلی ذکر کرتے ہوئے پرنسپل ملت ہائی سکول لکھتے ہیں :-

اسلامی جمہوریہ پاکستان کے بنیادی مقاصد میں یہ بھی شامل ہے :- کہ

(۱) پاکستانی مسلمانوں کو انفرادی اور اجتماعی طور پر اس قابل بنایا جائے کہ وہ اپنی زندگیوں کو اسلامی تعلیمات اور احکام کی روشنی میں قرآن و سنت کے مطابق ڈھال سکیں۔

(۲) اس قسم کی سہولتیں مہیا کی جائیں گی کہ پاکستانی مسلمان قرآن و سنت کے مطابق زندگی گزارنے کا صحیح مفہوم سمجھ جائیں۔

(۳) اسلامی اخلاق کا صحیح فہم پیدا کیا جائے۔

ان بلند مقاصد کے حاصل کرنے کا ایک مفید طریقہ یہ ہے کہ نصاب مدرسہ کا مطالعہ اسلامی تعلیمات کی روشنی میں کیا جائے۔ اس خیال سے پچھلے سال ماہ رمضان المبارک میں ایک مختصر سی تدریسی وحدت تیار کی گئی تھی جس میں ماہ صیام کو مرکزی نقطہ قرار دے کر مختلف مضامین کا مطالعہ کیا گیا تھا۔ یہ تجربہ خاصہ کامیاب ثابت ہوا۔ اس سے مدرسے کے اساتذہ کا حوصلہ بڑھا، اور انھوں نے اس تجربے کو وسیع تر پیمانے پر آزمانے کا فیصلہ کیا۔ اس غرض کے لیے اسوۂ مبارکہ کو بطور مرکزی موضوع چنا گیا۔

اساتذہ نے کم و بیش دو ہفتوں تک اس مسئلے پر ہر پہلو سے غور کیا۔ بحث و تمحیص کے بعد جو عملی تجویزیں تیار ہوئیں انھیں ایک کتابچے کی شکل دے دی گئی۔ فیصلہ یہ کیا گیا کہ کوئی دو ہفتے تک چھٹی سے لیکر دسویں جماعت کے تمام مضامین کا مطالعہ اس طور پر کیا جائے کہ سرورِ کونین کی پاکیزہ زندگی اس مطالعہ کا مرکزی نقطہ بنی رہے۔ سرکاری طور پر مجوزہ نصاب کو اس انداز میں پیش کرنے میں کوئی خاص دقت پیش نہیں آئی۔ اس سارے منصوبے کو احاطۂ تحریر میں لاکر اسے ایک کتابچے کی شکل دیدی گئی۔

اس تجربے کے نتائج توقع سے بڑھ کر ثابت ہوئے۔ اس سے اساتذہ اور طلبہ دونوں کو حقیقی ذہنی اور اخلاقی بالیدگی حاصل ہوئی۔ چوں کہ منصوبے کا سارا خاکہ اول سے آخر تک استادوں کے ہاتھوں تیار ہوا تھا۔ اس لیے یہ کام ان کے لیے دوران ملازمت بالیدگی کا درجہ رکھتا تھا۔ طلبہ نے اس تدریسی وحدت میں جس ذوق و شوق اور سرگرمی سے حصہ لیا وہ اس بات کا کھلا ہوا ثبوت تھا کہ طلبہ کے مقاصد سے کام لینے سے نصاب مدرسہ کے مختلف مضامین سے کتنی زندگی اور تر و تازگی پیدا کی جا سکتی ہے۔ طلبہ کے لیے یہ کام روایتی تدریس کی بجائے ایک دلچسپ سرگرمی بن گیا۔ ایک ایسی سرگرمی جسے ان کی پوری ہستی کی تائید حاصل تھی وہ اس سرگرمی میں اس لیے شریک نہیں تھے کہ استاد کا حکم یا امتحان کا خوف انھیں اس بات پر مجبور کر رہا تھا۔ بلکہ یہ سرگرمی ان کی اپنی دلی پسند اور جذباتی تشنگی کا ایک پاکیزہ جواب تھی۔ اس تدریسی وحدت کے ضمن میں طلبہ نے جس قدر تحریری کام کیا وہ الگ فائلوں میں رکھا گیا۔ ان فائلوں کو دیکھنے سے فوراً یہ اندازہ ہو جاتا ہے کہ یہ تحریری کام خوبی اور ذاتی کاوش کے لحاظ سے عام تحریری کام سے کسی قدر بلند ہے۔

اس تدریسی وحدت کے طفیل مدرسے کو والدین اور عوام کا جو وسیع تعاون حاصل ہوا وہ اس کا

ایک اور روشن پہلو ہے۔ ہر مدرسے کی کامیابی کے لیے ایک لازمی شرط یہ ہے کہ نہ صرف والدین بلکہ باقی لوگ بھی اس کے مقاصد اور اس کے طریقہ ہائے کار کو سمجھیں۔ روایتی نصاب کی تدریس میں اس امر کے مواقع بہت کم حاصل ہوتے ہیں۔ بیرٹ پر تدریسی وحدت تیار کر کے ملّیت ہائی سکول نے اپنے آپ کو نہ صرف مقامی طور پر مرکزِ توجہ بنا لیا۔ بلکہ صوبے بھر کے ماہرین تعلیم نے اس تعلیمی تجربے میں دلچسپی لی اور اس کے نتائج کو سراہا اب کی مرتبہ مدرسہ ارادہ رکھتا ہے کہ بیرٹ پر ایک وسیع تر تدریسی وحدت تیار کی جائے اور پچھلے تجربے کی روشنی میں اس کو جامع اور زیادہ پُرمعنی بنایا جائے۔

اسلام کی علمی پیاس

خداداد نعمان

"پڑھ اپنے پروردگار کے نام سے"

اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِي خَلَقَ ۚ خَلَقَ الْإِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ۚ اِقْرَأْ وَرَبُّكَ الْأَكْرَمُ ۙ الَّذِي عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ۙ عَلَّمَ الْإِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ ۚ

پڑھ اپنے پروردگار کے نام سے جس نے پیدا کیا ۔ آدمی کو اپنی محبت سے بنایا ۔ پڑھ اور تیرا پروردگار بڑا کریم ہے جس نے قلم کے ذریعے علم سکھایا ۔ انسان کو وہ باتیں سکھائیں جو اس کو معلوم نہ تھیں ۔"

یہ ہیں وہ پانچ مقدس آیات جن سے نزول وحی کی ابتدا ہوئی ۔ ان آیتوں کا سب سے پہلے نازل ہونا واضح کر دیتا ہے کہ ان کے ذریعے اللہ تعالےٰ کو انسانیت کے ارتقا کے لیے کتنا مکمل اور جامع لائحہ عمل پیش کرنا مقصود تھا ، اور ان الفاظ سے کتنے عظیم الشان پیغام کی وضاحت منظور تھی ۔ پہلی آیت اس حقیقت کو بیان کرتی ہے کہ تمام کائنات کو پیدا کرنے والا وہی قادر مطلق ہے ۔ دوسری آیت سے یہ واضح ہوتا ہے کہ تمام مخلوق میں انسان ہی صنعتِ خداوندی کا مکمل شاہکار ہے کیوں کہ اللہ تعالےٰ اس کو اپنی انتہائی رحمت اور محبت سے پیدا کیا ہے محض اس لیے کہ اس کی پیدائش کے مقاصد نہایت ہی ارفع و اعلیٰ ہیں ۔ اور یہی بلند مقاصد ہیں جن کی وجہ سے انسان کو تمام مخلوق پر شرف عطا ہوا ہے ۔ اس خالق لم یزل نے اپنے لطف وکرم سے اپنی رحمت اور محبت کو انسانی فطرت میں سمویا ہے ۔ تاکہ اس کی بنائی ہوئی دنیا میں انسان کے معاشی اور جماعتی عمل سے رحمت اور محبت عام ہو جائے ۔ تیسری آیت یہ بتاتی ہے کہ تمام تعظیم اور تعریف اللہ ہی کے لیے ہے ۔ کیوں کہ وہی سب کا پروردگار ہے ۔ اور وہ دنیا میں صرف انسان ہی کی برتری اور جلال کو پسند کرتا ہے کیوں کہ انسان ہی ایک ایسی مخلوق ہے جو اللہ تعالےٰ کے بعد قابل تعریف ٹھہرائی گئی ہے ۔ قرآن مسلسل طور پر انسانیت کے ارتقا کا حامی ہے ۔ بلکہ

قرآن کا موضوع ہی انسانی معراج ہے۔

اُس کتاب (قرآن) میں تمہاری (برتری) عظمت پوشیدہ ہے؟

اب دیکھنا یہ ہے کہ وہ کیا وسائل ہیں جنہیں انسانی عظمت کا ذریعہ قرار دیا گیا ہے۔ تاکہ باقی مخلوق پر اس کا شرف قائم رہے؟ اس کا جواب چوتھی اور پانچویں آیت سے واضح ہوتا ہے کہ انسان یہ شرف قلم کے علم سے پائے گا یعنی اللہ تعالےٰ قلم کے ذریعے انسان پر وہ تمام اسرار کھول دے گا جن کا اس کو ابھی تک کچھ علم نہیں ہے۔ اور ان مخفی اسرار کا پا جانا ہی دراصل انسانیت کا شرف اور ارتقا ہے۔ ان آیتوں کے الفاظ انسانی معاشرے میں علم کے عام اور ہمہ گیر ہونے کی صاف صاف پیش گوئی کرتے ہیں اور ترجماتِ قرآن سے دنیا میں جو علمی اور سائنسی انکشافات اور ایجادات ہو رہی ہیں وہ اس پیشین گوئی کی تصدیق کر رہی ہیں۔ علم کے ذریعے سے ذہنی صفائی اور قلبی روشنی حاصل کرنا ہی انسان کی پیدائش کا بڑا مقصد ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سب سے پہلے جو وحی اتری اس کا پہلا لفظ ہی اِقْـرَأْ (پڑھو) تھا۔ اور نہ صرف یہ بلکہ اللہ تعالےٰ نے قرآن میں انسان کے لیے اس دعا کی بھی تاکید فرمائی۔

"اے اللہ میرے علم کو وسعت عطا فرما"

پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام فرمایا کرتے تھے کہ علم کا حصول ہر مسلمان مرد اور مسلمان عورت پر فرض ہے۔ قرآن میں حضرت آدم علیہ السلام کے قصے سے واضح ہوتا ہے کہ آپؑ کو محض علم کے ذریعے سے ہی فرشتوں پر شرف حاصل ہوا تھا۔ اور یہ علم آپ کو براہِ راست اللہ کی طرف سے دیا گیا تھا۔

"اور اس (اللہ) نے آدم کو تمام چیزوں کا علم بخشا"

فرشتے مسلسل طور پر عبادت گذار مخلوق ہونے کے باوجود علم کی نعمت اور نور سے محروم تھے۔ اور ان کی اس محرومی نے ان کو آدم کی بارگاہ میں سربسجود ہونے پر مجبور کر دیا تھا۔ یہاں یہ امر واضح ہو جاتا ہے کہ علم کے بغیر پاکیزہ سے پاکیزہ مخلوق بھی ذلیل ہونے پر مجبور کر دی گئی ہے۔

انسانی تمدن کی تاریخ میں یہ شہادت صاف موجود ہے کہ جدید تہذیب اور سائنس کی ترقی میں قرآنی نظریات کا صاف پتہ چلتا ہے۔ قرآن کے مخالفین تک اس پر متفق ہیں کہ آسمانی کتابوں میں صرف قرآن ہی ایک

ایسی کتاب ہے جس نے علم و فن کو انسانی تمدن اور معاشرت کے ارتقا کی بنیاد قرار دیا ہے۔ یورپین علما، نے قرآن کے اس احسان کا بار بار ذکر کیا ہے کہ یورپ کی موجودہ سائنس اور علمی ترقی بغداد اور قرطبہ کی مسلمان یونیورسٹیوں کی مرہون احسان ہے۔ تاریخ بتاتی ہے کہ مسلمان حکمرانوں اور مسلمان علما، نے پہلی بار علوم کے مختلف شعبوں میں خوش گوار امتزاج اور ہم آہنگی پیدا کی۔ ان کے علمی کارنامے ان کے تفریحی مشاغل نہ تھے۔ بلکہ علم حاصل کرنا اور اس میں عروج تک پہنچنا ان کے ایمان کا جزو تھا۔ قرآن کے نزول سے پیشتر علم ذاتی یا انفرادی طور پر ہی حاصل کیا جاتا تھا کیوں کہ اس کے حاصل کرنے کے ذرائع محدود تھے۔ اور علم حاصل کرنے کا انحصار کسی شخص واحد کے رجحان طبیعت اور ذوق پر تھا۔ باقاعدہ درس گاہیں کہیں نہ تھیں۔ کوئی مستقل ادارہ تھا۔ اس وقت کی حکومتیں عوام کی تعلیم کی ذمہ دار نہ تھیں۔ یونان اور روم اگرچہ زمانہ قدیم کی انتہائی تہذیب یافتہ قومیں تھیں۔ لیکن ان میں بھی قومی تعلیم کا کوئی نظام نہیں تھا۔ "انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا" میں لکھا ہے کہ "وہاں بچوں اور جوانوں کے لیے حکومت کی طرف سے باقاعدہ سکول بالکل نہیں تھے۔" یہی انسائیکلو پیڈیا روم کے متعلق یہ بتاتا ہے کہ

> جمہوری نظام سے پیشتر رومیوں کا نظام تعلیم خاندانی طرز پر تھا۔ باپ کو بیٹے کی زندگی پر پورا اختیار ہوتا تھا اور اگر وہ اپنی تربیت اولاد کو مذہبی، اخلاقی یا معاشرتی تعلیم دینے میں ناکام رہتا تو عوام کی نگاہوں میں اس کی کچھ عزت نہیں رہتی تھی۔ اور وہ ہمیشہ کے لیے ہدف ملامت بن جاتا تھا"

لیکن اس کے باوجود یہ تعین نہیں کیا جا سکتا کہ روم میں باقاعدہ طور پر نظام تعلیم تھا یا نہیں ـــــــ

مگر قرآن نے ابتدا میں ہی تعلیم کو ایک قومی مسئلہ قرار دے دیا تھا۔ مدینہ میں رسول کریمؐ نے جنگ بدر کے بعد جنگی قیدیوں سے تعلیمی فدیہ طلب فرمایا تھا۔ زر تاوان لینے کے بجائے آپؐ نے ان سے فرمایا کہ وہ مدینہ کے بچوں کو کتابت سکھا دیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ رسول کریمؐ کو قوم کی تعلیم سے کس قدر دلچسپی تھی۔ دلچسپ حقیقت یہ ہے کہ عرب قوم کو جہاں اپنی دوسری وحشیانہ صفات پر فخر تھا۔ وہاں انہیں اپنے اُمّی ہونے پر بھی ناز تھا۔ اس لیے اگر پیغمبر نے عربوں کی تعلیم کی طرف توجہ فرمائی تو اس کا یہ مطلب نہیں تھا کہ آپ نے ماحول اور وقت کے تقاضا کے تحت ایسا کیا تھا۔ بلکہ آپ نے قرآنی احکام کے تحت فرمایا تھا۔ آپؐ چوں کہ معلم ربانی تھے۔ اس لیے قلم کے علم کے مخفی اسرار کی فضیلت کو خوب جانتے تھے۔ چناں چہ آپ نے منشائے الٰہی کے مطابق قرآنی آیات کا مفہوم

واضح فرماتے ہوئے مسلمانوں کو تعلیمی اور فنی اقدار سے روشناس کیا۔ آپ کے اس عظیم الشان اسوۂ کی تصدیق قرآن نے بھی کی ہے۔

"پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے اہل عرب پر خدا کے احکام واضح کیے اور انہیں پاکیزہ بنا کر انہیں کتاب اور حکمت سکھائی۔"

ہجرت کے بعد مدینہ سب کے لیے توجہ کا مرکز بن گیا تھا۔ پیغمبرؐ کا شہرہ ہونے کے باعث مختلف اقوام اور ملکوں خصوصاً ایران شام، یونان اور افریقہ کے لوگ آپؐ کے پیغام کو سننے کے لیے آتے تھے۔ آپؐ کے ارشادات میں علم کی فضیلت اور ضرورت کا ذکر برابر شامل ہوتا تھا۔

"جو علم کی باتیں کرتا ہے، وہ خدا کی تعریف بیان کرتا ہے۔ جو علم کی تلاش میں رہتا ہے، خدا کی عبادت کرتا ہے، اور جو دوسروں کو علم سکھاتا ہے وہی خدا کے رستے پر چل رہا ہے۔"

"علم ہی امر و نہی میں تمیز کرنے کا ذریعہ ہے۔ علم موت کا راستہ آسان اور روشن بناتا ہے۔ علم صحرا میں تمہارا دوست ہے۔ تنہائی میں تمہارا مونس ہے۔ جدائی میں تمہارا رفیق ہے۔ مصیبت میں تمہارا سہارا ہے۔ دوستوں کی محفل میں تمہارا حسن ہے۔ اور دشمن کے مقابلے میں تمہارا کارگر ہتھیار ہے۔"

"ایک عالم کے قلم کی سیاہی شہید کے خون سے زیادہ مقدس ہے۔"

"علم حاصل کرو خواہ تمہیں کہیں بھی جانا پڑے۔"

"جو کوئی علم کے لیے اپنا گھر چھوڑتا ہے۔ خدا کے راستے پر چلتا ہے۔"

"حکمت الٰہی پر ایک گھنٹے تک غور و خوض ستر سال کی عبادت سے افضل ہے۔"

"علم و ادب کی محفل میں ایک گھنٹے تک بیٹھنا ہزار شہیدوں کے جنازے میں شامل ہونے کی نسبت زیادہ پسندیدہ ہے اور ہزار راتوں کی عبادت سے زیادہ افضل ہے۔"

یہ تھے وہ مبارک کلمات جو شارح اسلام کے مبارک لبوں پر جاری رہتے۔ اب اندازہ کیجیے کہ خدا کے احکام ہوں اور نبیؐ کی زبان سے ان کا اظہار ہو تو ان کا اثر کتنا گہرا، کتنا ہمہ رس اور کس قدر ہمہ گیر ہوگا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ علم وقت کا ایک اہم فریضہ اور چلتا ہوا اصول بن گیا۔ سب کی آنکھیں کھل گئیں اور دماغ روشن ہو گئے کہ خدا کی عبادت کا

از علم کے ذریعے حاصل کی ہوئی روحانی اصلاح میں ہی ہے۔ سب نے سمجھ لیا کہ صحیح غور و فکر ہی دراصل روحانی اصلاح کا اصلی مفہوم ہے۔

"ایک لمحے کے لیے حکمت الٰہی پر غور و فکر کرنا ستر سال کی عبادت سے افضل ہے"

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم تھی اور قرآن کا پیدا کیا ہوا اثر تھا کہ عرب اقل قلیل مدت میں دنیا بھر کے معلم بن گئے۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے مختلف علوم کے متعلق جو خطبے دیے انھیں پڑھ کر آج کل کے مفکرین اور علما دم بخود ہیں۔ آپ کی علم سے محبت ضرب المثل ہے۔ یہ آپ ہی کا قول ہے کہ جو علم کے راستے میں فوت ہوا، زندہ ہے۔ آپ نے رسول اکرم کی تعلیمات کو دلائل اور اصول کے امتزاج کے ساتھ پیش کیا۔ اور علم و حکمت کے صحیح اصولوں کی وضاحت فرمائی۔ مدینہ میں اور بھی بہت سے عالی دماغ لوگوں کی کوشش سے علم و ادب کی بنیادیں مضبوط ہو گئی تھیں۔ سید امیر علی اپنی "سپرٹ آف اسلام" میں لکھتے ہیں کہ "علم کے چشمے مدینہ سے پھوٹ پھوٹ کر دمشق کی طرف بہ رہے تھے"۔

دمشق اموی حکومت کا پایہ تخت ہونے کی وجہ سے ان تمام اقوام کا مرکزی شہر تھا، جو امویوں کے زیر اثر تھیں۔ امویوں کے خاتمے تک بہت سے مسلمان حکما اور علما، علم دنیا میں شہرت پا چکے تھے۔ ان حکما کے نظریات آئندہ نسلوں کی ایک مقدس امانت سمجھے جاتے ہیں۔ خلیفہ منصور اپنے ادبی اور علمی کارناموں کے لحاظ سے بے مثال شہرت کا حکمران تھا۔ ایک انگریز مصنف اس کے متعلق لکھتا ہے کہ۔

"خلیفہ کا کردار بالکل بے داغ تھا۔ اس کی ذہنی اور اخلاقی خوبیوں کی وجہ سے ایک ایسی علمی تحریک جاری ہو گئی تھی۔ جو بعد میں تمام اسلامی دنیا میں پھیل گئی۔ خلیفہ نے غیر ملکی زبانوں کی تصنیفات کا عربی زبان میں ترجمہ کرایا۔ وہ بذات خود ایک بہت بڑی علمی شخصیت اور اعلیٰ پایہ کا ریاضی دان تھا۔ اور اس کے پاس ہر قسم کی کتب کے نایاب ذخائر موجود تھے"۔

منصور کے دربار میں ہر قوم اور مذہب کے اہل کمال موجود تھے ۱۵۶ھ ہجری میں ہندوستان کے ایک بہت بڑے ریاضی دان عالم نے بغداد پہنچ کر سنسکرت کی مشہور زیچ سدھانتا منصور کی خدمت میں پیش کی تھی۔ منصور کے بعد اس کے جانشین حکمرانوں نے بھی علم و ہنر کی خوب سرپرستی کی۔ بلکہ وہ مختلف فنون کے بانی

بھی تھے۔ ان کے عہد میں مسلمانوں کی علمی اور ادبی سرگرمیاں تو انتہا کو پہنچ گئی تھیں۔ اس خاندان کے پہلے چھ بادشاہوں میں بالخصوص مامون، کے دور میں اسلامی تہذیب پورے عروج پر تھی۔ دارالحکومت تو گویا علم و حکمت کا گہوارہ تھا۔

"علم و حکمت مسلمان کا گم شدہ مال ہے جہاں سے بھی ملے حاصل کرو۔"

کی مشہور حدیث کے تحت عباسی خلفاء نے دنیا کے مختلف ممالک میں اپنے قاصد روانہ کیے تاکہ ہر جگہ علمی ذخائر کا پتہ لگائیں۔ وہ ان قاصدوں کے ساتھ باقاعدہ طور پر اپنے مترجم بھیجتے تھے۔ تمام ملک میں مدرسے اور دانش گاہیں قائم تھیں۔ ہر شہر میں عوامی کتب خانے تھے۔ ماضی کے حکما اور فلاسفروں کی تصانیف کے مطالعہ کے لیے عام سہولتیں پیدا کر دی گئی تھیں۔ یونانی حکما اور فلاسفروں کی تصانیف کے مطالعہ کے لیے عام سہولتیں پیدا کر دی گئی تھیں۔ یونانی حکما ارسطو۔ اقلیدس۔ افلاطون اور ثاسیلیوس کے نظریات خصوصیت سے زیر مطالعہ تھے۔ بادشاہ بذات خود علمی اور ادبی مجالس اور فلسفیانہ مباحثوں میں شامل ہوتے تھے۔ اس قسم کی مجلسیں اور مباحثے عوام کی علمی دلچسپی کا باعث بن گئے۔ مختلف صوبوں کے گورنر بادشاہ کی تقلید میں علم و حکمت کے اتنے شیدائی بن گئے کہ وہ اپنی ادبی سرگرمیوں میں اور اپنی نگرانی میں تصنیف و تالیف کے کام میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی ہمیشہ کوشش کرتے۔ علم کے لیے سفر، چوں کہ مسلمانوں کا مذہبی فریضہ تھا۔ اس لیے دور دور کے مسلمان طلبہ قرطبہ بغداد، اور قاہرہ، کی یونیورسٹیوں میں جمع رہتے۔ انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا میں ایک اسلام دشمن مصنف نے لکھا ہے کہ اسلامی علوم کا عروج یونیورسٹیوں کے قیام کی وجہ سے تھا۔ ان یونیورسٹیوں میں مسلمان طلبہ کے علاوہ عیسائی طالب علموں کی تعداد بھی خاصی ہوا کرتی تھی۔ مشہور پوپ، گربرٹ، نے، قرطبہ کی یونیورسٹی میں ہی تعلیم پائی تھی المعیزنے جسے یورپ کا مامون کہا جاتا ہے۔ قاہرہ میں ایک سائنسی ادارہ قائم کیا، جس میں بیکن کا موجودہ تصورات زیر بحث تھا نیز، میں، اور لیسی اور اسپین میں عرب حکمرانوں نے متوازی حیثیت میں سائنس اور ادب کو ترقی دی الغرض بحر اوقیانوس سے لے کر بحر الکاہل تک کے ملکوں میں مسلمانوں کی رہنمائی میں فلسفہ اور ادب کی ترقی انتہائی عروج پر تھی۔

استخراجی طریق تعلیم جسے غلطی سے اہل مغرب کی طرف منسوب کیا جاتا ہے حقیقتاً مسلمانوں کی ہی ایجاد ہے

اور سب سے پہلے انہوں نے ہی اس کو استعمال کیا تھا۔ جدید طریق تعلیم میں "معلوم سے نامعلوم کی طرف چلو" کا اصول بغداد کے مدرسے میں جاری تھا۔ سید امیر علی لکھتے ہیں کہ یہ طریق تعلیم عربوں کے طریق تدریس کا ایک کامیاب اصول تھا۔ اور ان کے تعلیمی انکشافات میں ایک کارگر طریق کار تھا۔

سائنس اور ادب میں مسلمانوں کے کارناموں کا بیان ایک بہت بڑی تفصیل چاہتا ہے۔ منصور کے دور حکومت میں نامور ہیئت دان حکیم ماشاء اللہ نے اصطرلاب اور اجرام فلکی کی ماہیت اور ان کی حرکات پر بیش بہا رسائل لکھے۔ یہ رسالے آج بھی ماہرین فلکیات کے لیے مشعل ہدایت ہیں۔ احمد بن محمد النہاوندی کی المستمد، ایک ایسی زیچ ہے۔ جو قدیم یونان اور ہندوستان کی زیچوں کی نسبت زیادہ صحیح ہے۔ دوسرے ہیئت دانوں مثلاً خالد بن عبدالملک اور علی ابن یحیٰی نے بھی نہایت صحیح اور واضح جدولیں مرتب کیں۔ انہوں نے سورج گرہن، چاند گرہن، اور آفتاب کے نقطۂ اعتدال (وہ زمانہ جب سورج استوا کو قطع کرتا ہے) کے نہایت تفصیلی مشاہدے کیے اور ان کے اثرات کو قلم بند کیا۔ انہوں نے تمام اجرام فلکی کا گہرا مطالعہ کیا۔ محمد بن موسیٰ الخوارزمی نے مشہور ہندوستانی زیچ سدھانتا، کا نئے سرے سے ترجمہ کیا، اور اس میں اپنے مشاہدات کی بھی ایزادی کی۔ الکندی نے حساب، جیومیٹری، فلسفہ، موسیقات، بصریات، اور طب پر تقریباً دو سو ضخیم کتابیں لکھیں۔ وہ یونانی زبان کا بہت بڑا عالم تھا، اور اس کی تصنیفات ارسطو کی تصنیفات کے ہم پلہ خیال کی جاتی ہیں۔ اسے فارسی اور سنسکرت کے علوم میں بھی کمال حاصل تھا۔ اس نے اپنی تحقیقات میں قدیم ایتھنز اور اسکندریہ کی روایات کو بھی شامل کیا ہے، اسے اجرام فلکی کے مطالعہ کا خاص شغف تھا، بلکہ عشق تھا۔ اس کی مشہور کتاب، زیچ ابی معشر، علم ہیئت میں بڑے بلند رتبے کی کتاب ہے۔ موسیٰ بن شاکر نے سائنسی انکشافات کے علاوہ اجرام فلکی کی حرکات کے متعلق جو اندازے لگائے ہیں وہ یورپ کے موجودہ انکشافات کے عین مطابق ہیں۔ اس نے کمال صحت کے ساتھ سورج کی حرکات اور اس کے مدارج کی تعیین کی اور زمین کو گول ثابت کر کے اس کا رقبہ بھی دریافت کیا، اور یہ دریافت اس زمانے میں کی جب کہ یورپ میں یہ عقیدہ تھا، کہ زمین چپٹی ہے۔ ابوالحسن نے دوربین ایجاد کی جسے بعد میں مراغہ اور قاہرہ کی رصدگاہوں میں استعمال کیا گیا۔ البطانی، کی جن جدولوں کا لاطینی زبان میں ترجمہ کیا گیا وہ صدیوں تک یورپ کے ہیئت دانوں کی رہنمائی کرتی رہیں۔ ان کی بدولت آج تک مصنف کا نام زندہ ہے۔ علی بن عاجور،

اور ابوالحسن علی بن عماجور نے چاند کی حرکات کے متعلق جو اندازے لگائے تھے وہ آج تک مستند سمجھے جاتے ہیں۔ مشہور عالم طبیعیات، عبدالرحمن صوفی نے ستاروں کے نور کی پیمائش کے طریق میں اصلاحات کیں۔ خلیفہ مکتفی کے بیٹے جعفر نے اجرام فلکی کی حرکت کے مشاہدات کے متعلق ایک نہایت دلچسپ کتاب لکھی۔ الکوہی نے علم سیارگان پر بیشمار تصنیفات لکھی ہیں۔ مشہور و نامور ریاضی دان اور ماہر فلکیات عبدالوفا نے نہایت گہرے مشاہدے کے بعد، زیج الشامل لکھی، جو ایک یادگار جدول ہے۔ فلکیاتی مشاہدوں اور علم مثلث میں تالمیع اور ماس کا تعارف سب سے پہلے اسی نے کرایا تھا، اور اسکندریہ کے قدیم ہیئت دان بطلیموس نے حرکات قمر کے جو نامکمل نظریات اور اصول وضع کیے تھے اس نے ان کی بھی اصلاح کی اور مرکز زمین کے متعلق قدیم انکشافات کی عملاً تصدیق کی۔

قاہرہ میں ابن یونس نے گھڑی کا لٹکن ایجاد کیا تھا، اور وقت کے شمار کا طریق وضع کیا۔ اس کی عالم آرا کتاب، زیج الاکبر الحاکمیہ، جب منصۂ شہود پر آئی تو بطلیموس کے نظریات کلیتۂ لوگوں کے ذہنوں سے اتر گئے۔ اس کتاب کی شہرت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ تھوڑی مدت میں ہی اس کے ترجمے فارسی، یونانی، منگولی، چینی اور دوسری کئی زبانوں میں ہو گئے۔ ابن یونس کی وفات کے بعد نامور ماہر فلکیات اور بصریات ابن ہیثم نے انکشافات کا سلسلہ جاری رکھا۔ ابن ہیثم نے علم بصارت پر کئی کتابیں لکھیں۔ جن میں سے ایک کتاب کا ترجمہ ایک اطالوی فاضل رنسر (RINSUR) نے لاطینی زبان میں کیا۔ ابن ہیثم نے بصارت کے متعلق یونان کے غلط نظریوں کی درستی کی اور یہ ثابت کیا کہ آنکھوں میں روشنی کی شعاعیں کسی خارجی جسم سے پاتی ہیں۔ اس نے پردۂ شبکی کو بصارت کا اصل مقام قرار دیا۔ جہاں سے اس کا اثر اعصاب بصارت کی مدد سے دماغ پر پڑتا ہے۔ اس نے یہ بھی انکشاف کیا کہ روشنی کا انعطاف ماحول کی کثافت سے مختلف ہوتا ہے۔ اور اپنی کتاب معیار حکمت میں نظریہ قوت پر سیر حاصل بحث کی۔ لیکن اس نے جن نظریات سے دنیا کو متعارف کرایا انہیں غلطی سے مغربی علماء کی طرف منسوب کیا جاتا ہے۔ اس کو اس مضمون پر مکمل عبور حاصل تھا، اس نے غیر ذی روح اشیاء کی حرکت اور رفتار اور ان سے بلندی سے گرنے کے وقت کی صحیح تعیین کی، وہ مذاہب شعری کے اصول سے بھی پوری طرح آگاہ تھا۔

اسپین میں احیاء علوم کا جذبہ نہایت استقلال اور جوش کے ساتھ کارفرما تھا، قرطبہ، گرنیڈا، سوراکیہ، ٹولیڈو اور دوسرے شہروں میں عوامی کتب خانے اور مدرسے تھے، جہاں مختلف علوم کی مفت تعلیم جاری تھی۔ طلبہ کے لشکر کے لشکر کھنچے چلے آرہے تھے۔ ایک انگریز قرطبہ کے متعلق لکھتا ہے :-

قرطبہ کے خوب صورت محلوں اور حسین باغوں کی تعریف ممکن نہیں۔ ایک عام آدمی تو کیا، گرجوں میں معصوم راہبائیں بھی قرطبہ کے حسن کے گیت گاتی تھیں۔ ذہین علماء نے اس کو یورپ میں تہذیب کا مرکز بنا دیا تھا، جہاں عیسائی اور مسلمان طلبہ جمع رہتے تھے۔ قرطبہ میں علم کے ہر شعبے کی تعلیم دی جاتی تھی۔ بالخصوص طب پر مسلمانوں نے انتہائی توجہ مبذول کر رکھی تھی۔ اندلس کے اطبا اور جراحوں کے انکشافات کی مثالیں گذشتہ صدیوں میں ہرگز نہیں ملتیں۔ ہیئت، جغرافیہ، کیمیا، اور تاریخ وغیرہ کے مضامین کی تعلیم عام تھی۔ یہاں کا ہر شخص عربی شاعری کا بے پناہ ذوق رکھتا تھا، اور ہر مقرر کی تقریر رنگین اشعار سے مزین ہوتی تھی، جس سے وہاں کے حکمران طبقے کے ذوقِ علم کا پتہ چلتا تھا۔"
(لین پول (مورزان اسپین))

کچھ اسی قسم کے الفاظ سید امیر علی نے بھی لکھے ہیں:-

دسویں صدی میں، سپین شعر و ادب کی ترقی کی مثال جدید دور میں مشکل سے ملتی ہے، عیسائی، یہودی، اور مسلمان ایک ہی زبان بولتے تھے۔ ان کے گیت ایک ہی زبان میں تھے۔ سائنس اور ادب میں ان کی تحقیق یکساں تھی۔ ان کے اختلافات مٹ چکے تھے اور ان کی معیشت میں ہم آہنگی اور تعاون تھا۔ قرطبہ کی مسجد میں عیسائی اور مسلمان طلبہ کی تعداد ہزاروں تک تھی۔ جو وہاں فلسفہ اور دوسرے تمام علوم کی تعلیم پاتے تھے۔" (سپرٹ آف اسلام)

یورپ میں سب سے پہلی رصدگاہ کا تخیل عربوں سے ہی لیا گیا تھا۔ مشہور ریاضی دان جابر بن عقیل کی نگرانی میں ایک مینار تعمیر کیا گیا، جہاں سے فلکیاتی مشاہدات کا کام ہوتا تھا۔ لیکن جب موروں کی حکومت ختم ہوئی اور اسپین سے ان کا نشان مٹ گیا تو اس مینار کو چرچ کے گھنٹہ گھر میں تبدیل کر دیا گیا۔ کیوں کہ اہلِ شہر اس کے استعمال سے بے خبر تھے۔

مغربی افریقہ بھی اپنی علمی شہرت میں کچھ کم نہ تھا۔ مراکو، فیض اور الجیریا میں قرطبہ اور گرنیڈا کے مساوی علمی ادارے

ادبی سرگرمیاں جاری تھیں۔

گیارھویں صدی کا آغاز وسطی ایشیا میں سیاسی انقلاب کا زمانہ تھا۔ افغانستان ایران وغیرہ محمود غزنوی کے حیطۂ اقتدار میں آ چکے تھے۔ محمود محض ایک فاتح ہی نہ تھا، بلکہ بہت بڑا علم دوست حکم ران تھا۔ اس کے دربار میں علماء اور فضلاء کی بہت بڑی تعداد تھی، جن میں ابوریحان البیرونی۔ ایک باکمال ریاضی دان اور فلسفی تھا۔ اس کا دماغ ہمہ رس اور سہہ فہم تھا۔ القانون مسعودی، اس کی ایک یادگار تصنیف ہے، وہ سولہ سال تک ہندوستان میں رہا اور ہندو ادب اور فلسفے کا مطالعہ کیا۔ اور اپنی تمام معلومات اور مشاہدات کو ایک کتاب کی صورت میں قلم بند کیا۔ اس کتاب کا انگریزی میں ترجمہ کیا گیا ہے جو لندن میں محفوظ ہے۔ البیرونی نے ریاضی، تاریخ، ریاضیاتی جغرافیہ، طب اور کیمیا پر نادر کتب تصنیف کیں۔ اس نے ہندوؤں کو اسلامی علوم سے متعارف کرایا۔ اس وقت سائنس اور فلکیات کے متعلق ہندوؤں کے نظریات بالکل نامکمل تھے اور انہوں نے اہل چین کی طرح اسلامی علوم سے بہت کچھ اخذ کیا، اور اسلامی نظریات کو اپنی قومی ضروریات کے مطابق اپنایا۔

محمود کے جانشینوں نے بھی علم اور ادب کی برابر سرپرستی کی، سلجوقی بادشاہوں کے ذوق اور فیاضی کی بدولت جو علمی سرگرمیاں ہوئیں وہ عباسی دور سے کسی طرح کم نہ تھیں۔ الپ ارسلان۔ طغرل۔ اور ملک شاہ۔ علمی اور ادبی ذوق کے لحاظ سے خاص طور پر مشہور رہیں۔ ملک شاہ کے عہد میں عمر خیام اور عبدالرحمٰن الحسینی، جیسے ہیئت دانوں کی نگرانی میں رصد گاہیں قائم تھیں، اور انھوں نے علم ہیئت میں جو اصلاحات کیں وہ آج تک بھی رائج ہیں — چنگیز خاں کی سرکردگی میں تاتاریوں کی خوں ریزیوں کی وجہ سے کچھ عرصے تک علمی سرگرمیاں بند ہو گئی تھیں۔ لیکن جونہی وسط ایشیا کی اس وحشی اور سفاک قوم نے اسلام قبول کیا تو ان کے ذہن و دماغ بھی تبدیل ہو گئے۔ ان کی تمام تخریبی کارروائیاں تعمیری کاموں میں تبدیل ہو گئیں، اور ہمیشہ کے لیے علم و فن کے محافظ بن گئے۔ یہ ایک واضح حقیقت ہے کہ ان کے کردار میں یہ نمایاں تبدیلی محض قرآنی تعلیم کا اثر تھی۔ سلطان خدا بندہ جس کا سلسلۂ نسب چنگیز خاں سے چھٹی جگہ جا کر ملتا ہے، بے پناہ علمی ذوق کا انسان تھا جس نے نہایت خلوص کے ساتھ سائنس اور ادب کی سرپرستی کی، نصیرالدین طوسی، مؤیدالدین دمشقی، فخرالدین المراغی، محی الدین المغربی، اور علی شاہ بخاری جیسے فلاسفروں کو منگول جیسے بادشاہوں کی سرپرستی حاصل تھی۔

ایشیائی حکومتوں کا بانی تیمور شعر و ادب کا بہت بڑا سرپرست تھا۔ وہ بذات خود ایک مقتدر مصنف اور اعلیٰ پائے کا قانون دان تھا۔ اس نے شاندار مدرسے اور مسجدیں تعمیر کرائیں جو اس کے علمی ذوق کی گواہ ہیں۔ مشہور جامع العلوم ہستی مولانا جامیؒ اور سہیلی، اور علی شیر امیر جیسی بزرگ، یہ شخصیتیں تیمور کے دور حکومت میں گذری ہیں۔ تیمور کے بیٹے مرزا نے اپنے باپ کی شاندار علمی روایات کو قائم رکھا۔ اس کی حکومت تقریباً نصف صدی تک قائم رہی، جس میں علم و ادب کی خوب گہما گہمی رہی۔ تیمور کا پوتا الغ بیگ بہت بڑا ہیئت دان تھا۔ اس نے مراغہ میں ایک رصدگاہ اپنی نگرانی میں قائم کی تھی، اور باپ دادا کی طرح علم و ادب کو خوب رونق دی۔

"مصر میں ابن الشہیر نے ریاضی کو خوب ترقی دی۔ تمام دنیا اس پر متفق ہے کہ جبر و مقابلہ کے فن کو وضع کرنے اور ترتیب دینے میں عربوں کو بہت بڑی فضیلت حاصل ہے۔ عربوں کو جب ہندوؤں کے حساب سے واقفیت ہوئی تو انہوں نے یونانی کتب کے تراجم میں جبر و مقابلہ کا بھی اضافہ کر دیا۔ اس طرح عام جبر و مقابلہ کے بانی عرب ہی ہیں۔ اس فن پر مسلمان کتابوں میں سب سے زیادہ مشہور محمد بن موسیٰ الخوارزمی کی کتاب۔ کتاب الجبر و مقابلہ ہے۔ اس کتاب میں یونان، ہندوستان اور فارس کے اصول جبر بھی شامل ہیں، اور انہی کی مدد سے عربی جبر و مقابلہ کا استخراج کیا گیا۔ خوارزمی نے یہی طریق اپنی زیچ میں بھی استعمال کیا ہے۔ (رسالہ زمانہ)

خوارزمی کے علاوہ ابوکامل شجاع، اور ابوالوفا بوزجانی نے بھی جبر مقابلہ پر اچھی کتابیں تصنیف کی ہیں۔ ابوالوفا نے ریاضی پر بے شمار کتابیں لکھیں۔ اس نے قدیم یونان کے ریاضی دان ابرخس کی کتاب جبر و مقابلہ کا ترجمہ کیا۔ اور دعوؤں کو ہندسی دلائل سے ثابت کیا۔ جب یورپ نے نئی کروٹ لی اور وہاں علمی اور تمدنی بیداری پیدا ہوئی تو انہوں نے جبر و مقابلہ کو عربوں سے اخذ کیا۔ ("زمانہ")

علم ہندسہ میں عربوں نے یہ جدت کی کہ اس علم کو مثلث پر منطبق کیا۔ سب سے پہلے پانچویں صدی میں ابوالہیثم المعروف نے ایک ایسی کتاب لکھی جس میں عددی اور ہندسی اصول جمع کیے اور ان کی نوعیں اور قسمیں مقرر کیں اور ان پر حسی اور منطقی امور سے دلیلیں قائم کیں۔ جبر و حساب میں ہندسی اور عددی جہات سے مسائل استخراج کرنے کے نئے اسلوب داخل کیے اور اصول مساوات قائم کیا۔ موسیٰ بن شاکر کے بیٹوں محمد، حسن، اور احمد نے ایسے ہندسی مسائل ایجاد کیے جو اسلاف میں کسی نے استخراج نہیں کیے تھے۔ مثلاً زاویہ کو تین مساوی قسموں میں منقسم کرنے کا مسئلہ انہی کی ایجاد ہے

الغرض عربوں نے علم ہندسہ میں وہ نازک اور پیچیدہ مسائل حل کر کے دکھائے جس کی نظیر بہت کم ملتی ہے۔ دائرہ کو سات اقسام میں تقسیم کرنے کا طریق انہی کا وضع کردہ ہے۔ اور انہوں نے اس پر بہت سی کتابیں اور رسالے لکھے۔"

بحوالہ جرجی زیدان (رسالہ "زمانہ" کانپور)

ریاضیاتی جغرافیہ کے متعلق ابن حوقل اور ابو فدا کی تصانیف آج بھی قدر و قیمت کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہیں جس زمانے میں یورپ والے زمین کے گول ہونے پر عقیدہ رکھنے والوں کو زندہ جلا دیتے تھے۔ مسلمانوں نے گلوب کے ذریعے سے جغرافیہ کی تدریس شروع کی، اور طبعی جغرافیہ سے دنیا کو متعارف کرایا۔ انہوں نے تجربات کے ذریعے تمام پرانے غلط نظریات کی اصلاح کی اور انہیں افادی حیثیت میں دنیا کے سامنے پیش کیا۔ کیمیا۔ علم نباتات یعنی علم طبقات الارض میں مسلمانوں کو کامل عبور حاصل تھا۔ موجودہ دور میں یہ حقیقت واضح ہو چکی ہے کہ علم کیمیا مسلمانوں کی ایجاد ہے۔ جابر موجودہ علم کیمیا کا باپ خیال کیا جاتا ہے اور موجودہ علم کیمیا اسی کی طرف منسوب کیا جاتا ہے۔

طب اور جراحت کے فنون پر بھی مسلمانوں کا کچھ کم احسان نہیں۔ اس میں شک نہیں کہ فن طب کو یونان میں عروج حاصل ہوا۔ لیکن مسلمانوں نے بھی اسے کچھ کم ترقی نہیں دی۔ طب کا موجودہ معیاری کمال مسلمانوں ہی کی وجہ سے ہے۔ آج کل یورپ میں طب کا سائنٹیفک مطالعہ عربوں کا ہی اکتشاف ہے۔ انہوں نے کیمیاوی دواخانوں کی ایجاد کی۔ اسلامی دور میں حکومتوں کے زیر اہتمام کثرت سے شفاخانے قائم تھے۔ جن کے انچارج حکومت کی طرف سے متعین ہوتے تھے۔ دواؤں کی قیمتیں ان کی اہمیت کے مطابق مقرر تھیں۔ طبی درسگاہوں میں طبابت اور دواسازی کے باقاعدہ امتحانات ہوتے تھے۔ امیدواروں کو کامیابی کے بعد سندات عطا ہوتی تھیں۔ ان سندات کے بغیر کسی کو بھی طبابت کا پیشہ اختیار کرنے کی اجازت نہ تھی۔ تقریباً ہر شہر میں ایک شفاخانہ ہوتا تھا۔ جس کے اخراجات حکومت کے ذمہ ہوتے تھے۔ مسلمانوں میں نامور اطبا کی فہرست بڑی طویل۔ عبدالخلف ابن عباس نہ صرف اعلیٰ پائے کا طبیب تھا بلکہ ایک باکمال جراح بھی تھا۔ اس نے بہت سے خطرناک اور مشکل ترین اپریشن کیے۔ عورتوں کے اپریشن میں وہ اکثر تربیت یافتہ نرسوں کی خدمات حاصل کرتا تھا۔ اس کے جراحی کے آلات دیکھ کر اسلامی فن جراحت کے کمال کا پتہ چلتا ہے۔ بو علی سینا، تمام علوم پر یکساں حاوی تھا۔ فلسفہ، فلکیات، ریاضی اور طب پر اسے کامل عبور تھا۔ اسے مشرق کا

ارسطو بھی کہا جاتا ہے۔ اس کی مشہور کتاب قانون، فن طب میں آج تمام دنیا کی رہنمائی کر رہی ہے۔

علم الاعضا یونانیوں کے ہاتھ میں نامکمل حالت میں تھا۔ لیکن مسلمانوں نے اس کی اصلاح کر کے ترقی دی انہوں نے علم نباتات میں تقریباً دو ہزار جڑی بوٹیوں کا اضافہ کیا۔ اس ضمن میں، زکریا رازی کی ایک کتاب بہت شہرت رکھتی ہے۔ قاہرہ، بغداد، فیض اور قرطبہ میں جڑی بوٹیوں کی تربیت کے لیے باقاعدہ باغات لگائے گئے تھے۔ مسلمانوں نے علم نباتات کا نام علم طبقات الارض رکھا تھا۔

علم تاریخ تمام علوم کی ماں ہے۔ اور بے شک وشبہ مسلمانوں کی ایجاد ہے۔ ابن خلدون کی تاریخ عالم مسلمانوں کی ذہنی بلندی کا بہت بڑا ثبوت ہے۔ ایک اور مسلمان مؤرخ تقی الدین مقریزی ابن خلدون کا ہمعصر تھا۔ اس نے مصر کی جو تاریخ لکھی ہے، اس میں قدیم مصر کی سیاست، مذہب، معاشرت اور آثار قدیمہ کے متعلق مفصل اور تصویری معلومات ہیں۔ چونکہ عرب ایک تاجر اور سیاح قوم تھی، اس لیے انہوں نے علم کی تلاش میں دنیا کے تقریباً تمام ملکوں کے بری اور بحری سفر کیے۔ ملاحوں کا کمپاس انہی کی ایجاد ہے۔ انہوں نے افریقہ میں اپنی بستیاں آباد کیں۔ چین، لنکا اور ہندوستان سے اپنے تجارتی تعلقات استوار کیے۔ اپنے مقبوضہ ممالک میں نہریں کھدوائیں اور سڑکوں کا انتظام کیا۔ اسپین میں انہوں نے آبپاشی کے لیے رہٹ اور پمپ کے طریقے جاری کیے۔ بنجر اور غیر آباد زمینیں باغات میں تبدیل کر دیں۔ انہوں نے زیتون کے درختوں کے ذخیرے لگائے۔ صنعت وحرفت کو ترقی دی۔ مزدوروں کی انجمنیں بحال کیں۔ کیوں کہ پیغمبر نے ان پر مزدور کا احترام واجب ٹھہرایا تھا۔ انہوں نے کاغذ، ریشم، چمڑے اور لوہے کی صنعتوں کو فروغ دیا۔ قرطبہ کے قالین۔ مراکو کے اونی تکیے۔ گرینیڈا اور سیویل کے ریشمی کپڑے۔ ٹولیڈو کے زیورات اور لوہے کے ہتھیار اور سالیرکا کاغذ تمام دنیا میں مشہور تھے، اور ہر ملک میں ان کی مانگ تھی۔ مسلمان معماروں اور انجینیروں کے کارناموں کا اس سے زیادہ کیا ثبوت ہوگا کہ مشرق اور مغرب میں ان کی یادگاریں مرجع عام بنی ہوئی ہیں۔ قرطبہ کی مسجد اور آگرے کا تاج محل دنیا کے سات عجائبات میں شمار ہوتے ہیں۔

علم وفن سے دلچسپی مسلمان مردوں تک ہی محدود نہ تھی۔ بلکہ زمانہ نبوی کے تحت طبقہ اناث کو بھی علم وادب سے پورا شغف تھا۔ حضرت عائشہ رضہ کے خطبات تاریخ میں مشہور ہیں۔ دور دور سے لوگ آپ کے خطبوں کو سننے آتے تھے۔ حضرت عائشہ رضہ کو قرآن پر پورا پورا عبور حاصل تھا اور اخلاقیات کی تعلیم دی جاتی تھی۔ حکمران طبقے کی

عورتیں اور بیٹیاں مدرسوں اور ہسپتالوں کے قیام میں بہت ایثار سے کام لیتی تھیں۔

الغرض یہ مختصر سے واقعات نمونتہً تاریخ اسلام سے پیش کیے گئے ہیں ورنہ تفصیلی ذکر کو کئی دفتر چاہئیں مسلمانوں نے قرآن کے ان الفاظ "پڑھ اپنے پروردگار کے نام پر" کی اپنے عمل سے تصدیق کی۔ علم کی تلاش میں دنیا کا چپہ چپہ چھان مارا اور دنیا کے سامنے نئے نئے علوم پیش کر کے اس کی کایا پلٹ دی۔ خدا کے بخشے ہوئے قلم کے علم سے علم و فضل کی نہریں بہا دیں۔ جدید دور میں علمی انکشافات اور سائنسی ایجادات قرآن کی ان پیشین گوئیوں کی تصدیق کر رہی ہے جو اس نے سینکڑوں برس پہلے کی تھیں۔ اس حقیقت سے کسی کو انکار نہیں کہ موجودہ دور کی علمی ترقی میں مسلمانوں کا بہت بڑا حصہ ہے۔ چوں کہ اسلامی تعلیمات کا لب لباب ہی انسانیت کی فلاح ہے۔ اس لیے اسلام نے انسانیت کی حفاظت اور نجات کے لیے بہت ہی نمایاں رول ادا کیا ہے۔ اور جہاں اسلامی علوم نے دنیا کو دور ماضی میں فائدہ پہنچایا ہے۔ وہاں مستقبل میں اسلام اور قرآن ہی دنیا کی رہنمائی کریں گے۔

ثانوی مدارج میں ریاضی کا نصاب

فضل محمد خاں

مسلسل نمبر ۵

اس مضمون سے متعلق چار قسطیں جولائی، ستمبر، اکتوبر، اور دسمبر ۱۹۵۶ء کے شماروں میں شائع کی جا چکی ہیں۔ ان اقساط میں ان تمام نظریوں پر بحث کی گئی تھی جو ثانوی مدارج میں ریاضی کے نصاب کے سلسلے میں مختلف مغربی اور ایشیائی ممالک میں پیش کیے جا رہے ہیں۔ جولائی کے شمارے میں یہ بتایا گیا تھا کہ ثانوی مدارج میں بھی ریاضی کو سب طلبہ کے لیے لازمی قرار دینا ضروری ہے۔ اور سب لڑکوں کے لیے ریاضی کا نصاب بھی ایک ہی ہونا چاہیے (جیسا کہ آج کل سیکنڈری بورڈ لاہور نے کیا ہے) ستمبر کے شمارہ میں یہ واضح کیا گیا تھا کہ ثانوی مدارج میں ریاضی کی حیثیت ایک اختیاری مضمون کی ہونی چاہیے، جیسا کہ پشاور یونیورسٹی نے آئندہ سالوں کے لیے تجویز کیا ہے۔ اس تجویز کے ماتحت جو لڑکے ریاضی کو پڑھنا چاہیں وہ پڑھ سکتے ہیں اور جو چھوڑنا چاہیں وہ چھوڑ سکتے ہیں۔ یعنی اس مضمون کی حیثیت ایسی ہونی چاہیے۔ جیسی کہ آج کل سیکنڈری بورڈ لاہور نے، اُردو، فارسی، ڈرائنگ، سائنس وغیرہ کو دی ہے۔ اکتوبر کے شمارے میں یہ بتایا گیا تھا کہ ثانوی مدارج میں ریاضی کے دو حصے کر دینے چاہئیں، لازمی حصہ اور اختیاری حصہ۔ لازمی حصے میں ریاضی کے ان موضوع کو شامل کر دیا جائے جن کی زندگی کے روزمرہ مسائل میں افادی حیثیت ہے۔ اور یہ حصہ سب کو پڑھنا ہوگا۔ اختیاری حصے میں وہ موضوع شامل ہونے چاہئیں جو اُن طلبہ کے لیے ضروری ہوں جو اعلیٰ اداروں میں جا کر ریاضی پڑھنا چاہتے ہیں۔ یا جن میں ریاضی پڑھنے کی خصوصی صلاحیتیں ہوں یا جو ان پیشوں کو اختیار کرنا چاہتے ہوں۔ جن کا دارومدار ریاضی پر ہے۔ اس قسم کی تجویز کراچی بورڈ میں رائج ہے۔ دسمبر کے شمارے میں ریاضی کی افادی اہمیت کو وضاحت سے بیان کیا گیا تھا۔ اس شمارے میں اس بات کی وضاحت کی گئی تھی کہ اس مضمون کا امور روزمرہ میں کیا حصہ ہے۔ مختلف پیشوں کا انحصار اس مضمون پر کہاں تک ہے۔ اور دیگر مضامین کی تحصیل کے لیے اس مضمون کا جاننا کہاں تک ضروری ہے اس مسئلہ کا معقول حل اسی وقت ہو سکتا ہے جب ہم تدوین نصاب کے اصولوں پر بھی بحث کریں

تدوین نصاب کے اصولوں پر بحث سے ہم صحیح معنوں میں اس نتیجہ پر پہنچ سکیں گے کہ ریاضی کا کونسا مضمون ثانوی مدارج میں لازمی ہونا چاہیے، اور کونسا اختیاری اور کیوں۔ لہٰذا ان اصولوں کے پیش نظر ریاضی کی حیثیت ثانوی مدارج میں کیا ہونی چاہیے۔ الغرض تدوین نصاب کے اصولوں پر بحث سے تصویر کا صحیح رُخ ہمارے سامنے پیش ہو سکے گا۔ اس لیے ضروری سمجھا گیا ہے کہ اس شمارے میں تدوین نصاب کے اصولوں پر تفصیلی بحث کی جائے۔

تدوین نصاب کے اصول

ایک مدرسے کا ترقی پذیر نصاب کئی اجزا پر مشتمل ہوتا ہے، یہ قومی کلچر کی وضاحت کرتا ہے۔ یہ نسلی روایات کو جیتا ہے۔ یہ سماجی، سیاسی اور معاشی رجحانات کو واضح کرتا ہے۔ ان سے بالاتر یہ متعلم کی ضروریات اور صلاحیتوں کو بھی پورا کرتا ہے۔

مدرسہ ایک ایسا ادارہ ہے جس کو یہ سماج صغریٰ کہتے ہیں۔ اس کا فرض ہے کہ یہ ماضی اور حال کی روحانی، اخلاقی اور تمدنی اقدار کو قائم رکھے اور ان کو آئندہ نسلوں تک پہنچائے۔ اس کا یہ فرض بھی ہے کہ یہ ان تمام قدروں کو چھانٹ دے جو معاشرے کے لیے کوئی اہمیت نہیں رکھتیں۔ مگر اس کا سب سے بڑا فرض یہ ہے کہ یہ ترقی پذیر ماحول کے ساتھ ساتھ مطابقت کرتا رہے تاکہ یہ مستقبل کی ضروریات کو پورا کر سکے۔ اگر یہ ترقی پذیر ماحول کے ساتھ مطابق کرنے سے قاصر رہے گا تو یہ مردہ روایات متروک طریقہ ہائے تعلیم، بے سود نصاب اور ان کے مقاصد کا ذخیرہ بن جائے گا۔ مدرسے کے نصاب، اس کے تدریسی طریقوں اور اس کی روایات میں وقتاً فوقتاً مکمل تبدیلی کی ضرورت ہوتی ہے تاکہ یہ ترقی پذیر سماج کی تجدید میں ممد ثابت ہو، اور یہ اُن تعلیمی اور نصابی تبدیلیوں کے ساتھ مطابقت کر سکے جو ایک نئے معاشرتی ماحول نے پیدا کی ہیں۔

اس کا نتیجہ صریح یہ ہے کہ اگر ان تمام اجزا میں سے جن پر نصاب کی تدوین کا دارومدار ہے۔ کسی ایک یا زیادہ میں تبدیلی واقع ہو تو مدرسے کے نصاب میں لازماً تبدیلی کی ضرورت ہے۔ دلیں مدرسے کا وہ نصاب جو انیسویں صدی کے آخری سالوں کے لیے یا بیسویں صدی کے شروع کے سالوں کے لیے ضروری خیال کیا جاتا تھا۔ موجودہ دور کی ضروریات کو پورا نہیں کر سکے گا۔ اور ان تدریسی طریقوں میں بھی جن کا دارومدار قدیم نفسیاتی نظریوں پر ہے موجودہ نفسیاتی رجحانات کے پیش نظر تبدیلی کی ضرورت ہے۔

متذکرہ بالا بحث کے پیش نظر ضروری ہے کہ ہم ان معاشی اور سماجی حالات کا جائزہ لیں جن کو اپنانے کے لیے ہم تگ و دو کر رہے ہیں۔ اور ان نفسیاتی نظریات اور رجحانات کا بھی تجزیہ کریں جو موجودہ دور کے نفسیاتی ماہرین نے پیش کیے ہیں ۔

یا معاشرتی دور

اس نئے معاشرتی دور کی جس میں سے ہم آج کل گذر رہے ہیں، دو اہم خصوصیات ہیں۔ اوّلاً اس دور میں صنعتی تمدن عروج و وجود میں آیا ہے۔ دوسرے اس دور میں مادی تعلیم مواقعات کے مہیا کرنے کا مطالبہ انتہا کو پہنچ گیا ہے۔ اگر ہم ان دونوں خصوصیات کو ملا دیں تو ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ نیا معاشرتی دور صنعتی جمہوریت کا دور ہے ۔

یہ دور ہماری زندگی پر کئی طرح سے اثر پذیر ہے، اس دور میں سائنٹیفک اور صنعتی ترقی کمال عروج کو پہنچ چکی ہے۔ اس دور میں مشینی استعمال یہاں تک ہو رہا ہے کہ اگر اس دور کو مشینی دور کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ اس ترقی نے ہمارے دوسرے ملکوں کے ساتھ جغرافیائی تعلقات کو بالکل بدل دیا ہے۔ اس ترقی نے دنیا کی وسعت کو بلحاظ وقت بہت چھوٹا کر دیا ہے۔ اور دنیا کے دور دراز ملکوں کو بھی ہمارے قریب کر دیا ہے۔ طبیعی سائنس اور ٹکنالوجی کی ترقی نے ہمیں اس قابل بنا دیا ہے کہ ہم ایسے آلے پیدا کر سکیں جس سے نئی قوتیں ظہور پذیر ہوں۔ اس دور میں انسان نے زندگی کے پورے عملوں پر مکمل قابو پا لیا ہے۔ انسان بیماریوں کے دور کرنے میں کامیاب ہو گیا ہے۔ حتیٰ کہ تپ دق جیسی مہلک بیماری پر بھی وہ خاصا قابو پا چکا ہے۔ اس نے زندگی کی میعاد کو کافی بڑھا لیا ہے۔ اور اس نے صحت مندانہ معیار زندگی کو بے حد اونچا کر لیا ہے۔ اس دور میں رسل و رسائل اور آمد و رفت کے نئے نئے وسائل۔ ریڈیو۔ ٹیلی ویژن۔ ہوائی جہاز عالم پیدا ہو چکے ہیں۔ جن کے ذریعے دنیا کی قومیں ایک دوسری کو آسانی سے سمجھ سکتی ہیں۔ سائنس کی ترقی نے دور میں اٹامک انرجی جیسی قوت کو پیدا کر دیا ہے۔ جو تمام قوتوں سے بالاتر ہے ۔

نئے سماجی دور میں تعلیم کے جمہوری نظریے کو بین الاقوامی حیثیت دے دی ہے۔ اس دور سے قبل کوئی پہلا وقت نہ تھا۔ جب تعلیم یافتہ جمہور کو اتنا ضروری سمجھا گیا ہو جتنا کہ اس دور میں سمجھا جانے لگا ہے۔ خواہ انفرادی حیثیت سے۔ خواہ قومی حیثیت سے اور خواہ بین الاقوامی لحاظ سے، اس کا اثر یہ ہے کہ مختلف ممالک میں ایسی تعلیمی کمیٹیاں متعین کی گئی ہیں جن کا کام مستقبل کی تعلیم کو جمہوری آئین پر ڈھالنا ہوگا۔

پاکستان ایک نیا ملک ہے۔ اسے وجود میں آئے صرف دس سال ہوئے ہیں۔ مگر کئی لحاظ سے اس کی اہمیت بہت زیادہ ہے۔ آبادی کے لحاظ سے کل دنیا میں اس کا آٹھواں نمبر ہے۔ اور اسلامی ممالک میں یہ دوسرے نمبر پر ہے۔ موجودہ صنعتی ترقی کے دھارہ میں یہ ملک اسی تیزی سے بہ رہا ہے کہ اچھے خاصے صنعتی ترقی والے ممالک، اس دس سال کے قیام میں اس ملک نے نمایاں ترقی کی ہے۔ جس کی تفصیل پر اس مضمون میں بحث کی چنداں ضرورت نہیں۔

موجودہ دور کی معاشرتی اور معاشی تبدیلیوں کی وجہ سے ضروری ہوگیا ہے کہ پاکستان کے ثانوی مدارس کے نصاب میں تجدید کی جائے۔ اور اس کے اغراض و مقاصد کو تبدیل کیا جائے۔ ہماری جمہوریت ایک زرعی صنعتی جمہوریت ہے۔ ہمیں اس ملک میں ایسی قوم پیدا کرنے کی ضرورت ہے جس میں سے ہم سائنس دان، انجینئر اور تمام قسم کے کاریگر چن سکیں۔ یہ اس وقت تک ناممکن ہے جب تک کہ ہم تعلیم کے مواقعات پورے معاشرے کو نہ بہم پہنچائیں، جس کی اسلام نے ہمیشہ سے اشاعت کی ہے۔ ہمارے ثانوی مدارس کے نظام تعلیم میں سائنس اور سائینٹفک طریق کار کو مرکزی حیثیت دینا ہوگی۔ ہمارے نوجوانوں کو سائنس کی روح میں پرورش پانا ہوگی۔ دوسرے ان نوجوانوں کو صنعت کاری کے مختلف شعبوں سے بھی واقفیت دلانے کی ضرورت ہوگی، تاکہ ان کو معلوم ہو سکے کہ مختلف قسم کی صنعت کا ہمارے لوگوں کے ذریعہ معاش پر کیا اثر ہے۔ ثانوی مدارس کا کام ہوگا کہ وہ ایسے مواقع پیدا کریں، جن سے بچے صنعت کاری کے اصولوں سے واقف ہو سکے اور اس میں صنعتی کام میں حصہ لینے کی روح پیدا ہو سکے۔ یہی ایک واحد طریق کار ہے جس کے ذریعے مدرسہ پاکستان کے زرعی صنعتی معاشرے کی ضروریات کو پورا کر سکتا ہے۔

بحث کو مکمل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم اپنے نصاب کا جائزہ لیں۔ اکثر علاقوں میں ہمارا روایاتی نصاب جو تقسیم ہند سے قبل رائج تھا، اب بھی رائج ہے۔ مغربی پاکستان کے بیشتر حصے (جس میں راولپنڈی۔ لاہور، ملتان۔ بہاولپور، کوئٹہ اور قلات کی کمشنریاں شامل ہیں) کے سکولوں میں اب بھی وہی نصاب ہے جو تقسیم ہند سے قبل تھا۔ اس نصاب کی رو سے میٹریکولیشن کے ہر طالب علم کو انگریزی، ریاضی اور سماجی علوم (تاریخ، جغرافیہ) لازمی طور پر پڑھنا پڑتے ہیں۔ اور ان کے علاوہ مضامین کی ایک محدود فہرست میں سے اسے دو مضمون اور لینا ہوتے ہیں

اور اختیاری مضمونوں میں سے فارسی، اردو، اور سائنس کو ایک اچھی خاصی تعداد پڑھتی ہے۔ زراعت، عام سائنس کے پڑھنے والوں کی تعداد ناگفتہ بہ ہے اور کامرس وغیرہ سے متعلق مضامین کو کوئی طالب علم نہیں پڑھتا۔ اس سال چند ٹیکنیکل ہائی سکولوں کے نصاب میں البتہ ٹیکنیکل مضامین شامل کر دیے ہیں۔ اس بیان کی صداقت کے لیے نیچے ایک جدول دیا گیا ہے جس میں گذشتہ سالوں کے طلبہ کی وہ تعداد درج ہے جو انہوں نے میٹرکولیشن امتحان کے لیے پڑھے تھے۔

مضمون	سنہ ۱۹۵۴ء	سنہ ۱۹۵۵ء	سنہ ۱۹۵۶ء
انگریزی	۲۴۹۰۳	۲۸۷۷۵	۳۴۹۹۵
ریاضی	۲۳۶۹۱	۲۷۸۶۸	۳۴۱۲۲
تاریخ و جغرافیہ	۲۲۸۲۰	۲۸۶۲۴	۳۴۴۷۱
عربی	۲۸۵۲	۲۸۷۷	۳۹۶۰
فارسی	۹۲۴۷	۹۹۴۷	۱۲۷۷۵
سائنس	۱۳۶۳۵	۱۶۴۱۵	۲۱۳۳۱
فزیالوجی اور علم صحت	۲۲۲۹	۲۵۶۹	۲۹۷۹
اردو	۱۲۶۳۵	۱۳۰۶۸	۱۵۸۳۱
زراعت	۱	۱۷	۱۱۷
ڈرائنگ	۸۳۶۷	۱۱۶۹۷	۱۳۸۴۹
عام سائنس	۸	۲۲	—
سوکس و علم صحت	۱۶۵	۲۸۲	۳۵۰
حساب خانہ داری	۱۱۳۳	۱۲۹۰	۱۸۲۸
میزان	۲۲۹۰۵	۲۸۸۵۵	۳۴۲۳۴

یہ صحیح ہے کہ جو مضامین طالب علم زیادہ شوق سے پڑھتے ہیں، ان کے سوا بھی ایسی باتیں ہیں جو بہت اہم ہیں۔ یہ بھی صحیح ہے کہ تعلیم کے ارتقا میں ان مضمونوں کو بہت دخل ہے۔ اس وقت کے یہ مضمون بہت اچھے تھے جب تعلیم چند لوگوں تک محدود تھی۔ یہ مضمون اچھے خیال کیے جاتے تھے۔ چوں کہ کالج جانے والے طلبہ کے لیے یہ بہت اہم تھے۔ یہ مضمون اس وقت اچھے تصور کیے جاتے تھے۔ جب ثانوی تعلیم کا کسی پیشے پر کوئی اثر نہ تھا۔ مگر ہمارے بدلے ہوئے معاشرتی اور معاشی حالات کے پیش نظر ان کی اہمیت وہ نہیں رہی۔

اب ہمارا نظریہ یہ ہے کہ ثانوی مدارس میں سب لوگ تعلیم پائیں۔ یہ مدارس صرف کالج جانے والوں کے لیے مخصوص نہ ہوں۔ بلکہ یہ ان بچوں کی بھی تربیت گاہ ہوں جو میٹرکولیشن کے بعد کسی پیشے میں داخل ہوں گے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آیا ان تبدیلیوں کا اثر مدارس کے نصاب اور طریقہ تعلیم پر بھی پڑے گا۔ یا ہمارا روایتی نصاب مستقبل کے طلبہ کو بھی اس قابل بنا دے گا کہ وہ بدلتے ہوئے ماحول کے ساتھ مطابقت کر سکیں۔ یہ ایسا مسئلہ ہے جس کا صحیح جائزہ لینے کی ضرورت ہے، اور اس کا جائزہ لینے کے لیے اساتذہ۔ والدین۔ بورڈ آف سیکنڈری ایجوکیشن۔ ٹریننگ کالجوں کے عملے۔ اساتذہ کی انجمنوں کے اراکین سب کو متحدہ کوشش کرنا ہوگی۔

تعلیمی تبدیلی خواہ کسی سمت میں بھی کیوں نہ کی جائے۔ یہ امر اٹل ہے کہ ثانوی مدارس کے نصاب کی تجدید مقتضی ہوگی۔ کہ ان مدارس میں سائنس کے معیار کو کچھ بلند کرنا ہوگا۔ اور روزمرہ سائنس پر مشتمل کورس ثانوی مدارج کے سارے طلبہ کو پڑھنے کی ضرورت ہوگی۔ اگر ہم نے ایسا نہ کیا تو ثانوی تعلیم اور روزمرہ کی ضروریات میں ایک خلیج پیدا ہو جائے گی جس کا پُر کرنا ناممکن ہوگا۔ سائنس کی اہمیت کا تذکرہ کرتے ہوئے ایک کمیٹی نے اپنی رپورٹ میں یوں لکھا ہے۔ سائنس کے صنعت۔ زراعت اور وسائل آمد و رفت پر اثر نے دنیا کی معاشی زندگی میں تبدیلی پیدا کر دی ہے۔ سائنس کے جراحی اور علم صحت پر اثر نے بیماریوں کو دور کر کے ہماری زندگیوں کو بڑھا دیا ہے۔ سائنس کے چھاپے خانے۔ ریڈیو اور ٹیلی وژن پر اثر نے انسان کو اس قابل بنا دیا ہے کہ وہ ایک جگہ کی خبریں دوسری جگہ آسانی سے پہنچا دے۔ سائنس انسانی زندگی کے مطالعہ پر بھی اثر پذیر ہے۔ سائنس کے اطلاق نے بتا دیا ہے کہ از نسل امتیازات سے بالاتر ہے۔ وہ تاحیات علم سیکھ سکتا ہے۔ اور عوام اپنی حکومت کی باگ ڈور خود سنبھال

سکتے ہیں اور اس نے عوام سے متعلق مساوی مواقعات اور آزادی کے نظریوں کو وسیع کر دیا ہے"۔ پس اتنا اہم مضمون ثانوی مدارج کے ہر طالب علم کے لیے بطور ایک لازمی مضمون پڑھایا جانا ضروری ہے۔

اس تبدیلی کا اثر ریاضی کی تعلیم پر بھی بے حد پڑے گا۔ ابتدائی ریاضی اور ابتدائی سائنس ایک دوسرے سے بے حد جڑے ہیں، جیسا کہ ہم پچھلے شمارے میں بتا چکے ہیں۔ ریاضی اور میکانکس کا گہرا تعلق ہے۔ یہاں تک کہ میکانکس کا بغیر ریاضی کے سمجھنا ناممکن ہے۔ حرارت میں بے شمار اصول ایسے ہیں جن میں جبریہ کلیوں اور عبارتی سوالات کے بذریعہ اجزا حل کی بے حد ضرورت ہے۔ روشنی میں لیا اوقات علم ہندسہ اور علم مثلث کا استعمال ہوتا ہے۔ برق میں بھی بار بار ریاضیاتی عملوں کا اطلاق ہوتا ہے۔ لہٰذا سائنسی ترقی کے اس دور میں ریاضی ایسے اہم مضمون کو ثانوی مدارج کے نصاب میں اختیاری مضمون بنانے کا تصوّر ہی سرے سے غلط ہے۔

نئے نفسیاتی نظریے

اس سلسلے میں چند ایسے نفسیاتی نظریوں پر بحث کرنے کی ضرورت ہے۔ جن پر تدوین نصاب کا دارومدار ہوتا رہا ہے۔ سب سے اہم مسئلہ انتقال تربیت کا ہے۔ یہ ایسا مسئلہ ہے جس پر روایاتی طور پر تدوین نصاب کا انحصار رہا ہے اور بہت حد تک ابھی ہے۔

انتقال تربیت کا نظریہ جس کی رو سے تعلیم کو بڑی حد تک ذہنی یا دماغی ضبط کا عمل شمار کیا جاتا ہے بہت ہی پرانا نظریہ ہے۔ اس نظریے کی رو سے چند ایک مضمون مثلاً ریاضی۔ لاطینی اور گرامر ایسے مضامین ہیں جو ذہن میں ایک خصوصی ضبط پیدا کر دیتے ہیں اور اس ضبط کا اطلاق دوسرے مضامین کی تحصیل میں یا دوسرے مسائل کے حل کرنے میں خود بخود ہوتا ہے۔ پس ان مضامین کا نصاب میں شامل کرنا از بس ضروری ہے۔ یہی وجہ تھی کہ گرامر، ریاضی اور لاطینی ثانوی مدارج کے نصاب کا جزو لاینفک صدیوں تک بنے رہے۔ بیسویں صدی کے شروع تک ماہرین تعلیم اور ماہرین نفسیات اس نظریے کے عقیدت مند رہے۔ بیسویں صدی کے شروع میں ہربارٹ کے پیروؤں نے اس نظریے کے خلاف آواز اٹھائی۔ انہوں نے کہا کہ صرف وہ مضامین ہی نصاب کا جزو ہونے چاہئیں جو ظاہری قدروں کے مرکب ہوں۔ اور مضامین کو ان کی مخفی قدروں کی بنا پر نصاب کا جزو نہیں بنانا چاہیے۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ لاطینی اور ریاضی کوئی ایسا دماغی ضبط نہیں پیدا کرتے

کر اندھا دھند ان مضامین کو نصاب میں شامل کیا جائے۔ دوسرے الفاظ میں انہوں نے اس اصول کی مزاحمت کی جس پر صدیوں سے تدوین نصاب کا انحصار تھا۔

یہ دیکھنے کے لیے کہ ان لوگوں کا چیلنج کہاں تک درست ہے، ماہرین تعلیم اور ماہرین نفسیات مثلاً سٹارچ (STARCH) رگ (RUGG) روڈگری (RUEDIGER) تھارن ڈائیک (THARNDYKE) وغیرہ نے بے شمار تجربی اور تحقیقاتی کام کیا۔ بالخصوص تھارن ڈائیک نے تو اس سلسلے میں بہت سا تحقیقاتی کام کیا۔ یہاں تک کہ اس کے تجربات کو عموماً فیصلہ کن تصور کیا جانے لگا۔ اور لوگ سمجھنے لگے کہ تھارن ڈائیک نے مسئلہ کا صحیح حل معلوم کر لیا ہے۔ تھارن ڈائیک اس نتیجہ پر پہنچا کہ انتقال تربیت اتنا نہیں ہوتا جتنا ہم لوگ سمجھے ہوئے ہیں۔ چناں چہ ایسی حالت میں مضامین کو نصاب میں دماغی ضبط کی بنا پر داخل کرنا صحیح نہیں۔ ذیل میں چند اقتباسات دیے جاتے ہیں جو اس نظریے پر ماہرین تعلیم اور ماہرین نفسیات کی کثیر تعداد کی رائے کو ظاہر کرتے ہیں۔ پہلا پروفیسر سیرل برٹ CYRIL BURT کے تخیلات کا نتیجہ ہے جو پینس کمیٹی نے اپنی رپورٹ میں درج کیے تھے۔ صاحب موصوف نے اپنی رائے کا اظہار یوں کیا ہے۔

تربیت کا انتقال اسی وقت ممکن ہے جب دونوں مشاغل (یعنی جس مشغلہ سے تربیت حاصل کی جائے اور جس مشغلہ کے لیے تربیت حاصل کی جاتی ہے) مشترک اجزاء رکھتے ہوں۔ جتنا زیادہ ان کے اجزاء میں اشتراک ہوگا اتنا ہی زیادہ انتقال تربیت ہوگا۔ مثلاً تفریق کرنے کی مشق کا اثر تقسیم کرنے کے عمل کی تحصیل میں ہو سکتا ہے۔ کیوں کہ متاخر الذکر میں اول الذکر شامل ہے۔ مگر تفریق کرنے کی مشق کا اثر ضرب کے عمل پر کچھ نہیں ہوگا۔ کیوں کہ تفریق اور ضرب میں کوئی جزو مشترک نہیں ہے۔ ایسے لاطینی زبان کے مطالعہ سے فرانسیسی زبان کی تحصیل میں اس لیے مدد ملتی ہے کہ فرانسیسی زبان کے بہت سے الفاظ کی اصل لاطینی ہے ...... پس انتقال تربیت نہ اتنی زیادہ یقینی ہے اور نہ اتنی زیادہ ہی ہے۔ جیسا کہ کسی زمانے میں تصور کی جاتی تھی۔ دوسرا اقتباس پروفیسر بیلرڈ کے اس سلسلے میں نظریے کی وضاحت کرتا ہے جو انہوں نے اپنی کتاب "تغیر پذیر مدرسہ" میں درج کیا ہے۔ پروفیسر بیلرڈ فرماتے ہیں کہ۔

خصوصی ذہنی تربیت کا عام اثر ضرور ہوتا ہے۔ لیکن یہ اثر بہت قلیل مقدار میں ہوتا ہے۔ یہ اُس

مقدار سے بہت کم ہے۔ جوکہ آج سے بیس سال قبل کے ماہر تعلیم خیال کرتے ہیں۔ اور اس مقدار سے تو بہت ہی کم ہے جو آج کل کے عوام تصور کرتے ہیں۔ انتقال تربیت کی مقدار ایک مشغلے سے دوسرے مشغلے میں اسی نسبت سے بڑھتی گھٹتی ہے۔ جس نسبت سے دونوں مشغلوں کے اجزاء میں اشتراک بڑھتا یا گھٹتا ہے۔ مختلف قسم کے مشاہدات نتیجۃً ایک ہی فعل نہیں ہوتے اور ضروری نہیں کہ ایک مشاہدہ سے جو تربیت حاصل ہو وہ دوسرے مشاہدے سے بھی حاصل ہو۔ اگرچہ ہم کو ان حالات کا صحیح پتہ نہیں جن میں انتقال تربیت ہو سکتا ہے۔ اغلب یہی ہے کہ انتقال تربیت کے لیے مخصوص عادات، مخصوص انداز کار اور مخصوص مطمح نظر کی ضرورت ہے۔ چنانچہ پیشہ ورانہ لحاظ سے انتقال تربیت کا نظریہ بردہ ہو چکا ہے۔ یا کم از کم اسے ان کارکنوں کے پیش نظر جو اسے لگی ہیں مردہ ہو جانا چاہیے"۔

پس اگر مختلف مضامین اتنی ہی قلیل مقدار میں ذہنی ضبط پیدا کرتے ہیں جیسا کہ نفسیاتی تجربہ گاہوں نے ثابت کیا ہے تو لازم ہے کہ تدوین نصاب کا اصول تعلیمی طور پر انتقال تربیت کا نظریہ نہیں ہو سکتا۔ اور تدوین نصاب کے اصول اس نظریے کے علاوہ کچھ اور ہونے چاہئیں۔ پس اس مضمون جیسے لاطینی، گرامر یا ریاضی جو اب تک انتقال تربیت کے نظریے کے ماتحت ہر نصاب کا جزو لاینفک تصور کیے جاتے تھے صرف اسی وقت نصاب میں شامل کیے جانے چاہئیں۔ جب ان میں انتقال تربیت کے علاوہ کوئی دیگر اقدار ہوں۔ اس بحث کو ہم ماہرین تعلیم اور ماہرین نفسیات کے چند اقتباسات درج کر کے ختم کرتے ہیں جو انہوں نے اس موضوع سے متعلق بیانوں کے تحت اپنی کتابوں میں درج کیے ہیں۔

(۱) پہلا اقتباس پروفیسر روڈیگر (RUEDIGER) کی رائے کا اظہار کرتا ہے جو انہوں نے اپنی کتاب اصول تعلیم میں درج کی۔ صاحب موصوف کا کہنا ہے کہ

کسی مضمون کو نصاب میں رکھنا صرف اس خیال سے کہ اس سے ذہنی ضبط پیدا ہوتا ہے اپنے آپ کو بہت کمزور ستون پر کھڑے رکھنے کے مترادف ہے۔ مضامین کو نصاب میں لانے کی اصل (افادی) اقدار پر مبنی ہونا چاہیے"

(۲) دوسرا اقتباس ڈاکٹر شارپ کی رائے کی وضاحت کرتا ہے جو انہوں نے اپنی کتاب تعلیمی نفسیات میں

درج کی ہے۔ صاحب موصوف فرماتے ہیں کہ

"جہاں تک مضامین کی اقدار کا تعلق ہے تو ہمیں چاہیے کہ ہم اس کو اس کے مواد کی افادی اہمیت کی وجہ سے پڑھیں نہ کہ ذہنی ضبط کی وجہ سے جو اس مضمون سے پیدا ہوتا ہے۔ پس ریاضی اور لاطینی کو اگر پڑھنا ہے تو صرف اس وجہ سے پڑھنا ہوگا کہ ان کی کوئی افادی اہمیت ہے۔ ذہنی ضبط جو کسی مضمون سے پیدا ہوتا ہے، وہ اچھی چیز ہے۔ مگر یہ اتنا اہم نہیں کہ کسی مضمون کو پڑھنے کی وجہ ہی ذہنی ضبط کو متعین کر لیا جائے۔ طعام کی قدر طعام پر منحصر ہے نہ کہ ان ٹکڑوں پر جو کھانے کی میز سے گرتے ہیں۔"

(۳) تیسرا اقتباس پروفیسر انگلس (INGLIS) کے تخیلات کو واضح کرتا ہے جو انہوں نے اس موضوع کے متعلق اپنی کتاب ثانوی تعلیم کے اصول میں درج کیے ہیں۔ صاحب موصوف فرماتے ہیں کہ

آج کل ریاضی کے پڑھانے کا مقصد یہ ہے کہ اس سے ایک دماغی ضبط پیدا ہوتا ہے جس کا اطلاق ایسے مشاغل میں بھی ہو سکتا ہے جو ریاضی سے بالکل غیر متعلق ہوں۔ یہ تصور غلط ہے۔ ریاضی کے پڑھانے کا ایک دوسرا مطلب یہ لیا جاتا ہے کہ انتقال تربیت از خود ہو جاتا ہے۔ خواہ ریاضی اور دیگر مشاغل میں کوئی جزو مشترک مہیا نہ ہو۔ یہ تصور بھی غلط ہے۔ ریاضی کے اساتذہ کو معلوم ہونا چاہیے کہ ایسی کوئی ذہنی تکنیک نہیں ہے جس کی بغیر مخصوص مواد کے ہم تربیت کر سکیں۔ ان اساتذہ کو یہ بھی معلوم ہونا چاہیے کہ قلیل مقدار میں تو انتقال تربیت ہو ہی جاتا ہے خواہ حالات کچھ بھی کیوں نہ ہوں۔ لیکن اچھی خاصی مقدار میں انتقال تربیت اسی حالت میں ہوتا ہے جب انتقال تربیت کے لیے مخصوص حالات پیدا کیے جائیں۔ یہ ایک بے کار بلکہ مجرمانہ فعل ہے کہ ثانوی مدارج میں ریاضی کو اس لیے پڑھایا جائے کہ یہ مضمون انتقال تربیت کا حامل ہے۔"

(۴) چوتھا اقتباس اوشی کے تصورات کو بتاتا ہے جو انھوں نے اپنی کتاب ایجوکیشن اینڈ ایڈجسٹمنٹ میں درج کیے ہیں ان کا کہنا ہے کہ

ہم اس کو بڑے شک و شبہ کی نظر سے دیکھتے ہیں کہ آیا ذہنی ضبط جو ہندسہ یا اعلیٰ ریاضی پیدا کرتے ہیں، اس کا اطلاق علم حیاتیات یا سیاسی معاشیات کے سمجھنے میں بھی ہوتا ہے۔ حق تو یہ ہے کہ ریاضی دان خود دوسرے مشاغل میں صائب رائے دینے سے قاصر رہتے ہیں جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ تدلیل کی عام

صلاحیت مفقود ہے"

(۵) پانچواں اقتباس ڈاکٹر تھولیس (THOULESS) کے تخیلات کو ظاہر کرتا ہے جو انہوں نے اپنی کتاب عام اور سماجی نفسیات میں لکھے ہیں، وہ فرماتے ہیں کہ۔

مدرسی تعلیم کے موجودہ حالات میں انتقال تربیت بہت کم ہوتا ہے۔ جو کچھ ہم بچوں کو پڑھانا چاہتے ہیں وہ ان کو براہ راست پڑھانا چاہیے۔ مثال کے طور پر اگر ہم ان کو غور و فکر کرنا سکھانا چاہتے ہیں تو ہمیں اسے سکھانا چاہیے نہ کہ ریاضی اور لاطینی اس امید پر کہ ان سے تاثرات کا انتقال ہو جائے گا۔ بالواسطہ تعلیم یا تو ہمیشہ غیر موثر ثابت ہو گی یا وہ اتنی مہنگی ثابت ہو گی کہ اس کو کسی طریق پر ہم حق بجانب نہیں کہہ سکیں گے۔ بچوں کو ریاضی اور لاطینی پڑھانے کا مقصد صرف یہ ہونا چاہیے کہ ہم ان کو یہ مضامین پڑھانا چاہتے ہیں۔ کسی مضمون کی جگہ نصاب میں صرف اس لیے نہیں ہونی چاہیے کہ اس میں ذہنی ضبط کے اقدار مضمر ہیں"

ثانوی مدارج کے طلبہ کے خصائل

جہاں تدوین نصاب میں معاشرے کی ضروریات کو پیش نظر رکھنے کی ضرورت ہے، اتنی ہی ضرورت طلبہ کے خصائل اور ان کی ضروریات کو بھی تدوین نصاب میں مدنظر رکھنے کی ضرورت ہے۔ لہذا ضرورت اس امر کی ہے کہ ثانوی مدارج کے طلبہ کے خصائل پر عالمانہ نظر ڈالی جائے۔

جب بچہ ثانوی سکول میں داخل لیتا ہے تو اس کی عمر عموماً ۱۱ سال کی تصور کی جاتی ہے۔ اور اگر وہ ہر سال پاس ہوتا چلا جائے تو اس کو مدرسہ سے ۱۵ سال کی عمر میں فارغ التحصیل ہو جانا چاہیے۔ مگر ایسا نہیں ہے جب طلبہ میٹریکولیشن امتحان میں شریک ہوتے ہیں تو اس کی اوسط عمر ۱۶ سال سے بھی زیادہ ہوتی ہے بلکہ کبھی کبھی تو یہ عمر ۱۷ سال کے قریب یا اس سے بھی تجاوز کر جاتی ہے (اس کی وجوہ پر بحث کرنے کی اس مضمون میں گنجائش نہیں) راقم الحروف کو ایک سلسلہ میں چند اسکولوں کے میٹریکولیٹس کی اوسط عمروں کی اوسط نکالنے کی ضرورت پڑی جس عمر میں کہ وہ اس امتحان میں شریک ہوئے تھے۔ راقم الحروف نے ۲۶ گورنمنٹ ہائی سکولوں کا انتخاب کیا۔ یہ سکول سب مغربی پاکستان کے مختلف اضلاع کے صدر مقاموں میں واقع تھے۔ ان کی عمروں کی اوسطیں مختلف سالوں کی نکالی گئی۔ ان میں سوائے ایک سکول کے سب سکولوں میں طلبہ کی اوسط عمر ۱۶ سال سے زیادہ تھی۔ بلکہ بلا اتفاق

یہ اوسط ۱۷ سال سے تجاوز کر گئی تھی۔ ان اوسط عمروں کا جدول نیچے درج ہے۔

نمبر شمار	سکول	۱۹۵۱ء سال	۱۹۵۱ء ماہ	۱۹۵۲ء سال	۱۹۵۲ء ماہ	۱۹۵۳ء سال	۱۹۵۳ء ماہ
۱	گورنمنٹ سنٹرل ماڈل ہائی سکول ۔ لاہور	۱۵	۳	۱۵	۵	۱۵	۲
	گورنمنٹ ہائی سکول ۔ کیمبل پور	۱۷	–	۱۶	۱۱	۱۷	۳
	گورنمنٹ " ڈی۔جی۔خاں	۱۶	۵	۱۷	۵	۱۷	–
	گورنمنٹ " گوجرانوالہ	۱۶	۲	۱۶	۹	۱۶	۹
	گورنمنٹ " جھنگ	۱۶	۱۱	۱۷	–	۱۶	۹
	گورنمنٹ " جہلم	۱۷	–	۱۷	۲	۱۶	۱۱
	گورنمنٹ " میانوالی	۱۷	۸	۱۷	۱	۱۶	۷
	گورنمنٹ " منٹگمری	۱۶	۸	۱۶	۱۱	۱۷	۲
	گورنمنٹ " ملتان	۱۶	۱	۱۶	۷	۱۶	۶
	گورنمنٹ " مظفر گڑھ	۱۶	۸	۱۶	۱۱	۱۶	۶
	گورنمنٹ " سیالکوٹ	۱۶	۵	۱۶	۷	۱۶	۷
	گورنمنٹ " شیخوپورہ	۱۶	۸	۱۶	۷	۱۶	۶
	گورنمنٹ " سرگودھا۔	۱۶	۵	۱۶	۶	۱۶	۶

اس جدول سے ظاہر ہوتا ہے کہ سوائے سنٹرل ماڈل سکول کے باقی اضلاع کے گورنمنٹ سکولوں کے میٹرکولیشن کی عمر جب وہ امتحان میں شریک ہوتے ہیں ۱۶ سال سے کہیں زیادہ ہوتی ہے اور کئی حالتوں میں یہ عمر ۱۷ سے بھی بڑھ گئی ہے۔ یہ خیال کرتے ہوئے کہ سرکاری سکولوں میں تعلیم کی سہولتیں نسبتاً زیادہ ہوتی ہیں اور ان سکولوں میں مقابلتہً زیادہ پڑھے لکھے گھرانوں کے طلبہ زیر تربیت ہوتے ہیں، یہ نتیجہ نکالنا بے جا نہ ہوگا کہ

غیر سرکاری یا نیم سرکاری مدارس کے میٹرکولیشن کی عمر جب وہ امتحان میں شریک ہوتے ہیں ۱۸ یا اس سے بھی زیادہ ہوگی۔ اور دیہاتی سکولوں کے میٹرکولیشن کی عمر جب وہ امتحان میں شریک ہوتے ہیں اس سے بھی زیادہ ہوگی۔ پس ایک ثانوی مدرسہ میں طلبہ کی عمریں ۱۰ سے ۱۷ برس تک کی ہوتی ہیں۔ لہٰذا ہر ثانوی مدرسہ میں ایسے مشاغل کا اجرا ضروری ہے جو ۱۰ سے ۱۷ سال کی عمر کے بچوں کے لیے ضروری ہوں۔ اس جدول سے ہم یہ بھی نتیجہ نکالتے ہیں کہ نویں جماعت کے شروع میں بچوں کی اوسط عمر ۱۴ سال نہیں ہوتی جیسا کہ ہمارا عام تصوّر ہے بلکہ ان کی اوسط عمر ۱۵ سالوں سے بھی زیادہ ہوگی۔

ان عمروں کے طلبہ میں انفرادی تفاوت بہت زیادہ ہوتا ہے۔ ان میں جسمانی اور ذہنی دونوں لحاظ سے نمایاں تفاوت ہوتا ہے۔ ان میں صرف قد، وزن اور طاقت کے لحاظ سے ہی نمایاں فرق نہیں ہوتا ہے۔ بلکہ ان میں ذہنی صلاحیتوں کے اعتبار سے بھی نمایاں فرق ہوتا ہے۔ پس ثانوی مدارج کے طلبہ کے لیے وسیع تعلیمی پروگرام کے اجرا کی ضرورت ہے، تاکہ زیادہ سے زیادہ طلبہ کی ضروریات کو پورا کیا جا سکے۔ ہمیں ثانوی مدارس میں نہ صرف مختلف قسم کے ایسے مشاغل کا اجرا کرنا ہوگا جس سے ان کی جسمانی نشو و نما بہتر ہو سکے۔ بلکہ ہمیں نصاب میں بھی لچک پیدا کرنے کی ضرورت ہوگی۔ تاکہ زیادہ سے زیادہ طلبہ ہمارے نصاب سے فائدہ اٹھا سکیں۔ اور یہ نصاب زیادہ سے زیادہ طلبہ ہمارے نصاب سے فائدہ اٹھا سکیں اور یہ نصاب زیادہ سے زیادہ طلبہ کی ضروریات کو پورا کر سکے۔ یوں کہ تدوین نصاب کے سلسلہ میں ہمیں ثانوی مدارج کے طلبہ کی ذہنی تفاوتوں کو پیش نظر رکھنا ہوگا۔ اس لیے ضروری ہے کہ ثانوی مدارج کے طلبہ کے ذہنی اعتبار سے انفرادی اختلافات پر مزید روشنی ڈالی جائے۔

عام ذکاوت

موجودہ نفسیاتی ترقی نے یہ ثابت کر دیا ہے۔ بچوں میں ذہنی اور جذباتی اعتبار سے نمایاں فرق ہوتا ہے اور یہ کہ دنیا کے ہر نارمل بچہ ایک ہی قسم کی نشو و نما پاتا ہے تعلیمی طور پر غلط ہے۔ ان کی عام ذکاوت میں فرق ہوتا ہے۔ اس کا نفسیاتی کلیہ آپ یوں سمجھیے کہ ہر بچے کی ذہنی عمر اور اس کی اصلی عمر میں تقریباً تقریباً ایک ہی نسبت رہتی ہے۔ اصلی عمر بڑھتی رہتی ہے۔ لہٰذا ذہنی اعتبار سے بچوں میں فرق بھی بڑھتا رہتا ہے۔ حتیٰ کہ جب وہ سنِ بلوغ کو پہنچتے ہیں تو یہ فرق زیادہ سے زیادہ ہو جاتا ہے۔ پس وہ بچہ جو ذہنی اعتبار سے چار سال کی عمر میں دوسرے بچے سے

ایک سال پیچھے ہوتا ہے تو غالباً وہ ۸ سال کی عمر میں دوسرے بچے دو سال پیچھے رہ جائے گی اور ۱۶ یا ۱۸ سال کی عمر میں دوسرے بچے سے ذہنی اعتبار سے تین، چار سال پیچھے ہو جائے گا۔ لہٰذا میٹرکولیشن کے امتحان میں ہم نے دیکھا ہے ہو سکتا ہے کہ دو ایسے طلبہ جن کی اصل عمر یکساں ہو ان کی ذہنی عمروں میں ۳، ۴ سال کا فرق ہو۔

خصوصی صلاحیتیں

اس صدی کے شروع تک یہ تصور کیا جاتا تھا کہ ذکاوت ایک کلی چیز ہے۔ چناں چہ اس تصور کے پیش نظر ہم یہ کہا کرتے تھے کہ ایک طالب علم زیادہ ذکی ہے۔ دوسرا کم ذکی ہے وغیرہ، اور ذکاوت کے لحاظ سے ہم طلبہ کو مختلف گروہوں میں تقسیم کرتے تھے۔ اس زمانے کے ماہرین نفسیات کا عقیدہ تھا کہ خصوصی صلاحیتیں نہیں ہوتیں۔ لیکن موجودہ ماہرین نفسیات نے ہمہ گیر صلاحیت کے نظریے کو مسترد کر دیا ہے۔ ڈاکٹر سپیرمین SPECRMAN نے سب سے پہلے اس نظریے کے خلاف آواز اٹھائی۔ اس نے دو اجزا کا نظریہ پیش کیا۔ اس کے نظریے کے مطابق ہر مشغلے کے پورا کرنے میں دو اجزا کام ہوتے ہیں۔ عام ذکاوت کا جزو جس کو اس نے انگریزی کے حرف (G) سے ظاہر کیا اور خصوصی صلاحیت کا جزو جس کو اس نے حرف (S) سے ظاہر کیا۔ پس کسی فرد کا کسی کام کو کرنا اس کی دو صلاحیتوں پر منحصر ہے (G) پر اور (S) پر (S) وہ صلاحیت ہے جو اس مخصوص مشغلہ سے متعلق ہو۔ لہٰذا کسی کام کو پوری کامیابی سے کرنے کے لیے وہ اونچی عام ذکاوت یعنی (G) اور اس کام سے متعلق اونچی خصوصی صلاحیت یعنی (S) کا حامل ہونا چاہیے۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ خصوصی صلاحیت (S) انسان کے لیے بہت اہم ہے۔

ڈاکٹر سپیرمین کے بعد ہمہ گیر ذکاوت کے نظریے کی مزید چھان بین کی گئی۔ ماہرین نفسیات نے نہ صرف ڈاکٹر سپیرمین کے دو جزوی نظریے کو تسلیم کیا بلکہ انھوں نے اس کی توسیع بھی کی، انھوں نے خصوصی صلاحیت (S) کے آگے بھی حصے کیے۔ ان خصوصی صلاحیتوں کا احاطہ کار اور ان کی حدود معلوم کرنے کے لیے بڑے بڑے ماہرین نفسیات۔ بیٹ۔ وڈورتھ۔ کیلی، ورنن، ایلگزنڈر۔ تھرسٹن اور کیٹیل نے کی۔ ان میں سے ہم چند ایک ماہرین کی اس موضوع پر رائے کا اظہار کرتے ہیں۔

(۱) پروفیسر وڈورتھ کا خیال ہے کہ

ظاہراً ہم تین قسم کی خصوصی صلاحیتیں ضرور پاتے ہیں (i) زبان سے متعلق صلاحیت (iii) عددی ...

متعلق صلاحیت اور (iii) ہندسہ سے متعلق صلاحیت۔ ان کے علاوہ گانے کی صلاحیت اور میکانکی صلاحیت بھی خصوصی اہمیت رکھتی ہیں۔ چند اور بھی خصوصی صلاحیتیں ہیں جو عام ذکاوت حس سے تو یقینی الگ ہیں۔ مگر وہ اتنی وسیع ہیں کہ ان کو خصوصی صلاحیتیں نہیں کہا جا سکتا۔"

(۲) ڈاکٹر کیشل نے اپنے تجربات کا خلاصہ ان الفاظ میں کیا ہے۔

غالباً صلاحیتوں میں گروہی اجزا تو کافی ہیں مگر چار اجزا تعلیم اور صنعت کے لحاظ سے زیادہ اہم ہیں۔ انکی بٹ۔ تھرسٹن۔ سٹیفنسن۔ الیگزنڈر۔ کاکس۔ سی شور نے وضاحت کی ہے۔ ان کو خلاصتہً ہم یوں لکھ سکتے ہیں (۱) زبان کی صلاحیت (۲) زبانی اور تصویری تصور کی صلاحیت (۳) عددی صلاحیت (۴) تولیلی صلاحیت (۵) حافظہ (۶) ہندسی صلاحیت (۷) علمی کام کی صلاحیت (۸) میکانکی صلاحیت (۹) دستی کام کی صلاحیت اور گانے کی صلاحیت۔

عددی اور ہندسی صلاحیتیں

چوں کہ ہمارا مضمون ریاضی کے نصاب کی تدوین ہے، لہٰذا ضروری ہے کہ عددی اور ہندسی صلاحیتوں پر مزید روشنی ڈالی جائے۔ یہ صلاحیتیں حساب اور جیومیٹری دونوں کی تحصیل پر اثر انداز ہوتی ہیں۔ عددی صلاحیت ۱۲ سال کی عمر میں عود کرتی ہے۔ اس صلاحیت کا عددوں کے بنیادی اصولوں کو سیکھنے پر کافی اثر ہوتا ہے۔ عبارتی سوالوں کے حل میں عددی صلاحیت اور زبان کی صلاحیت دونوں اثر پذیر ہوتی ہیں۔ عددی صلاحیت کو دو حصوں میں منقسم کر دیا گیا ہے۔ پہلا ریاضیاتی طریقوں سے واقفیت اور دوسرا بنیادی اصولوں کے اطلاق میں صحت اور چستی ہندسی صلاحیت جگہ سے متعلق اصولوں کے سمجھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ اس کا تعلق اشکال اور مجسمات سے ہے عددی صلاحیت اور ہندسی صلاحیت ایک دوسرے سے بالکل جدا ہیں۔ ان کا آپس میں کوئی تعلق نہیں ہے۔

انفرادی تفاوت کا تعلیم پر اثر

اگر ہر بچے کی صحیح نشوونما مقصود ہے تو ضرورت اس امر کی ہے کہ نصاب میں لچک ہو۔ اس میں اتنے اختیاری مضامین شامل کیے جائیں کہ طالب علم اپنی صلاحیتوں کے مطابق ان کو پڑھے۔ تاکہ ہر بچہ اس مضمون کو پڑھے جو اس کی ضروریات کے مطابق ہو۔ اور جس کو وہ بہتر سے بہتر طریقہ سے سیکھ سکتا ہو۔ بطور معلمین ہمارا فرض ہے کہ

ہم بچوں کی خصوصی صلاحیتوں کا جائزہ لیں۔ تاکہ ہم ان کی تعلیمی اور پیشہ ورانہ رہبری کر سکیں۔ یہی ایک طریقہ ہے جس سے ہم ریاضی میں لائق بننے والے طلبہ کی ریاضی کی تعیین کر سکتے ہیں۔ دوسرے کسی بچے میں خصوصی صلاحیتوں کا ہونا یا نہ ہونا اس امر کی بھی وضاحت کرتا ہے کہ بچہ اس مضمون کے سیکھنے میں کہاں تک کامیاب ہو سکتا ہے جس بچہ میں عددی یا ہندسی صلاحیت کا فقدان ہوگا وہ بہت زیادہ محنت کرنے پر بھی حساب یا جیومیٹری کی تحصیل میں زیادہ کامیاب نہیں ہوگا۔ اور جس لڑکے میں عددی اور ہندسی صلاحیتیں موجود ہوں گی وہ حساب اور ہندسہ کی تحصیل میں بہت زیادہ کامیاب ہوگا۔

نتیجہ سخن

ان تمام نفسیاتی نظریوں پر بحث کرنے کے بعد اور ہمارے نئے معاشرتی دور کا جائزہ لینے کے بعد ثانوی مدارج میں ریاضی کے نصاب کی تدوین کے سلسلے میں ہم مندرجہ ذیل نتائج پر پہنچتے ہیں۔

(۱) ہمیں ثانوی مدارج میں روزمرہ سائنس سے متعلق ایک وسیع نصاب متعین کرنے کی ضرورت ہے تاکہ ہمارا بچہ بدلتے ہوئے معاشرے کے ساتھ عمدہ طریق سے مطابقت کر سکے۔ اس قسم کا ریاضی کا نصاب جو سائنس کے موضوعات کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے، وہ بھی سب کے لیے لازمی ہو۔

(۲) ریاضی کے جملہ موضوع کا نفس مضمون میں اس طرح سے اصلاح کی جائے کہ جو طلبہ عددی یا ہندسی صلاحیت نہ رکھتے ہوں وہ بھی اس مضمون کو سمجھنے میں دشواری محسوس نہ کریں۔ ان طالب علموں کے لیے ہمارا مقصد ہوگا کہ وہ ریاضیاتی عملوں کا اطلاق روزمرہ کے مسائل حل کرنے کے لیے آسانی سے صحت سے اور تیزی سے کر سکیں اور وہ ریاضیاتی علامتوں اور ریاضیاتی زبان کو آسانی سے سمجھ سکیں۔ وہ ہندسہ اور ریاضی کی دیگر عملی شاخوں کی مبادیات سے واقف ہو جائیں اور وہ اس کا اطلاق روزمرہ زندگی میں کر سکیں۔

(۳) ہمیں ایک ایسے گروہ کی تربیت کرنا ہے جو ریاضیاتی دلائل کا اپنی زندگی کے مسائل میں اطلاق کر سکے۔ ان میں ریاضیاتی نظریہ پیدا ہو جائے۔ ہمیں ایسے عنوانوں سے گریز کرنا ہے جن کا مقصد ذہنی ضبط کے سوا کچھ نہ ہو۔ بالفاظ دیگر ہمیں ریاضیاتی نظریے کی نشوونما کرنا ہے نہ کہ ذہنی ضبط کی۔

(۴) چونکہ ثانوی مدارس کا ایک کام ان طلبہ کی تربیت کرنا ہے جو سکول سے فارغ التحصیل ہونے کے بعد اعلیٰ تعلیمی اداروں میں داخلہ لیں گے۔ اس لیے ان طلبہ کے لیے اعلیٰ ریاضی کا مضمون نصاب میں شامل کیا گیا ہے

ایک تکنیک

اساتذہ کے کام کی نگرانی

نذیر احمد

نگرانی کی ضرورت

تدریسی کام کی نگرانی اور رہنمائی ایک ناگزیر تعلیمی ضرورت ہے۔ کسی مدرسے میں نگران کا وجود محض اس لیے ضروری نہیں کہ مدرسے کی زندگی میں نظم و ترتیب پیدا کرنے کے لیے ایک منتظم ہاتھ کی ضرورت ہے۔ بلکہ اس کا وجود اس لیے بھی ضروری ہے کہ خود عمل تدریس کی خوبی کو معیاری درجے پر رکھنے کے لیے ایک نگران آنکھ کی ضرورت ہے۔ ایک ایسا نگران جو تدریس کی اچھائی برائی میں تمیز کر سکے اور بوقت ضرورت مدرس کی موزوں رہنمائی بھی کر سکے۔

ایسے استادوں کی کبھی کمی نہیں رہی جو کسی نگران نگاہ کے خوف کے بغیر بھی اپنا کام محنت اور دیانت کے ساتھ انجام دیتے رہتے ہیں۔ لیکن ایسا خوش نصیب مدرسہ شاید کوئی نہیں ہوگا۔ جسے تمام کے تمام استاد اسی قسم کے میسر آجائیں۔ لہذا ایک منتظم ہاتھ اور ایک نگران آنکھ کی ضرورت ہر مدرسے میں باقی رہتی ہے۔ نگرانی اور رہنمائی کا یہ کام ہر جگہ صدر معلم انجام دیتا ہے۔

کلیدی آسامی

بعض سطحی طور پر سوچنے والے لوگ صدر معلم کے کام کو معمولی نوعیت کا کام خیال کیا کرتے ہیں۔ بعض ناسمجھ صدر معلم بھی اپنے کام کو زیادہ اہمیت نہیں دیتے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ جو شخص مدرسے کی ذہنی فضا کو قائم کرتا اور اس کی مزاجی ساخت کا فیصلہ کرتا ہے۔ وہ شخص صدر معلم کے سوا کوئی دوسرا شخص نہیں۔ مدرسے کی زندگی میں صدر معلم جو کلیدی کردار ادا کرتا ہے۔ اس کا اندازہ ذیل کے خطوط سے ہو جائے گا جو ایک استاد نے اپنے مدرسے کی عام فضا کے متعلق لکھے ہیں۔

در آپ کو علم ہے کہ میں اس مدرسے میں کس قسم کا جذبۂ عمل لے کر آیا تھا۔ یہاں صرف نوکری کرنا مقصود

نہ تھا بلکہ قومی اور دینی خدمت انجام دینا بھی غایت تھی۔ میں نے پہلے دن سے آج تک اپنے کام کو ایک مقدس فرض خیال کیا۔ میں اکیلا دو اہم ترین مضامین کی تدریس کا بوجھ اٹھائے ہوئے ہوں۔ یونیورسٹی جماعت کی تیاری میرے ذمہ ہے۔ اس جماعت کو فالتو وقت دیتا ہوں۔ یہ سارا کام اور فالتو محنت راحت میں بدل جاتی اگر صرف صدر معلم صاحب انسانی مراسم کی ماہیت کو کچھ بھی سمجھتے ہوتے! مجھے یہ کہتے ہوئے دکھ ہوتا ہے۔ مگر یہ تلخ حقیقت دیر تک چھپائی نہیں جا سکتی کہ ـــــ صاحب کے سلوک نے اپنے ساتھ کام کرنے والے تمام استادوں کو بری طرح بدل کر دیا ہے۔ ان کی ترش روئی اور کج خلقی اب ناقابل برداشت حد تک پہنچ گئی ہے۔ اگر یہی لیل و نہار رہے تو بہت سے استاد اس ادارے کو چھوڑ دیں گے۔ میں تو ایسی فضا میں زیادہ دیر تک گزارہ نہ کر سکوں گا۔''

(۲) اس خط کے کوئی دو ماہ بعد اسی استاد نے مندرجہ ذیل خط لکھا۔ اس دوران میں پہلے صدر معلم صاحب تشریف لے جا چکے تھے۔ اور ان کی جگہ ایک اور صاحب تشریف لے آئے تھے۔

''میں یہ اطلاع دیتے ہوئے مسرت محسوس کرتا ہوں کہ نئے صدر معلم صاحب نے مدرسے کی بجھی ہوئی زندگی میں ایک نئی روح پھونک دی ہے۔ آپ کو علم ہے ہم سب کس حد تک دل برداشتہ ہو چکے تھے۔ میں نے تو سرکاری ملازمت میں چلے جانے کا عزم کر لیا تھا۔ مگر پچھلے چند ہفتوں میں مدرسے کی فضا میں ایک پُرکیف تبدیلی پیدا ہوئی ہے ـــــ صاحب نے اپنے اخلاق اور خلوص سے تمام اساتذہ کو اپنا گرویدہ بنا لیا ہے سب کے دلوں میں پھر سے وہی عزم اور وہی ولولہ عود کر آیا ہے جس کو لے کر ہم اس ادارے میں آئے تھے میں اب سرکاری ملازمت میں جانے کا نام بھی نہ لوں گا ـــــ صاحب جیسے بلند کردار انسان کی رفاقت میں کام کرنے میں بڑی روحانی لذت ہے۔ میں اس لذت کو کسی قیمت پر ترک نہیں کروں گا''

یہ خطوط جو ایک ہی مدرسے کے استاد کی طرف سے صرف چند ہفتوں کے وقفے سے لکھے گئے ہیں اس بات کا ثبوت ہیں کہ صدر معلم کی شخصیت کسی مدرسے اور اس کی ساری زندگی پر کس قدر فیصلہ کن اثر ڈال سکتی ہے۔

دوہری ذمہ داری

جہاں صدر معلم پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ استادوں کے احترامِ نفس اور اعتماد ذات کو سہارا دے

اور ان کے لیے مکمل سلامتی کی فضا پیدا کرے وہاں اس پر یہ فرض بھی عاید ہوتا ہے کہ تدریس اور خوبی کو زیادہ سے زیادہ بڑھانے کی تدبیریں سوچے۔ جو طلبہ مدرسے میں پڑھنے آتے ہیں ان کی تعلیم و تربیت کی آخری ذمہ داری صدر معلم ہی کے کندھوں پر عاید ہوتی ہے۔ استادوں کی کارکردگی سے آنکھیں بند کرکے ان سے ہر دل عزیزی کی سند حاصل کرلینا ہر صدر معلم کے لیے ایک بے حد آسان راستہ ہے۔ لیکن ایسا کرنا طلبہ اور والدین کے مفاد کے ساتھ صریح غداری کے مترادف ہوگا۔ جو صدر معلم اس قسم کی سستی ہر دلعزیزی میں یقین رکھتا ہو، وہ زیادہ دیر تک چین سے نہیں بیٹھ سکتا۔ تدریسی معیاروں سے غفلت زود بدیر اس کے لیے ایسے کٹھن مسائل پیدا کردیتی ہے۔ جن سے عہدہ برآ ہونا مشکل ہو جاتا ہے۔

ایک کامیاب صدر معلم کے لیے ضروری ہے کہ وہ نہ صرف استادوں کے ہر جائز مفاد کا سرگرم نگہبان ہو بلکہ وہ طلبہ اور والدین کے مفاد کی نگہداشت بھی اسی گرم جوشی کے ساتھ کرے۔ اس دوسری ذمہ داری کے لیے تدریسی کام کی لگاتار جانچ پڑتال ایک ضروری شرط ہے۔ اس فرض کی انجام دہی کافی ہوش مندی کا مطالبہ کرتی ہے۔ استادوں کو کسی مرحلے پر بھی یہ شبہ نہ ہونا چاہیے کہ ان پر بلاوجہ نکتہ چینی کی جارہی ہے۔ تاہم انہیں یہ احساس بھی رہنا چاہیے کہ کمرۂ جماعت میں وہ جو کچھ کرتے ہیں صدر معلم اس سے بے خبر نہیں۔

ایک تکنیک

تدریسی کام پر لگاتار نگاہ رکھنے کے لیے صدر معلم کو اپنے حالات کے حسب حال کوئی طریق کار وضع کرلینا چاہیے ذیل میں تدریسی کام کی نگرانی کی ایک کامیاب تکنیک کا ذکر کیا جاتا ہے۔ یہ تکنیک لاہور کے ایک بڑے مدرسے کے صدر معلم صاحب کی وضع کردہ ہے۔

صدر معلم نے ہر جماعت میں سے ایک قابل اعتماد طالب علم چن رکھا ہے، اسے ایک کاپی دی گئی ہے اس کاپی پر وہ لڑکا ہر روز ان اسباق کی مختصر سی کیفیت درج کرتا ہے جو اس روز پڑھائے گئے ہوں۔ لڑکے کو ہدایت ہے کہ پیریڈ ختم ہونے پر چند جملوں میں استاد صاحب کی کارکردگی بیان کردے۔

استاد کی روزانہ کارکردگی کا یہ نقشہ جماعت وار نیاد ہوتا رہتا ہے۔ صدر معلم صاحب ان کاپیوں کو باقاعدگی سے دیکھتے رہتے ہیں۔ جہاں کہیں کوئی ایسا اندراج نظر آئے جو استاد کے احساس فرض کی کوتاہی ظاہر کرتا ہو

اس کے نیچے سرخ سیاہی سے نشان کر دیتے ہیں اور صفحے کے نیچے اپنے دستخط کر دیتے ہیں۔

اپنی تکنیک کی وضاحت کرتے ہوئے صدر معلم صاحب نے بتایا کہ انہیں چند بار یہ احساس ہوا کہ بعض اساتذہ تدریسی اوقات کو پوری طرح کام میں نہیں لاتے۔ بلکہ اس وقت کا کچھ حصہ ادھر اُدھر کی گپوں میں ضائع کر دیتے ہیں۔ یا کمرۂ جماعت میں دیر سے آتے ہیں، یا تھوڑی دیر پڑھا کر آرام سے بیٹھ جاتے ہیں اور جماعت سے کہہ دیتے ہیں کہ اپنا کام کرتے جاؤ۔ ان باتوں کا تدارک کرنا اور طلبہ کو تدریسی وقت سے پورا فائدہ پہنچانے کے لیے انہوں نے بالآخر یہ تکنیک وضع کی۔

اس کے نتائج کا ذکر کرتے ہوئے انھوں نے کہا اس تکنیک کو اختیار کیے چند روز نہ گذرنے پائے تھے کہ تدریسی کام کی خوبی میں ایک خوش گوار اصلاح نظر آنے لگی۔ اوّل اوّل طلبہ کی رپورٹوں میں اس قسم کے اندراجات عام تھے :- کہ

استاد صاحب آٹھ دس منٹ تک برآمدے میں کھڑے کسی سے باتیں کرتے رہے۔ پھر کمرے میں داخل ہوئے اور آتے ہی کرسی پر بیٹھ گئے۔" استاد صاحب نے پہلے دس منٹ ادھر اُدھر کی باتوں میں صرف کر دیے۔ پھر کتاب پکڑی اور تیزی سے تین چار صفحوں میں سے گذر گئے" استاد صاحب نے آتے ہی چند سوال پوچھے۔ طلبہ کی خوب مرمت کی گئی۔ بعد ازاں جماعت کو حکم ہوا کہ کتابیں کھول کر یاد کرو۔ استاد صاحب باقی سارا پیریڈ کرسی پر بیٹھے رہے"

صدر معلم صاحب نے بتایا کہ انہوں نے آج تک کسی استاد سے کوئی باز پرس نہیں کی۔ اور نہ ہی کسی استاد کو اشارۃً یہ جتلایا کہ ان کے خلاف عدم توجہی کی رپورٹ موصول ہوئی ہے۔ انہوں نے صرف اتنا کیا کہ طلبہ کی مخالف رپورٹ کے نیچے نشان لگا کر سامنے دستخط کر دیے۔ استاد خود بخود طلبہ کی ان رپورٹوں کو دیکھتے ہیں۔ یہ احساس کہ ان کی کارکردگی کا سارا حال صدر معلم کو باقاعدہ پہنچتا رہتا ہے، انہیں زیادہ فرض شناس بنانے کا موجب ہوا ہے۔ اب بہت شاذ ایسا ہوتا ہے کہ کسی استاد کے متعلق اس قسم کے جملے درج جائیں جن کا ذکر اوپر ہوا ہے۔

ایک استفسار کے جواب میں صدر معلم صاحب نے کہا کہ اس طریقے کی کامیابی کے لیے یہ ضروری

جن لڑکوں کو روزانہ رپورٹ لکھنے کی ذمہ داری سونپی جائے ان کے انتخاب میں پوری بیداری سے کام لیا جائے اور وقتاً فوقتاً اس بات کا جائزہ بھی لیا جاتا رہے کہ وہ اپنا فرض پوری دیانت اور مستعدی کے ساتھ انجام دے رہے ہیں یا نہیں۔

تعلیمی دُنیا پر ایک نظر

سرسید کی تعلیمی خدمات

ؔ مولانا ابو الکلام آزاد کے خطبۂ تقسیم اسناد کا ایک حصہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے جو آپ نے ۲۰ فروری ۱۹۴۹ء میں دیا تھا۔ اس خطبہ کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں گذشتہ نصف صدی کی، سیاسی، علمی اور ثقافتی تاریخ کے بعض وہ گوشے اجاگر ہو گئے ہیں، جن سے بے خبری تاریخ کے ایک طالب علم کے لیے بہت بڑا جرم ہے۔

اغلب خیال یہ ہے کہ عوام کے ذہنی رجحانات پر جتنے ہمہ گیر اثرات "تہذ الاخلاق" نے چھوڑے ہیں، ہندوستان (برصغیر ہندوپاک) کے کسی اور رسالے نے نہیں چھوڑے۔ سرسید مرحوم نے دورۂ انگلستان سے واپسی پر اس رسالہ کی داغ بیل ڈالی تھی۔ وہ خود اور ان کے رفقا اس کے لیے مضامین لکھتے تھے۔ اس رسالہ کے اجراء سے موجودہ اردو ادب کی تاریخ کا آغاز ہوتا ہے۔ اردو نے اس رسالہ کی بدولت اتنا فروغ پایا کہ دقیق سے دقیق مطالب کا اظہار اس زبان میں ہونے لگا۔ اس دور کا کوئی مسلمان ادیب ایسا نہ تھا جو تہذیب الاخلاق کے حلقۂ ادب سے متاثر نہ ہوا ہو۔ دورِ جدید کے بلند معیار مصنفین نے اسی خوان نعمت سے لقمے چنے۔ اسی حلقہ کے اثر و نفوذ سے نقد و بصر کی نئی قدریں اور فکر و نظر کے نئے زاویے متعین ہوئے۔ اگرچہ یہ ایک حقیقت ہے کہ جدید اردو شاعری نے لاہور میں جنم لیا۔ لیکن اسے اپنی نشو و نما کے لیے علی گڑھ کی فضا راس آئی۔ نئے انداز اور جدید اسلوب کی نظمیں اسی شہر کے ادبی ماحول کی پیداوار ہیں۔ پہلی بار محمڈن ایجوکیشن کانفرنس نے اس انداز کلام سے دنیا کو روشناس کرایا۔ اردو خطابت کی تربیت گاہ بھی دراصل یہی کانفرنس ہے۔ اس کی آغوش میں وقت کے بلند پایہ ارباب ادب کی خطیبانہ صلاحیتیں بیدار ہوئیں۔ اس کانفرنس کے پلیٹ فارم نے انہیں عوام سے متعارف کرایا، اور یہیں حقیقت میں ان کی شخصیتوں کے دبے ہوئے نقوش ابھرے۔ انیسویں صدی نہ صرف ہندوستان بلکہ پورے مشرق کے لیے ایک عبوری دور کی حیثیت رکھتی تھی۔ حیات و فکر کے قدیم نشانات مٹ رہے تھے۔ اور ان کی جگہ وقت کے جدید تقاضوں کا قصر تعمیر ہو رہا تھا۔ ہندوستان کی پرانی دھرتی ایک

نئے سانچے میں ڈھل رہی تھی۔ جہاں تک مسلمانان ہند کا تعلق ہے ان کی اصلاحی تحریکات پہلے پہل علی گڑھ ہی میں پایۂ تکمیل کو پہنچیں۔ یہی وہ خطۂ تھا جس کے سر پر قدرت نے ہند جدید کی تخلیق کا تاج قیادت رکھا۔ انیسویں صدی کو ہندوستان کی نشاۃ ثانیہ کا دور کہا جا سکتا ہے۔ اور علی گڑھ اس نشاۃ ثانیہ کا اہم ترین مرکز تھا۔

یہ سچ ہے کہ سر سید احمد خاں کے انتقال نے علی گڑھ کو متعدد امتیازی خصوصیات سے محروم کر دیا۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ کالج نے ترقی کی منازل طے کیں اور یونیورسٹی کا مقام حاصل کر لیا۔ لیکن بایں ہمہ یہ ادارہ شان و شکوہ کی قدیم روایات برقرار نہیں رکھ سکا۔ بہرحال یہ ذہن نشین رہے کہ یہ ادارہ آپ حضرات کی عظیم بالشان میراث ہے۔ اور اس لیے آپ پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ آپ اس کی گزشتہ روایات کے احیا کی فکر کریں۔ وہ کتبے جو آپ حضرات نے اسٹریچی ہال کے در و دیوار پر کندہ کیے ہیں۔ گردش لیل و نہار کی ایک رگڑ ان کے نقش محو کر سکتی ہے۔ لیکن وہ کتبے جو علی گڑھ نے تاریخ ہند کے موجودہ دور کی پیشانی پر مرتسم کیے ہیں۔ ان کے نقوش کی درخشندگی و تابندگی میں فرق نہیں آ سکتا۔ مستقبل میں مورخین ان اہم اسباب و ذرائع کی فہرست میں علی گڑھ کو بھی شامل کیے بغیر نہیں رہ سکتے۔ جن پر ہند جدید کی پیش رفت کا دارومدار ہے۔

وہ تعلیمی ادارہ جس کی پشت پر ماضی کی شاندار روایات ہیں، اس کا مستقبل بھی شان و شکوہ کا مظہر ہونا چاہیے۔ مجھے یہ معلوم نہیں کہ آج کل آپ حضرات کے ذہنی رجحانات کیا ہیں؟ اور نہ مجھے یہ خبر ہے کہ آپ مستقبل کے بارے میں کن نظریات کے حامل ہیں؟ یہ کہ مستقبل آپ کو دربندی کا پیغام دیتا ہے یا فتح باب کا۔ تاکہ تجربات کی نئی راہیں کھلیں۔ ابھی میرے دائرہ علم و اطلاع سے باہر ہے۔ میں نہیں جانتا کہ آپ کے تصورات کیا ہیں؟ جن روشن حقیقتوں کے دریچے میری نگاہوں کے سامنے کھلے ہیں ان سے آپ بھی تاک جھانک کر سکتے ہیں۔ غالباً آپ حضرات کے محسوسات یہ ہیں کہ جو دروازے کھلے ہوئے تھے بند ہو چکے ہیں۔ میرا خیال یہ ہے کہ جن دروازوں پر تالے پڑے ہوئے تھے وہ اب پہلے کی طرح بند نہیں رہے۔ ایک ایرانی شاعر کے الفاظ میں:

تفاوت ست میانِ شنیدنِ من و تو   تو بستنِ در و من فتح باب می‌شنوم

میری اور آپ حضرات کی سماعت کے انداز جدا جدا ہیں۔ آپ حضرات دربندی کی صدا سنتے ہیں اور میں فتح باب کی آواز۔

تکلفات بالائے طاق رکھتے ہوئے میں آپ حضرات سے کچھ کھل کر باتیں کرنا چاہتا ہوں اور مجھے یقین ہے کہ آپ مجھ سے اسی بات کی توقع رکھتے ہیں، اگر میں یہ سمجھتا کہ آپ ہنوز اس سیاسی ماحول میں زندگی بسر کر رہے ہیں جو ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء سے قبل آپ حضرات کے دل و دماغ پر مستولی تھا تو میں بلا تامل یہ کہہ سکتا تھا کہ ابھی آپ حضرات کا مستقبل تاریکی میں ہے۔ مجھے مسرت ہے کہ آپ میں بہت بڑی تبدیلی آچکی ہے اور ایک نئے دور کی خوش آئند توقعات آپ کی تبدیلی کا خیر مقدم کر رہی ہیں۔ اچھا ہوا کہ آپ نے آج کے بدلے ہوئے حالات میں اس ادارہ کا ذہنی ماحول بھی بدل لیا ہے۔ آپ نے وقت کی نبض پہچان کر ایسے حالات کے قالب میں اپنے آپ کو ڈھال لیا ہے جس سے سفر کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ مجھے اس حقیقت کے اظہار میں مطلق کوئی تامل نہیں ہے کہ وقت کے تقاضوں کے پیش نظر آپ نے جو راہ عمل اپنے لیے تجویز کی ہے۔ اسے نہ صرف اس ادارہ کے حق میں بلکہ جملہ مسلمانان ہند کے لیے ایک خدمت جلیلہ سے تعبیر کیا جا سکتا ہے، اس سلسلہ میں میں آپ کو دلی مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

مرکزی حکومت نے قومی تعلیم اور تعلیمی اداروں سے متعلق جو پروگرام پیش کیا ہے اس کی رو سے علی گڑھ یونیورسٹی کے دروازوں کا ملک کے باہر باشندوں کے لیے وا ہونا ناگزیر ہے۔ میرا خیال ہے آپ حضرات جس ملک کی موجودہ حیثیت و حیثیت کے پیش نظر مجھ سے اس بارے میں ضرور متفق ہوں گے کہ تعلیم کی نوعیت میں عمومیت ہونی چاہیے اس تعلیمی ادارہ کا نصب العین عوام کی ترقی اور خوش حالی ہونا چاہیے۔ علی گڑھ یونیورسٹی میں قومی تعلیم کچھ اس انداز کی ہونی چاہیے کہ زمانہ کے مزاج پر شاق نہ گذرے۔ اگر یہ رخ اختیار کیا گیا تو اپنی اہم خصوصیات کے باوجود یہ تعلیمی ادارہ عمومی فرائض کے ساتھ ساتھ خصوصی کردار بھی ادا کر سکے گا۔ اس مقصد کی تکمیل کے لیے بڑے دل گردے اور کافی حوصلے کی ضرورت ہے۔ کہا جاتا ہے کہ افلاطون نے اپنی درس گاہ کے دروازہ پر یہ الفاظ کندہ کرا دیے تھے کہ:-

"جن حضرات کو اقلیدس نہیں آتی داخلہ کی اجازت نہیں"

آپ حضرات کے ادارہ کو اس قسم کا کوئی امتناعی حکم صادر نہیں کرنا چاہیے، بلکہ آپ کا مقولہ یہ ہونا چاہیے کہ:- "ہم اقلیدسی اور غیر اقلیدسی دونوں کا خیر مقدم کرتے ہیں"

مجھے معلوم ہے کہ آپ کے ادارہ کا اصول شروع ہی سے فراخ دلانہ اور فیاضانہ رہا ہے۔ جب آپ کے کالج کی بنیاد پڑی تھی تو اس کے طلبہ میں ہندو بھی تھے اور مسلمان بھی اور اساتذہ میں بھی ہندو اور مسلمان

دونوں ہی تھے بعض ہندو پروفیسروں کے نام اس تعلیمی ادارہ کی تاریخ کا ایک اہم جزو بن چکے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ ان روایات کے دائرہ میں مزید توسیع کا اہتمام کیا جائے گا اور رفتار زمانہ کے ساتھ ساتھ اگلی عظمت رفتہ کے نقوش اجالنے کی کوشش بھی ہوگی۔

علوم اسلامیہ اور تاریخ اسلام کے مطالعہ وتحقیق کے سلسلہ میں اس تعلیمی ادارہ کے ساتھ شاندار روایات وابستہ رہی ہیں۔ لیکن واقعات بتلاتے ہیں کہ سرسید کے انتقال کے بعد اس تعلیمی ادارہ کا چاند گہن میں آگیا تھا یونیورسٹی کے قیام کے بعد بھی اس کے دبے ہوئے نقوش نہیں ابھر سکے۔ آج آپ حضرات کا یہ فرض منصبی ہے کہ قدیم روایات کا احیا، عمل میں آئے اور علوم وفنون کے تمام شعبوں میں تحقیق وتدقیق کے ایک خوش گوار ماحول کی تخلیق کی جائے۔

میں یہ بتا چکا ہوں کہ علی گڑھ ہی وہ مقام ہے جہاں موجودہ اردو ادب نے ارتقائی منازل طے کی تھیں۔ یہ ایک ایسی امتیازی فضیلت اور ایک ایسا شرف ہے جس پر آپ کی یونیورسٹی بجا طور پر ناز کر سکتی ہے اب یہ آپ کا فرض ہے کہ آپ اس میراث کے حفظ وبقا کا اہتمام اور اس کے بام ودر پر گلکاریاں کریں۔ یہ بھی واضح رہے کہ موجودہ دور کا تقاضہ یہ ہے کہ آپ کی ادبی کوششوں کا دائرہ ماضی کی بہ نسبت زیادہ وسیع ہونا چاہیے۔ آپ کو ہندی ادب سے بھی دلچسپی لینی چاہیے۔ مسلمانوں کا یہ طرۂ امتیاز رہا ہے کہ انھوں نے ہر زبان اور ہر ادب سے دلچسپی لی ہے۔ ہندی ادب پر مسلمانوں کے بھی اتنے ہی حقوق ہیں جتنے کہ ہندوؤں کے۔ ماضی میں دونوں نے ہندی اور اردو کی ادبی پیش رفت کے لیے نمایاں خدمات سرانجام دی ہیں۔

عہد مغلیہ میں برج بھاشا کے نئے ادب کی تخلیق کا آغاز دراصل اکبر اور جہانگیر ایسے مغل حکمرانوں کی ادب نواز سرپرستی کا نتیجہ ہے۔ محمد جائسی خانخاناں اور عبدالجلیل بلگرامی نے برج بھاشا کے ادب کو اپنے کلام سے چار چاند لگائے ہیں۔ تاریخ بتلاتی ہے کہ اٹھارہویں صدی کے آخر تک جن مسلمان شعراء نے برج بھاشا میں اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے ان کی تعداد اچھی خاصی ہے۔ اب وقت کا تقاضہ ہے کہ آپ حضرات بھی پرانی روایات کا احیا کریں۔ میری خواہش ہے کہ اس تعلیمی ادارہ کے ماحول میں ایسے ادبا کی ایک بہت بڑی کھیپ پیدا ہو جو ہندی اور اردو ادب میں برابر کی دست گاہ رکھتی ہو۔

آج رسم الخط کا مسئلہ مابہ النزاع بنا ہوا ہے۔ آپ حضرات سے غالباً مہاتما گاندھی کی وہ رائے مخفی نہ ہوگی جس کا انہوں نے وقتاً فوقتاً اظہار کیا ہے۔ ان کی دیانت دارانہ رائے یہ تھی کہ ہر ہندوستانی کو ہندی اور اردو دونوں رسم الخط سیکھنے چاہئیں۔ غالباً یہی وجہ تھی کہ انہوں نے ہندوستانی پرچار سبھا کی داغ بیل ڈالی تھی اور اس کے کارکنوں پر لازم کر دیا تھا کہ وہ ان دونوں رسوم الخط میں مہارت بہم پہنچائیں۔ سال ہا سال سے میری رائے اور میرا خیال بھی یہی رہا ہے۔ میرے خیال میں موجودہ حالات کے پیش نظر مسئلہ کا یہی مناسب حل ہے، مجھے امید ہے کہ حامیان اردو، ہندی ادب کے حامیوں کے ردِ عمل کا انتظار کیے بغیر وہ راہ عمل اختیار کریں گے جو ملک کے مفاد کے لیے ازبس ضروری ہے۔ زندگی کے ہر دوسرے گوشے میں دوسروں کے ردعمل اور انداز کار پر غور اور تامل کیا جا سکتا ہے۔ لیکن اگر حصولِ علم کے سلسلہ میں بھی ہمارا طرز عمل اس نوعیت کا ہوگا تو اس سے ہمارے وقار میں فرق آئے گا، اور ہم اس مقام سے گر جائیں گے جو تاریخ نے ہمارے لیے متعین کیا ہے۔ اگر دوسرے صرف ایک رسم الخط پر قانع ہیں اور وہ دوسری طرف نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھنا چاہتے تو یہ بات ہمارے لیے وجہ ملال نہیں ہونی چاہیے۔ بلکہ غور طلب چیز یہ ہے کہ ہم دو رسوم الخط جان لیں گے جب کہ انھیں صرف ایک ہی پر اکتفا کرنا ہوگا۔ میری دیانتدارانہ خواہش یہ ہے کہ ہندوستان میں ہر مسلمان کو دونوں رسم الخط آنے چاہئیں تاکہ مسلمان ملک کے سامنے مثال پیش کر سکیں۔

مجھے خوشی ہے کہ اس مسئلہ کی اہمیت کا احساس عام ہو چلا ہے۔ اردو میں ایسی کتابیں لکھی گئی ہیں جن کی مدد سے دیوناگری رسم الخط اور ہندی ادب پر عبور حاصل ہو سکے، اس مقصد اور اس غرض سے ملک کے مختلف حصوں میں کچھ ادارے بھی قائم ہو چکے ہیں اور ان میں کام بھی شروع ہو چکا ہے۔ مجھے امید ہے کہ آپ حضرات نے بھی اس مسئلہ کی اہمیت اور کام کی نوعیت کا احساس کر لیا ہے۔ اگر یہ بات ہے تو پھر آپ کا یہ تعلیمی ادارہ زبان کی تعلیم و تدریس کا ایک اہم ترین مرکز قرار پائے گا۔

آخر میں مجھے ان فارغ التحصیل گریجویٹوں سے بھی کچھ کہنا ہے۔ ان گریجویٹوں پر زندگی نے ذمہ داریوں کے دروازے کھول دیے ہیں۔ انہوں نے اپنی تعلیم کی ابتدا غلامی کے دور میں کی تھی، لیکن اب اسناد فراغت انہیں اس دور میں ملی ہیں جب کہ ملک نے غلامی کا جوا اپنے کاندھوں سے اتار پھینکا ہے۔ مجھے امید ہے

یہ گریجویٹ اس اہم تبدیلی اور اس عظیم الشان انقلاب کی حقیقت اپنے پیش نظر رکھیں گے۔

یہ کھلی ڈلی بات ہے کہ ملک کی آزادی کے بعد آپ پر جو فرائض عائد ہوتے ہیں ان کی نوعیت پہلے سے کہیں مختلف ہے۔ آپ اس ملک کے شہری ہیں اور اس لیے آپ پر نہ صرف سیاسی خدمات کے بلکہ تجارت، صنعت وحرفت اور دوسرے اہم شعبہ ہائے زندگی کے دروازے بھی کھلے ہیں۔

ماضی میں تو یہ تھا کہ تعلیم سے فراغت کے بعد سرکاری ملازمتوں کے لیے مختلف محکموں کے دروازوں پر دستک دی جاتی تھی، لیکن آج آزادی کے دور میں آپ کو اپنی صلاحیتیں ملک کی صلاح و فلاح کے لیے بھی استعمال کرنی ہوں گی۔

آپ کو چاہیے کہ اپنے کردار کی بنیادیں استوار کریں اور اس انداز سے حصولِ علم کریں کہ اس کی بدولت مستقبل میں ترقی کی منازل طے کر سکے۔

نوجوان اپنی صلاحیتوں اور قابلیتوں سے ملک کو جو فائدہ پہنچائیں گے اس کا تعلق خود ان سے بھی ہے کہ وہ اس ملک کے شہری ہیں +

ایکیفے کے اجلاس میں پاکستان کے وزیر مالیات کی تقریر

اقوام متحدہ کے اقتصادی کمیشن برائے ایشیا و مشرق بعید (ایکیفے) کے دسویں سالانہ اجلاس میں ۸ مئی کو پاکستان کے وزیر مالیات سید امجد علی نے تقریر کی۔ وہ بنکوک میں حکومت تھائی لینڈ کے مہمان خصوصی کی حیثیت سے مقیم تھے۔

حاضرین جلسہ سے وزیر مالیات کا تعارف کراتے ہوئے اجلاس کے صدر تھائی لینڈ کے نمائندے ڈاکٹر بنیاراچن نے کہا کہ مسٹر امجد علی کا اقوام متحدہ سے ایک قریبی اور نمایاں تعلق رہا ہے وہ اقتصادی سے متعلق اقوام متحدہ کے خاص فنڈ (سن فیڈ) اور بین الاقوامی مالیاتی ادارے کے پہلے رہنماؤں میں شامل تھے۔ وہ اقتصادی اور معاشرتی کونسل کے صدر بھی رہ چکے ہیں۔

حاضرین کو مخاطب کرتے ہوئے مسٹر امجد علی نے کہا کہ اس اجلاس میں تقریر کرنا میرے لیے باعث فخر ہے انہوں نے یہ بھی کہا کہ اقوام متحدہ کے مختلف اداروں میں شریک ہو کر میں نے ہمیشہ پس ماندہ ملکوں کی فلاح و بہبود

وکالت کی ہے۔ لیکن جب تک ان نام نہاد پس ماندہ ملکوں کے باشندے خود قدم بڑھانے کی کوشش نہ کریں، دنیا میں امن و عافیت اور آزادی کی فضا قائم نہیں ہو سکتی۔ خواہ ہم اس مقصد کے لیے کتنی ہی آرزو کریں اور کوشاں رہیں۔

ایشیائی ملکوں کے سامنے اس وقت بنیادی مسئلہ یہ ہے کہ وہ کم سے کم وقت میں اپنے بیش بہا قدرتی اور انسانی وسائل سے استفادہ کریں اور اس طرح عوام کا معیار زندگی بلند کریں۔

انہوں نے کہا اس وقت بنیادی سوال یہ بھی ہے کہ ایشیائی ملکوں میں زراعت کو کس طرح ترقی دی جائے۔ کیا وہ بچت کی خاطر ٹریکٹروں کا استعمال شروع کر دیں۔ لیکن سوچنا یہ ہے کہ مشینوں کے ذریعہ کھیتی باڑی کرنے سے بے روزگاری اور کم روزگاری کی کیفیات پیدا ہو جائیں گی، جو اس وقت بھی ایشیائی ملکوں میں لاحق ہیں۔ پھر ایشیائی ملکوں کے لیے کلوں کی فراہمی بھی بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ اس وقت مغربی دنیا میں جو مشینیں تیار ہو رہی ہیں وہ بہت پیچیدہ اور گراں قیمت ہیں۔

عالمی ادارۂ صحت کی سالانہ رپورٹ

اقوام متحدہ کے عالمی ادارہ صحت نے ۲۷ مارچ کو اپنی سالانہ رپورٹ شائع کر دی ہے، جس میں اس مسئلہ پر خاص زور دیا گیا ہے کہ مچھروں میں کیڑے مار سفوف کا مقابلہ کرنے کی صلاحیت پیدا ہو رہی ہے۔ ادارے کے ڈائرکٹر جنرل ڈاکٹر کنڈاؤ نے رپورٹ میں لکھا ہے کہ اس مسئلہ کو حل کرنے کا ایک طریقہ یہ ہے کہ انسان کے جسم میں ایک خاص نمک پہنچایا جائے جس میں ملیریا کا توڑ کرنے والی ادویات ملی ہوئی ہوں ادارے نے اپنی نگرانی میں اس کا تجربہ کیا تھا جس کے نتائج بہت افزا برآمد ہوئے ہیں۔

ڈاکٹر کنڈاؤ کا کہنا ہے کہ پچھلے سال ملیریا کے استیصال پر ادارے نے سب سے زیادہ توجہ دی ہے۔ اس مقصد کے لیے ڈی ڈی ٹی اور بی ایچ سی کی صلاحیتوں میں مقابلہ ہو رہا ہے کہ ان میں کون زیادہ تباہ کن ہے۔ یونان کے بعض حصوں میں مچھروں پر ان دونوں کیڑے مار سفوفوں کا کوئی اثر نہیں ہوا ہے۔ اگر یونان جیسے حالات دوسرے مقامات پر بھی پائے گئے تو ظاہر ہے کہ وہاں بھی ملیریا کے استیصال کی مہمیں ناکام ہو جائیں گی اور ضرورت ہوگی کہ مچھروں سے بچنے کا کوئی نیا طریقہ اختیار کیا جائے۔

ڈاکٹر کنڈاؤ نے اس بات پر زور دیا کہ عالمی ادارۂ صحت کے تمام اراکین کو اجتماعی طور پر یہ ذمہ داری اپنے سر لینی چاہیے کہ دنیا بھر سے ملیریا کا استیصال ضروری ہے۔ اس مقصد کے لیے لازمی ہے کہ ادارے کو زیادہ چندے بھی دیے جائیں اس رپورٹ پر عالمی صحت کی اسمبلی میں غور کیا جائے گا جس کا اجلاس مئی میں جنیوا میں ہونے والا ہے۔ اس میں اور مسائل پر بھی اظہار خیالات کیا جائے گا۔

لالہ موسےٰ میں بنیادی تعلیم کے انتظامات

پاکستان کے بالغ باشندوں میں سے تقریباً اسی فی صد ناخواندہ ہیں۔ ناخواندگی کا یہ عالم ہر ملک کی قومی اقتصادیات پر بُرا اثر ڈال سکتا ہے۔ پاکستان نے اس مسئلے کو حل کرنے کی بارہا کوشش کی ہے۔ اور اسی مقصد کے لیے تعلیم بالغان کے متعدد منصوبے بنائے ہیں۔ بدقسمتی سے ایسی کوششیں زیادہ تر ناکام رہی ہیں، ان کا بڑا سبب یہ ہے کہ ہر مرتبہ زیادہ زور نصابی تعلیم پر دیا گیا ہے اور یہ تو ظاہر ہے کہ پڑھنے لکھنے کی طرف ایسے شخص کو راغب کرنا ذرا مشکل ہے جس کا پیٹ خالی ہو اور جو اس سبب سے بیمار بھی ہو۔ ایک قومی مہم میں اس کا تعاون حاصل کرنے کے لیے اسے یہ یقین دلانا ضروری ہے کہ تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد اسے بے پناہ اقتصادی فائدے ہوں گے۔ اور اس کا معیارِ زندگی بلند ہو جائے گا۔ صرف اس اعتبار سے وہ تعلیمی جدوجہد میں شریک ہو سکتا ہے۔

بنیادی تعلیم:۔ دیہی امداد کے پروگرام کا مقصد یہی ہے کہ باشندگان دیہات کا معیار زندگی بلند کیا جائے انہیں بتایا جائے کہ وہ کس طرح اپنی فصلوں کو بہتر بنا سکتے ہیں اور کس طرح صحت کے عام اصولوں پر کاربند ہو سکتے ہیں۔ تاہم دیہات کی تعمیر نو کا پروگرام صرف اسی وقت کامیاب ہو سکتا ہے جبکہ گاؤں کے رہنے والے عمدہ بنیادی تعلیم حاصل کر لیں۔ اس ضمن میں کچھ تعلیمی نقشے، خاکے اور رسالے تیار کیے گئے ہیں۔ جنہیں دیکھ کر اور پڑھ کر بہت سی معلومات حاصل کی جا سکتی ہیں، اور دیہات کے رہنے والے کھیتی باڑی کے کاموں میں کافی ترقی کر سکتے ہیں لیکن اس سے قبل لازمی ہے کہ وہ نوشت و خواند کی تھوڑی بہت استعداد حاصل کر لیں۔ اسی طرح دیہات میں اس کا کام کرنے والوں کے لیے ضروری ہے کہ وہ خود بھی پڑھے لکھے ہوں۔ نئی دستکاریوں کی ترقی، خالی وقت کو اچھی طرح استعمال کرنے کا گر۔ اچھے شہری کے صفات اور ایک جمہوری حکومت میں اس کی ذمہ داریوں کا احساس ملک کی روایات اور تاریخی قدریں اور اسی قسم کی بہت سی باتیں بنیادی تعلیم کے نصاب میں شامل ہونی چاہئیں

مغربی پاکستان کے شہر لالہ موسیٰ میں دیہی امداد کا ایک تربیتی ادارہ قائم ہے جس کا فرض ہے کہ :-

(ا) ایسے استادوں کو تربیت دے جو دیہات سدھار کے پروگرام کو عملی جامہ پہنانے کے لیے منتخب کیے گئے ہوں۔

(ب) ایسے درسی سامان کی تیاری میں حصہ لے جسے تقسیم کرکے یہ استاد اپنے پروگرام کو عمل میں لائیں۔

(ج) وہ اندازہ لگائے کہ ادارے کے ماتحت مرکزوں میں جو سامان استعمال ہو رہا ہے وہ کس حد تک مفید ہے

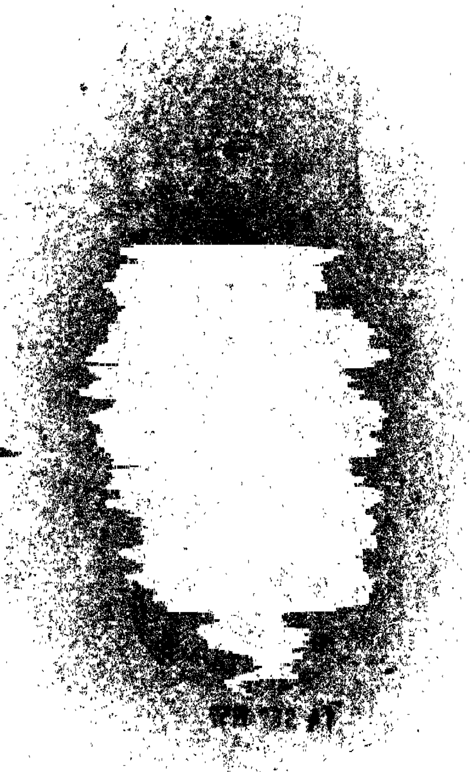
(د) زبان کے بارے میں تحقیقات کرے اور معلوم کرے کہ بالغ کس کام میں دلچسپی لے رہے ہیں اور ان کی ضروریات کیا ہیں۔

دیہی امداد کے پنج سالہ منصوبے میں بتایا گیا ہے کہ ہر ترقی طلب علاقے میں درس دینے والے سات ہزار متقرر ہوں گے۔ ان استادوں کے لیے تربیت کا پہلا نصاب لالہ موسیٰ میں پچھلے سال دسمبر میں شروع ہوا ہے۔ کوئٹہ، بہاولپور، پشاور اور لاہور کے علاقوں سے تربیت کے لیے ۴۲ دیہی کارکن منتخب کیے گئے ہیں انہیں سب سے پہلے بنیادی تعلیم کا اصل فلسفہ سمجھایا جائے گا۔ مذکورہ بالا درسی سامان کی تفہیم و تشہیر کے علاوہ وہ فلینل گراف دکھانے اور فلمی پیٹیوں کی مشین چلانے کے کام بھی سیکھیں گے۔ اس تعلیم کی مدت دو ماہ ہے اور اس کا عملی تجربہ حاصل کرنا ہر استاد کے لیے ضروری ہے۔ لالہ موسیٰ کے تربیتی مرکز میں ہر طالب علم کو چھ ماہ گزارنے ہوں گے فارغ التحصیل ہونے کے بعد اپنے علاقے میں واپس آکر وہ خود تعلیم و تدریس کا انتظام کرے گا۔ انہیں اپنے علاقے میں کام کرنے کے لیے ضروری سامان بھی دیا جائے گا۔

پاکستان کے لیے سائنسی مترجم کا تقرر

اقوام متحدہ کے تعلیمی، سائنسی اور ثقافتی ادارے (یونیسکو) نے ایک برطانوی سائنسی مترجم و مدیر مسز ڈیزی ہال کو پاکستان بھیجا ہے۔ وہ کراچی آکر اس وفد میں شامل ہو گئی ہیں جو سائنسی اور فنی دستاویزات کا مرکز قائم کرنے میں حکومت پاکستان کی مدد کر رہا ہے۔ اس مرکز کا مقصد دنیا بھر کی ایسی قابل قدر سائنسی اور فنی مطبوعات کو جمع کرنا ہے جو پاکستان کے سائنس دانوں اور صنعت کاروں کے لیے مفید ثابت ہو سکیں۔

اس شمارہ میں



تعلیمی ماہ نامہ

آموزش

لاہور

مئی ۱۹۵۷ء

سالانہ چندہ

جلد ——————— ۱۰

شمارہ ——————— ۲

پاکستان کے لیے ۶ روپے

غیر ممالک کے لیے ۸ روپے

قیمت فی پرچہ دس آنے

پبلشرز

یونی ورسٹی بک ایجنسی ۔ لاہور

آر۔ ایچ۔ ڈی خالد پرنٹر پبلشر نے دین محمدی پریس میں طبع کرا کے
یونیورسٹی بک ایجنسی ۲ کچہری روڈ۔ لاہور سے شائع کیا۔

یونیورسٹی طلبہ اور ضبط

ایم۔ اے۔ مخدومی

یونیورسٹی طلبہ میں لاقانونی کا رجحان جس حد تک بڑھ چکا ہے، اس سے ملک کے ماہرینِ تعلیم کو بجا طور پر تشویش لاحق ہونے لگی ہے۔ چند روز ہوئے لاہور کے ایک کالج کے پرنسپل نے اپنی تقریر میں کہا تھا:۔

"یہ امر قابلِ افسوس ہے کہ ہمارے طلبہ سیاسیات میں حصہ لینے کے شائق بنتے جا رہے ہیں، وہ ایسا رویہ اختیار کرتے ہیں جو طلبہ کی بجائے مزدور انجمنوں کے رہنماؤں کو زیادہ زیب دیتا ہے، ان کے لیے زیادہ مناسب یہ ہے کہ پڑھائی میں دل چسپی لیں اور تعلیمی معیار مقرر کرنے کا کام ماہرینِ تعلیم پر چھوڑ دیں"

ہر قوم کی بہت سی امیدیں اپنے یونیورسٹی طلبہ سے وابستہ ہوتی ہیں۔ کیوں کہ آگے چل کر یہی لوگ قومی زندگی کے بہت سے بوجھ اٹھانے والے ہوتے ہیں۔ اگر ان میں ذمہ داری کا وہ بلند احساس مفقود نظر آئے جو ایک قابلِ اعتماد کردار کی پہلی شرط ہوا کرتی ہے، تو ملک و قوم کو یقینی طور پر فکر دامن گیر ہونی چاہیے۔

یونیورسٹی طلبہ میں بدنظمی کے بڑھتے ہوئے رجحان کے کئی ایک اسباب بیان کیے گئے ہیں۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اس مرض کی اصل جڑ انٹرمیڈیایٹ جماعتوں کا یونیورسٹی کے درجہ میں شامل کرنا ہے۔ عام حالتوں میں میٹرک پاس طلبہ ابھی بچے ہی ہوتے ہیں۔ یونیورسٹی کی آزاد فضا انہیں راس نہیں آتی۔ جس کا نتیجہ آئے دن کی بدنظمیوں کی صورت میں نکلتا رہتا ہے۔

اس دلیل میں بظاہر کافی وزن ہے۔ مگر اس سلسلے میں ہمیں یہ نہ بھولنا چاہیے کہ یونیورسٹی درجہ میں انٹرمیڈیایٹ درجہ کی شمولیت کوئی نئی شے نہیں۔ اس ملک میں یہ چیز سالہا سال سے چلی آتی ہے بہر نقطۂ

طلبہ میں نظم و ضبط کا احترام اس خوفناک تیزی سے کیوں گھٹنے لگا ہے؟

اس سوال کا شافی جواب تلاش کرنے کے لیے ہمیں تعلیمی سطح سے آگے بڑھ کر زیادہ دور رس معاشرتی اسباب کا جائزہ لینا چاہیے۔ حال ہی میں ایک غیر ملکی ماہر تعلیم نے ہمارے نظام تعلیم پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا تھا کہ "کسی ملک کے نظام تعلیم کا سب سے بڑا مقصد یہ ہونا چاہیے کہ وہ نوجوانوں کے دلوں میں ذمہ داری کا ایک بلند احساس اور اخلاقی اقدار کا ایک شدید شعور پیدا کرے"۔

ایک غیر ملکی ماہر تعلیم کا یہ تبصرہ بہت معنی خیز ہے۔ ہماری یونیورسٹی تعلیم میں صرف یہی خامی نہیں کہ یہ ہاتھ سے کام کرنے کو باعث عار بنا کر رکھ دیتی ہے بلکہ اس کا دامن روز بروز اخلاقی اقدار سے بھی خالی ہوتا جا رہا ہے۔ مغربی علوم و فنون کا اکتساب ایک بے حد پسندیدہ چیز ہے۔ لیکن کم از کم اسی قدر پسندیدہ شے یہ ہے کہ ان اخلاقی قدروں کو جو ہماری ثقافت کی جان ہیں برقرار رکھا جائے۔ بدقسمتی سے تعلیم کا یہ دوسرا مقصد بڑی حد تک نگاہوں سے اوجھل ہوتا جا رہا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ جہاں تعلیم کی بے مقصدیت کی عام شکایت ہے وہاں نئی پود میں نظم و ضبط کا احترام بھی تیزی سے گھٹ رہا ہے۔

آج ہماری ایک اہم ضرورت تعلیم کی قومی خطوط پر تشکیل نو ہے۔ بے شک ہمیں ترقی یافتہ ممالک کے نظامہائے تعلیم کا مطالعہ کرنا چاہیے، اور ان کے تعلیمی تجربوں اور علمی خزانوں سے جی کھول کر فائدہ اٹھانا چاہیے لیکن اس دھن میں ہمیں ان ابدی اخلاقی اقدار سے لحظہ بھر کے لیے تغافل نہ برتنا چاہیے، جن پر ہماری ثقافت کو ہمیشہ فخر رہا ہے۔ تعلیم کو ایک اعلیٰ مقصد عطا کرنے اور طلبہ میں شدید اخلاقی شعور پیدا کرنے کی اس سے زیادہ موثر تدبیر غالباً اور کوئی نہیں، یہ کہنے کی شاید ضرورت نہیں کہ اخلاقی اقدار کا شعور احساس ذمہ داری پیدا کرنے کی سب سے بڑی ضمانت ہوا کرتا ہے۔

نیویارک کی سیر

فضل احمد

درج ذیل مضمون ۱۹۰۳ء میں نیویارک کے موسم گرما میں لکھا گیا تھا۔ لیکن ایک عجیب غریب اتفاق کے باعث پورے چار سال تک مکتوب الیہ تک نہ پہنچ سکا۔ امید ہے نیویارک کی سیر کے یہ تاثرات آج بھی اپنے اندر وہی تازگی رکھتے ہوں گے جو آج سے چار سال پہلے۔

یوں تو پچھلے بڑے دنوں میں بھی کچھ دنوں کے لیے نیویارک میں قیام رہا تھا، مگر ان دنوں عیسائی دنیا کے سب سے بڑے تہوار کی بھڑکیلی چہل پہل نے دوسری چیزوں کو دیکھنے کا بہت کم موقع دیا۔ پندرہ جون سے کنی ٹی کٹ یونیورسٹی دو ہفتہ کے لیے بند ہو رہی تھی، چناں چہ شیخ معز الدین اور میں نے فیصلہ کیا کہ یہ چھٹیاں نیویارک میں گذاریں حسن اتفاق سے ہمارے ایک پروفیسر ڈاکٹر ہیلن نیویارک کے رہنے والے ہیں، وہ تعطیلات میں گھر جا رہے تھے، جب انھیں ہمارا ارادہ معلوم ہوا تو ہمیں ساتھ لے جانے کی پیش کش کی اور کہا کہ میں نیویارک کے چپہ چپہ سے واقف ہوں۔ تمھیں تمام ضروری مقامات دکھا دوں گا۔ ہم نے نہایت شکریہ کے ساتھ یہ پیش کش قبول کی اور پندرہ جون کو بعد دوپہر ان کے ساتھ بیٹھ کر نیویارک کو چل دیے۔

سٹوآز (یونیورسٹی آف کنی ٹی کٹ) سے نیویارک کا فاصلہ ڈیڑھ سو میل ہے۔ یہ سفر کوئی چار گھنٹوں میں طے ہو گیا۔ امریکہ میں عمدہ سڑکوں کا جال بچھا ہوا ہے۔ مگر اس پر بھی موٹر کاروں کی بھرمار کا یہ حال ہے کہ بسا اوقات بھیڑ کی وجہ سے ٹریفک رک جاتی ہے۔ مقامی آمد و رفت میں تو اسے برداشت کرنا ہی پڑتا ہے، مگر لمبے سفر میں یہ چیز بہت تکلیف دہ ثابت ہوتی ہے۔ اس دقت کو رفع کرنے کے لیے ملک کے بڑے بڑے شہروں کے درمیان بہت کشادہ سڑکیں بنائی گئی ہیں۔ جو ٹرن پائک (TURN PIKE) کے نام سے پکاری جاتی ہیں، یہ عموماً دو رویہ سڑکیں ہوتی ہیں۔ یعنی دو الگ الگ متوازی راستوں پر مشتمل جن میں سے ایک جانے کے لیے مخصوص ہے اور دوسرا آنے کے لیے۔ ہر راستہ دو یا تین گلیوں پر مشتمل ہوتا ہے جو سفید

کیہ وں سے نمایاں کیے جاتے ہیں۔ اس طرح گویا ایک ہی ساتھ دو یا تین کاریں پہلو بہ پہلو ایک ہی سمت میں چل سکتی ہیں۔ یہ کشادہ سڑکیں بعض اوقات ...... نجی کمپنیوں نے تیار کی ہوتی ہیں اور بعض اوقات ریاستوں نے، دونوں صورتوں میں ان کے استعمال کے لیے سرکار کو محصول چونگی ادا کرنا پڑتا ہے، جس کی تعداد مختلف ہوتی ہے۔ پھر ساری کی ساری سڑک ایک ہی کمپنی یا ریاست کی ملکیت نہیں ہوتی۔ سڑک کے مختلف حصے مختلف مالکوں نے تعمیر کیے ہوتے ہیں، اور ہر مالک اپنے حصّہ کی سڑک کے لیے محصول چونگی وصول کرتا ہے۔ مثلاً ہمیں سٹواز سے نیویارک تک آتے آتے کوئی چار یا پانچ مرتبہ یہ محصول ادا کرنا پڑا جس کی کل مقدار کوئی ایک ڈالر کے قریب بنی۔ مگر اس محصول کے باوجود ان کشادہ سڑکوں پر سفر کرنے میں اس قدر سہولت ہے کہ سفر طے کرنے والے لوگ انہی کو استعمال کرتے ہیں اور ان سڑکوں پر موٹر کاروں کا تانتا بندھا رہتا ہے۔

امریکہ کی صنعتی عظمت کو تو دنیا جانتی ہے۔ مگر جن لوگوں نے اس ملک کو نہیں دیکھا ان کے لیے غالباً یہ اندازہ کرنا مشکل ہے کہ صنعتی زندگی کے شور و شغف، ہجوم و انقباض اور دود و غبار سے صرف چند قدم کے فاصلہ پر حسن فطرت کس شوخی اور رنگینی کے ساتھ بکھرا موجود رہتا ہے۔ اٹلانٹک کا ساحل گنجان آبادی اور صنعتی ترقی کے اعتبار سے ملک بھر میں بڑھا ہوا ہے۔ مگر اس ساحل کے ساتھ ساتھ ڈیڑھ سو میل لمبا راستہ سرسبز درختوں سے ڈھپی ہوئی پہاڑیوں اور وادیوں کا ایک لگاتار سلسلہ تھا، جس میں کہیں کہیں چند گھر، کچھ کھیت، یا گائیں چرتی نظر آجاتی تھیں۔ غرض امریکہ نے ملک کی قدرتی خوب صورتی کو جس طور پر برقرار رکھا ہے وہ حد درجہ حیرت انگیز ہے۔ پہاڑیوں اور جنگلوں میں نفیس سڑکوں کا جال بچھا دیکھ کر اجنبی کو اوّل اوّل حیرت ہوتی ہے۔ گویا امریکہ کی صنعتی اور سائنسی ترقی نے فطرت کے روپ کو کم نہیں کیا بلکہ دوگنا کرکے رکھ دیا ہے۔

جزیرہ من ہٹن (MANHATTEN)

نیویارک دنیا کا سب سے بڑا شہر کہا جاتا ہے۔ عظمت کا یہ دعویٰ لندن کو بھی ہے۔ مگر غالباً نیویارک کا دعویٰ زیادہ صحیح ہے۔ کیونکہ لندن کا رقبہ بہت لمبا چوڑا ہے، جوں جوں شہر پھیلتا گیا قریب کے

تیاں اس میں شمار ہو گئیں۔ مگر نیویارک چند چھوٹے چھوٹے جزیروں پر بسا ہوا ہے۔ اس طرح اس نے
ِیباً اسی لاکھ کی آبادی صرف ۳۲۰ مربع میل میں سمیٹ رکھی ہے۔ دنیا کے عام بڑے شہروں کی طرح نیویارک
ں دریا پر واقع ہے۔ بلکہ دریاؤں اور سمندر سے گھرا ہوا ہے۔ نیویارک کی عظمت کا سب سے بڑا سبب دریائے
سن ہے، جو ملک کی تجارتی شاہ راہ ہے، اور جس کے طفیل نیویارک کی بندرگاہ دنیا کی بہترین بندرگاہوں میں
رہوتی ہے۔ ہڈسن میں تقریباً کینیڈا تک جہاز رانی ہو سکتی ہے۔ جس کی وجہ سے اس دریا اور نیویارک کی
رگاہ کی اہمیت کئی گنا بڑھ گئی ہے۔

نیویارک پانچ جزیروں پر مشتمل ہے، جن میں سب سے زیادہ اہم جزیرہ منہٹن ہے۔ یہ جزیرہ
۱۳ میل لمبا اور ۲ میل چوڑا ہے اور ان چند مربع میلوں میں دنیا کی جس قدر دولت سمٹی ہوئی ہے، اس کی
ی مثال غالباً دنیا بھر میں نہیں۔ جہاں دنیا کی سب سے اونچی عمارتیں ہیں۔ امیر ترین جوہریوں کی دکانیں
ں۔ عالمگیر کاروبار کا سب سے بڑا مرکز ہے جو دنیا کی مالی اور اقتصادی زندگی کے لیے مرکز اعصاب کا درجہ رکھتا
ہے، اور اب دوسری عالمگیر جنگ کے بعد اقوام متحدہ کا صدر دفتر بھی اسی چھوٹے سے جزیرہ میں تعمیر
ا ہے۔ گویا مالی اور اقتصادی امور کے ساتھ ساتھ اب دنیا کے سیاسی مسائل کا نقطۂ وسط بھی اسی کو قرار
گیا ہے۔ نیویارک کی بین الاقوامیت کا دوسرا رخ یہ بھی ہے کہ یہاں تقریباً ہر ملک، ہر مشرب اور ہر ڈھنگ
۔ لوگ موجود ہیں۔ چینیوں کی ایک باقاعدہ بستی موجود ہے جو چائنا ٹاؤن کے نام سے موسوم ہے۔ یہاں
ں جائیے تو بس چین کا سماں نظر آنے لگتا ہے۔ اس طرح اطالوی اور دوسری یورپی اقوام کے بڑے بڑے
ے ہیں، جو بذات خود بستیوں کا درجہ رکھتے ہیں۔ مگر افسوس کہ اس مشہور بین الاقوامی شہر یا اس کے
مافات میں مسلمانوں کی کوئی بستی نہیں۔ بلکہ زیادہ صحیح یہ ہے کہ چینیوں کو چھوڑ کر کوئی اور ایشیائی بستی
ں نہیں۔ چینیوں کی بستیاں یا محلے تو آپ کو شکاگو اور اس طرح کے دوسرے بڑے شہروں میں بھی مل جائیں گے
ے شہروں میں چینی ہوٹل اور ریسٹورنٹ بھی عام مل جاتے ہیں۔ ہر شہر اور قصبے میں کچھ نہ کچھ چینی آباد
ں، اور نہیں تو چینی لانڈری ضرور ہوگی۔ مگر یہ بات بہت عجیب ہے کہ چینیوں اور کچھ جاپانیوں کے
اوہ کسی دوسری ایشیائی قوم نے نئی دنیا کا رخ نہیں کیا۔ اور شمالی اور جنوبی امریکہ کے دونوں براعظم

صرف یورپ کے چھوٹے سے براعظم کی فاضل آبادی کے لیے ہی مخصوص ہو کر رہ گئے۔ یورپ نے اسی پر بس نہیں کی، بلکہ دوسری جنگ عظیم کے بعد اس کی فاضل آبادی نے کھلم کھلا بجوم ایشیا پر بھی دھاوا بول دیا معلوم ہوتا ہے، جس کی بیّن مثال فلسطین میں یہودیوں کا تسلّط ہے۔ خیر یہ اس بحث کا مقام نہیں۔ بہتر ہے کہ اب نیو یارک کی ایک جھلک پیش کی جائے جو اس مضمون کا اصل موضوع ہے۔

ہم صبح کے نو بجے کے قریب نیو یارک میں گھومنے کے لیے نکلے، وسط جون میں ہمارے ہاں بلا کی گرمی ہوتی ہے، مگر یہاں موسم خاصہ خوش گوار تھا۔ صرف چلتے ہوئے دھوپ کی کچھ حدت محسوس ہوتی تھی لاکھوں کارخانوں۔ جہازوں۔ گاڑیوں اور موٹروں کے دھوئیں نے ہوا کو کافی کثیف کر رکھا تھا، اور معمولی حرارت میں بھی یہ کثافت طبیعت پر گراں گذر رہی تھی۔ کراچی میں یہ بات نہ تھی۔ اس وقت سڑکیں اور بازار پرت سے ڈھکے پڑے تھے، اور ہوا میں دھوئیں کا اثر بھی نمایاں نہ تھا۔ سلون ہاؤس، وائی۔ ایم سی اے جو ہمارا نقطۂ روانگی تھا جزیرہ من ہٹن کے جنوبی حصہ میں واقع ہے۔ پہلے ہم نے شمال کا رخ کیا۔ آمد و رفت کی کثرت کے باعث کار کو آہستہ چلنا پڑتا تھا۔ ہم دریائے ہڈسن کے کنارے کنارے جا رہے تھے، سڑک کے دائیں جانب ایک خوب صورت پارک ہے اور بائیں جانب بندرگاہ نیو یارک کے سیلوں لیے ڈاکس جن میں سینکڑوں جہاز ہر وقت اسباب تجارت لادنے یا اتارنے میں معروف رہتے ہیں، جزیرے کے انتہائی شمالی کنارے سے کچھ پہلے دریائے ہڈسن پر ایک عظیم الشان فولادی پل ہے جو ریاست نیو یارک کو ریاست نیو جرسی سے ملاتا ہے کیونکہ دریائے ہڈسن ان دونوں ریاستوں کے درمیان حد فاصل ہے۔

فورٹ ٹرائن پارک (FORT TRYON PARK)

جارج واشنگٹن پل سے کچھ اوپر شمال کو فورٹ ٹرائن پارک ہے۔ جو ایک اونچے ٹیلے پر بنائی گئی ہے یہ حسین و شاداب باغ دراصل مشہور راک فیلر خاندان کی ملکیت تھا جو انہوں نے سیر و تفریح کے لیے بنا رکھا تھا۔ مگر ۱۹۳۵ء میں جان ڈی راک فیلر نے یہ باغ اور اس کی ساری عمارتیں بلدیہ نیو یارک کو تحفۃً دیدیں اور یہ نجی تفریح گاہ عوام کے لیے وقف ہو گئی۔

فورٹ ٹرائن شہر نیو یارک میں سب سے اونچی جگہ ہے۔ اس کے چاروں طرف درخت اور پھول میں

جن میں اونچی نیچی کھاتی پختہ سڑکیں بنی ہوئی ہیں۔ عین چوٹی پر سرسبز درختوں نے چھتری بنا رکھی ہے۔ جس کے نیچے بنچ بچھے ہیں۔ چوٹی سے نیچے دیکھو تو شہر کا نہایت پُرلطف طائرانہ نظارہ حاصل ہوتا ہے۔ اس باغ میں پہنچ کر آدمی کو حیرت ہوتی ہے کہ نیو یارک کے ہجوم، شور اور دھوئیں سے بچ کر کچھ گھنٹے گذارنے کے لیے یہ مقام کس قدر قریب ہے۔

فورٹ ٹرائن محض ایک باغ ہی نہیں بلکہ یہاں ایک عجائب گھر بھی ہے۔ یہ عجائب گھر دراصل قرونِ وسطیٰ کی بہت سی مسیحی خانقاہوں پر مشتمل ہے جن کا سارا مصالحہ فرانس، سپین اور دوسرے یورپی ممالک سے اٹھا کر یہاں لایا گیا اور انہیں دوبارہ ان کی اصلی شکل دی گئی۔ اس کے علاوہ پندرھویں اور سولھویں صدیوں کے یورپی آرٹ کے بہت سے نوادرات بھی اس عجائب گھر میں موجود ہیں۔

یہاں یہ اشارہ کردینا شاید بے محل نہ ہوگا کہ نظام سرمایہ داری کی جو بھیانک تصویر اکثر لوگ پیش کیا کرتے ہیں اس میں مبالغے کا رنگ بہت زیادہ ہے۔ فورٹ ٹرائن لاکھوں مثالوں میں سے صرف ایک مثال ہے۔ جہاں ایک امریکی سرمایہ دار نے اپنی دولت یا جائداد رفاہِ عام کے لیے وقف کردی ہو۔ ریاست ڈیلاویئر میں مشہور ڈو پانٹ خاندان کے ایک فرد نے حال ہی میں ۹۰ میل لمبی دورویہ کشادہ سڑک تعمیر کر کے ریاست کے حوالے کی ہے۔ انسانی طبیعت کے لیے دولت سے بڑھ کر ایک اور چیز کی کشش ہے اور وہ ہے نیک نامی۔ جس قوم میں نیک نامی کے لیے مسابقت کا جذبہ موجود ہو وہاں سرمایہ داری بھی گزند نہیں پہنچاتی۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ کمیونسٹ نظام کی ساری کامیابی کی جان یہی پاکیزہ جذبہ مسابقت ہے لیکن جب مسابقت کا جذبہ نفس پرستی سے بلند تر کسی چیز کو دیکھنے کی صلاحیت کھو دے تو پھر نظامِ حیات کا اقتصادی ڈھانچہ خواہ کسی نام سے موسوم ہو اس کا نام اسے ذلت اور نامرادی سے نہیں بچا سکتا۔ قرآن حکیم نے اس نکتہ کی طرف ان بلیغ الفاظ میں اشارہ کیا ہے۔

"کیا تم نے اس شخص کو نہیں دیکھا جس نے نفسانی خواہشات کو معبود بنا رکھا ہے، اور خدا نے اسے باوجود دانش کے علم کے سرگرداں کر رکھا ہے۔ اس کے دل اور کانوں پر مہر لگا رکھی ہے اور اس کی آنکھوں پر پردہ ڈال رکھا ہے"۔

ہارلم (HARLEM)

فورٹ ٹرائن پارک سے نکلے تو جزیرہ کے مشرقی کنارے کے ساتھ ساتھ جنوب کا رُخ کیا اور کولمبیا یدرسٹی کو دیکھتے ہوئے نیویارک کی مشہور حبشی بستی ہارلم میں پہنچے۔ یہ بستی اپنی خستہ حالی اور عدم صفائی ،لیے خوب بدنام ہے، مجھے اس کے دیکھنے کا خاص اشتیاق تھا۔ ہم سرخ رنگ کی کئی منزلہ عمارتوں ،درمیان سے گذر رہے تھے۔ گلیاں ہمارے ہاں کی پرانی بستیوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ کھلی ہیں۔ جگہ جگہ مکانوں کی دہلیزوں یا بیرونی سیڑھیوں پر حبشی عورتیں، مرد اور بچے پاؤں پھیلائے بیٹھے تھے۔ گو شہر کے عام حصوں کے مقابلے میں یہ مکانات بے رنگ سے دکھائی دیتے تھے اور اس ساری بستی ایک عجیب بے کیفی سی طاری تھی، پھر بھی بظاہر یہ مکانات کچھ ایسے بُرے نہ تھے، آخر میں نے ڈاکٹر بیلن ے پوچھا کہ کیا یہی آپ کی غلیظ بستی ہے؟ اس پر انہوں نے مسکرا کر جواب دیا کہ گو یہ مکان پختہ اینٹوں کے ہ ہیں، مگر اندر سے جا کر دیکھو تو ان کا بھرم کھل جائے۔ عموماً دیواروں کے پلستر گرے پڑے ہیں، کئی ایسے نبے ملیں گے جو دس، پندرہ، افراد پر مشتمل ہیں اور دو یا تین کمروں میں وقت کاٹ رہے ہیں، کئی حالتوں میں تیس پینتیس افراد کے استعمال کے لیے صرف ایک پاخانہ اور ایک ہی غسل خانہ ہے۔ فرش پر چیزیں یوں بکھری پڑی ہیں کہ قدم دھرنا مشکل نظر آتا ہے، ان مکانوں میں جس قدر لوگ بستے ہیں ان سے زیادہ بادی چوہوں کی ہے، ڈاکٹر بیلن نے کہا میں نے کچھ سال اس بستی میں کام کیا ہے، مجھے معلوم ہے کہ تنے بچوں کو چوہے روزانہ کاٹ کھاتے ہیں، اس پر ہم کو حیرت ہوئی اور ہم نے تعجب سے پوچھا کہ چوہوں سے کاٹے جانے سے کیا مطلب؟ اس کی توضیح انہوں نے یوں کی کہ چوہے رات کو برتنوں اور بستروں ٹولتے پھرتے ہیں۔ اکثر یوں ہوتا ہے کہ بچے کے سرہانے دودھ کی بوتل پڑی ہے، چوہا بوتل پر ڈاکہ ڈالنے یا۔ اتفاق سے بچے نے پہلو بدلا، چوہے پر ذرا دباؤ پڑا، اور اس نے بچے کو کاٹ کھایا۔ ڈاکٹر بیلن نے ہا کہ ان مکانوں میں میں نے غیر معمولی طور پر بڑے بڑے چوہے دیکھے ہیں۔

کچھ آگے بڑھے تو دیکھا کہ دو مکانوں کے درمیان ایک پلاٹ خالی پڑا ہے اور وہ سارے کا سارا ڈے کرکٹ سے اٹا پڑا ہے۔ اسی طرح کئی اور پلاٹ بھی نظر پڑے، غرض نیویارک کی اس غلیظ

بستی اور ہمارے ہاں کی کسی غلیظ بستی میں کچھ زیادہ فرق نہیں۔ اگر کچھ فرق ہے تو صرف یہ کہ یہاں بول وبراز کا تعفن نہیں جس کی وجہ لوگوں کی صفائی پسندی نہیں بلکہ بلدیہ کا فلش سسٹم ہے۔ ذرا آگے بڑھے تو کئی نئی عمارتیں بنتی نظر آئیں۔ یہ رہائشی مکانات ہیں، جو بلدیہ نیو یارک کی طرف سے غلیظ مکانوں کو گرا کر تعمیر کیے جا رہے ہیں۔

سنٹرل پارک

ہارلم کے ختم ہوتے ہی چند گزوں کے فاصلہ پر نیو یارک کی مشہور سڑک ففتھ ایونیو آگئی، جو صاحب حیثیت لوگوں کی عالی شان عمارتوں پر مشتمل ہے۔ ان میں سے بہت سی عمارتیں اب رفاہ عام کے اداروں کو مل چکی ہیں کیونکہ ایسی عمارتوں پر سرکاری ٹیکس اس قدر زیادہ ہیں کہ امراء ٹیکس ادا کرنے کی بجائے عمارت سے ہاتھ اٹھانا بہتر خیال کرتے ہیں۔

ہم بہت جلد سنٹرل پارک میں آن پہنچے جو جزیرہ من ہٹن کے ٹھیک وسط میں بالکل مستطیل شکل کا ایک وسیع کشادہ باغ ہے، اس میں درخت ہیں، پھول ہیں، سبزہ زار ہیں، کھیل کے میدان ہیں، جھیلیں ہیں، کئی ایک تفریح گاہیں ہیں۔ چڑیا گھر اور عجائب گھر ہے۔ غرض سنٹرل پارک جزیرہ من ہٹن کے جسم میں پھیپھڑوں کی حیثیت رکھتی ہے۔ جہاں ہر وقت، مرد، عورتیں، بچے چلتے پھرتے اور کھیلتے نظر آتے ہیں۔ صبح و شام کے وقت بالعموم اور چھٹی کے دن بالخصوص بہت بھیڑ ہوتی ہے، جھیل سردی میں کئی ہفتوں تک منجمد رہتی ہے۔ اور اس کی یخ بستہ سطح پر لوگ آہنی جوتے پہنے بھاگتے دوڑتے نظر آتے ہیں۔

ٹائمز سکوائر

سنٹرل پارک کے ختم ہوتے ہی ہم نے جنوب مشرق کا رُخ کیا، اور چند منٹوں میں گرانڈ سنٹرل ٹرمینل کے سامنے آ پہنچے جو شہر کا سب سے بڑا ریلوے سٹیشن ہے، اور جس کی عظیم الشان عمارت خواہ مخواہ توجہ کو کھینچتی ہے، اس نقطہ سے آگے ہم نیو یارک کے حد درجہ بارونق حصہ میں سے گذر رہے تھے، جہاں مشہور عالم فلک بوس عمارتوں کی بھرمار ہے۔

ہم نے تھوڑی ہی دیر میں اپنے آپ کو ٹائمز سکوائر میں پایا، یہ وہ مشہور عالم چوراستہ ہے جس کے

وسط میں شہرہ آفاق اخبار نیو یارک ٹائمز کا دفتر ہے۔ یہ چوراستہ صنعت لباس سازی کا غالباً دنیا میں سب سے بڑا مرکز ہے، جو ملک کی بیشتر آبادی کے لیے طرح طرح کے لباس تیار کرتا ہے، اور لاکھوں آدمیوں کو روزگار بہم پہنچاتا ہے۔ ٹائمز سکوائر سنیماؤں اور تھیٹروں کا بھی مرکز ہے۔ ان تمام چیزوں نے اس کی رونق اور رنگینی کو بہت شوخ بنا رکھا ہے۔ رات کے وقت اس جگہ آؤ تو آنکھوں میں چکا چوند پیدا ہوتی ہے تفریح گاہوں کے سامنے تماشائیوں کے ٹھٹ کے ٹھٹ لگے ہوتے ہیں اور رنگا رنگ بجلی کی روشنی سے اشتہار بازی کے عجیب و غریب کرشمے دیکھنے میں آتے ہیں۔

وال سٹریٹ

ٹائمز سکوائر کی گہما گہمی میں سے گذرتے ہوئے ہم مسلسل جنوب کو بڑھتے گئے۔ جیسا پہلے کہا جا چکا ہے کوھٹن کا جنوبی حصہ تجارتی اور بنج بیوپار کا خاص الخاص مرکز ہے۔ چینی بستی اور ملبریہ کے وسط کے درمیان میں سے گذرتے ہوئے ہم وال سٹریٹ میں آئے جو آج امریکہ بلکہ ساری دنیا کی مالی صحت مندی کے لیے دل کا درجہ رکھتی ہے۔ کبھی یہ مقام لندن کی لمبارڈ سٹریٹ کو حاصل تھا، اور گو اس کی بہت کچھ اہمیت ابھی باقی ہے اور عالمگیر سیادت کا کام بڑی حد تک اس کے ہاتھ سے نکل کر وال سٹریٹ کے قبضہ میں آ چکا ہے۔

اس دو فرلانگ لمبی تنگ سڑک پر مالی لین دین اور کاروبار کے بہت بڑے بڑے ادارے واقع ہیں۔ اسی جگہ مشہور نیو یارک سٹاک ایکسچینج ہے، جہاں امریکہ کی ۱۱۰۰ دیو ہیکل کمپنیوں کے حصے بیچے اور خریدے جاتے ہیں۔ سٹاک ایکسچینج کا منظر دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ اوقات کار دس بجے سے تین بجے تک ہیں۔ دس بجنے سے پہلے ممبر کمپنیوں کے ایجنٹ بڑے ہال میں جمع ہو جاتے ہیں، ادھر گھڑی نے دس بجے کا ٹن ٹن ختم کیا اور ادھر اس گروہ سے یکبارگی ایک شور اٹھا۔ تماشائیوں کی گیلری سے دیکھنے والے اجنبی کو اوّل اوّل کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ ان لوگوں کو دفعتہً کیا ہو گیا، اور ان کے عجیب و غریب شور و غل اور ہاتھوں اور انگلیوں کے اشاروں کا کیا مطلب ہے، ادھر کئی لوگ ٹیلیفون کان پر رکھے بیٹھے نظر آتے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ دیواروں پر حصوں کی قیمتوں کے اتار چڑھاؤ درج ہوتے چلے جاتے ہیں، اس سارے معمہ کی سمجھ اس وقت آتی ہے، جب لیکچر اور فلم سلائڈ کے ذریعہ سے سٹاک ایکسچینج کے طریق کار کی تشریح

جاتی ہے۔ تماشائیوں کے لیے اس تشریح کا باقاعدہ انتظام ہے۔

سمندر کی سیر

وال سٹریٹ سے کچھ دور اور جنوب کو بڑھے تو اپنے آپ کو سمندر کے کنارے پایا، یہ وہ نقطہ ہے۔ یہاں ایک طرف سے دریائے ہڈسن اور دوسری طرف سے مشرقی دریا جزیرہ من ہٹن کی آغوش سے نکل کر سمندر میں شامل ہوتے ہیں۔ یہ نیویارک کی بندرگاہ ہے۔ ہم یہاں سے دخانی کشتی پر بیٹھ کر جزیرہ سٹین (STRTAN) کی طرف روانہ ہوئے جو صرف چند میل کے فاصلہ پر واقع ہے۔ کشتی چند سو گز گے بڑھی تو ہم نے پلٹ کر من ہٹن پر نگاہ ڈالی، یہ عجیب دل فریب منظر تھا۔ فلک بوس عمارتیں اب یوں نظر آتی تھیں۔ گویا بہت سے مینار پہلو بہ پہلو کھڑے ہوں۔ ہمارے بائیں ہاتھ صرف چند گز کے فاصلہ پر گورنر آئی لینڈ تھا جو ایک چھوٹا سا جزیرہ ہے، اور خالصتہً ایک فوجی مرکز ہے۔ اس جزیرے سے دسمندر کے ایک تنگ بازو کے کنارے بُرک لِن (BROOK LXN) کا جزیرہ نظر آرہا تھا، جو ایک خاصہ لمبا جزیرہ ہے۔

تھوڑی دیر میں ہماری کشتی مشہور و معروف مجسمہ آزادی کے سامنے تھی۔ کانسی کا یہ دیو قد مجسمہ ۱۸۷۵ء میں فرانس میں تیار ہوا، اور اہل فرانس کی طرف سے اہل امریکہ کو بطور تحفہ پیش کیا گیا۔ اس وقت سے یہ نیویارک کی بندرگاہ میں ایک چھوٹے سے جزیرہ میں ایک اونچے چبوترے پر نصب ہے، اور نئی دنیا میں آنے والوں کی توجہ کو میلوں سے اپنی طرف کھینچتا ہے۔

مستقل میلہ

ہمارے ہاں میلوں ٹھیلوں کی خوب بھرمار ہے، جو سال بعد مقررہ دنوں میں منعقد ہوتے ہیں مگر نیویارک میں ہم نے ایک ایسا میلہ دیکھا جو لگاتار جاری ہے، دن، رات۔ صبح، شام، گرمی، سردی، بہار، خزاں، غرض کسی وقت جائیے، یہ میلہ موجود ہوگا۔ البتہ اس کی رونق ہر وقت ایک سی نہیں رہتی۔ شام کے چھ بجے سے صبح کے دس بجے تک کا وقت اس کی روزانہ گہما گہمی کے لیے مخصوص ہے۔ اسی طرح عام دنوں کی بجائے اتوار کو اس کی رونق کئی گنا زیادہ ہوتی ہے، یہ میلہ

کونی آئی لینڈ (CONY IS LAND) کے نام سے موسوم ہے۔ کونی آئی لینڈ فی الحقیقت کوئی الگ جزیرہ بروکلن کے انتہائی جنوبی سرے کا نام ہے، جو ایک تنگ لمبوترے جزیرہ نما کی شکل اختیار کر گیا ہے۔

کونی آئی لینڈ کے متعلق ہم سب نے سن رکھا تھا، چناں چہ ہماری فرمائش پر ڈاکٹر طہلین ہمیں اس طرف لے کر چل دیے۔ من ہٹن سے بروکلن کو جانے کے لیے یوں تو کئی ایک پل ہیں۔ مگر پلوں پر بھیڑ کی یہ حالت ہوتی ہے کہ کار کو بسا اوقات قدم قدم پر رکنا پڑتا ہے، اس دشواری سے بچنے کے لیے پانی کے نیچے ایک زمین دوز راستہ تیار کیا گیا ہے جو صرف کاروں کے لیے ہے۔ راستہ کے استعمال کے لیے محصول ادا کرنا پڑتا ہے۔ مگر اس کی سہولت اس قدر زیادہ ہے کہ یہاں بھی کاروں کا تانتا ہر وقت نظر آتا ہے دنیا میں یہ سب سے لمبا زمین دوز راستہ ہے، اس کی لمبائی دو میل سے کچھ کم ہوگی، دراصل یہ ایک راستہ نہیں، بلکہ دو متوازی اور بالکل الگ الگ راستے ہیں، جن میں سے ایک جانے کے لیے مخصوص ہے اور دوسرا آنے کے لیے۔ ہر راستہ اس قدر کشادہ ہے کہ تین کاریں پہلو بہ پہلو چل سکیں، اس احتیاط کے باوجود راستے کے کنارے تھوڑے تھوڑے فاصلہ پر سنتری کھڑے رہتے ہیں جو گاڑیوں کے تانتے کو قابو میں رکھتے ہیں۔ اس تحت آب راستہ کو موٹروں کے دھوئیں سے پاک رکھنے اور تازہ ہوا کی بہم رسانی کے لیے نہایت عمدہ انتظام کیا گیا ہے۔

اس سرنگ سے نکلے تو ہم بروکلن کے مغربی ساحل کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے کونی آئی لینڈ کی طرف بڑھے۔ بروکلن میں من ہٹن کی نسبت بھیڑ کم ہے۔ مکانات اور بستیاں نسبتاً کشادہ اور ہوادار ہیں۔ ساحل کے ساتھ ساتھ ایک خوب صورت لمبی پارک ہے۔ سامنے سٹیٹن آئی لینڈ کا سرسبز کنارہ دکھائی دیتا ہے اور دونوں کے درمیان سمندر کا ایک تنگ بازو حائل ہے۔ یورپ سے آنے جانے والے جہاز اس تنگ آبی راستے میں سے ہو کر گذرتے ہیں۔

بالآخر ہم کونی آئی لینڈ آ پہنچے، یہ کوئی چھ میل لمبا خوب صورت ریتیلا ساحل ہے جس کے کنارے ایک آہنی جنگلا نصب ہے اور جگہ جگہ بیٹھنے کو بنچ موجود ہیں، لوگ اس ساحل پر آکر لیٹتے ہیں، نہاتے ہیں تیرتے ہیں۔ غرض نیویارک کے شور و غل اور ہجوم سے بچ کر تفریح کے چند گھنٹے گذارنے کے لیے یہ ایک

ہ جگہ ہے۔ مگر اس جگہ بھی ہجوم کا یہ عالم بتایا جاتا ہے کہ ہر اتوار کو کم و بیش دس لاکھ لوگ آتے ہیں، اور کھوے سے کھوا چھلتا ہے۔

مگر کونی آئی لینڈ میں صرف ساحل سمندر ہی دل لگی کا سامان نہیں، اس کے علاوہ سینکڑوں کھیل تماشے ستقل اڈے موجود ہیں، جہاں بچے، بوڑھے، جوان، مرد، عورتیں، اپنی اپنی پسند کے مطابق کھیل شے میں معروف نظر آتے ہیں۔ یہ کھیل تماشے بالکل اسی نوعیت کے ہیں جیسے میلوں میں عام دیکھنے میں تے ہیں، البتہ سائنس نے انھیں زیادہ دلچسپ اور بھڑکیلا بنا دیا ہے، ان میں سے اکثر کھیلیں تو ی ہیں جو کسی نہ کسی رنگ میں جوئے کا موقع پیش کرتی ہیں۔ اس کے علاوہ طرح طرح کے جھولے ڑیاں اور دوسری سواریاں ہیں اور کئی قسم کی دوسری دلچسپیاں۔

قوام متحدہ کا صدر مقام

ڈاکٹر ملن کے ساتھ ہم اقوام متحدہ کے مستقل صدر دفتر کے سامنے سے گزر رہے تھے۔ مگر اس وقت فصیل سے دیکھنے کے لیے وقت نہ تھا، چناں چہ یہ کام اگلے اتوار کو انجام پایا، یہ عمارت مشرقی دریا کے کنارے اٹھارہ ایکڑ رقبہ پر واقع ہے۔ زمین کا یہ ٹکڑا راک فیلر خاندان کے ایک فرد کا عطیہ ہے، جونہی پنے سڑک سے قدم اٹھا کر اس اٹھارہ ایکڑ رقبہ پر قدم دھرا، تو نہی آپ فوراً اضلاع متحدہ امریکہ کو خیرباد ہ کر اقوام متحدہ کی سرزمین میں داخل ہو گئے۔ یہاں اقوام متحدہ کے سپاہی پہرہ دیتے نظر آئیں گے، اور حکومتی ظام کے کل پرزے بھی حرکت کرتے دکھائی دیں گے، غرض اس جگہ اقوام متحدہ کے ایک زندہ، متحرک ت ہونے کا بیقین خواہ مخواہ ہونے لگتا ہے۔ اگر کسی کو اقوام متحدہ کی عملی سیادت محض اس اٹھارہ ایکڑ رقبہ ک ہی محدود نظر آئے تو اس میں بیچاری اقوام متحدہ کا قصور نہیں، یہ قصور صاحب املاک لوگوں کا ہے ن میں سے اب تک صرف ایک راک فیلر کو یہ توفیق نصیب ہوئی کہ اٹھارہ ایکڑ کا ایک قطعہ اقوام متحدہ نذر کرے۔ اگر بڑی بڑی حکومتوں اور جغادری جاگیرداروں کو کبھی یہ احساس ہو گیا کہ حکومت اور م و نسق ایک بے کار درد سر ہے جس کا اقوام متحدہ کے حوالے کیا جانا ہی فائدہ مند ہے تو وہ دن دنیا کی یخ میں خوش بختی کا دن ہو گا۔ اور گو وہ دن کتنا ہی دور کیوں نہ ہو، اس کی طرف ایک چھوٹا سا قدم

اٹھایا جا چکا ہے، اور یہی اقوام متحدہ کی کامیابی ہے۔

اقوام متحدہ کے صدر مقام کی عمارت کافی وسیع اور جاذب نظر ہے، اس کا سب سے نمایاں حصہ اس کا سکریٹریٹ ہے جو ۲۹ منزلہ عمارت میں واقع ہے، اس بلند عمارت کی سامنے کی دیوار شیشے کے ٹکڑوں سے بنائی گئی ہے، جو نہایت بھلی معلوم ہوتی ہے۔ اور دیکھنے والے کو یہ یقین دلاتی ہے، کہ اس بلورین مکان کے باسی دوسروں پر پتھر پھینکنے کی ہمت کبھی نہیں کریں گے۔

دریا کے کنارے پہلو بہ پہلو تین اہم عمارتیں ہیں جن میں سے ہر ایک ۷۲ × ۱۳۵ سے ان میں سے پہلی سلامتی کونسل کی ہے جو تمام کی تمام ناروے کے معاملہ سے تیار ہوئی ہے، دوسری ٹرسٹی شپ کونسل کی ہے جس کا معاملہ ڈنمارک نے مہیا کیا، اور تیسری معاشی اور معاشرتی کونسل ہے جس کی تعمیر سویڈن کے معاملہ سے ہوئی۔ چوتھی بڑی عمارت جنرل اسمبلی کا ہال ہے، جس کی سامنے کی دیوار پر صدر کی کرسی کے پیچھے ساٹھ رکن حکومتوں کے قومی نشانوں کے لیے گول جگہیں مہیا کی گئی ہیں۔

ٹرسٹی شپ کونسل کے ضمن میں رہنما نے ذکر کیا تھا کہ یہ کونسل ان غیر ترقی یافتہ ملکوں کو حکومت خوداختیاری کے لیے تیار کر رہی ہے جو جنگ کے خاتمہ پر شکست خوردہ محوری حکومتوں سے چھین لیے گئے تھے، اس پر میں نے پوچھا کہ اگر شکست ہی صلاحیت استعمار کی نفی کی دلیل ہے تو اس میں محوری اور غیر محوری کی تخصیص کیوں ہے؟ فرانس اور بلجیم بھی تو میدان جنگ میں اسی طرح پٹے تھے جس طرح آخرکار جرمنی، اور اٹلی، پھر فرانس اور بلجیم کو کیا حق حاصل ہے کہ نوع انسان کے ایک بڑے حصے کو استعمار کے چنگل میں دبوچے رکھیں؛ اس پر رہنما نے کہا کہ اس سوال کا جواب آپ کو نیچے ڈیسک سے مل سکے گا مگر ڈیسک پر بیٹھنے والا فاضل بھی جواب نہ دے سکا۔

عمارت کے زیریں حصہ میں اور بہت سی چیزوں کے علاوہ اقوام متحدہ کا اپنا ڈاک خانہ ہے جہاں اس کے نام کا ٹکٹ چلتا ہے۔ مگر یہ خط اور ٹکٹ صرف اسی ڈاک خانہ میں قابل قبول ہیں۔ اس عمارت سے باہر وہ بے کار ہیں، ڈاک خانہ کے ساتھ ہی اقوام متحدہ کی کتابوں کی دکان اور تحائف کی دکان ہے۔ جہاں سے لوگ کتابیں اور تحفے خریدتے ہیں۔ تحائف کی دکان میں مختلف ملکوں کی

مصنوعات موجود تھیں، جن میں ہندوستان کے بنارسی ریشم رومال اور چوڑیاں خوب نمایاں تھیں، مگر پاکستان کی بنی ہوئی کوئی چیز نظر نہیں آئی۔ بیرونی دنیا میں ہندوستان کا جس قدر پروپاگنڈا ہے اور پاکستان کے متعلق جس قدر لاعلمی اور غلط فہمی ہے اس کو دیکھتے ہوئے یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ پاکستان اپنے تعارف کرانے کا کوئی موقعہ ہاتھ سے نہ جانے دے۔ اقوام متحدہ کے تحائف کی دکان اس قسم کا ایک اچھا موقعہ ہے۔

گھر اور تعلیم

شریف کنجاہی

تعلیم سے بالیدگی اور نمو کی وہ منہاج مراد ہے جس کے ذریعے فرد معلومات کی ذخیرہ اندوزی کرتا ہے ایک مخصوص نظریہ حیات کو اپناتا ہے اور اس علمی میراث سے اس مخصوص نظریہ حیات اور مقاصد کی تکمیل کی استعداد پیدا کرتا ہے۔

وجدان کی اثر پذیری کے طفیل تعلیم و تعلم کا یہ سلسلہ پیدائش کے ساتھ ہی شروع ہو جاتا ہے۔ جبکہ بعض کے خیال میں تو اس سے بھی قبل بطن مادر ہی میں اس کی ابتدا ہو جاتی ہے۔ کیوں کہ تعلیم اثر اندازی اور اثر پذیری ہی کا دوسرا نام ہے۔ اثر اندازی اور اثر پذیری کا یہ تعلق باہم چوں کہ بہت جلد قائم ہو جاتا ہے بلکہ ماہرین نفسیات کے خیال میں یہ ابتدائی تعلق اس قدر استوار ہوتا ہے کہ بیشتر حالات میں عمر بھر ساتھ جاتا ہے۔ اس لیے وسائل تعلیم میں سے گھر کو بہت اہمیت حاصل ہے۔

ابتدائی چند ماہ میں چوں کہ بچے کو ماں سے زیادہ واسطہ رہتا ہے۔ اس لیے اس کے رویہ اور رویہ پر عموماً بچہ اپنے ننھے سے فلسفہ حیات کی دیوار کھڑی کرتا ہے، ماں اس کی ایک فطری تحریک یعنی بھوک کی تسکین کا سامان ہوتی ہے، لیکن وہ سارا دن اسے سینے سے بھی تو نہیں لگائے رکھتی۔ اگرچہ بچے کے ذاتی میلانات کا تقاضہ یہی ہوتا ہے، اور پھر دودھ چھڑانے کا وقت بھی آجاتا ہے، نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اس ننھے شیر خوار کے لیے زندگی خوش گوار و ناگوار لمحات کی آنکھ مچولی بن جاتی ہے، خوش گوار لمحات ایک خوش گوار ماں کا تصور پیدا کر دیتے ہیں، اور ناگوار لمحات ایک ناگوار ماں کا، ایک سے وہ محبت کرتا ہے، دوسری سے نفرت، پھر جب اس پر یہ حقیقت روشن ہوتی ہے کہ خوش گوار ماں اور ناگوار ماں ایک ہی شخصیت کے دو روپ ہیں اور اس کی محبت و نفرت کا ہدف بھی دو نہیں ایک ہی شخصیت ہے تو یہ احساس اس کے لیے ناقابل برداشت ہو جاتا ہے۔ اب دو ہی راہیں کھلی ہوتی ہیں، یا تو اس کی

کمی کو کم کیا جائے، یا پھر اس سے نجات حاصل کی جائے، آگے چل کر بچہ عملی زندگی میں جو کچھ کارہائے نمایاں کرتا ہے، مہارت اور کردار کے جو جو مدارج طے کرتا ہے، ذہنی اور دماغی الجھنوں کے جن جن منفعت خوالوں میں سے گذرتا ہے، ان سب کا سراغ آپ کو اس بنیادی مسئلہ میں ملے گا۔

لیکن گھر سے مراد ماں کی گود ہی نہیں ہے۔ گھر میں اور بھی ہوتے ہیں۔ باپ ہوتا ہے۔ بہن بھائی بھی ہوتے ہیں، ان کی آوازیں، ان کے لہجے، ان کا پیار، ان کی بے توجہی، ان کی شخصیتیں اس کو بہت زیادہ متاثر کرتی ہیں، اچھے طریقے سے بھی اور برے طریقے سے بھی۔ شروع شروع میں اس پر بعض خاص خاص وقت ایسے بھی آتے ہیں، جب اسے ماحول یعنی آس پاس والوں کو سمجھنے میں غلطی لگتی ہے، لیکن چونکہ اسے اس غلطی کا احساس نہیں ہوتا، بلکہ وہ اسے غلطی سمجھتا ہی نہیں، اس لیے اسی تاثر پر اپنی زندگی کی ساری عمارت اٹھائے چلا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر بعض بچوں کو والد کے خلاف شکایت پیدا ہو کر ان کو "ایڈی پس کمپلکس" کا شکار بنا دیتی ہے۔ بعض بچوں میں کوئی جسمانی نقص اور ادھوراپن ہوتا ہے، کسی کی بصارت کمزور ہوتی ہے، کسی کی سماعت میں نقص ہے، کسی کی زبان ساتھ نہیں دیتی، اس کمی کا مطلب یہ ہے کہ وہ ان حواس کے ذریعہ معلومات حاصل نہیں کر سکتا، یا اگر کرتا ہے تو وہ معلومات ناقص ہوتی ہیں، ادھر بچو لی اسے دوں کرتے ہیں، نام دھرتے ہیں اور اس کے اندر کمی کا احساس پیدا ہو جاتا ہے، یہ احساس اس کے تخیل کو حرکت دیتا ہے اور وہ اپنی حالت کو سدھارنے، اپنی حیثیت کو ابھارنے کی کوشش کرتا ہے، اس کی زندگی کمی کے احساس اور اس کی تلافی کی کوشش سے عبارت ہو جاتی ہے۔ تھوڑا بہت کمی کا احساس فطری قوتوں کو بروئے کار لانے کے لیے نہایت ضروری ہے، اور تعلیمی لحاظ سے بھی مفید رہتا ہے، لیکن جب آس پاس والوں کا رویہ اس احساس کو شدید بنا دیتا ہے، اور جب کمی جسمانی ہو جس کی تلافی ممکن نہ ہو تو معاملہ بگڑ جاتا ہے، بہت زیادہ کمی کا احساس عملی قوتوں کو مغلوج کر دیتا ہے، اور تلافی اگر بالکل ناممکن نہیں تو دشوار ضرور ہو جاتی ہے، اسی طرح بہت زیادہ تلافی کی دھن بھی بچے میں استقلال پیدا نہیں ہونے دیتی، وہ ہر راہ پر چلنے کی دھن میں اور ہر ایک سے بازی لے جانے کی فکر میں کہیں بھی نام پیدا نہیں کر سکے گا۔ شہد کی مکھی نہیں بھونرا بن کر اس چمن زار میں زندگی کے دن گذار دے گا۔

جسمانی روگ کے علاوہ بھی اس وادی میں دو چار سخت مقام آتے ہیں، مثلاً جب بچہ بولنا شروع کرتا ہے، تو اس وقت والدین اور آس پاس والوں کی معمولی سی ناسمجھی بچے کی قوت اظہار کو مفلوج کر دیتی ہے اور اکثر میں ہکلانے کی عادت پیدا ہو جاتی ہے۔ اس عمر میں ہمدردی کے ساتھ بچے کو اظہار کے مواقع دینے چاہئیں۔ آہستہ آہستہ اس کا الفاظ کا ذخیرہ بڑھنے دینا چاہیے۔ اس کے غلط سلط لفظوں پر ہنسنا نہیں چاہیے کہ اس میں جھجک پیدا نہ ہو جائے۔ اس طرح کا ایک مرحلہ دوسرے بہن بھائی کی پیدائش کے وقت پیش آتا ہے۔ کیونکہ اب گھر والوں کی ساری توجہ کا مرکز وہ نووارد ہو جاتا ہے۔ ماں بھی اسی کو ہر وقت گود میں لیے رہتی ہے، ابا بھی اسی کو اٹھاتے ہیں، نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اس کے ننھے سے دماغ میں اس نووارد کے خلاف ایک نفرت سی پیدا ہو جاتی ہے، اسے اپنی کمی کا احساس ہونے لگتا ہے، اور جب اس احساس کے لیے کوئی مثبت راہ تریاق مہیا نہیں کرتی تو وہ منفی راہوں پر چل پڑتا ہے، بدتمیزیاں کرتا ہے، میلا رہتا ہے۔ بات بات پر بگڑتا ہے، اور کیا کچھ نہیں کرتا۔ اگر سکول جاتا ہے تو اب کئی بار اس کا کتابوں میں جی نہیں لگتا، وہ بھگوڑے کے بھینڈی، شیطان کے خالو قسم کے لڑکوں کا ساتھی بن جاتا ہے، اور استاد کی جان کا روگ۔

لیکن اگر گھر کی فضا درست رہے، والدین اور آس پاس والے اپنے رویہ سے اس کی راہ میں کانٹے نہ بکھیریں، اور اس بات کو کبھی نہ بھولیں، کہ بچہ آنکھ، کان، اور قوت حافظہ رکھتا ہے، اس لیے کوئی ایسی بات مقدور بھر نہ کی جائے، جس سے وہ غلط نظریہ اختیار کر لے تو تعلیم کا کام بہت آسان ہو جاتا ہے اسی طرح گھروں میں معمول کے تربیتی پہلو کو نگاہ میں رکھا جائے، دودھ وقت پر پلایا جائے یا نہلایا یا سلایا جائے۔ بچے میں ایک اطمینان سا پیدا ہو جاتا ہے۔ کیونکہ معمول کا مطلب یہ ہے کہ خلاف توقع کچھ نہیں ہوا اس میں شک نہیں کہ معمول پر زیادہ زور دینے سے بعض اوقات بچے میں ایک چڑ سی پیدا ہو جاتی ہے اور تربیت کے لحاظ سے یہ ایک کٹھن مرحلہ ہے کہ کس طرح بچے کو معمول کا خوگر بنایا جائے۔ لیکن خوگر اور غلام میں یاد رکھنا چاہیے کہ ایک فرق ہے۔ اسی لیے ماہرین نفسیات کا کہنا ہے کہ کھانے، پینے، کپڑے بدلنے ایسے تمام امور میں ترغیب سے کام لینا چاہیے نہ کہ تادیب سے۔ کھانے کا ایک وقت ہونا چاہیے جس میں گھر کے سب افراد دسترخوان پر بیٹھ جائیں، خواہ کوئی کھائے یا نہ کھائے۔ اسی طرح سونے کے

۔بستر بچھ جائیں، اور جہاں تک ہو سکے، سب اپنے اپنے بستر پر چلے جائیں۔ بچے اکثر کام دوسروں کو ہا دیکھی کرتے ہیں، ان کو سلانے یا کھلانے کے متعلق تشویش کا اظہار کرنا، اس کے لیے مضطرب ہونا ر بچوں میں یہ احساس پیدا کر سکتا ہے کہ آپ ان سے کوئی مراعات مانگ رہے ہیں، اور بچہ اس میں ں طرح اپنی بڑائی محسوس کرتے ہوئے نادانستہ طور پر آپ سے مزید التماس اور خوشامد کا خواہاں رہتا ہے، اور بے وقت کھاتا یا سوتا ہے، ایسے بچے جب سکولوں میں جاتے ہیں تو اس وقت بھی ان کی ی عادت ان کا ساتھ دیتی ہے، جب استاد ان کو کام کرنے کے لیے کہتے ہیں، بار بار ان کی بے توجہی کا شکوہ رتے ہیں تو وہ غیر شعوری طور پر اس میں اپنی بڑائی محسوس کرتے ہیں اور زیادہ بے توجہی سے کام لیتے ہیں اس لیے بچے کو مکتب کے مخصوص ماحول میں کامیاب دیکھنے کے لیے بھی ضروری ہے کہ گھر میں اس کی تربیت اس انداز کی ہو کہ وہ محض مکتب میں مفید رہ سکے، کیوں کہ ایک تعلیمی وسیلے کی حیثیت سے گھر کا کام یہی ہے کہ وہ بچے کو مکتب کے حالات سے نباہ کرنے کے قابل بنا دے، اس میں اپنے بھائی بہنوں سے نفرت نہ ہو تاکہ وہ دوسرے بچوں سے محبت کر سکے، والدین کے بارے میں ان کے ذہن میں شکوک و شبہات نہ پرورش پا رہے ہوں، تاکہ وہ اس کا انتقام استاد سے نہ لینے لگے، کیوں کہ بچہ اپنے لاشعور میں استاد کو باپ کا روپ سمجھتا ہے اور جو نزلہ ادھر نہیں گرا سکتا وہ اس "عضوِ ضعیف" پر گرا دیتا ہے۔ گھر کی فضا جہاں تک ممکن ہو، ایسی ہونی چاہیے کہ اس میں بے جا دباؤ کو دخل نہ ہو، کیوں کہ دباؤ کا قدرتی ردِ عمل نفرت ہے، اور یہی نفرت ذہن کی گہرائیوں میں جا کر کتنی ہی بغاوتوں کی ماں بن جاتی ہے۔ تشدد پسندوں، خدا کا انکار کرنے والوں، اور بغاوت کو اپنا شعار بنانے والوں میں سے آپ کو بیشتر ایسے ملیں گے جن کے لاشعور میں والدین سے نفرت کے جراثیم نے پرورش پائی تھی، اور وہی نفرت کہیں حکومتِ وقت سے بغاوت کا روپ لے گئی تو کہیں خدا سے بغاوت کا۔ آج دنیا میں محبت اور پیار کی جگہ کینہ اور نفرت کی فراوانی کا ایک بنیادی سبب یہی بچپن کی غلط تربیت ہے، اور اگر ہم مستقبل کو سہانا دیکھنا چاہتے ہیں تو گھروں میں بچوں کی تربیت کو زیادہ اہمیت دینی ضروری ہے کیوں کہ بچے اکثر مکتب میں جانے سے پہلے چار پانچ سال کے اندر اندر اپنا ایک مخصوص نظریۂ حیات قائم کر لیتے ہیں، اور پھر آنے والے ایام میں دنیا کو اسی عینک سے دیکھتے ہیں۔

دباؤ سے خالی فضا میں سانس لینے والے بچوں کو گھٹن کا احساس بہت کم ہوتا ہے، اس لیے ان کی حرکات میں بے ساختگی پائی جاتی ہے، اس کے برعکس تشدد اور سختی سے ایک قسم کی جھجک پیدا ہو جاتی ہے۔ جھجک جہاں زبان میں ہکلا پن پیدا کر دیتی ہے، وہاں بصارت اور سماعت میں بھی ہمواری نہیں رہنے دیتی۔ اعصاب میں اینٹھن اور الجھاؤ پیدا ہو جاتے ہیں، جو کتنی ہی جسمانی اور ذہنی بیماریوں کا باعث بنتے ہیں۔ کیوں کہ حرکات اعصاب ہی کی محتاج ہوتی ہیں، آنکھ کی پتلی میں جو تاثر پیدا ہوتا ہے اس کی خبر اعصاب ہی کے ذریعہ دماغ تک پہنچتی ہے اور اعصاب ہی کے ذریعے اس کے حسب حال ردعمل ہوتا ہے، جبلی سرمایہ یعنی وجدان کی بنیادوں پر مخصوص استعداد کی عمارت اعصاب ہی کے سہارے کھڑی ہوتی ہے۔ ناشناسی سے آگاہی کی جانب ہر قدم اعصابی تعاون کا محتاج ہوتا ہے اور جذبات کی باگ ڈور مقاصد کے ہاتھ میں دینے کے لیے بھی ان کے بغیر کام نہیں چل سکتا، اور اگر مجھے چند الفاظ میں گھر کی تربیتی ذمہ داریوں کا ذکر کرنے کو کہا جائے تو "اعصاب کی تربیت" میرے مفہوم کو ادا کرنے کے لیے کافی ہے۔ اعصاب کی اس تربیت کے لیے نہ زیادہ لاڈ کی ضرورت ہے نہ بے جا دباؤ اور جبر کی، اس کے لیے بقول ڈاکٹر ذاکر حسین ضرورت ہے محبت کے ساتھ تھوڑی سی سمجھ اور تھوڑے سے علم کی اور قدرے صبر کی۔ محبت تو کہتے ہیں ماں باپ کو بچوں سے ہوتی ہی ہے۔ مگر آخری تین چیزیں ذرا کم یاب سی ہیں اور دشواری یہ ہے کہ ان کے بغیر نسخہ مکمل نہیں ہوتا۔

گھر کی بات ماں ہی سے شروع کی تھی اور اس ہی پر اسے ختم بھی کرتے ہیں، گھروں میں لڑکے اور لڑکیوں کے درمیان جو امتیاز برتا جاتا ہے، اس کے نفسیاتی اور معاشرتی طور پر بہت دوررس نتائج ہیں، ہم لڑکوں کو لڑکیوں سے زیادہ چاہتے ہیں۔ پھر تعجب کیوں ہو اگر لڑکیاں ماں بننے سے نفرت کرنے لگیں شاید ہماری موجودہ دنیا کی سب سے بڑی گتھی یہی ہے کہ عورت ماں بننا پسند کرتی ہے یا نہیں، ظاہر ہے کہ وہ پسند اسی صورت میں کر سکتی ہے کہ اس کے کام کو اہمیت دی جائے۔ جہاں بھی عورت کو کم اہمیت دی گئی ہے اور مرد کے کارنامے گنے، چند سکوں کا نرخ بڑھایا گیا ہے۔ بیاہی زندگی کا تار تار بکھر کر رہ گیا نہیں تو الجھ کر ضرور رہ گیا ہے جب عورت یہ محسوس کرے کہ بچوں میں دلچسپی لینا ادنیٰ کام ہے، اس میں وہ مہارت۔ وہ احتیاط اور وہ سمجھ کیوں کر آسکتی ہے جو بچوں کو اچھی زندگی کی لذت سے آشنا کرنے کے لیے ضروری ہے۔ جو عورت اپنے مقام پر

مطمئن نہیں وہ بچوں میں پوری پوری دلچسپی لے ہی نہیں سکتی۔ وہ یا تو اسے زیادہ لاڈ سے بگاڑ دیتی ہے یا کم التفاتی کا شکار بنا دیتی ہے۔ زندگی میں ناکام رہنے والوں کا کھوج لگائیے۔ بیشتر صورتوں میں یہی نظر آئے گا کہ ماں اپنے فرض کو کسی نہ کسی سبب پوری طرح نباہ نہ سکی۔ اس نے بچے کو اچھا آغاز نہ دیا۔ اگر مائیں محسوس کریں کہ وہ زندگی میں ناکام ہیں، اگر انہیں اطمینان نہ ہو تو اندازہ لگائیے کہ نسل انسانی کے لیے یہ کس قدر بڑا خطرہ ہے۔ کیوں کہ وہ تو نت نئی ذہنی کھینچا تانیوں کا شکار رہ کر امومت کے فرائض کو پوری طرح نباہ نہیں سکیں گی۔ اس لحاظ سے گھروں میں لڑکیوں کے مقام کو لڑکوں سے پست نہ رہنے دینا ایک خانگی معاملہ ہی نہیں بلکہ معاشرتی فریضہ بھی ہے۔ اور تعلیمی ضرورت بھی ؛

آرٹ کی تعلیم کیوں اہم ہے؟

ناصر علی

آرٹ یعنی مصوری فنونِ لطیفہ میں سے ایک اہم فن ہے، زمانہ کے ہر دور میں اس کا عمل دخل رہا ہے اور جب تک دنیا قائم ہے یہ فن جاری و ساری رہے گا۔ فرق صرف یہ ہے کہ قدیم مصوّر اس میں رنگوں کی آمیزش اتنی ضروری نہیں سمجھتے تھے جتنی کہ آج ضروری سمجھی جاتی ہے، اس کی وجہ ایک یہ بھی ہے کہ اس وقت مختلف رنگوں کے حصول کے وسائل بے حد محدود تھے، اس لیے صرف قدرتی رنگوں یعنی نیچرل کلرز پر اکتفا کیا جاتا تھا، اور وہ بھی سین سینری وغیرہ میں۔ میں نے قدما کی اکثر تصاویر، لوحیں اور بیلیں دیکھی ہیں جو رنگوں سے خالی تھیں۔ پھر بھی اپنے اندر بڑی دل کشی رکھتی تھیں۔ قدیم عمارات میں بھی چابک دست معماروں نے اکثر قدرتی رنگوں سے کام لیا ہے، اور پھول بیلوں میں خود رنگ پتھر آویزاں کیے گئے ہیں، لیکن جہاں کہیں بھی قدرتی رنگوں کی باہمی آمیزش سے کام لیا گیا ہے۔ وہاں ان کا سلیقہ اور شعور کارِ کاریگروں کی مہارت کا ثبوت دیتا ہے۔ مجھے زمانۂ قدیم کے بعض نقاشوں کی ایسی لوحیں اور بیلیں دیکھنے کا بھی اتفاق ہوا، جو بعض مذہبی ادبی کتابوں اور شاہانِ سلف کی خود نوشت سوانح حیات پر بنائی گئی تھیں، ان میں سونا بھرا ہوا تھا، اور سینکڑوں برس گذرنے کے بعد بھی ایسا معلوم ہوتا تھا، جیسے آج ہی یہ سونا بھرا گیا ہے۔ اس زمانے کا اچھا آرٹسٹ جانتا ہوگا کہ سونے کے اوراق معنا گوند میں یکجان کر کے گلہری کی دم کے نرم برش سے یہ نازک کام کیا جاتا ہے۔ لیکن آج کل یہ فن تقریباً ختم ہو چکا ہے، اور اس کی جگہ سستے سنہری اور روپہلی پوڈروں اور رنگوں نے لے لی ہے۔

اس میں شبہ نہیں کہ رنگ ہر بچے، بوڑھے اور جوان کے لیے ایک پسندیدہ چیز ہے، لیکن نفسیاتی طور پر ہر رنگ مختلف طبائع پر مختلف اثر ڈالتا ہے بعض کو گہرے رنگ، اور بعض کو ہلکے پسند ہوتے ہیں۔ بچے عموماً گہرے رنگ پسند کرتے ہیں، خصوصاً گہرا لال، ہرا، اودا، اور نیلا رنگ۔ بعض شاعرانہ طبیعت رکھنے والے بچے ہلکے رنگوں کو گہرے رنگوں پر ترجیح دیتے ہیں، لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ رنگ خواہ ہلکا ہو یا تیز بچہ اس میں

دل چسپی لیتا ہے۔ نیچے کے اس رجحان کو یورپ والوں نے سب سے پہلے سمجھا اور انھوں نے بچوں کی درسی کتابوں کو مختلف رنگوں کی تصاویر سے مزین کر کے ان کی دل چسپی کو اپنالیا تاکہ وہ ان کتابوں میں زیادہ سے زیادہ دل لگا سکیں۔ یورپ اور امریکہ والوں کی دیکھا دیکھی ہمارے مصنفین اور پبلشروں نے بھی کچھ عرصہ سے اس جانب توجہ کی ہے۔ لیکن ہم ابھی ابتدائی حالت میں ہیں۔ تاہم یہ غنیمت ہے کہ ہمارا محکمۂ تعلیم اپنے نونہالوں کی ذہنی ضرورتوں کے پیش نظر مصوّر اور رنگدار لٹریچر کی حوصلہ افزائی کر رہا ہے۔

اب میں اس فن لطیف کی وسعت پر اپنے خیالات مختصراً بیان کروں گا اور بتاؤں گا کہ آرٹ اتنا ہمہ گیر فن ہے کہ دوسرے بہت سے علوم و فنون اس کے بغیر تشنہ اور نامکمل رہتے ہیں۔ ایک سنگ تراش ہی کو لیجیے ایک بن گھڑے پتھر کو کاٹ چھانٹ کر بت بناتا ہے۔ اور آورز کے سوا اس میں وہ تمام خوبیاں پیدا کر دیتا ہے، جو تناسب اعضا کے لیے ضروری ہیں۔ ایک لوہار لوہے اور دوسری دھاتوں سے اشیء تیار کرتا، اور حرکت کے سوائے انسانی یا حیوانی اعضا کی ایسی نمائش کرتا ہے گویا وہ قدرتی ہے۔ ایک کمہار معمولی مٹی سے بعض قدرتی پھلوں کی نقل اتارتا، اور ان پر لال، پیلے، ہرے رنگ اس انداز سے لگاتا ہے کہ دیکھنے والا اس کشمکش میں پڑ جاتا ہے کہ آیا یہ قدرتی پھل ہیں یا مصنوعی۔ ایک اچھے گل ساز کی ہنرمندی دیکھیے۔ کاغذ کی تراش خراش سے ایک گلدستہ تیار کرتا ہے اور مختلف رنگوں کی ملاوٹ سے اسے قدرتی پھول پتوں کے مشابہ کر دیتا ہے۔ یہ سب آرٹ ہی کی کارفرمائی ہے۔

ادیب اور شاعر بھی اس فن لطیف کے دل دادہ ہیں۔ وہ اپنے الفاظ و اشعار میں کہسار و سبزہ زار، جنگل، ہامے رنگین اور ماہ و انجم کے دل کش مناظر جذب کر لیتے ہیں۔ اور ایک مصوّر اپنے موقلم کی گردش سے جلوہ ہائے جمال مظاہر قدرت اور چمن زار فطرت کی تمام تر دلاویزیاں پیش کرتا اور ان میں آب و رنگ پیدا کرتا ہے۔

دنیا کے مختلف ممالک میں جو بے شمار قسم کے ریشمی اور سوتی کپڑے تیار ہوتے اور ان میں خوش رنگ پھول بوٹے ڈالے جاتے ہیں۔ ان کے ڈیزائن بھی اسی فن کی مدد سے تیار کیے جاتے ہیں۔ آرٹ کی وسعتیں یہیں ختم نہیں ہو جاتیں۔ خدا کی اس غیر محدود کائنات میں، جس شعبہ، جس ہنر، جس کام اور جس چیز پر نظر ڈالیے اس فن کی مرہون منت ہے۔ درحقیقت قدرت سب سے اعلیٰ و ارفع آرٹسٹ ہے، جس کے ہم نقال ہیں۔ نقل اصل

ہوسکتی۔ البتہ ایسی نقل جو اصلیت کو اس درجہ اپنا لے کہ دیکھنے والے کو اپنی جانب متوجہ کر لے، یہی آرٹ کا کمال ہے۔ ایک انسان فطرت کی ہمسری نہیں کر سکتا۔ لیکن اگر وہ اپنے مشاہدے اور تخیل کی مدد سے ایک حسین چہرہ، مور، یا نیل کنٹھ کا ایک پر، ایک خوب صورت گلاب، یا لالے کا پھول یا رنگ برنگے پھول پھلے بناتا ہے۔ اور ان میں ویسی ہی رنگ آمیزی کر دیتا ہے جیسی قدرت نے انہیں بخشی تو یقیناً وہ ایک کامیاب آرٹسٹ کہلانے کا مستحق ہے، کیوں کہ اس نے نقل کو اصلیت کا جامہ پہنا دیا۔ قدرت کی فیاضیاں عام ہیں۔ نظر یا مشاہدے کی قوت اور اس کے ساتھ ریاضت درکار ہے۔ ریاضت میں طریقہ کار ضروری ہے جس طرح ایک سنگتراش کے لیے پہلے پتھر کی ڈرائنگ لازمی ہے۔ ایک گویے کے لیے سا۔ رے۔ گا۔ ما۔ پا۔ دھا کا اتار چڑھاؤ جاننا اس کے آرٹ کا کمال ہے۔ ایک نجار، لوہار، کمہار، چینی اور دھات کے برتن بنانے اور ان پر نقش و نگار کرنے کے لیے گول، بیضاوی اور آڑی ترچھی لکیروں کا استعمال جاننا ان کی ہنرمندی کی دلیل ہے، بالکل اسی طرح ایک آرٹ کے مبتدی کے لیے ان شکلوں کا صحیح استعمال جاننا ضروری ہے، یہی سبب ہے کہ ہمارے اور دنیا بھر کے اسکولوں میں دوسرے لازمی مضمونوں کے ساتھ ساتھ ڈرائنگ بھی رکھی گئی ہے۔ قدرت نے خود ہڈیوں کی آڑی ترچھی لکیروں سے انسان اور حیوانوں کے ڈھانچے بنائے اور ان پر گوشت پوست چڑھا کر اندرونی اعضا، دل، دماغ وغیرہ کو چھپا دیا ہے، اور پھر ان اعضائے رئیسہ وغیرہ کو رگوں اور شریانوں کی لکیروں سے متصل کر کے ان میں خون دوڑا دیا۔ آپ ایک خوش رنگ پھول یا سرسبز پتے کو دیکھیے، اس میں بھی آپ کو یہ ٹیڑھی بینکی لائنیں نظر آئیں گی، اس سے میرا مطلب سوائے اس کے اور کچھ نہیں کہ ڈرائنگ آرٹ کی جزو لاینفک ہے اور اکثر و بیشتر مواقع پر اس کے بغیر کام نہیں چلتا۔ میں اوپر عرض کر آیا ہوں کہ آرٹ ایک ہمہ گیر فن ہے، اور اس کے بغیر دوسرے علوم و فنون تشنہ اور نامکمل رہتے ہیں۔ ایک سائنس داں، انجینئر، ڈاکٹر سب کسی نہ کسی طرح اس کی امداد کے طالب ہیں۔ انجینئرنگ کا طالب علم عظیم الشان عمارات، بڑے بڑے ریلوے پل اور دوسری بے شمار چیزیں بنانا نہیں سیکھ سکتا، جب تک وہ ڈرائنگ کے آلات استعمال نہیں کر سکتا۔ میڈیکل کالج کا ایک طالب علم اس وقت تک ڈاکٹر نہیں بن سکتا، جب تک کہ وہ انسانی ہڈیوں کا ڈھانچہ اور اندرونی اعضا کی تصاویر دیکھ کر یہ ذہن نشین نہ کر لے کہ یہ اعضا کس شکل کے ہیں، اور انسانی پنجر میں جوڑ توڑ کہاں کہاں ملتے ہیں، اور وہ کس ڈھب

گئے ہیں۔ اس طرح علم معارف میں اس کا عمل دخل ہے۔ آرٹ کے اس لٹریچر کے علاوہ جو آرٹ کالجوں میں پڑھایا اور سکھایا جاتا ہے۔ دنیا بھر کے اسکولوں اور کالجوں کی درسی کتب بھی اس سے خالی نہیں، ان میں مختلف تاریخی مناظر اور مشہور شخصیتوں کی تصاویر سے ہوتی ہیں، طب اور ڈاکٹری کی کتب میں مختلف جڑی بوٹیوں، پھلوں، کونپلوں اور پتوں کی شکلیں دیکر ان کی شناخت کرائی جاتی ہے، دور کیوں جائیے ایک انسان جو خالق حقیقی کا مجسم آرٹ ہے اپنے لباس میں ہم آہنگی سے ایک قسم کے آرٹ کا مظاہرہ کرتا ہے، ایک خاتون اپنے سنگھار، لباس کی تراش خراش اور مختلف پارچات کے رنگوں کی مناسبت سے اپنا ملکی آرٹ پیش کرتی اور اس سلیقہ شعاری کی بدولت محفل کی دوسری عورتوں کی توجہ اپنی جانب منعطف کر لیتی ہے، بالکل اسی طرح ایک بچہ آرٹ کا دلدادہ ہے، وہ حسین و شوخ رنگوں کی تصویریں دیکھ کر خوش ہوتا ہے۔ رنگ برنگے کھلونے اسے بے حد بھاتے ہیں، وہ قدرتی پھول بوٹوں سے ویسی ہی دل چسپی لیتا، جیسی کاغذی پھول، پتوں سے۔ شاید تخلیق کائنات سے ہی ماہرین نفسیات نے سمجھ لیا تھا کہ قدرت نے بچے کی خلقت میں آرٹسٹک چیزوں سے ایک خاص لگاؤ رکھا ہے اور اسی ضرورت کے پیش نظر کھلونا ایجاد ہوا ہو، کھلونوں کی طرح گڑیا بھی بہت پرانی چیز ہے، اور بچوں کی دنیا میں یکساں طور پر مرغوب ہو سکتا ہو کہ دوسرے ممالک میں گڑیاں اس طرح نہ کھیلی جاتی ہوں جیسے ہمارے ملک میں لڑکیاں کھیلا کرتی ہیں، لیکن ان کے وجود سے انکار نہیں کیا جا سکتا، خواہ کھیل کی نوعیت کچھ ہی کیوں نہ ہو۔

غرض رنگوں، کھلونوں، تصویروں اور نقش و نگار سے بچوں کی دل چسپی کے پیش نظر گورنمنٹ جونیر ماڈل اسکول اور دوسرے ایسے ہی اسکولوں میں مروجہ مضامین کے ساتھ یہ دل پسند فن بھی رکھا گیا ہے تاکہ بچے اپنے ذوق کی پذیرائی کر سکیں اور انھیں کاغذ، رنگ، برش اور پنسل کے استعمال کا طریقہ آ سکے۔ اس کے ساتھ ہی ان کی سوچنے سمجھنے، دیکھنے اور غور کرنے کی قوتیں اجاگر ہو سکیں، تاکہ وہ آگے چل کر زندگی کی جدوجہد میں ان سے مناسب کام لے سکیں۔

آوارہ بچے

ڈاکٹر عبدالرؤف

تاریخی پس منظر

۱۹۴۷ء کا انقلاب ہماری تاریخ کا عظیم ترین واقعہ ہے، ان ناقابل فراموش ایام میں لوٹ مار، مار دھاڑ قتل و غارت اور نقل مکانی نے قیامت کی ہلچل برپا کر دی تھی۔ اس ہلچل کے مہلک اثرات ہم میں اب تک باقی ہیں جس طرح جنگ کے بعد مغرب میں اخلاقی اور معاشرتی قدروں میں تنزل رونما ہوا کرتا ہے، اسی طرح ہمارے ہاں تقسیم ہند و پاکستان کے بعد معیاروں، قدروں، اور اخلاقی ضابطوں میں بے حد افسوس ناک انحطاط رونما ہوا۔ مہاجر لوگ ہندوستان میں اپنا سب کچھ لٹا کر بے انتہا قابل رحم حالت میں پاکستان پہنچے۔ یہاں ابتدا میں ان کی بحالی اور آبادکاری کسی واضح منصوبے کے بغیر محض اتفاقی طریقے سے ہوئی، انھیں مختلف اجنبی گلی کوچوں میں انجان لوگوں کے ساتھ رہائش اختیار کرنا پڑی۔ اپنے آبائی وطن کے مکانوں، گلی کوچوں اور پرانے ہمسایوں کو یک دم چھوڑ کر جب انھیں اجنبی جگہوں پر اچانک آباد ہونا پڑا، تو انہیں ہمسائگی اور انسانی تعلقات کی وہ جذباتی فضا میسر نہ آ سکی جو انھیں اپنے آبائی علاقوں میں نصیب تھی۔ اس کا ایک نتیجہ یہ ہوا کہ غیر ذمہ دار کردار عام ہونے لگا۔ بڑوں کے کردار کے اس تنزل سے چھوٹے بھلا کیسے بچ سکتے تھے؟

مادی اور اقتصادی پہلو سے حالات اور بھی ناسازگار تھے۔ مہاجرین اپنا سب کچھ گنوا بیٹھے تھے، ابتدا میں انھیں یہ یقین ہو گیا تھا کہ ان کی مالی حالت پھر کبھی بھی بحال نہ ہو گی، اس مایوس کن خیال سے ان میں محنت کرنے اور کشمکش للبقاء میں شرکت کرنے کی تڑپ زنگ آلود ہونے لگی، مگر جب ذرا حالت سنبھلے اور الاٹمنٹیں ہونے لگیں اور سیاسی سودے شروع ہوئے تو انھیں یہ معلوم کر کے قدرے سکون ہوا کہ ماضی کے نقصان کا کفارہ محنت کیے بغیر بھی ممکن ہے، اس انکشاف اور حالات کی اس پریشانہ تاویل نے ان میں محنت و مشقت اور اخلاق و انسانیت کے بچے کھچے اصولوں پر ضرب کاری کا کام کیا، نتیجہ یہ ہوا کہ ابتدائی ایام میں تو کافی عرصہ تک یوں معلوم ہوتا تھا،

جیسے ہم نے جنگل کے قانون اور لاٹھی کے اصول کو پھر سے اپنالیا ہے، ایسے حالات کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ معاشرے میں اضطراب، عدم مسرت، ہوس، خود غرضی، بداخلاقی اور درندگی کو مزید تقویت مل جاتی ہے، بدقسمتی سے ان برائیوں کی زد سے متاثر لوگ بھی نہ بچ سکے، بچوں نے بھی جب بڑوں اور اخلاق کے اجارہ داروں کو اخلاقی ضابطے توڑتے اور طرح طرح کی رنگ رلیاں مناتے دیکھا تو وہ یہ سوچنے لگے کہ آخر وہ اس موقع سے کیوں فائدہ نہ اٹھائیں انہیں بڑوں کی اطاعت، مدرسوں میں جانے اور محنت کرنے کے اصولوں کو ٹھکرانے اور اپنی من مانی کرنے کا بے نظیر موقع ہاتھ آگیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بچے بھی بداخلاقی اور آوارگی کے مشاغل میں بڑی بے تکلفی سے شریک ہونے لگے۔ آج ہمیں آزاد ہوئے کافی عرصہ ہوگیا ہے، اگر اخلاقی اور معاشرتی طور پر ہم غالباً ابھی تک آزاد نہیں ہوئے۔ ہم ابھی تک جہالت، انتشار، نااتفاقی اور بداخلاقی کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہیں۔

یہ تو اس عمومی پس منظر کا مختصر سا خاکہ ہے جو ہمارے بچوں میں آوارگی پھیلنے کے لیے ممد ثابت ہوتا ہے مگر اس کے علاوہ آوارگی کے چند خصوصی اسباب کا ذکر بھی ضروری ہے، اچھی طرح سمجھنے کی خاطر ان اسباب کو تین گروہوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔

اول :- گھریلو اسباب

دوم :- گھر سے باہر کے اسباب

سوم :- متفرق اسباب۔

گھریلو اسباب

چند ایک چیدہ چیدہ گھریلو اسباب جو بچوں میں آوارگی کے ذمہ دار بنتے ہیں، یہ ہیں۔

(۱) اقتصادی عناصر :- غربت میں بداخلاقی اور آوارگی کے امکان بڑھ جاتے ہیں، ایسا بچہ جسے گھر میں اچھی طرح کھانے پینے اور پہننے کو نہ ملے اور جس کی ہر جائز خواہش کچل دی جاتی ہو۔ اپنے بنیادی تقاضوں کی تسکین کے لیے گھر سے باہر کی طرف دیکھنا شروع کر دیتا ہے۔

(۲) اخلاقی عناصر :- اگر والدین خود بداخلاق ہوں یا اخلاقی تربیت سے متعلق غفلت کے مرتکب ہوتے ہوں۔ یا اس تربیت کو غلط طریقوں سے سرانجام دینے کی کوشش میں ہوں تو بچوں کے لیے بداخلاقی

اور آوارگی کی زد سے محفوظ رہنا بہت مشکل ہو جاتا ہے۔

(۳) جذباتی عناصر:- انسانی کردار میں جذباتی عناصر کو بے پناہ اہمیت حاصل ہے۔ غیر مستقل مزاج سیلانی طبع۔ چڑچڑے۔ بدمزاج۔ غصیلے اور جھگڑالو۔ والدین گھر کی فضا میں ایک مستقل تناؤ اور کشیدگی کا باعث بن جاتے ہیں، وہ اپنے ناروا طرز عمل سے بچوں کو گھر سے بھاگ جانے اور باہر کی دلچسپیوں اور آوارگیوں میں شریک ہونے پر مجبور کرتے رہتے ہیں۔

(۴) ذہنی اور جسمانی صحت کے عناصر:- خرابی صحت کے باعث بعض اچھے بھلے والدین بھی بچوں کی تعلیم و تربیت اور نگہداشت اچھی طرح سے نہیں کر سکتے، چنانچہ بچے ان کی معذوری سے ناجائز فائدہ اٹھا کر ضابطوں اور اصولوں کے خلاف بغاوت کر دیتے ہیں، آوارگی اسی بغاوت کے اظہار کا ایک طریقہ ہے۔

(۵) والدین کی موت:- والدین یا ان میں سے کسی ایک کی موت بھی گھر کے نظم و نسق کا شیرازہ بکھیر دیتی ہے اور بچوں کے لیے آوارگی کے دروازے کھول دیتی ہے۔

گھر سے باہر کے اسباب

چند ایک اہم عناصر جو بچے کو آوارگی کی طرف مائل کرتے ہیں اور جو گھر سے باہر کے ماحول میں موجود ہوتے ہیں۔

(۱) مخرب اخلاق گلیاں:- ہمارے گلی بازاروں میں اخلاقی قدروں کا خون ہو چکا ہے گلی بازار میں گالی گلوچ۔ ہاتھا پائی اور بداخلاقی کے عام مناظر تو اب ہمارے تمدن کا تقریباً مستقل جزو بنا گئے ہیں۔ مناسب تفریح گاہیں میسر نہ آنے کی وجہ سے گلی بازار ہمارے بچوں کی مرغوب تفریح گاہ بھی ہے۔ بھلا سوچیے تو ایسی مخرب اخلاق جگہ میں کھیلنے۔ طرح طرح کے آوارہ مزاج بچوں میں اٹھنے بیٹھنے اور بڑی عمر کے لوگوں سے ملنے جلنے سے آپ کا بچہ بداخلاقی اور آوارگی کی زد سے کیسے محفوظ رہ سکتا ہے؟

(۲) مدرسہ اور تعلیم:- محکمہ تعلیم کے اعداد و شمار سے پتہ چلتا ہے کہ بچوں کی کل آبادی میں سے فقط ۱/۲ کے لیے تعلیمی سہولتوں کا اہتمام موجود ہے، جن بچوں کو ابتدائی عمر میں تعلیمی سہولتیں میسر نہیں آتیں ان کے لیے

آوارگی اور جرائم میں کھو جانے کے امکان بڑھ جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ ہمارے موجودہ مدرسوں میں بے حد افسوس ناک علمی، تمدنی اور اخلاقی انحطاط بھی واقع ہو چکا ہے، بچوں پر اب مدرسے کا اعتبار دن بدن گھٹتا جا رہا ہے۔ بھگوڑے بچوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے، مدرسوں سے بھاگنے والے بچے والدین کی پٹائی کے خوف سے گھر چلے جانے کی بجائے چھٹی تک کا سارا عرصہ عموماً گلی بازار میں آوارہ پھر کر بسر کرتے ہیں۔

(۳) فلم کی تباہ کاریاں:۔ فلم کی تباہ کاریوں سے کون واقف نہیں ہے۔ یہ فلمیں اخلاقی قدروں کو بڑی تیزی سے پامال کر دیتی ہیں۔ جائز اور مناسب تفریحوں کے میسر نہ آنے کی وجہ سے فلم ہمارے بچوں میں بڑی سرعت سے مقبول ہوتی چلی جا رہی ہے، جن بچوں کو فلم دیکھنے کی چاٹ پڑ جائے انہیں طرح طرح کے جائز و ناجائز طریقوں سے پیسہ حاصل کرنے کی رغبت بھی ستانے لگتی ہے۔ اس کے علاوہ یہ فلمیں ذہن میں یہ خیال جاگزیں کر دیتی ہیں کہ رنگین زندگی محنت و مشقت کی خشک زندگی سے بدرجہا بہتر ہے اور دلچسپ بھی۔

(۴) ہمارا موجودہ تمدن:۔ ہمارا موجودہ تمدن بھی مطالعہ کے لیے بہت دلچسپ موضوع ہے۔ ہم میں اخلاق اور قانون کا التزام نہ صرف مٹ چکا ہے، بلکہ اب تو بعض نازیبا حرکتوں کو عزت کی نگاہ سے دیکھا جانے لگا ہے۔ چور بازاری، اقربا پروری، رشوت ستانی، ناانصافی، جبر و استبداد، اور جنسی بے راہ روی کی داستانیں سننے سنانے میں اب ہمیں کوئی خاص حیرانی نہیں ہوتی، محنت و مشقت کی آبرومندانہ زندگی کو بھی ہمارے معاشرے میں کوئی خاص وقعت کی نگاہ سے نہیں دیکھا جاتا، ہم کس قدر جوش و خروش سے ایک اسلامی جمہوریہ کے باشندے ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں، مگر ہمارے روزمرہ عمل سے یہ صاف ثابت ہوتا ہے کہ ہم ہر اس حرکت کو سرانجام دیتے ہیں جو اسلامی تعلیمات کے منافی ہو۔ اس تمدنی انحطاط اور انتشار سے بچے بے حد متاثر ہوتے ہیں۔ اپنے ماحول میں بہت، استقلال، استحکام، دیانت داری، نیکی اور خیر سگالی کے جذبے مفقود پا کر وہ بھی بداخلاقی اور آوارگی کی طرف مائل ہو جاتے ہیں۔

متفرق وجوہات

گھر اور گھر کے باہر کے ماحول کے ان خصوصی عناصر کے علاوہ چند متفرق اسباب بھی آوارہ کرداری کا موجب بنتے ہیں:۔

(۱) بارونق شہروں کی رغبت:۔ دیہات میں دل چسپیوں کے مناسب سامان غائب پاکر دیہاتی بچے گھومنے پھرنے کے لیے شہروں کی طرف کھنچے چلے آتے ہیں۔ اسی طرح قصبوں اور چھوٹے چھوٹے شہروں کے رہنے والے بچے بڑے اور بارونق شہروں کی طرف فطری کشش محسوس کرتے ہیں، شہروں کی رونق اور ہنگامے دیکھنے کی یہ تڑپ اگر زیادہ قوی اور مستقل ہو جائے تو اس سے آوارگی کی عادت پڑ جانے کا احتمال ہے، شہروں میں اسی آوارگی کے دوران میں بچوں کا میل جول آوارہ بچوں اور بالغ مجرموں سے ہوتا ہے جس سے ان کے لیے خلاف معاشرت حرکات اور مجرمانہ مشاغل کے راستے کھل جاتے ہیں۔

(۲) بچوں کی تجارت کے اڈے:۔ کئی ایک بڑے شہروں میں بعض مجرم افراد اور ادارے ایسے بھی پائے جاتے ہیں، جو بچوں کو ورغلانے اور پھسلانے کی تجارت کرتے ہیں، یہ لوگ بچوں کو اغوا کرکے لے جاتے ہیں، اس قسم کے کئی ایک بچوں کو بالغ مجرم گروہوں میں کام کاج کے لیے ملازم بھی رکھ لیا جاتا ہے۔ بعض جیب کتروں، جوئے بازوں اور پیشہ ور مجرموں کے علاوہ چند ایک ایسے نام نہاد یتیم خانوں کے مالک بھی اسی زمرے میں شمار کیے جا سکتے ہیں، یہ لوگ اغوا شدہ اور اچھے بھلے بچوں کو "یتیم" بنا کر چندہ اکٹھا کرنے اور لوگوں کو دھوکہ دینے کے طرح طرح کے ہتھکنڈے اختیار کر لیتے ہیں، وہ بچے جو کسی نہ کسی وجہ سے آوارگی کی طرف پہلے ہی سے مائل ہوتے ہیں ان معاشرتی مجرموں کے جال میں نسبتاً جلد پھنس جاتے ہیں۔

(۳) بچوں کی آبادی میں اضافہ:۔ ہمارے ہاں جس حیرت انگیز رفتار سے بچے پیدا کیے جا رہے ہیں وہ فوری اور سنجیدہ غور و فکر کی متقاضی ہے۔ ہمارا وطن بے حد مفلس ہے، اس میں ہر شے کا قحط ہے۔ ہماری غذائی، تعلیمی، طبی اور تفریحی سہولتیں بہت محدود ہیں، ایسے ملک میں دھڑا دھڑ بچے پیدا کیے جانا کسی

اعتبار سے بھی کوئی مناسب حرکت نہیں ہے۔ بچوں کی تعداد زیادہ ہو تو نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ان میں سے اکثر کو زندگی کی بنیادی سہولتیں بھی میسر نہیں آتیں۔ کثرت اولاد کی وجہ سے اکثر بچوں کے والدین گھر پر مناسب نظم و نسق رکھنے سے عاجز آجاتے ہیں۔ اس کا مجموعی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ بچوں کے آوارگی کی طرف مائل ہونے کے امکان بڑھ جاتے ہیں

آوارگی کا علاج

یہ ہیں بچوں کو آوارگی کی طرف دھکیلنے والے چند ایک عناصر۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آوارہ بچوں کا کیا کیا جائے۔ ظاہر ہے کہ اس بات کے لیے کوئی ایک ہی اکسیر اعظم تو تجویز نہیں کیا جا سکتا۔ بہرکیف علاج اور اصلاح اور آوارگی کے روک تھام کے لیے چند ایک تجویزیں پیش کی جا سکتی ہیں۔

(۱) تفریحی مراکز :۔ بچوں کے لیے زیادہ سے زیادہ تفریحی مراکز اور پارکیں وغیرہ بنائی جائیں، جہاں کھیلنے اور جی بہلانے کے جدید سامان رکھے جائیں۔ ان مرکزوں پر بچوں کی محفلیں اور کھیلوں کے مقابلے وغیرہ کا اہتمام بھی کیا جائے۔ مقابلہ کے کھیلوں اور دلچسپ تفریحوں میں شرکت سے بچوں میں متمدن اور صحت مند شہری بننے کا جذبہ اجاگر ہوتا ہے۔ اگر ایسے مرکزوں کی تعمیر کے لیے مناسب جگہ نہ مل سکے تو عارضی طور پر مدرسوں کی عمارتیں جو شام کے وقت بے کار پڑی رہتی ہیں، اس مقصد کے لیے استعمال ہو سکتی ہیں۔

(۲) بچوں کے کلب :۔ ہر محلہ میں بچوں کا ایک کلب قائم کیا جائے، جہاں منتخب کردہ اخبار رسالے اور کتابیں وغیرہ پڑھ سکیں اور اندرون خانہ کھیل کھیل سکیں، اس کام کے لیے بھی مدرسوں کی عمارتوں کو بھی بروئے کار لایا جا سکتا ہے۔

(۳) کیمپ :۔ بڑی عمر کے بچوں کے لیے دیہاتوں میں کیمپوں وغیرہ کا اہتمام کیا جائے، یہ کیمپ گرمیوں کی چھٹیوں میں بڑی آسانی سے منعقد کیے جا سکتے ہیں۔ ایسے موقعوں پر بچے محنت، تعاون، خوش مزاجی اور جمہوری اصولوں سے روشناس ہونا سیکھتے ہیں، جس کی بدولت وہ بے شمار گمراہیوں سے بچ جاتے ہیں

(۴) خصوصی ادب :۔ بچوں کے لیے علمی، سائنسی اور تفریحی ادب خصوصی طور پر تیار کروایا جائے، اور اس میں بچوں کی دلچسپی پیدا کرنے کے لیے موثر اقدام اٹھائے جائیں۔

(۵) فلمیں :- اچھی فلم کی تعلیمی اور تفریحی حیثیت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا۔ بچوں کو لچر فلموں کے مخرب اخلاق اثر سے بچانے کا ایک طریقہ یہ ہے کہ ان کے لیے مخصوص اور دل چسپ فلمیں تیار کی جائیں جو ان کی علمی اور اخلاقی بہتری کا باعث بنیں، اور ہر گلی محلے اور سکول میں ان کی نمائش کی جائے۔

(۶) مدرسے اور تعلیم :- زیادہ سکول کھولنے کے کام کو ملی جہاد کی صورت دیدی جائے۔ مدرسوں میں عام اور دل چسپ انداز میں فنی اور صنعتی تعلیم دینے کا اہتمام کیا جائے اور اعلیٰ صنعتی تعلیم کے لیے مزید خصوصی ادارے کھولے جائیں۔

(۷) والدین کی رہ نمائی :- بچوں کی بہتر تعلیم و تربیت کے بارے میں والدین کی سائنسی رہ نمائی کا اہتمام کیا جائے۔ والدین کو اپنے بچوں میں ذاتی اور انفرادی دل چسپی لینے، گھر میں معقول نظم و نسق برقرار رکھنے کے اصولوں اور بچوں کی نفسیات کے مبادیات سے روشناس کیا جائے۔

اس غرض کو پورا کرنے کے لیے جگہ جگہ والدین کی انجمنوں اور اساتذہ اور والدین کی ملی جلی انجمنوں کے قیام کی سخت ضرورت ہے۔ اس کام کے لیے بھی مدرسوں کی عمارتوں، ہیلتھ سنٹروں اور مسجدوں کو استعمال کیا جا سکتا ہے۔

(۸) نفسیاتی کلینک :- بعض بچوں میں آوارگی کی چاٹ بہت راسخ ہو چکی ہوتی ہے۔ ایسے بچوں کے علاج کے لیے نفسیاتی کلینک قائم کیے جائیں۔ جہاں والدین معلم اور بچوں کی عدالتوں کے مجسٹریٹ عادی قسم کے آوارہ گرد بچوں کو علاج کے لیے بھیج سکیں۔

(۹) بچوں میں دل چسپی :- بدقسمتی سے ہمارا معاشرہ بچوں کی فلاح و بہبود کے بارے میں بہت مجرمانہ غفلت کا مرتکب ہو رہا ہے۔ اخباروں، فلموں، ریڈیو اور مساجد کے ذریعے سے والدین اور اساتذہ کو بچوں کے کردار سنوارنے کی اہمیت سے آگاہ کیا جائے۔

(۱۰) خصوصی قوانین اور تبدیلیاں :- بچوں کو آوارگی کی طرف پھیلانے والے مجرم بالغوں کی سزا کے لیے سخت قوانین وضع کیے جائیں، آوارہ اور مجرم بچوں کے محاسبہ کے لیے خصوصی پولیس اور خصوصی عدالتیں قائم کی جائیں۔ پروبیشن سروس (بچوں کی نگرانی کا سلسلہ) کا اجرا کیا جائے، اور بچوں کے موجودہ

جیل خانوں اور بورسٹلوں کے نظم و نسق پر نظرِ ثانی کی جائے۔

بچوں کا محکمہ:- وزارت معاشرتی فلاح و بہبود میں بچوں کی فلاح و بہبود کا ایک خصوصی شعبہ قائم کیا جائے جس میں بچوں کو بد خلاقی اور آوارگی سے بچانے کے کام پر ٹھوس تحقیق ہو اور مناسب عملی اقدام بھی کیے جائیں۔

معاشرتی جہاد کی ضرورت

بچوں کو آوارگی سے محفوظ رکھنے کے یہ فقط چند ایک طریقے ہیں۔ آوارگی ایک مہلک معاشرتی مرض ہے جس کا بروقت سدِ باب ہونا نہایت ضروری ہے، جب تک ہم معاشرے کے آوارہ لوگوں کی اصلاح نہ کریں بہتر اور صالح معاشرے کا قیام ناممکن ہے۔ اصلاح کا بہترین اور صحیح ترین وقت بچپن کا زمانہ ہے۔ اگر بچپن میں آوارگی کو کھلی ڈھیل مل جائے تو بالغ عمر میں راہِ راست پر آنا بہت دشوار ہوتا ہے۔ اس لیے بہتر یہی ہے کہ آوارہ، اور بد اخلاق بچوں کی اصلاح کی طرف خصوصی توجہ دی جائے۔

آوارہ بچے ہی بڑے ہو کر اوباش اور مجرم بالغوں کی صورت پروان چڑھتے ہیں۔ حکومت اور معاشرہ ان کے غیر مہذب کارناموں سے بے پناہ، اخلاقی، تمدنی، جانی اور مالی نقصان اٹھاتا ہے۔ اگر ان لوگوں کو آوارگی اور خلافِ معاشرت مشغلوں کی طرف چلنے سے بروقت بچا لیا جائے تو حکومت اور معاشرہ بے حساب نقصان سے بچ جاتے ہیں۔ اس اعتبار سے دیکھا جائے تو بچوں میں آوارگی کے خلاف جہاد کو ہمارے تعمیری منصوبوں میں نمایاں مقام ملنا چاہیے۔ مگر یہ معاشرتی جہاد فقط اسی صورت کامیاب ہو سکتا ہے جب حکومت اور عوام اس مہلک بیماری کے خلاف نہایت موثر اور متحدہ محاذ قائم کریں۔

ٹمی توانائی کی مختصر تاریخ

محمد حسین

۲ دسمبر ۱۹۴۲ء انسانیت کی طویل ترین تاریخ میں ایک اہم دن ہے، بلکہ وہ ہمیشہ اس کرۂ زمین کے باشندوں کی کوششوں میں سنگ میل کی حیثیت کا حامل رہے گا۔

یہی وہ دن تھا جس دن سائنس دانوں نے پہلی مرتبہ ایک خود کار ایٹمی زنجیری عمل کو قابو کر کے ابتدا کی۔ ایٹم کے اندر چھپی ہوئی کثیر المقدار توانائی اب انسان کی پہنچ سے باہر نہ تھی، بلکہ اب اس کو تاریکی سے نکال کر نسل انسانی کی خدمت کے لئے مامور کیا جا سکتا تھا۔

یہ تاریخی واقعہ تقریباً دو ہزار سال بعد رونما ہوا، اور ایٹم سے متعلق پہلا مشاہدہ تھا۔ یہ جاننا حیرانی و استعجاب کا باعث ہوگا کہ ایٹم کا تصور مسیحی سن سے پہلے کا موجود ہے۔ تاہم یہ ایک حقیقت ہے اور اندازہ سے بھی کہا جا سکتا ہے کہ وہ انتہائی تہذیب کو پہنچنے والے یونانیوں میں سے تھے، جنہوں نے ایٹم سے متعلق سب سے پہلے مطالعہ شروع کیا تھا۔

حضرت عیسیٰ کی پیدائش سے کئی صدیاں پیشتر یونانی علما کے ایک گروہ نے زندگی کے ہر پہلو اور مادی دنیا جو اس وقت انھیں گھیرے ہوئی تھی، کے متعلق عمیق مطالعہ کیا۔ ان علما میں لیوسی پس، ایمپی ڈوکلس اور ڈیموکریٹس شامل تھے۔ درحقیقت لیوسی پس ہی ایٹم کے متعلق سب سے پہلے نظریہ کا مصنف تھا، لیکن ڈیموکریٹس نے اس کثرت سے اس نظریہ کی تشریح کی کہ وہ وقت کے ساتھ اسی کے نام سے منسلک ہوگیا۔ وہ اور اس کے شاگرد عقیدہ رکھتے تھے کہ اگر مادی دنیا میں کسی چیز کو چھوٹے سے چھوٹے حصوں میں تقسیم کرتے جائیں تو بالآخر ایک حد ایسی آن پہنچے گی جس کے بعد اس چیز کو اور زیادہ حصوں میں توڑا نہیں جا سکے گا۔ انہوں نے اس ننھے ذرے کو بیان کرنے کے لیے لفظ "ایٹم" کا استعمال کیا جس کے معنی ہیں ناقابل تقسیم جس کے متعلق ان کا عقیدہ تھا کہ اس کو اور زیادہ حصوں میں توڑا اور تقسیم نہیں کیا جا سکتا۔ اگرچہ ہم نے اس کے لیے

یونانیوں کا عطا کردہ نام ہی برقرار رہنے دیا ہے۔ لیکن ایٹم سے متعلق ہمارا تصور ان کے تصور سے اس قدر دور ہے جس طرح پہلی ایٹمی بھٹی کا دن ڈیموکریٹس کے دن سے۔ تاہم ڈیموکریٹس اور اس کے شاگردوں سے پوری پوری ایمان داری سے کام لیتے ہوئے یہ فرق تسلیم کرنا پڑے گا کہ ان کے چھوڑے ہوئے کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لیے پورے دو ہزار سال تک دیو ہیکل ذہن شیر جیسی طاقت کے ساتھ تصویر کا رُخ بدلتے رہے۔

ڈیموکریٹس اور اس کے فلسفی ساتھیوں کے چھوٹے سے گروہ نے ایٹم سے متعلق ۔۔ ہم قبل از مسیح کے قریب دلچسپ مشاہدات کیے۔ بعد ازاں ان کی دریافتیں رومیوں کو منتقل ہو گئیں۔ اگرچہ رومی فلاسفر یونانیوں کے پیش کردہ ایٹمی نظریہ میں مزید اضافہ نہ کر سکے۔ تاہم، ہم ان کے مشکور ضرور ہیں کہ انھوں نے ڈیموکریٹس کی تحقیق کے ایک خوردہ حصے کو محفوظ رکھا، اس کے لیے لیوکریٹس کارس ایک رومی شاعر جو ۔ ۷ قبل از مسیح میں حیات پذیر رہا۔ بڑی حد تک ذمہ دار ہے۔ لیوکریٹس کارس نے چھ جلدوں پر مشتمل ایک کتاب بنام (DE RESUN NOTUSAE) جو کہ اشیا کی ماہیت کے متعلق تھی، اور جس میں علم الاخلاق نفسیات اور طبیعات سے وابستہ مواد بھی شامل تھا لکھی۔ علم طبیعات پر بحث کرتے ہوئے اس نے ڈیموکریٹس کے نظریات بھی بیان کیے۔

متقدمین کو خیر باد کہنے سے پیشتر ہم نے یہ بھی دیکھنا ہے کہ یونانیوں اور رومیوں کے نظریہ سائنس اور ہمارے اپنے تصور سائنس میں ایک وسیع خلیج واقع ہے۔ گزشتہ زمانے کے علما، سائنس دانوں سے کہیں زیادہ فلسفی ہوتے تھے۔ وہ مادی دنیا کے متعلق نتائج عملی تجربہ کاری کی بجائے مشاہدے کی بنا پر اخذ کیا کرتے تھے۔ جدید سائنس دان مادی دنیا کی صحیح کیفیت کو سمجھنے کے قابل صرف عملی تجربہ اور تجزیہ کی بنا پر ہی ہو سکے ہیں باوجود محدود ذرائع کے پھر بھی قدیم فلاسفروں کو ان کی دریافتوں اور مفروضوں کا زیادہ سے زیادہ خراج ملنا چاہیے۔

یونانیوں اور رومیوں کے تمدن کے زوال سے علم اور سائنسی حقائق کی تلاش ختم ہو گئی۔ بالآخر کتنی ہی صدیوں کی ذہنی تاریکی کے بعد سائنسی جوش و خروش ایک مرتبہ پھر تمام یورپ میں پھیل گیا۔ ایٹمی سائنس کی ترقی کے سلسلے میں انگلینڈ، علما و فضلا کے تمام مرکزوں میں سے عمدہ ترین مرکز تھا، جو اس میدان میں ایک اہم کردار ادا کرتا آیا ہے۔ اس وقت تیز فہم فرنگیوں کا ایک گروہ اپنے قدرتی قرب و جوار سے اثر پذیر تھا۔ ان میں

سب سے نامور نیوٹن تھا جس کے مضامین انسان کو اس دنیا کے سمجھانے کے لیے اس قدر مشہور و معروف ہو گئے ہیں کہ ان کے اس جگہ دہرانے کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔ ایک اور غیر معمولی قابلیت کے فرنگی جان ڈالٹن نے علم کیمیا اور علم طبیعات میں نہایت اہم تحقیق خصوصاً ایٹم سے متعلق شاندار مطالعے کیے۔ درحقیقت اس کی سعی کی اہمیت اس قدر زیادہ ہے کہ آج ہم ایٹمی تحقیق کی تاریخ کو ڈالٹن کے وقت کی تحقیق سے شروع کرتے

جان ڈالٹن ۱۷۶۶ء میں پیدا ہوا، اور ۷۸ سال کی عمر تک زندہ رہا۔ کیمیا اور طبیعات کی بیشتر شاخوں کی طرف اپنی دلچسپیاں مبذول کر کے مختلف عنوانوں میں باثمر تحقیق کی، ان میں سے ایک موضوع موسمیات کا تھا۔ کئی سالوں تک وہ موسمی ڈائری لکھتا رہا۔ اور بعد ازاں اس نے اپنے بہت سے شاہدات کو شائع کرایا۔ ۱۷۹۳ء میں ڈالٹن نے "شمالی شفق" کے سبب کا سب سے قدیم نظریہ اس دعوے کے ساتھ پیش کیا کہ یہ مظہر برقی خلل کے سبب ہوتا ہے۔ بنیادی طور پر یہ نظریہ آج بھی لازم ہے۔ تاہم ڈالٹن کا سب سے بڑا قابل ذکر سائنسی کارنامہ ایٹم کے تصور سے متعلق تھا۔

ڈالٹن کے اندر کے کیمیادان نے ایٹم کے تصور تک اس کی رہنمائی کی جس سے کیمیا اور طبیعات کی مکمل تکمیل کے لیے بطور موسمی چارٹ کے خدمت حاصل ہوئی۔ ڈالٹن کے نظریہ کی رو سے مادی دنیا کے تمام عنصر بہت ہی ایٹموں سے بنے ہوتے ہیں، جن کو نہ اور آگے تقسیم کیا جا سکتا ہے اور نہ ہی دوسرے ایٹموں میں تبدیل کیا جا سکتا ہے۔ ڈیمو کریٹس شاید کہہ دیتا کہ یہ تصور اس کے اپنے تصور سے ملتا ہے اور جو بڑی حد تک درست ہوتا۔ لیکن ڈالٹن اپنی تحقیق میں قدیم فلسفیوں پر اپنے عملی تجربوں کی بنا پر سبقت لے گیا۔ اس نے ایٹموں کو چند خصوصیات منسوب کرنے کا کام بھی ضرور



ڈالٹن کا ایٹم کے بارے میں تصور "کیمیائی فلسفہ کی ایک نئی شکل"

ان مجاہدانہ مشاہدات میں سے اکثر اس کی کتاب

میں رونما ہوئیں جو ۱۸۰۸ء میں شائع ہوئی۔

ڈالٹن کے نظریہ کے مطابق وہ تمام ایٹم جو ایک خصوصی قسم کے عنصر کی تشکیل کرتے ہیں سب یکساں

مثال کے طور پر ایلومینیم، سوڈیم یا آکسیجن، تمام اپنے ہی خاص قسم کے ایٹموں سے مشتمل ہیں۔ ڈالٹن ڈالٹن اس پر قائم رہا کہ ایک عنصر کے ایٹم دوسرے عنصر کے ایٹموں سے قطعاً مختلف ہوتے ہیں۔ خاص طور پر وزن میں۔ ایلومینیم یا سوڈیم میں سمائے ہوئے تمام ایٹم آکسیجن کے ایٹموں سے بھاری تھے۔

ڈالٹن نے یہ بھی مشاہدہ کیا کہ جب دو یا دو سے زیادہ عنصر ایک مرکب بنانے کے لیے آپس میں ملتے ہیں تو وہ ایسا مقررہ نسبتوں میں کرتے ہیں۔ کسی مرکب کے سالموں کے جوہر (ایٹم) کیمیائی عمل کے دوران نہیں بدلتے، ان کے وزن میں کمی بیشی بھی نہیں ہوتی۔ دوران عمل نہ تو ایٹموں کا ضیاع ہوتا ہے اور نہ ہی نئے ایٹم بنتے ہیں اور آخرش سارے عمل میں شامل شدہ سالموں کے جوہروں کی خاص مقدار اپنے اندر رکھتے ہیں۔

ان نظریات نے نہ صرف انگلینڈ کے سائنس دانوں میں بلکہ یورپ بھر کے دوسرے سائنس دانوں میں تہلکہ مچادیا۔ طبیعات میں ایک تحقیقاتی راہ جو خصوصاً سب سے زیادہ محرک ہوئی، وہ نئے عنصروں کی تلاش تھی۔ اٹھارہویں صدی کے شروع میں ڈالٹن کے مشاہدہ جوہر و عنصر کے وقت بمشکل ایک درجن سے زیادہ قدرتی چیزیں معلوم تھیں، جن کو جوہری وزن کی ترتیب سے رکھا گیا تھا، اس صدی کے نصف تک تعداد پچھتر تک جا پہنچی تھی، اور تمام کے متعلق مکمل طور پر کیمیائی خصوصیات جان لی گئی تھیں۔

ان قدرتی اشیاء میں سے بہت سی چیزوں کی لاثانی کیمیائی خاصیتوں کے ساتھ ساتھ سائنس دانوں نے ان میں سے کئی ایک کو ایسی خصوصیات کا حامل پایا جو پوری طرح یکساں تھیں، بعض عنصروں میں تین تین کے گروہ میں جدا ہونے کی رغبت پائی گئی۔ جن میں سے ہر عنصر اپنے پڑوسی عنصر سے ایک یا ایک سے زیادہ خصوصیات میں مشترک ہوتا ہے۔ سائنس دانوں نے (TRIAD) کا لفظ ان گروہوں کے لیے استعمال کیا۔ اس کی ایک مثال ہیلیم نیون اور آرگون عناصر پر مشتمل ہے۔ چند ایک کے عقیدے کے مطابق چیزوں کی ظاہراً بنیادی گروہی وصف کو استعمال کرتے ہوئے جس کا وجود اس وقت معلوم ہو چکا تھا، ایک چارٹ جس میں تمام عنصروں کو ترتیب اور ان کی کیمیائی خصوصیات کے مطابق آسان سلجھے ہوئے طریقے سے ترتیب دینا غیر ضروری طور پر ممکن ہو گیا تھا۔ سب سے پہلے اس قسم کی کوشش کرنے والا جاہن ڈوبیرنیر جرمن کیمیا دان تھا۔ لیکن اس کی یہ کوشش ناکام رہی، اس کے راستہ کی مشکل کرنے نئے دریافت شدہ عنصروں میں گروہی تمثیل پوری طرح صادق نہیں آتی تھی ایک حقیقت تھی۔

(باقی)

السنۂ شرقیہ کی تدریس

نذیر احمد

ہمارے ہاں عرف عام میں السنۂ شرقیہ سے مراد صرف عربی اور فارسی زبانیں ہی ہوتی ہیں۔ گو ایک علمی بحث میں ترکی زبان بھی ان کے ساتھ شامل کرنی ضروری ہے۔ کیونکہ اہل مغرب مشرق وسطیٰ کی تمام زبانوں پر السنۂ شرقیہ کا اطلاق کرتے ہیں۔

اہل مغرب نے پہلے پہلے جب مشرقی ممالک کے ساتھ میل جول بڑھایا تو انہیں مشرقی زندگی اپنی زندگی سے اس قدر مختلف نظر آئی کہ انھیں بے ساختہ یہ کہنا پڑا کہ "مغرب مغرب ہے اور مشرق مشرق، وہ دونوں کبھی یکجا نہیں ہو سکتے۔" اس مقولہ میں مدت تک کافی صداقت باقی رہی۔ مگر انیسویں صدی کے نصف آخر میں یورپ میں دو ایسے ہمہ گیر انقلابات رونما ہوئے جن کے اثرات سے سست رو مشرق بھی بچ نہ سکا، اور موجودہ صدی کے ابتدائی سالوں میں ہی مشرق وسطیٰ میں بعض ایسی تحریکوں نے جنم لیا جنہوں نے بالآخر مشرق و مغرب کی تمیز کو بڑی حد تک مٹا دیا۔

قومیت اور وطنیت

پچھلی صدی میں ریلوں اور دخانی جہازوں کی ایجاد دنیا کی اقتصادی زندگی کے لیے ایک انقلاب آفرین واقعہ تھا۔ مگر نتائج کے لحاظ سے غالباً اتنی ہی اہم وہ ذہنی تحریک تھی جس نے قومیت اور وطنیت کے نام سے سر اٹھایا۔ اور بجلی کی تیزی کے ساتھ مغرب و مشرق پر ہر جگہ چھا گئی۔ ذرائع آمد و رفت کے انقلاب نے تو صرف اقتصادی اور معاشی زندگی کو متاثر کیا تھا۔ مگر قومیت کے نئے تصور نے ہر جگہ ثقافتی روح کے پس منظر کو تبدیل کر دیا۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ تبدیلی مغرب کی مادی ثقافت کے لیے اس قدر دور رس نتائج کی حامل نہ تھی جس قدر مشرقی ثقافت کے لیے۔ مغربی ثقافت کی بنیادیں پہلے دن سے ہی مادی اقدار پر اٹھائی گئی تھیں اس لیے گو قومیت اور وطنیت کے نئے نظریوں نے قومی زندگی کو مغرب میں ہر جگہ متاثر کیا۔ مگر اس سے

ماضی اور حال کی ثقافتی زندگیوں میں کوئی انقلابی تبدیلی لازماً نہ ہوئی، مگر مشرق میں معاملہ اس سے بالکل الگ تھا۔

السنۂ شرقیہ کا دورِ قدیم

کسی قوم کی زبان اس کی ثقافتی زندگی کی بہترین آئینہ دار ہوا کرتی ہے۔ پچھلی صدی کے ربع آخر تک مشرقِ وسطیٰ کی ثقافتی زندگی کی بنیاد صرف اسلام اور قرآن پر تھی۔ اس لیے اس وقت تک عربی، فارسی، اور ترکی زبانوں کا ادب بالعموم پرانی روایات کا حامل نظر آتا ہے۔ اس وقت تک حالت یہ تھی کہ جو شخص ان زبانوں کی ادبیات کا مطالعہ کرنا چاہے اس کے لیے ضروری ہے کہ قدیم استادوں کے شاہکاروں سے بالعموم اور قرآن اور اسلام کے دوسرے مذہبی لٹریچر سے بالخصوص پہلے واقفیت حاصل کرے۔ اس کے بغیر السنۂ شرقیہ کی ادبی روح کو سمجھنا اور ان زبانوں میں مہارت پیدا کرنا ممکن ہی نہ تھا۔ عربی زبان میں تو قرآن حکیم ہی سب سے پہلی عربی تحریر ہے۔ مگر فارسی اور ترکی زبانوں کا بھی یہ حال ہے کہ وہ اسلام کے ہی طفیل عالمِ وجود میں آئیں، اور ان کا قدیم ادب تمام کا تمام اسلامی محور کے گرد ہی گھومتا ہے۔ ان زبانوں میں عربی الفاظ کی تعداد کوئی ساٹھ فی صد کے قریب تھی، اور نئے خیالات ظاہر کرنے کے لیے جب بھی جدید الفاظ کی ضرورت پیش آئی تو فارسی اور ترکی زبانیں عربی کے دامن میں ہی پناہ تلاش کرتیں۔ ان کا رسم الخط بھی عربی تھا۔ ان تمام باتوں کا مجموعی اثر یہ تھا کہ گذشتہ صدی کے آخری سالوں تک جبکہ ابھی مشرقِ وسطیٰ کی ثقافتی زندگی کا سب سے بڑا سہارا پرانی اسلامی روایات ہی تھیں، مروجہ اور پرانی زبان میں کوئی حدِ فاصل موجود نہ تھی، مروجہ زبان کو سیکھنے کے لیے سہل ترین شاہ راہ قدیم شاہکاروں کا سیکھ لینا تھا۔

دورِ جدید

گو انیسویں صدی کے آخری سالوں میں ہی مشرقِ وسطیٰ کی ثقافتی زندگی میں انقلابی تبدیلیوں کے آثار پیدا ہو چکے تھے۔ مگر جدید رجحانات کے پورے اثرات پوری شدت کے ساتھ موجودہ صدی کے آغاز میں ہی رونما ہوئے۔ چنانچہ عرب ممالک میں اس ذہنی انقلاب نے تحریک قومیت کی صورت اختیار کی۔ ترکی میں یہ ۱۹۰۸ء کے انقلاب کی شکل میں ظاہر ہوا، جس کی پشت پر نوجوان ترکوں کی انقلابی سرگرمیاں تھیں، ایران میں ۱۹۰۶ء کی تحریک دستور بینہ کے پیچھے بھی یہی قوت کام کر رہی تھی۔ اس ذہنی انقلاب کی صحیح وسعت کو جانچنے کے لیے السنۂ شرقیہ کے گذشتہ تیس سالہ ادب پر ایک نگاہ ڈال لینا کافی ہے۔ ان زبانوں کے موجودہ اور آج سے تیس برس پہلے کے لٹریچر میں جو فرق ہے

وہ کسی نگاہ سے مخفی نہیں رہ سکتا، یہ درست ہے کہ قدیم اور جدید زبانوں کی گرامر ایک ہی ہے، اور ترکی کو چھوڑ کر باقی باقی زبانوں کے رسم الخط اور ہجائیں بھی کوئی فرق نہیں آیا۔ مگر بایں ہمہ قدیم اور جدید لٹریچر کی روح ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہے۔ نئے موضوع پرانوں کے مقابلے میں سراسر اجنبی ہیں۔ ادبی تکنیک سرے سے مختلف ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ثقافتی پس منظر میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔

یہاں یہ امر قابل ذکر ہے کہ یہ انقلاب سب سے پہلے عربی زبان کے ادب میں رونما ہوا۔ عرب ادیب ۱۸۸۰ء سے ہی نئے مغربی رجحانات سے متاثر ہونے لگے تھے، اور زیادہ تعجب کی بات یہ ہے کہ وہ عرب اہل قلم جو کسی مغربی زبان سے بھی آشنا نہ تھے انھوں نے بھی نئی روش فکر کو اپنانے میں کوئی پس و پیش نہیں کیا۔ ترکی اور فارسی میں یہ انقلاب نسبتاً بعد میں آیا اور اس کی ابتدا مغربی زبانوں کے تراجم سے ہوئی۔

اس ذہنی انقلاب نے مشرق وسطیٰ کی زندگی کو جس حد تک متاثر کیا، اس کا کچھ اندازہ صرف اس ایک بات سے ہو جائے گا کہ ایرانی سینیٹ کے صدر تقی زادہ جو ۱۹۰۶ء کی تحریک میں بھی پیش پیش تھے، اس بات کے سرگرم حامی ہیں کہ مغربی تہذیب و ثقافت، مغربی طرز زندگی، نظام معیشت، رسوم، سائنس، آرٹ، نظریہ حیات، غرضیکہ مغربی زندگی کے ہر پہلو کو سوائے زبان کے بلا پس و پیش غیر مشروط طور پر اختیار کر لینا چاہیے۔

یہ درست ہے کہ مشرق وسطیٰ کی ساری آبادی اس حد تک جانے کے لیے کبھی آمادہ نہ ہوگی۔ مگر پڑھا لکھا طبقہ جو ان ممالک کے لیے نفس ناطقہ کا حکم رکھتا ہے، پرانے نظریہ حیات کو مدت سے خیرباد کہہ چکا ہے۔ اور آج مشرق وسطیٰ کی ثقافتی زندگی کا دھارا جس نہج پر بہ رہا ہے۔ اسے پرانی روش کے ساتھ کوئی لگاؤ نہیں۔

السنہ شرقیہ کی تدریس

یہاں تک یہ بات اب صاف ہو چکی ہے کہ ثقافتی روح کے اعتبار سے السنہ شرقیہ کا قدیم اور جدید لٹریچر دو مختلف چیزیں ہیں، یہ امر ان زبانوں کی تدریس کے معاملے میں بہت دور رس نتائج پیدا کرتا ہے، ان زبانوں کو پڑھانے سے پہلے ہمیں دو نکات واضح طور پر سمجھ لینے چاہئیں، ان میں سے پہلا سوال یہ ہے کہ کیا ان زبانوں کے جدید لٹریچر کو بخوبی سمجھنے کے لیے قدیم ادب کا علم ضروری ہے؟ دوسرا سوال یہ ہے کہ کیا قدیم ادب پڑھا رکھنے والے اصحاب بہ آسانی جدید زبان اور محاورہ پر قدرت حاصل کر سکتے ہیں؟

ہر وہ زبان جو طویل ادبی تاریخ کی مالک ہو۔ اس کے متعلق یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ قدیم ادب کا علم جدید ادب کو بخوبی سمجھنے کے لیے ضروری ہے، مثلاً انگریزی زبان کے متعلق بھی یہی چیز کہی جا سکتی ہے۔ مگر موجودہ زندگی کی ضرورتیں اور ہمارے عام علمی مسائل آج کل اس قدر نئے ہیں کہ قدیم اقتباسات اور پرانے حوالوں کی ضرورت نسبتاً کم ہی پیش آتی ہے۔ ایک غیر ملکی انگریزی دان جو قدیم انگریزی ادب سے بے خبر ہے، غالباً بعض تلمیحات کو سمجھنے سے قاصر رہے گا۔ مگر خود کئی پڑھے لکھے انگریزوں کی بھی یہی حالت ہے۔ السنہ شرقیہ کے بارے میں جب ہم یہ بات پیش نظر رکھتے ہیں کہ قدیم اور جدید ادب کا ثقافتی پس منظر بالکل الگ الگ ہے تو یہ نتیجہ بالکل قدرتی معلوم ہوتا ہے کہ ان زبانوں کے ادب جدید سے لطف اندوز ہونے کے لیے ادب قدیم میں مہارت پیدا کرنا لازمی نہیں۔

اب رہا یہ سوال کہ آیا قدیم عربی ادب میں مہارت رکھنے والے لوگ آسانی سے جدید ادب میں دسترس پیدا کر سکتے ہیں۔ بظاہر اس سوال کا جواب اثبات میں نظر آئے گا۔ کیوں کہ صرف و نحو کے اصول قدیم و جدید ادب ہر دو کے لیے یکساں ہیں۔ مگر قدیم ادب کے طالب علم کو جدید ادب میں قدم رکھتے ہی دو دقتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ یعنی غیر مانوس زبان و محاورہ اور غیر مانوس ثقافت، اور ان دو دقتوں پر عربی جیسی زبان میں قابو پانا ایک اوسط درجے کے طالب کے لیے آسان نہیں۔

قدیم اور جدید عربی زبان میں الفاظ و محاورات اور ثقافتی پس منظر کے اعتبار سے جو تفاوت ہے اس کا کچھ اندازہ اس واقعہ سے ہو جائے گا کہ کچھ سال ہوئے ایک مشہور ہندوستانی عالم مصر میں گئے۔ موصوف قدیم عربی کے بہت بلند پایہ عالم تھے۔ ایک مجمع میں انہوں نے اپنے خیالات کا اظہار عربی زبان میں فرمایا۔ حاضرین خاموشی سے ان کا منہ تکتے رہے اور خاتمہ کلام پر ایک مصری ترجمان نے ان کو مولانا کے خیالات سے آگاہ کیا۔

ان تصریحات کے بعد غالباً اب اس امر کو دہرانے کی ضرورت نہیں کہ قدیم و جدید عربی ادب تقریباً تقریباً دو جداگانہ چیزیں ہیں، اور ان میں سے ایک کا اکتساب خود بخود دوسرے کے لیے راستہ ہموار نہیں کرتا، تقریباً یہی حالت فارسی کی ہے۔ ترکی زبان میں ادب قدیم اور ادب جدید کا ایک دوسرے سے بُعد اور بھی زیادہ ہے۔ کیوں کہ جدید ترکی زبان سے عربی الفاظ بڑی حد تک خارج کیے جا چکے ہیں، اور صرف یہی نہیں بلکہ اب رسم الخط لاطینی ہے، جبکہ پہلے ترکی زبان عربی رسم الخط میں لکھی جاتی تھی۔

ستان میں عربی، فارسی کی تدریس

ہمارے مدارس میں عربی فارسی کی تدریس برطانوی عہد سے چلی آرہی ہے اور اب تک بہت کچھ پرانی نہج پر
ن ہے۔ انگریز جب اس برعظیم میں آئے تو فارسی سارے ملک کی سرکاری اور دفتری زبان تھی اور عربی
یہ اور علمی زبان۔ نئے حکمرانوں نے سرکاری اور علمی زبان تو انگریزی کو قرار دیا۔ مگر صدیوں کی روایات کے پیش نظر
ور فارسی کو مدارس میں ایک غیر اہم اور مبہم سا مقام دے رکھا اور یہ صورت اب تک باقی ہے۔

اس وقت ہمیں ان زبانوں کی تدریس کے متعلق کوئی واضح نصب العین پیش نظر رکھنا چاہیے۔ عربی اور فارسی
ہمارے بیش بہا مذہبی علوم کی حامل ہیں۔ پاکستان کو اس اسلامی میراث سے جو تعلق ہے اس کو یہاں دہرانے
ورت نہیں۔ اگر پاکستانی مدارس میں عربی اور فارسی کی تدریس سے غایت صرف اسی قدر ہے کہ ہمارا پڑھا لکھا
اسلام کے ان علمی خزانوں تک براہ راست دست گاہ رکھ سکے تو اس کے لیے صرف قدیم عربی اور قدیم فارسی
ریس کافی ہوگی۔ مگر اس کے لیے یہ شرط لازمی ہے کہ چار پانچ سالہ نصاب کے بعد طالب علم میں اتنی استعداد پیدا ہو جائے
کم سے کم قرآن اور احادیث کی عبارتوں کو آسانی سے سمجھنے کے قابل ہو جائے۔

کیا آج ہمارے ہاں السنہ شرقیہ کی تدریس سے یہ غایت پوری ہو رہی ہے؟ اس سوال کا جواب صاف
میں ہے۔ میٹرک تو درکنار ہمارے ہاں جو طالب علم بی۔ اے تک عربی پڑھتے ہیں ان کی بھی یہ کیفیت ہے،
فرہ درسی کتابوں کو رٹ لیتے ہیں۔ ان سے باہر کوئی عبارت سامنے آجائے تو لبس کر دے۔ ظاہر ہے کہ
ے ہاں السنہ شرقیہ کی تدریس طلبا کو قدیم ادب پر کچھ قدرت نہیں دیتی۔

شاید یہاں یہ خیال کیا جائے کہ ہمارے مدارس جدید عربی ادب کی تعلیم دیتے ہیں۔ اس لیے طلبہ قدیم
ب میں کوئی دسترس پیدا نہیں کر سکتے۔ اس قسم کی کوئی بات نہیں۔ انگریز نے محض ایک رسم کو زندہ رکھنے کے لیے
اور فارسی کی تدریس کو برائے نام زندہ رکھا تھا، اور ہم آج تک اسی لکیر کو پیٹے جا رہے ہیں۔ ہمارے اکثر
لب علم کئی سال تک عربی اور فارسی پڑھنے کے بعد بھی ان زبانوں کے قدیم و جدید ادب سے اس طرح
بے خبر رہتے ہیں، جس طرح یہ زبانیں نہ پڑھنے والے طالب علم۔

اری موجودہ ضرورت:۔ آج پاکستان کو دنیا کی اہم ترین اسلامی حکومت ہونے کی حیثیت سے نہ صرف

سلام کی بیش قیمت علمی میراث کی حفاظت کرتا ہے۔ بلکہ اسے زندگی کے اکثر شعبوں میں اسلامی دنیا کو رہنمائی کے فرائض بھی سرانجام دیتے ہیں۔ اول الذکر فرض کی بجاآوری کے لیے ضروری ہے کہ عوام کو اسلام کی علمی میراث سے روشناس کرایا جائے س کی زیادہ قابل عمل صورت تو یہی ہو گی کہ ان علمی خزانوں کے تراجم اور تلخیصات اردو زبان میں آسانی سے دستیاب ہو جائیں۔ کیوں کہ عوام کو قدیم عربی اور فارسی ادب سے براہ راست روشناس کرانا، ایک ایسا نصب العین ہے جو گو دلکش ہے، مگر قابل عمل نہیں۔ ہمارے مدارس کا سالہاسال کا تجربہ ہمارے سامنے ہے۔ اس پرانے نام تدریس سنہ شرقیہ سے یہ بدرجہا بہتر ہو تا کہ یہی وقت قدیم شاہکاروں کے تراجم کا مطالعہ کرتے میں صرف کیا جاتا۔ تاکہ طلبا کو سلام کی حقیقی روح سے کچھ تو آگاہی ہو جاتی۔

دوسرا نصب العین ہماری آزاد زندگی کے نئے تقاضوں میں سے ایک ہے، دنیائے اسلام مدت سے دنیا کی استعماری ریشہ دوانیوں کا مرکز بنی چلی آرہی ہے۔ یہ صورت حال اب ناقابل برداشت ہے مگر اس کے خاتمہ کی واحد صورت یہی ہے کہ مشرق وسطیٰ کے اسلامی ممالک اپنے جغرافیائی قرب کا فائدہ ٹھا کر ایک مضبوط اسلامی بلاک قائم کریں جو اغیار کی چالوں کا موثر جواب دے سکے، اس حقیقت کا احساس اب دنیائے اسلام میں بڑی شدت سے کیا جارہا ہے۔ چوں کہ پاکستان مادی ذرائع کے لحاظ سے مشرق وسطیٰ کا سب سے بڑا اور سب سے اہم اسلامی ملک ہے، اس لیے لامحالہ بین الاسلامی معاملات میں رہنمائی کے فرائض اسی کو نجام دینے ہوں گے۔

اس فرض کو پورا کرنے کے لیے ہمیں تمام عرب ممالک ایران اور ترکی کے ساتھ محبت کے رشتے استوار کرنے ہوں گے، یہ درست ہے کہ مذہب کا قوی رشتہ ہمارے اور ان کے درمیان پہلے سے موجود ہے۔ مگر اس کے ساتھ ہی ساتھ معاشی۔ ثقافتی اور دوسرے روابط بھی قائم کرنے ضروری ہیں اور ان گوناگوں رشتوں کو مستحکم کرنے کے لیے جدید عربی، فارسی اور ترکی زبانوں کی عام واقفیت ضروری ہے۔

اس نقطۂ نگاہ سے جدید عربی اور فارسی کی اہمیت بہت زیادہ ہو جاتی ہے۔ اب تک یہ زبانیں ہمارے مدرسوں میں بطور مردہ زبانوں کے پڑھائی جاتی رہی ہیں۔ مگر اس تدریس سے کوئی خاطر خواہ فوائد حاصل نہیں ہوئے ج بین الاقوامی سیاست اور ہماری قومی زندگی کے تقاضے ہمیں اس بات پر مجبور کر رہے ہیں کہ مشرق وسطیٰ کے

تمام اسلامی ممالک یک جان وحدت کی صورت اختیار کرلیں۔ اگر وہ ایسا نہیں کریں گے تو ان سب کی قومی بقا مستقل طور پر خطرے میں رہے گی، پاکستان کو مغربی استعمار کے علاوہ ایک پُرفن ایشیائی ہمسایہ کا خطرہ بھی ہر وقت لاحق ہے۔ اس لیے یہ امر ہمارے لیے خاص طور پر زندگی اور موت کا سوال ہے۔ اگر اسلامی ممالک مشترکہ بچاؤ کے لیے ایک مشترک لائحہ عمل کو اختیار نہیں کریں گے تو ان سب کی ہستی خطرے میں رہے گی۔

اس دفاعی مسئلہ کے علاوہ پاکستان کی معاشی زندگی کی نشو و نما کا سوال بھی اہم ہے۔ آج حالت یہ ہے کہ جو ممالک معاشی طور پر سربلند نہیں وہ سیاسی طور پر بھی کسی شمار و قطار میں نہیں۔ پاکستان کے قدرتی ذرائع لامحدود اور گوناگوں ہیں۔ مگر ملک کی صنعتی ترقی کے لیے غیر ملکی منڈیاں ازبس لازمی ہیں۔ مشرق وسطیٰ کے ممالک آج یورپی اور ہندوستانی مصنوعات کی کھپت کے لیے اہم منڈیاں ہیں۔ دشمن کے سیاسی غلبہ کو توڑنے کے لیے ضروری ہے کہ اس کی اقتصادی قوت کو کمزور کیا جائے۔ پاکستان مشرق وسطیٰ کی منڈیوں پر قبضہ کرکے مغربی اور ہندوستانی سرمایہ داری پر ایک ضرب کاری لگا سکتا ہے۔

خاتمہ کلام

اس مختصر بحث سے یہ بات صاف ہو گئی کہ مشرق وسطیٰ کے اسلامی ممالک اور پاکستان کے درمیان جو مذہبی اور جغرافیائی قرب موجود ہے اس کو زیادہ مستحکم بنانا اور اسے معاشی اور ثقافتی وحدت کی بنا قرار دینا نہ صرف پاکستان بلکہ اسلام کی سربلندی کے لیے کس قدر ضروری ہے۔ ان باہمی رشتوں کو قائم کرنے اور ترقی دینے کے لیے ضروری ہے کہ پاکستان میں ان ممالک کی زبان جاننے والے لوگ زیادہ سے زیادہ تعداد میں موجود ہوں کیوں کہ لسانی وحدت باہمی قرب کا غالباً سب سے بڑا ذریعہ ہوا کرتا ہے۔ پس جدید عربی اور جدید فارسی کی تدریس کا انتظام موثر طریق پر ہونا چاہیے۔

آج کل ہمارے مدارس میں عربی اور فارسی زبانیں جس ڈھنگ پر پڑھائی جاتی ہیں وہ بالکل بے کار ہے جدید عربی اور فارسی زندہ زبانیں ہیں جو جدید علوم و فنون کو ادا کرنے کی پوری صلاحیت رکھتی ہیں۔ ہماری قومی زبان اردو کی ترقی کا مدار بہت کچھ ان زبانوں کی وسیع دامنی پر ہے۔ پس کوئی وجہ نہیں کہ ہمارے مدارس میں عربی اور فارسی زبانیں بالکل اسی طریق پر نہ پڑھائی جائیں جس طرح انگریزی پڑھائی جاتی ہے۔ یہ اصلاح نہایت ضروری ہے، تاکہ پڑھے لکھے

پاکستانی ہمسایہ اسلامی ممالک کی زبان میں بات چیت کرنے کی صلاحیت پیدا کر سکیں، جس طرح کہ اکثر انگریزی خواں انگریزی زبان میں بات چیت کر سکتے ہیں۔ بلکہ ہمارے لیے یہ ضرورت زیادہ حقیقی اور زیادہ شدید ہے۔ اب جبکہ ہمارے مڈل سکولوں میں انگریزی اور السنہ شرقیہ کو تقریباً یکساں توجہ کا مستحق سمجھا جا چکا ہے، اس امر کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ کیوں ہمارے طلبہ عربی اور فارسی میں بھی کم از کم اتنی استعداد نہ پیدا کر لیں جتنی کہ وہ انگریزی زبان میں پیدا کرتے ہیں۔

شہریت کی تدریس

ادریس احمد

موجودہ نصاب میں شہریت بطور ایک مضمون کے مڈل جماعتوں میں پڑھائی جانے لگی ہے، چونکہ پڑھانے والے اساتذہ نے خود یہ مضمون زمانہ طالب علمی میں نہیں پڑھا، اس لیے شاید بعض کو اس کی صحیح اہمیت کا اندازہ نہ ہو۔ مدرسہ میں ایسے اساتذہ کی بھی کمی نہیں جو شہریت کی کتاب کو اردو کی درسی کتاب کا ہی ایک جزو سمجھتے ہیں اور اسے بالکل اسی طرز پر پڑھا دیتے ہیں۔ اس مختصر سی صحبت میں شہریت کو بطور ایک مستقل مضمون کے پڑھانے کی ضرورت اور اس کے طریق تدریس پر ایک سرسری نگاہ ڈالی جائے گی۔

اہمیت:۔ جدید برق رفتار دور میں معاشری زندگی کی گتھیاں کچھ اس طور پر الجھ گئی ہیں کہ ایک معمولی پڑھا لکھا شخص بھی اکثر اوقات ان کو سمجھنے سے عاجز آجاتا ہے۔ عصر حاضر کی میکانکی ایجادوں اور جدید ذرائع رسل و رسائل نے اجتماعی زندگی کی حدود کو بہت وسعت دے دی ہے، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ پہلے جو امور مقامی طور پر طے پاتے تھے اب ان کی باگ ڈور کسی دور دراز مرکز کے ہاتھوں میں ہے۔ یہ درست ہے کہ یہ مرکزی ادارے مقامی شاخوں کی وساطت سے اپنا کام چلاتے ہیں۔ مگر چونکہ ان کا مرکزِ اعصاب عوام کی نگاہوں سے اوجھل رہتا ہے، اس لیے ان کا طریق کار اکثر لوگوں کے لیے ایک چیستان بن کر رہ جاتا ہے۔

مرکزیت کے اس رجحان کا ایک نتیجہ یہ بھی ہے کہ جدید حکومتیں معاشری زندگی میں دن بدن زیادہ سے زیادہ دخل دینے لگی ہیں اس کی وجہ یہ نہیں کہ حکومتیں افراد کو بے بس کر دینا چاہتی ہیں، بلکہ اصل بات یہ ہے کہ جدید زندگی کا میلانِ مرکزیت اس قدر قوی ہے کہ اگر حکومت اجتماعی زندگی کو اپنے حال پر چھوڑ دے تو اجتماعی امور کا تسلط لامحالہ بعض افراد یا جماعتوں کے ہاتھوں میں چلا جائے، جو غالباً ذاتی مفاد کی خاطر عام شہریوں کے مفاد کی پرواہ نہیں کریں گے۔ پس عوام کا مفاد اسی میں ہے کہ حکومت ایسے معاشری امور کا بندوبست خود اپنے ہاتھوں میں لے لے۔ ظاہر ہے کہ معاشری زندگی میں جدید ریاستوں کی روز افزوں دخل اندازی ایک اضطراری ضرورت ہے۔

یہ چیز انفرادی آزادی پر حملہ نہیں بلکہ انفرادی آزادی کی ضامن ہے۔ مگر اس سلسلے میں بڑی دقت یہ ہے کہ چونکہ اکثر اجتماعی امور سرکاری ہاتھوں میں ہوتے ہیں، اس لیے عوام ان کے نظام کار سے بے خبر رہتے ہیں۔ یہ بے خبری ایک با معنی شہریت کے لیے بہت بڑا خطرہ ہے۔ اگر کسی ملک کے اچھے خاصے فہمیدہ لوگ بھی اپنی اجتماعی زندگی کے سررشتہ کار سے ناواقف رہیں تو اس ملک کو اپنے مستقبل کے متعلق فکر کرنی چاہیے۔ کیوں کہ انجام کار ملکی نظم ونسق کی ذمہ داری ملک کے فہمیدہ طبقہ پر ہی عائد ہوا کرتی ہے۔ یہ احساس سب سے پہلے امریکہ میں پیدا ہوا اور امریکی مدرسوں میں معاشری علوم کے نام سے ایک نیا مضمون داخل نصاب کیا گیا جس کا مقصد مستقبل کے شہریوں کو اجتماعی زندگی کے سارے نظام کار سے آگاہ کرنا تھا۔ انگلستان میں شہریت کو بطور ایک الگ مضمون کے کبھی نہیں پڑھایا گیا؛ تاہم یہ ضرور ہے کہ تاریخ علم ادب، جغرافیہ، اور اس قسم کے دوسرے معاشری علوم کے ضمن میں شہریت کی تعلیم بھی دی جاتی رہی ہے۔ ۱۹۴۴ء کے برطانوی قانون تعلیم میں پہلی بار بالغوں کی تعلیم دینے کے سلسلے میں شہریت کی تدریس کا ذکر کیا گیا اور کہا گیا کہ بالغوں کو تعلیم جاری رکھنے کی سہولتیں بہم پہنچاتے وقت اس بات کا خاص خیال رکھنا چاہیے کہ وہ شہریت کے حقوق و فرائض سے اچھی طرح آگاہ ہو جائیں۔

پاکستان میں شہریت کی تدریس ایک اہم قومی ضرورت ہے۔ ہماری اجتماعی زندگی مدتوں اغیار کے ہاتھوں میں رہی ہے، اس عہد غلامی میں نہ ہمیں حقوق میسر تھے اور نہ فرائض کا کچھ احساس تھا۔ اس صورت حال کا لازمی نتیجہ ہماری اجتماعی زندگی کی غیر صحت مندی کی شکل میں نکلا۔ ہم ذاتی طور پر لاکھ اچھے ہوں لیکن اجتماعی زندگی کے ضبط سے بالکل ناآشنا ہیں۔ گلیوں اور بازاروں کی غلاظت اور سٹیشنوں پر ہجوم بے تمیز کا کے جو نمونے اکثر دیکھے جاتے ہیں وہ ہمارے جذبۂ شہریت کے غیر صحت مند ہونے کا کھلا ہوا ثبوت ہیں۔ اس قابل افسوس صورت حال کی اصلاح اس طرح ہو سکتی ہے کہ نئی پود کو نہ صرف ان کے شہری حقوق سے باخبر کیا جائے بلکہ ان کے دلوں میں اپنی ذمہ داریوں کا بھی شدید احساس پیدا کیا جائے۔ ہمارے مدارس میں شہریت کی تدریس کی یہی سب سے بڑی غایت ہے۔

استاد کی تعلیمی قابلیت:۔ اوپر کی بحث سے یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ شہریت کے احاطے میں موجودہ معاشری زندگی کی پوری وسعت آ جائے گی، اس لیے اسے کامیابی کے ساتھ پڑھانے کے لیے خود استاد کو تمام

مشرقی علوم سے کچھ نہ کچھ آگاہی ضروری ہے۔ اسے نہ صرف ملک کی سیاسی ہیئت اور انتظامی اداروں کا پورا علم ہونا چاہیے، بلکہ ان کے تدریجی ارتقا کی سب منزلوں سے بھی واقف ہونا چاہیے۔ مزید برآں آجکل بین الاقوامی حالات میں اور قوموں کی زندگیوں کو جس طرح متاثر کرتے ہیں، اس کا تقاضہ یہ ہے کہ استاد بین الاقوامی معاملات سے بھی آگاہی رکھے۔ ان علمی اور ذہنی صلاحیتوں کو پیدا کرنے کے لیے استاد کو تاریخ، جغرافیہ، معاشیات، سیاسیات اور عمرانیات جیسے معاشری علوم پر کافی نگاہ ہونی چاہیے۔ جب تک اس میں یہ تعلیمی قابلیت موجود نہ ہوگی، اس وقت تک وہ شہریت کو کامیابی کے ساتھ نہ پڑھا سکے گا۔

طریق تدریس :— اب غالباً اس بات کو دہرانے کی ضرورت نہیں کہ تدریس شہریت کی تمام تر غایت عملی زندگی کی اس طور پر تربیت دینا ہے کہ طالب علم معاشرے کا ایک نہایت کارآمد رکن بن سکے اور خود بھی ایک پرمعنی انفرادیت کا حامل بن جائے۔ پس شہریت کے اسباق میں عملی نظریوں اور نظری بحثوں کے لیے کوئی گنجائش نہیں۔ ان اسباق میں قدم قدم پر عملی زندگی اور روزمرہ کے واقعات کی وضاحت کی جائے گی۔ ان میں آغاز بھی گردوپیش کی زندگی سے ہوگا اور انجام بھی اسی پر۔ شہریت کا خواہ کوئی موضوع زیرنظر ہو، استاد اسے بڑی آسانی کے ساتھ حالات حاضرہ کے ساتھ تعلق دے سکتا ہے۔ فرض کیجیے کہ مقامی طور پر میونسپل کمیٹی یا ڈسٹرکٹ بورڈ کے انتخابات کا ہنگامہ برپا ہے، استاد اس فوری مرکز توجہ سے پیش قدمی کرتا ہوا نہ صرف لوکل سلف گورنمنٹ بلکہ صوبائی اور مرکزی آئین ساز مجلس کی تشکیل اور ان کے طریق کار کی تشریح کر سکتا ہے۔

گردوپیش کی زندگی کے ساتھ پوری واقفیت دلانے کے علاوہ تدریس شہریت کی ایک اہم غایت اچھے شہری اوصاف پیدا کرنا بھی ہے۔ تاکہ مستقبل کے شہری معاشرہ کے لیے زیادہ سے زیادہ مفید ثابت ہوں یہ وصف محض کمرہ جماعت کے اسباق سے پیدا نہ ہوگا۔ بلکہ اس کے لیے عملی تربیت ایک ضروری شرط ہے۔ آپ ہمسائیوں اور اہل وطن کے حقوق کو لاکھ ذہن نشین کرائیں جب تک طلبہ کسی پرخلوص مثال کی رہنمائی میں یہ کام عملاً سرانجام نہیں دیتے، نہ تو ان کے خوابیدہ جذبات ہمدردی جاگ سکیں گے۔ اور نہ ہی انہیں ان کاموں کو وسیع پیمانہ پر ہاتھ میں لینے کی تربیت ملے گی۔ یہ نمونے کی مثال کونسی ہو، اور یہ عملی کام کے مواقع کس طرح فراہم کیے جائیں؟

غالباً اس سے کسی کو اختلاف نہ ہوگا کہ نمونہ عمل خود استاد کو ہی پیش کرنا ہوگا۔ رہے عملی تربیت کے مواقع تو پاکستان جیسے افلاک زدہ اور پسماندہ ملک میں ان کی کمی نہیں۔ ہمارے ہاں طبی امداد کا کس قدر قحط ہے۔ برسات کے موسم میں جب موسمی بخار وطنوں پر ہوتا ہے تو اکثر قصبوں اور دیہات میں سینکڑوں بیمار ایسے ہوتے ہیں جن کو پوچھنے والا کوئی نہیں ہوتا۔ حکومت کی طرف سے کونین بھی مفت بہم پہنچائی جاتی ہے۔ مگر اس مفت کونین کو ضرورت مندوں تک پہنچانا کوئی سہل کام نہیں۔ ان دنوں میں ہمارے مدرسے عموماً تعطیلِ گرما کے لیے بند ہوتے ہیں۔ اگر ہر مدرسہ ان چھٹیوں کی فرصت سے فائدہ اٹھا کر ملیریا کے بیماروں تک کونین پہنچانے اور انہیں مناسب ہدایات دینے کی مہم کا بندوبست کرے تو اس سے نہ صرف گرد و نواح کے علاقے کی ایک قیمتی خدمت انجام پا جائے، بلکہ طلبہ کو خدمتِ خلق اور اجتماعی کام کی انجام دہی کا ایسا اچھا تجربہ ہو جائے جو شاید قدر و قیمت میں ان کی ساری تعلیم سے بھی بڑھ جائے۔ مگر اس کام کو منظم کرنے اور اس کو خاطر خواہ پایہ تکمیل تک پہنچانے والی قوت استاد کا جذبہ خلوص اور اس کا جوشِ عمل ہوگا، جب تک یہ قوت متحرکِ عمل میں نہیں آتی اس قسم کی کارروائیاں نمائشی حدود سے آگے نہیں بڑھ سکتیں۔

ملیریا کے انسداد کی مثال صرف نمونہ کے طور پر لی گئی ہے، ورنہ ہماری معاشرتی زندگی میں ایسی خدمت کے موقعوں کی کمی نہیں۔ ناخواندگی اور جہالت کو دور کرنے کے لیے اسی طرح جماعتی کام منظم کیا جا سکتا ہے۔ ابھی پچھلے دنوں انڈونیشیا کے طالب علموں نے اس سلسلہ میں جو کام کیا ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔ بہت سے نوجوان طلبہ نے اپنی خدمات رضاکارانہ طور پر اس کام کے لیے پیش کی تھیں۔ یہ طالب علم دن کے وقت بالغوں کی تعلیم میں لگے رہتے تھے اور رات کے وقت اپنے ساتھیوں سے دن کا آموختہ سیکھ لیتے تھے۔ اس طرح حفظانِ صحت کے متعلق بھی ہمارے ہاں بہت کام ہو سکتا ہے۔ اس کے علاوہ آئے دن بعض ناگہانی قومی ضرورتیں ایسی خدمت کے بہت اچھے موقعے پیدا کرتی رہتی ہیں۔

آج دنیا میں یہ احساس زور پکڑ رہا ہے کہ تعلیم کو زندگی کا ساتھ دینا چاہیے۔ ایک تعلیم یافتہ آدمی وہ ہے جو زندگی کے تقاضوں کو اچھی طرح سمجھتا ہے اور معاشرے کے لیے منبعِ فیض ہے۔ بنابریں تربیت کی تدریس کو ہر وقت بطور نصب العین پیش نگاہ رکھنا ہوگا، اور اپنی کامیابی کا اندازہ اسی کی روشنی میں کرنا ہوگا ◆

...ند و تبصرہ

...حیفہ"

یہ سہ ماہی رسالہ "مجلس ترقی ادب" ۲ - نرسنگھ داس گارڈن - کلب روڈ لاہور کی تازہ ترین ...لیشن ہے۔ مجلس ترقی ادب، ایک نیم سرکاری ادارہ ہے جس کا مقصد صحت مند ادب کی ترویج و اشاعت ... - سہ ماہی مجلہ "صحیفہ" اس مطلب کے لیے جاری کیا گیا ہے، کہ ہر مکتبۂ خیال کے ادیبوں، انشا پردازوں اور ...عروں کی صحت مند نگارشات باقاعدگی سے ملک کے سامنے پیش کی جائیں۔

صحیفہ کا پہلا شمارہ اس مقصد میں بہت اچھی طرح کامیاب ہے۔ زیرِ نظر شمارے میں جن ادیبوں ...ر شاعروں کی نگارشات شامل ہیں وہ تقریباً سب کے سب قدیم و جدید دونوں راستوں سے ہٹ کر ایک ...ی روش نکالنے کے حامی اور ماضی و حال کی کوششوں سے واقف ہیں، اس شمارے میں متعدد افسانے ...غالے۔ مزاحیہ مضامین۔ ڈرامے، غزلیں اور نظمیں پیش کی گئی ہیں۔ غرض یہ رسالہ جدید اردو ادب کی ایک ...صحت مند تصویر ہے۔ ان معنوی محاسن کے ساتھ رسالے کی ظاہری شکل و صورت بھی نہایت دیدہ زیب ہے۔

...خامت ۲۶۰ صفحات   زرِ سالانہ دس روپے   فی شمارہ تین روپے صرف

...عارف فلسفۂ جدید

مصنف - سی - ای - ایم - جوڈ   ترجمہ خواجہ افتخار حسین۔

ناشر - مجلس ترقی ادب ۲ - نرسنگھ داس گارڈن، کلب روڈ - لاہور۔

ضخامت ۱۷۲ صفحات   قیمت دو روپے۔

سی - ای - ایم - جوڈ دورِ حاضر کے ان برطانوی مصنفوں میں سے ہے جنہوں نے دقیق علمی ...نکات کو آسان پیرائے اور عام فہم زبان میں پیش کیا ہے۔ "انٹروڈکشن ٹو ماڈرن فلاسفی" اسی قسم کی ایک ...کتاب ہے جو آکسفورڈ یونیورسٹی پریس لندن کی شائع کردہ ہے۔ ایک چھوٹی سی کتاب میں جوڈ نے جدید فلسفے ...سے دقیق موضوع پر بڑے جامع اور موثر انداز میں بحث کی ہے۔ جوڈ کا بڑا کمال یہ ہے کہ اس نے بڑی حد تک

فنی اصلاحات کی الجھنوں سے دامن بچاکر جدید فلسفے کے اہم پہلوؤں کو ایسی مختصر اور عام فہم زبان میں پیش کیا ہے جسے ہر پڑھا لکھا آدمی آسانی سے سمجھ لے۔

فلسفیانہ عقائد نے ہر دور کے فکر کو متاثر کیا ہے، اس لیے یہ ضروری ہے کہ دور حاضر کے فکری مضمون سے ہر پڑھا لکھا آدمی باخبر ہو۔ مجلس ترقی ادب نے جوڈ کی کتاب کا یہ ترجمہ پیش کر کے اردو خواں طبقہ کی ایک ضرورت کو پورا کر دیا ہے۔

"دی لائف اینڈ تھوٹ آف رومی"

مصنفہ افضل اقبال

ناشر:- بزم اقبال ۲- نرسنگھ داس گارڈن۔ کلب روڈ۔ لاہور

ضخامت ۱۸۰ صفحات۔ قیمت چار روپے۔

مولانا رومی کا نام اسلامی دنیا کے گوشے گوشے میں لیا جاتا ہے۔ وہ دنیا کے ان معدودے چند آتش نوا شاعروں میں سے ہیں، جن کی پُرخلوص آتش بیانی نے نہ صرف اپنے ہم عصروں کی روحوں کو گرمایا بلکہ دنیا کی فکری تاریخ میں اپنا ایک مستقل اثر چھوڑا۔

پچھلی سات صدیوں میں مولانا رومی کی شاعری، ان کے فلسفہ اور ان کی شخصیت پر بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ مگر یہ ایک عجیب بات ہے کہ اب تک کوئی ایسی قابل ذکر کتاب موجود نہ تھی جس میں مولانا کی سیرت اور ان کے کارناموں کو اختصار اور جامعیت کے ساتھ یکجا کر دیا گیا ہوتا۔ جناب افضل اقبال صاحب نے انگریزی زبان میں زیر نظر کتاب لکھ کر اس کمی کو پورا کر دیا ہے۔

فاضل مصنف نے کتاب لکھتے وقت نہ صرف اس سارے لٹریچر کو پیش نظر رکھا ہے جو اب تک مولانا رومی کے متعلق لکھا گیا ہے، بلکہ خود مولانا کی اپنی تصنیفات سے بھی پورا پورا استفادہ کیا ہے۔ پیر رومی کے فکر کا تجزیہ کرنے اور ان کی عظمت کا اندازہ کرنے میں پُرخلوص اور حساس جذبات سے کام لیا گیا ہے۔ غرض زیرنظر کتاب علمی دنیا میں ایک قابل قدر اضافہ ہے۔

مفید معلومات

وحدت مغربی پاکستان کی ترقی کا جائزہ

مغربی پاکستان کے متحدہ صوبے نے جمہوریہ کے پہلے سال میں ترقی کی صلاحیتوں کا کافی ثبوت فراہم کیا ہے۔ صوبائی نظم ونسق کے سامنے اب محض امن وامان قائم رکھنے کی بجائے، صوبائی وسائل سے استفادہ کرنے اور عوامی بہبود کے لیے اصلاحی کاموں کو ترقی دینے کا پروگرام ہے۔ اب وادی سندھ کے مختلف علاقے یکساں اور ہمہ گیر ترقی کے نئے دور میں داخل ہو چکے ہیں۔ غیر ترقی یافتہ علاقے اب خاص توجہ کے مرکز بن چکے ہیں، اور قدرتی وسائل کو اب ان تمام علاقوں کی بہبود کے لیے وسیع پیمانے پر استعمال کیا جائے گا۔

انضمام سے ایک سال پہلے مختلف انضمامی وحدتوں کے میزانیوں میں ایک کروڑ ۲ لاکھ روپے کا خسارہ دکھایا گیا تھا تاہم انضمام کے بعد سال ۱۹۵۶-۵۷ء کے ترمیم شدہ تخمینوں کے پہلے مالی سال کے متعلق یہ توقع کی گئی کہ یہ سال ۳ کروڑ ۵۰ لاکھ کی بچت پر اختتام پذیر ہوگا۔ آئندہ سال ۱۹۵۷-۵۸ء کے مالی بجٹ میں جس میں محاصل آمدنی ۴۹ کروڑ اور اخراجات محاصل ۴۳ اعشاریہ ۲۰ کروڑ دکھائے گئے ہیں، جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ موجودہ مالی سال کے ترمیم شدہ تخمینہ جات (محاصل آمدنی ۵۸ اعشاریہ ۸۶ کروڑ۔ اخراجات محاصل ۴۵ اعشاریہ ۹۳ کروڑ) کے مقابلہ میں مجموعی طور پر چودہ فی صد اضافہ ہوا ہے۔ آئندہ سال کے محاصل اخراجات سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس مد میں گذشتہ سال کے اخراجات میزانیہ کے مقابلہ میں چھ کروڑ روپے اور مالی سالِ رواں کے ترمیم شدہ تخمینہ جات میں دیے گئے۔ اخراجات محاصل سے آٹھ کروڑ اٹھائیس لاکھ کے لگ بھگ اضافہ ہوا ہے۔ اس کے علاوہ ٹیکسوں کی فراہمی سے متعلق مد کے اخراجات انضمام سے قبل کے اخراجات ۳ کروڑ ۱۰ لاکھ ۲۵ ہزار روپے سے گھٹ کر موجودہ مالی سال کے دوران ۲ کروڑ ۷ لاکھ ۴۹ ہزار روپے تک رہ گئے ہیں۔

رفاہی محکموں کے لیے جو رقوم مخصوص کی گئی ہیں، ان سے مجموعی میزانیہ محاصل کا ۲۴ فی صد اضافہ ظاہر ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ زراعت۔ پرورش حیوانات اور صنعت کے لیے مختص رقوم میں علی الترتیب ۲۳ فیصد

۷۲ فی صد اور ۳۵ فی صد اضافہ کیا گیا ہے ۔

وحدت مغربی پاکستان کے نئے انتظامی شعبوں کو جو عملی دشواریاں پیش آئیں انھیں دور کرنے کے لیے اور انتظامیہ کو بحیثیت مجموعی زیادہ بہتر بنانے کے لیے کئی ایک فیصلے کیے گئے ہیں اور انھیں عملی جامہ پہنایا جا رہا ہے، جن میں درج ذیل بھی شامل ہیں :-

(۱) ہر ملحقہ محکمہ کے افسر اعلیٰ کی فوری ضرورت کے لیے جداگانہ گنجائش کی فراہمی ۔

(۲) تجارتی اسلوب پر سیکرٹریٹ کی تشکیل نو۔ مختلف افسروں کے معاملات کے فوری تصفیہ کے سلسلے میں اختیارات کی تفویض ۔

(۳) انتظامیہ کے اخراجات میں کفایت کے لیے خاص ایجنسی کا قیام ۔

(۴) الف یا د بہ عنوانی کے موجودہ قوانین و ضوابط پر غور کرنے کے لیے عدالت عالیہ کے ایک جج کی صدارت میں ایک کمیٹی کے قیام کی تجویز ۔

(۵) صوبے بھر میں قوانین میں یکسانیت پیدا کرنا اور شرح محصولات کو ایک سطح پر لانا ۔

(۶) گز یٹڈ اور نان گزیٹڈ ملازمین کی تنخواہوں کی شرح کو مربوط کرنا ۔

(۷) عارضی عملہ کے ایک حصہ کو مستقل طور پر جذب کرنا ۔

غذائی صورت حال

گزشتہ سال کے دوران میں غذائی قلت کی وجہ سے نازک صورت حال پیدا ہو گئی تھی۔ نئے سال کے شروع میں حکومت کے پاس صرف پندرہ ہزار ٹن گندم باقی تھی۔ گندم کی فصل کے وقت نقل و حمل پر پابندیاں عائد کر دی گئیں۔ فاضل اناج کی قیمت بڑھ گئی جس کی وجہ جزوی طور پر یہ بھی تھی کہ فاضل اناج کے علاقوں کی ناکہ بندی کر دی گئی تھی۔ لہٰذا حکومت نے گندم کی نقل و حمل سے پابندی اٹھانے کے علاوہ لازمی فراہمی کے تحت بڑے بڑے زمینداروں سے گندم فراہم کرنی شروع کی اور اس طرح مزید تیرہ ہزار ٹن ہو گئی ۔

بہرحال یہ ظاہر تھا کہ مقامی طور پر فراہم شدہ گندم قلت کے علاقوں کے لیے تمام سال کافی نہیں ہو گی۔ چناں چہ مرکزی حکومت سے گندم درآمد کرنے کی درخواست کی گئی۔ مرکزی حکومت نے رواں غذائی سال کے

دوران میں ۱۹۵۶ء کے آخر تک درآمد شدہ تین لاکھ ۵۰ ہزار ٹن گندم میں سے ہمارے صوبے کو ایک لاکھ ۷۲ ہزار ٹن گندم مہیا کی۔

صوبے کے کسی حصے میں مکمل طور پر راشن نہیں ہے۔ تاہم راشن بندی کو اور زیادہ وسیع کرنا پڑا۔ ابتدا میں مشکل سے ایک درجن اہم شہر ایسے تھے، جہاں راشن جاری کیا گیا تھا۔ لیکن گندم کی قیمت میں اضافہ ہونے کی وجہ سے تمام ضلعی صدر مقاموں کے شہروں اور غذائی قلت کے علاقوں میں راشن کرنا پڑا۔ اس وقت راشن کے تحت علاقوں کی کل تعداد ایک سو سے زائد ہے ۔

زراعت

مغربی پاکستان کی اقتصادی ترقی کے ہر منصوبے میں زراعت کی خاص اہمیت ہے۔ ایسا صرف اس واسطے نہیں ہے کہ ملک کو خوراک میں خود کفیل رکھنے کے لیے اس کی اہمیت ہے ، بلکہ اس لیے بھی زراعت سے ہماری بڑھتی ہوئی صنعتوں کے لیے خام مال پیدا ہوتا ہے۔ اور ہماری بیرونی تجارت کی بنیاد اسی پر ہے فی ایکڑ پیداوار بڑھانے اور مزید رقبہ زیر کاشت لانے کی غرض سے ان اراضیات کو بحال کرنے کی کوششیں کی جارہی ہیں ، جو سیم زدہ اور شور ہیں، اور اناج کی فراہمی اور ذخیرہ کے لیے مناسب تدابیر پر عمل کیا جارہا ہے۔

گذشتہ سال کیمیائی طریق پر محفوظ کیا ہوا بیج اور کیمیائی کھاد رعایتی نرخوں پر تقسیم کیا گیا تھا۔ آبادکاروں کو مالیہ اراضی اور آبیانہ میں بعض رعائتوں کے علاوہ تقاوی قرضے دیے گئے تھے۔ نیز تخفیف شدہ کرائے پر ٹریکٹر مہیا کیے گئے تھے ۔

۵۸-۱۹۵۷ء کے بجٹ میں زراعت کی ترقی کے لیے چھ کروڑ ۸۷ لاکھ روپے رکھے گئے ہیں جبکہ ۵۷-۱۹۵۶ء کے دوران میں اس پر دو کروڑ ۳۹ لاکھ روپے صرف کیے گئے ہیں ۔ اس کے علاوہ زرعی ترقی کے منصوبوں کے لیے ستر لاکھ اور محکمہ زراعت کی نئی عمارات کی تعمیر کے لیے مزید ستر لاکھ روپے مخصوص کیے گئے ہیں۔

مویشی کی دولت : ۔ مویشیوں کے مرکزی فارموں کی ترقی کے ساتھ ساتھ حکومت کے تمام اہم شہروں میں

وودن بغیر گوشت کے مقرر کر دیے ہیں، اور صوبے میں مویشیوں کی دولت کو محفوظ کرنے کے لیے ان کی نقل و حمل اور برآمد پر پابندیاں عاید کر دی ہیں۔

مویشیوں کی متعدد بیماریوں کو کنٹرول کرنے کے لیے صوبے کو حیاتیاتی مصنوعات میں خود کفیل بنا دیا گیا ہے۔ بیماریوں کو کنٹرول کرنے کے کام نے معقول ترقی کی ہے، اور اب بیل روگ کا بالکل قلع قمع کر دیا گیا ہے، جو مویشیوں کی ایک بڑی تعداد کو تباہ کرتا تھا۔

مچھلی اور شکار

اندازہ لگایا گیا ہے کہ مغربی پاکستان میں تازہ آبی وسائل سے چودہ ہزار سات سو ٹن مچھلی فراہم کی جاتی ہے۔ پنجسالہ منصوبہ کے مطابق اس مقدار کے بائیس ہزار چھ سو ٹن تک پہنچ جانے کا امکان ہے، اور اس میں بھی مزید ترقی کی گنجائش ہے۔ ڈویژنل ترقیاتی بورڈوں کی حوصلہ افزائی اور مدد سے دیہات میں تالاب بنائے گئے ہیں جن میں مچھلیوں کی نئی نئی اقسام کی پرورش کی جا رہی ہے۔ اسی مقصد کے لیے حیدرآباد میں جھیل کینجھر کو استعمال کیا جا رہا ہے۔ کسی ملک کے جنگلی حیوانات صرف غیر ملکی سیاحوں کے لیے ہی دلچسپی کا باعث نہیں ہوتے، بلکہ وہ آمدنی کا ذریعہ اور خوراک کا ایک وسیلہ بھی ہوتے ہیں۔ اس لیے جنگلی حیوانات کی بہتری اور ختم ہونے والی انواع کو محفوظ کرنے کے لیے صوبے میں شکار کے لیے ممنوعہ علاقے مقرر کیے گئے ہیں، جن کا مجموعی رقبہ ۲۹۵،۳۷۰ ایکڑ ہے اور مزید ایسے علاقے مقرر کرنے کی تجاویز زیر غور ہیں۔

جنگلات

کسی ملک کی متوازن معیشت کے لیے ضروری ہے کہ ملک کا بیس سے پچیس فی صد رقبہ جنگلات پر مشتمل ہو۔ لہٰذا جنگلات کے موجودہ تین فی صد رقبہ کو بڑھانے پر زور دیا جا رہا ہے تاکہ جہاں تک ممکن ہو جلانے کے ایندھن اور عمارتی لکڑی کی شدید قلت پوری ہو سکے، جو انسان کی بنیادی ضروریات ہیں۔ مقصد کے حصول کے لیے قدرتی جنگلات کے وسائل کو ترقی دینے کی کوششیں تیز تر کر دی گئی ہیں۔ صوبہ کے مختلف حصوں میں بعض علاقے اس کام کے لیے منتخب کیے گئے ہیں، جن میں سے حسب ذیل قابل ذکر

ٹھٹھ ڈویژن کا ساحلی علاقہ۔ دادو اور لاڑکانہ کے اضلاع میں کوہستان کا علاقہ۔ علاقہ تھر میں راجستھان کا علاقہ۔ لانڈ براج کا علاقہ۔ غلام محمد براج کا علاقہ۔ گڈو براج کا علاقہ۔ ضلع میانوالی میں دان بھچراں اور سالٹ رینج کا علاقہ۔ اس کے علاوہ لاہور، ملتان، کوئٹہ اور ایبٹ آباد کے سرکلوں میں متعدد علاقے منتخب کیے گئے ہیں۔ اس طرح جنگلات کا کل رقبہ تقریباً بیس لاکھ ایکڑ ہو جائے گا۔

آبپاشی

نہروں سے سیراب رقبہ جو ۴۷-۱۹۴۶ء میں ایک کروڑ ۸ لاکھ ۴۷ ہزار ایکڑ پر مشتمل تھا۔ اب ۵۷-۱۹۵۶ء میں ۲ کروڑ ۳۵ لاکھ ۲۵ ہزار ایکڑ تک پہنچ گیا ہے، صوبے کے انضمام کے بعد زیر تبصرہ رقبہ میں ۵ لاکھ ۲۲ ہزار ایکڑ کا اضافہ ہوا ہے۔ آبپاشی کی وسیع سرگرمیوں کے پیش نظر ۵۸-۱۹۵۷ء میں اس امر کا امکان ہے کہ مجموعی رقبہ ۲ کروڑ ۴۳ لاکھ ۵۰ ہزار ایکڑ تک جا پہنچے گا۔ آبپاشی کے امور کے لیے میزانیہ میں ۴۱ کروڑ بیس لاکھ ۱۲ ہزار روپیہ کی رقم رکھی گئی ہے۔

آبپاشی کے موجودہ منصوبوں کی تکمیل کے سلسلے میں تیزی سے کام جاری ہے۔ گڈو براج جس کی بدولت خیرپور اور کوئٹہ کے ڈویژنوں میں ۳۲ لاکھ ایکڑ اراضی سیراب کی جائے گی جس کا سنگ بنیاد فروری میں رکھا گیا تھا۔ تونسہ براج کا کام تیزی سے جاری ہے، اور توقع ہے کہ یہ براج ۱۹۵۸ء کے اختتام تک پایۂ تکمیل کو پہنچ جائے گا۔ یہ دونوں براج دریائے سندھ پر واقع ہیں۔ اس کے علاوہ وارسک پراجیکٹ، کوٹری براج پراجیکٹ، کرم گڑھی پراجیکٹ۔ اضافی نہروں کا پراجیکٹ۔ نہری پانی (آبشاروں) کے ہائیڈل پراجیکٹ اور دیگر بارآور منصوبوں کی تکمیل کے سلسلے میں کام ہو رہا ہے۔ ان بڑے بڑے منصوبوں پر آبپاشی کے لیے ۲۲ کروڑ روپیہ کی مجموعی رقم کا بیشتر حصہ صرف کیا جائے گا۔

ان نئی سکیموں کے تحت کوئٹہ ڈویژن میں نل کنوؤں کی تعمیر کے لیے دس لاکھ روپے، قلات ڈویژن میں آبپاشی کی نہروں کی استر بندی کے لیے پانچ لاکھ روپے اور ڈیرہ اسمٰعیل خاں ڈویژن میں بندوں کی تعمیر کے لیے ۵ء۷ لاکھ روپے کی رقوم رکھی گئی ہیں۔ پچہتر لاکھ روپے کی ایک رقم سیم زدہ علاقوں میں پانی کی نکاسی کے لیے علیحدہ رکھی گئی ہے۔ اس مقصد کے لیے یہ ابتدائی رقم ہو گی۔ زیر زمین پانی کا جائزہ لینے سے متعلق

تنظیم اور آبپاشی کی بنیاد پر صوبے کے مختلف مقامات میں چھ سو تل کنوئیں لگوانے کے لیے ایک کروڑ روپے کی رقم رکھی گئی ہے۔

سیلابوں کی روک تھام کے سلسلہ میں مختلف تدابیر کے لیے کروڑ روپے کی مزید ایک رقم رکھی گئی ہے۔ اس کے علاوہ غیر ترقی یافتہ علاقوں میں آبپاشی کے نئے منصوبوں کے امکانات کی تحقیق کرنے پر پچاس لاکھ روپے خرچ کیے جائیں گے۔

نئی سڑکیں اور عمارتیں: ۔ ۱۹۵۲ء میں سڑکوں کی تعمیر کا ایک وسیع پنجسالہ پروگرام شروع کیا گیا تھا۔ جس کے تحت سابق صوبہ سرحد میں ۱۰۵۰ میل قیمتی نئی پختہ سڑکوں کی تعمیر اور موجودہ سڑکوں کی مرمت سابق پنجاب میں ۲۹۴ میل لمبی نئی سڑکوں کی تعمیر شامل تھی۔ اب یہ سکیم، جسے اکتوبر ۱۹۵۵ء میں یکجا کر دیا گیا تھا، تکمیل کے آخری مراحل میں ہے۔ سابق پنجاب میں آزادی سے اب تک ۲۳ ۵ میل لمبی اعلیٰ درجے کی نئی سڑکیں تعمیر ہو چکی ہیں، یہ لمبائی ان کل سڑکوں کی لمبائی کے نصف سے زائد ہے جو ۱۹۴۷ء میں موجود تھیں۔ سابق صوبہ سرحد کے دشوار گذار پہاڑی علاقوں میں تین سو ستر میل نئی نئی سڑکیں بن چکی ہیں۔ ایسا ہی اہم کام سندھ میں ہوا ہے۔ صوبے میں آٹھ ہزار پانچ سو ایک میل لمبی پختہ سڑکیں بھی تعمیر ہو چکی ہیں۔

سڑکوں کے اہم منصوبوں میں جو اس وقت زیر تعمیر ہیں حسب ذیل شامل ہیں۔

گڈو براج کے علاقے میں بائیس میل۔ پشاور ڈیرہ اسمٰعیل خان، کراچی کی ۹۸ میل لمبی شاہراہ۔ کراچی قلات، کوئٹہ کو ملانے والی ۵۳۰ میل لمبی سڑک۔ ایک سو اسّی میل لمبی کوئٹہ۔ لورالائی۔ ملتان روڈ۔ سابق پنجاب میں پانچ سو چالیس میل لمبی دیہاتی سڑکوں کی مرمت اور سابق سندھ میں ۵۵۰ میل لمبی دیہاتی سڑکوں کی مرمت۔

وہ اہم عمارات جو مکمل ہوئی ہیں حسب ذیل ہیں۔

ضلعی صدر مقاموں کے آٹھ ہسپتال۔ میو اور گنگا رام ہسپتال۔ لاہور کے بیرونی مریضوں کے بلاک دن یونٹ ہسپتال لاہور۔ سامی سینی ٹوریم مری۔ نشتر میڈیکل کالج اور ہسپتال ملتان (اس میں ایک دو ذیلی عمارات ابھی باقی ہیں) اور خیبر میڈیکل کالج پشاور (ہوسٹل ابھی تعمیر نہیں ہوا)

ایسی عمارات میں جن کی تعمیر کا کام جاری ہے زراعتی کالج۔ ٹنڈو جام۔ لائلپور اور پشاور میں ٹیکنیکل کالج کی مرمت کے ورک شاپ۔ لیاقت میڈیکل کالج جام شورو۔ ہائر سیکنڈری سکول گوجرانوالہ۔ شیخوپورہ۔ راولپنڈی اور جہلم۔ وقار النساء نون سکول راولپنڈی۔ دماغی امراض کا ہسپتال پشاور اور زیدہ اور مانگو کے ہسپتال شامل ہیں۔ سکھر۔ لاڑکانہ۔ ٹھٹھہ۔ جیکب آباد اور سجاول میں بھی ہسپتال زیر تعمیر ہیں۔

تین کروڑ روپے کی لاگت سے حیدر آباد میں پانی کی بہم رسانی اور گندے پانی کے نکاس کے منصوبے پر کام شروع کر دیا گیا ہے۔ دوسرے شہر جہاں اس قسم کے منصوبے زیر تعمیر ہیں، راولپنڈی، لائلپور اور ملتان ہیں۔ پانی کی بہم رسانی اور گندے آب و فضلاب کے نکاس کے لیے چھوٹے قصبات اور بڑے دیہات میں دو کروڑ روپے کی لاگت کے کئی منصوبے زیر تعمیر ہیں۔

راولپنڈی کے نزدیک سہالا میں ۸۸ لاکھ روپے کی لاگت سے ایک انجینئرنگ کالج تعمیر ہو رہا ہے جس میں رہائش کا انتظام بھی ہوگا۔ ایسا ہی کالج حیدر آباد میں تعمیر ہو رہا ہے۔

برقی اضافے:۔ مختلف یونٹوں کے انضمام کے ساتھ مختلف برقی سلسلوں کو منسلک کرنے کا کام اور بھی اہمیت اختیار کر گیا ہے۔ لہٰذا مغربی پاکستان کے لیے ایک مشترکہ برقی سلسلے کے قیام کا کام ان دنوں جاری ہے جو مختلف علاقوں کو عام استعمال کے لیے بھی کچھ بجلی مہیا کرے گا اور بجلی گھروں کو چلانے میں جو لاگت آتی ہے اس میں بھی اس سے بہت کافی کفایت ہوگی۔ سابق پنجاب اور سرحد کے برقی سلسلے تو منسلک کیے بھی جا چکے ہیں۔ چیچو کی ملیاں۔ گوجرانوالہ۔ شادیوال۔ خانکی اور کرم گڑھی کے چار پن بجلی کے منصوبے جو مجموعی طور پر ۵۰۰۰ کلو واٹ بجلی پیدا کریں گے، نہایت تیز رفتار سے زیر تعمیر ہیں۔

لائلپور کے قریب جو بجلی گھر پایۂ تکمیل کو پہنچا چاہتے ہیں ... ۱۹۵ کلو واٹ بجلی پیدا کریں گے ادھر منٹگمری میں تین تین ہزار کلو واٹ کے دو سٹیم سیٹوں میں سے ایک تو کام کر رہا ہے اور دوسرا جلد ہی تیار ہو کر چل پڑے گا، ...۷ کلو واٹ کا ایک اور سیٹ جو حال ہی میں ہندوستان سے لایا گیا ہے منٹگمری میں نصب کیا جائے گا۔

رسول ہائیڈل سکیم نے ایک قدم اور آگے بڑھایا ہے، اور اب ۱۲۰۰ نل کنوؤں کو بجلی مہیا

دی گئی ہے۔ تجویز یہ بھی ہے کہ ۲۸ شہروں کو بجلی مہیا کی جائے جن میں سے دس کو تو پوری طرح بجلی بہم پہنچ چکی ہے اور باقی ۱۸ کے بارے میں کام ہو رہا ہے۔

شاہدرہ کے بجلی گھر کی تجدید ہو رہی ہے اور ایک نئی مشین جو ۱۰۰۰۰ کلوواٹ بجلی پیدا کرے گی نصب کی جا رہی ہے ۔ سابق صوبہ سرحد میں اب ۳۴ شہر اور ۷۶۲ دیہات میں بجلی پہنچ چکی ہے۔ آزاد کشمیر کو بجلی مہیا کر دی گئی ہے، اور اس علاقہ میں مزید دیہات کو بجلی فراہم کی جا رہی ہے۔ بنوں اور ڈیرہ اسمٰعیل خاں میں اے سی کی جگہ ڈی سی، بجلی مہیا کر دی گئی ہے۔ بجلی کی ایک سکیم جو شورو نزد حیدرآباد اور سکھر میں بجلی پیدا کرنے سے متعلق ہے، جس کے مطابق ان مقامات سے علی الترتیب ۱۵۰۰۰ کلوواٹ بجلی پیدا کی جائیگی جس سے آٹھ چھوٹے بڑے شہروں اور متعدد دیہات کو بجلی مہیا ہو گی۔ سابق صوبہ سندھ کی ۱۹ میں سے آٹھ نجی برقی کمپنیاں حاصل کر کے ۴۲ لاکھ روپے کی لاگت سے چلائی گئی ہیں، اور ان کی پیداوار ۲۰۰۰ سے بڑھا کر ۷۸۰۰ ہزار کلوواٹ کو پہنچا دی گئی ہے۔

معاشری بہبود :- حکومت نے ڈویژنوں کی ترقیاتی سکیموں پر پچاس لاکھ روپے صرف کرنے کا فیصلہ کیا ہے جن میں سے بیشتر معاشری سدھار سے تعلق رکھتی ہیں۔ محکمہ معاشری بہبود نے ایک عظیم پروگرام شروع کیا ہے جس میں بیوہ اور یتیم خانے اور اپاہج خانے قائم کرنا شامل ہے جس پر ۶۰ لاکھ روپے صرف ہوں گے، ان میں ۶۰۰۰ افراد کی گنجائش ہو گی۔

لوکل گورنمنٹ :- حکومت لوکل گورنمنٹ کا ایک محکمہ قائم کر رہی ہے، جو ڈسٹرکٹ بورڈوں اور میونسپلٹیوں کے نظم و نسق کی نگرانی کرے گا، ان کے مسائل کی جانچ پڑتال کرے گا اور ان کے کاموں میں ان کی عمومی رہنمائی کرے گا۔ اسی بنا پر ڈسٹرکٹ بورڈوں اور میونسپلٹیوں وغیرہ کی بعض اساسی اسامیوں کو صوبائی بنایا جا رہا ہے، تاکہ وہ صحیح معنوں میں قابل آدمیوں کو دی جا سکیں۔

یہ تجویز بھی ہے کہ ایک لوکل بورڈ قائم کیا جائے جو صوبے میں لوکل باڈیوں کی ایک قسم کی جنرل اسمبلی ہو گا۔ یہ بورڈ لوکل باڈیوں کے مختلف منصوبوں اور سکیموں کو مربوط کر کے انھیں پوری طرح ہم آہنگ بنائیگا۔

تعلیم :- گذشتہ سال مغربی پاکستان میں تعلیم کی رفتار کافی تیز ہوئی ہے۔ ابتدائی ثانوی اور اعلیٰ تعلیم کی

معدا فزوں ضرورت پر مناسب توجہ دی گئی ہے۔ قیام پاکستان سے اب تک کالجوں کی تعداد میں سو فی صد اضافہ ہوگیا ہے۔ اسی طرح کالجوں میں طلبہ کی تعداد میں ساڑھے بارہ ہزار سے ۲۰ ہزار تک اضافہ ہوگیا ہے، اور اس لحاظ سے طلبا کی تعداد میں دو فیصد بیشی ہوگئی ہے، اس کے علاوہ مختلف سکولوں کی تعداد تقریباً گیارہ ہزار سے اٹھارہ ہزار ہوگئی ہے۔ سکولوں میں طلبا کی تعداد ۱۱ ہزار سے تجاوز کر گئی ہے۔ موجودہ سال میں ۴۸۲ نئے پرائمری سکول، ۴۵ مڈل سکول اور ۲۴ ہائی سکول کھولے جائیں گے۔ علاوہ بریں چھ نئے انٹرمیڈیٹ کالج اور ایک ڈگری کالج کھولا جا رہا ہے۔

حیدرآباد ڈویژن میں میرپور خاص کے مقام پر ایک نیا پری کیڈٹ کالج قائم کیا جا رہا ہے۔ ایک جامع سکیم جاری کی جا رہی ہے، جس کے مطابق صوبے کے تمام ہائی سکولوں میں فوجی تعلیم و تربیت دی جائے گی۔ سائنس کی تعلیم کو فروغ دینے کی ضرورت کے پیش نظر محکمہ تعلیم تکنیکی تعلیم کو تیزی سے وسعت دینے پر خاص توجہ دیتا رہا ہے۔ اس مقصد کے لیے تکنیکی تعلیم کا ایک الگ محکمہ قائم کیا جا رہا ہے۔ کئی نئے تکنیکی ہائی سکول قائم کیے گئے ہیں، اور کچھ اور زیر تعمیر ہیں۔ تیس لاکھ روپے کی لاگت سے راولپنڈی میں ایک پولی ٹکنیک انسٹی کھولا جا رہا ہے۔

محکمۂ صحت:۔ محکمۂ صحت نے اپنے نظم و نسق کو بہتر بنانے اور طبی تعلیم و علاج کی سہولتوں میں توسیع کرنے کے سلسلے میں بہت ترقی کی ہے۔ فی الحال پانچ میڈیکل کالج جو مطلوبہ سازوسامان سے پوری طرح آراستہ ہیں ڈاکٹروں اور تربیت یافتہ عملے کی کمی کو پورا کرنے کے کام میں مصروف ہیں۔ ان میں سے ایک پشاور، ایک ملتان اور ایک حیدرآباد میں ہے، اور دو کالج لاہور میں ہیں۔ میڈیکل سکول بھی دیہی شفاخانوں کے لیے ڈاکٹر پیدا کرنے کا کام کر رہے ہیں۔ یہ سکول ایک کوئٹے میں، ایک بہاولپور میں اور ایک حیدرآباد میں ہے۔

لیاقت میڈیکل کالج کے لیے ایک عمارت جمشورو میں زیر تعمیر ہے۔ یہ جگہ حیدرآباد سے کوئی پانچ میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج لاہور میں پوسٹ گریجوایٹ کے مطالعے کے لیے ابتداً ایف۔ آر۔ سی۔ ایس کا نصاب بھی جاری کیا گیا ہے میو ہسپتال لاہور میں جو صوبے کا ممتاز ترین طبی ادارہ ہے۔ خاص علاجوں کے شعبوں اور اعلیٰ طبی تعلیم کی جماعتوں کا اضافہ کیا گیا ہے۔

سرکاری ملازموں کو طبی سہولتیں مہیا کرنے کے لیے ون یونٹ ہسپتال قائم کیا گیا ہے، اور آٹھ لاکھ روپے کی لاگت سے اس میں سو بستر کے ایک ان ڈور شعبے کا اضافہ کیا جائے گا۔

سماج سدھار کی سکیموں کے ماتحت دس ضلعے۔ صدر مقام ہسپتال سابق پنجاب اور صوبہ سرحد میں تعمیر کیے گئے تھے، جنہوں نے کام شروع کر دیا ہے۔ سابق سندھ میں اس قسم کے ہسپتال لاڑکانہ۔ سکھر جیکب آباد اور ٹھٹھہ میں قائم کیے گئے، اور نواب شاہ۔ میرپور خاص اور دادو میں زیر تعمیر ہیں۔ ایبٹ آباد میں ایک نیا پچاس بستر کا زنانہ ہسپتال کھولا گیا ہے۔

امداد باہمی :۔ گذشتہ سال مغربی پاکستان میں ۱۳ متنوعہ اقسام کی انجمن ہائے امداد باہمی کا اجرا عمل میں آیا۔ اس وقت کل ۱۹۷۲۷ انجمنیں ہیں جن کی رکنیت ۳،۷۲،۹۰۸ ہے اور سرمایہ حصص ۲۷ کروڑ ۹ لاکھ روپے ہے۔ گذشتہ سال علی الترتیب یہ اعداد و شمار ۱۹۲۹۷، ۳،۷۲،۱۱۸۸، اور تقریباً ۲۳ کروڑ ۷ لاکھ روپے تھے، ان میں سے ۱۱۷۰۲ قرضہ انجمنیں ہیں۔ گذشتہ سال ان کی تعداد ۱۰۹۲۸ تھی۔ یہ انجمنیں جو زیادہ تر دیہات میں کام کر رہی ہیں، شخصی ضمانت پر پیداوار کے مقاصد کے لیے دیہاتیوں کو قرضہ دیتی ہیں، زیادہ کاشتکاروں کو قرضے کی زیادہ سہولتیں بہم پہنچانے کے لیے محکمہ انجمن ہائے امداد باہمی نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ بڑی قرضہ انجمنیں قائم کی جائیں۔ جو ان دیہات میں کام کریں گی، جو محکمہ ترقی دیہات کے علاقے میں شامل ہیں، ان انجمنوں کا سرمایہ حصص ۲۰۰۰۰ روپے ہوگا، بعض کا ۱۰۰۰۰ روپیہ ہوگا، اور ہر حالت میں آدھا پیسہ محکمہ ترقی دیہات لگائے گا۔ سابق پنجاب کے علاقہ میں امداد باہمی کی ۲۰۹ کاشتکاری انجمنیں ہیں جن کی رکنیت ۱۱۲۹ ہے، اور سرمایہ زیر استعمال تیس لاکھ روپے ہے۔ کالونی اضلاع میں امداد باہمی کی انجمنوں کو بڑے بڑے قطعات کی صورت میں سرکاری اراضی الاٹ کی گئی ہے۔ ان انجمنوں نے مہاجرین کی معاشی حالت کو بہتر بنانے اور ان کے درجۂ زندگی کو بلند کرنے کے سلسلہ میں نمایاں کام کیا ہے۔

محکمہ امداد باہمی نے ایک اور اہم فیصلہ یہ کیا ہے کہ انجمنوں کے اراکین کے مستحق اور ضرورت مند بچوں کی تعلیمی ضرورت کے لیے مغربی پاکستان امداد باہمی وظیفہ فنڈ قائم کیا جائے۔

صنعت :۔ انضمام کے بعد محکمہ صنعت کی از سر نو تنظیم کی گئی ہے۔ یہ تنظیم نو دستور پاکستان کے نفاذ کے

پیشِ نظر بھی ضروری ہو گئی تھی۔ محکمہ صنعت سرِ دست ۱۳ زنانہ و مردانہ صنعتی سکول اور تربیتی مرکز چلا رہا ہے۔

حکومت مغربی پاکستان نے ایک معدنی ترقی کی کارپوریشن قائم کرنے کا بھی فیصلہ کیا ہے۔ اس کو ابتدائی ڈھانچہ کی سطح پر ایک کروڑ روپے کے منظور شدہ سرمائے سے قائم کیا جائے گا۔

مہاجرین کی آباد کاری:۔ متروکہ اراضی کی عارضی مستقل الاٹمنٹ کا کام سابق صوبہ پنجاب کے اضلاع میں تقریباً مکمل ہو چکا ہے۔ اس نوعیت کا کام سابق علاقہ جات میں ہوا ہے۔ ایک اہم فیصلہ جو حال ہی میں ہوا ہے مہاجرین کو مالکانہ حقوق دینے سے متعلق ہے۔ دوسری طرف اس امر کا بھی پورا خیال کیا گیا ہے کہ ہر مہاجر کنبے کو خواہ اس نے دعاوی پیش کیے ہیں یا نہیں پاکستان میں ایک گھر مہیا کیا جائے۔ اب تک جتنے دعاوی کا اندراج ہوا ہے ان کی تعداد تقریباً ۳۱ لاکھ ہے اور کراچی کو خارج کر کے صوبے کے شہری علاقوں میں ۲ سے ۵ و ۳ لاکھ تک مہاجر آباد ہوئے ہیں۔

شہروں میں کثرتِ آبادی کو کم کرنے کے لیے صوبائی حکومت نے نواحی شہر اور مہاجر بستیاں بنانے کا ایک جامع پروگرام مرتب کیا ہے جس کے ماتحت ۲۸ نئی آبادیاں بسانے کی تجویز ہے

ترقیاتی بورڈ:۔ حکومت غیر ترقی یافتہ علاقوں کی اصلاح و ترقی پر خاص توجہ دے رہی ہے۔ انضمام کے بعد حکومت نے صوبے میں ہر ڈویژن اور ہر ضلع کے لیے ترقیاتی بورڈ قائم کر دیے ہیں، تاکہ مقامی اہمیت کی چھوٹے پیمانے کی ترقیاتی سکیموں کا آغاز کیا جائے ۱۹۵۶ء ۵۷ اور ۵۸-۱۹۵۷ء کے دو سال میں ایک کروڑ دس لاکھ روپے کی رقم منظور کی گئی ہے، تاکہ اسے مذکورہ سکیموں کے اخراجات پر صرف کیا جائے۔

قبائلی علاقے۔ محصول آب کاری اور اصلاحاتِ جیل:۔ صوبے کے غیر ترقی یافتہ علاقے بالعموم اور قبائلی علاقے بالخصوص انضمام کے بعد صوبائی حکومت کی خاص توجہ کا مرکز بنے ہوئے ہیں۔ موجودہ مالی سال کے دوران ۹۰ لاکھ ۲۰ ہزار ۸ سو روپیہ کی گنجائش کے مقابلے میں آئندہ مالی سال میں غیر ترقی یافتہ سرحدی علاقوں کے لیے ۲ کروڑ ۳ ۸ لاکھ ۳۱ ہزار روپے کی رقم مخصوص کی گئی ہے۔ اسلامی عقائد کی پیروی میں حکومت نشہ آور خطرناک ادویہ مثلاً شراب، افیون، چرس، گانجا اور بھنگ کی بندش اور ان اشیا کے استعمال پر کڑی پابندیاں لگانے کے اقدامات کر رہی ہے۔ جیل میں اَن پڑھ قیدیوں کو لازمی تعلیم کی سہولتیں مہیا کیے جانے کے اقدامات کیے جا رہے ہیں۔

اس شمارہ میں



تعلیمی ماہنامہ

آموزش لاہور

جون ۱۹۵۷ء

جلد ——— ۱۰
شمارہ ——— ۳

سالانہ چندہ

پاکستان کے لیے ۶ روپے
غیر ممالک کے لیے ۸ روپے

قیمت فی پرچہ دس آنے

یونی ورسٹی بک ایجنسی لاہور

آر۔ ایچ۔ ڈی خالد پرنٹر پبلشر نے دین محمدی پریس لاہور میں طبع کرا کے
یونیورسٹی بک ایجنسی ۲ کچہری روڈ لاہور سے شائع کیا

طلبہ کے مسائل

ایم۔اے مخدومی

"ہمارا نظامِ تعلیم" کے عنوان سے ایک مقامی روزنامہ میں ایک خط شائع ہوا ہے جس میں ایک صاحب رقمطراز ہیں:۔

"یہ امر مایوس کن ہے کہ مسئلۂ تعلیم پر غور کرنے کی جب بھی کوئی کوشش کی جاتی ہے طلبہ کے نقطۂ نگاہ کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے...... موجودہ نظامِ تعلیم کے تحت گریجوایٹ درجے تک ہمارے طلبہ ایک عجیب قسم کی نامرادی، پژمردگی اور مایوسی کے احساس کا شکار رہتے ہیں۔ نامرادی، اکتاہٹ اور جذباتی عدم تناسب ہی نااہلیت، کاہلی اور امتحانات میں وسیع پیمانہ پر ناکامی کے اصل اسباب ہیں، ہمارے انسانی مواد کی ذہنی صلاحیتوں کا کچھ قصور نہیں۔ اصل قصور اس جذباتی ردِ عمل کا ہے جو ایک عام طالب علم میں پیدا ہوتا ہے"

جہاں تک مرض کی تشخیص کا تعلق ہے اوپر کی سطور میں بہت پتے کی بات کہی گئی ہے لیکن آگے چل کر اس مرض کے اسباب کی شرح یوں بیان ہوئی ہے:۔

"وجہ یہ ہے کہ طلبہ کو بے جان تصورات سے ضرورت سے زیادہ لاد دیا جاتا ہے۔ جو تعلیم بے جان تصورات عطا کرے، وہ نہ صرف بے کار ہے، بلکہ سب چیزوں سے زیادہ نقصان دہ ہے"

پروفیسر وائٹ ہیڈ کی کتاب "مقاصدِ تعلیم" سے مندرجہ بالا سند پیش کرنے کے بعد مکتوب نگار لکھتا ہے "میں ذاتی تجربے کی بنا پر کہہ سکتا ہوں کہ ہمارے سکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں کے کم از کم ساٹھ فیصد اساتذہ کسی قسم کے تصورات عطا کرنے کے قطعاً اہل نہیں"۔

مندرجہ بالا استدلال جو طلبہ کے نقطۂ نگاہ کی ترجمانی کے نام پر اختیار کیا گیا ہے، تین واضح اقدام پر مشتمل ہے (۱) معیاروں کے دن بدن گرتے اور طلبہ کے بے تحاشہ فیل ہونے کی اصل وجہ طلبہ کا جذباتی عدم توازن ہے۔

(۲) اس مرض کا سبب وہ بے جان تصورات ہیں جو ہماری کتابی تعلیم کے طفیل طلبہ پر ضرورت سے زیادہ لاد دیے جاتے ہیں۔
(۳) ہمارے سکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں پڑھانے والے استادوں کی اکثریت کسی قسم کا زندہ تصور عطا کرنے کی استعداد سے بالکل عاری ہے ۔ اس استدلال کی نمایاں خامی یہ ہے کہ یہ طریق علاج کی کوئی نشان دہی نہیں کرتا۔ ہم نے اس خیال پر تبصرہ کرنا محض اس لیے ضروری سمجھا کہ آجکل نظام تعلیم تعلیمی اداروں اور اساتذہ کے متعلق جو اظہار رائے بھی کیا جاتا ہے اس میں عموماً اسی قسم کا گول مول طریق استدلال اختیار کیا جاتا ہے۔ نظام تعلیم کو من حیث الکل یا اس کے کسی ایک جزو کو قصور وار ٹھہرا دینا چنداں مشکل نہیں لیکن اس سے اصل مسئلہ کا حل قریب تر نہیں آتا۔ تنقید و تبصرہ اسی صورت میں فائدہ بخش ثابت ہو سکتا ہے جب مرض کی تشخیص کے ساتھ اس کا کوئی قابل عمل حل بھی تجویز کیا جائے۔ متذکرہ صدر استدلال میں اساتذہ جنہیں ساری خرابی کا ذمہ وار ٹھہرایا گیا ہے یہ کہہ کر بری الذمہ ہو سکتے ہیں کہ اصل قصور اس نظام تعلیم کا ہے جس کی ہم پیداوار ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کی بحث کبھی نتیجہ خیز ثابت نہیں ہو سکتی۔

اگر ہمارے طلبہ کو یہ شکایت ہے کہ وہ جذباتی عدم توازن کا شکار رہیں تو یہ شکایت دوسرے ملکوں کے طلبہ بھی کم و بیش اسی شدت کے ساتھ کر سکتے ہیں۔ ترقی یافتہ ممالک جہاں تعلیم بے جان تصورات کی بجائے حیات بخش تصورات عطا کرتی ہے۔ وہاں بھی جذباتی سکون کا فقدان تقریباً اتنا ہی شدید ہے جتنا ہمارے ملک میں۔ وجہ یہ ہے کہ مغربی تعلیم کا محور پہلے دن سے علم و مہارت رہے ہیں۔ جذباتی ہم آہنگی نہیں۔ جذباتی ہم آہنگی کے لیے ان آفاقی اقدار میں کھو جانا ایک لازمی شرط ہے۔ جن کا ابدی حسن، روحانی صحت اور تر و تازگی کی سب سے بڑی ضمانت ہوا کرتی ہے۔ مغرب کو اپنی تعلیم کی اس کوتاہی کا احساس ہونے لگا ہے۔ لیکن اپنے نظام تعلیم کی اس شدید کوتاہی کے باوجود مغربی طلبہ ہمارے طلبہ کی سی نا اہلیت کا شکار کبھی نہیں ہوئے۔ اپنے جذباتی عدم توازن کے باوجود انہوں نے علم و مہارت کے میدان میں کسی سے مات نہیں کھائی، وہ اپنے نفسیاتی مسائل کے ہوتے ہوئے بھی گھڑی کے پرزوں کی طرح کام کرنا جانتے ہیں۔ وہ حاصل کردہ علم اور اخذ کردہ مہارت کی مدد سے ملکی اور قومی بہبود کو ترقی دینے کے درپے رہتے ہیں۔

اس بحث سے استادوں کی حمایت کرنا مقصود نہیں، بلکہ یہ جتلانا مقصود ہے کہ اصلاح تعلیم کی اصل راہ یہ نہیں کہ نظام تعلیم کے مختلف پرزے ایک دوسرے کو ملعون کرنے لگیں۔ اس کی اصل راہ یہ ہے کہ ہر پرزہ محاسبہ نفس کے

امریکی مدرسوں میں نسلی امتیاز کا مسئلہ

فضل احمد

جمہوری تقاضے اور نسلی تفاخر

تاریخ عالم سے باخبر لوگ اس افسوس ناک حقیقت سے واقف ہیں کہ گوری قوموں نے تاریخ کے مختلف ادوار میں اپنے رنگ کو وجہ امتیاز بنانے کی کوشش کی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ کوشش سیاسی غلبے کے دور میں ہی کامیاب ہو سکتی تھی۔ تاریخ میں بارہا ایسا ہوا کہ جب کسی گوری قوم نے دوسری سیاہ فام قوم پر سیاسی غلبہ حاصل کیا تو اپنے نسلی گھمنڈ کو قائم رکھنے کے لیے اپنے اور مفتوح قوم کے درمیان رنگ کے امتیاز کی دیوار کھڑی کر لی۔ ہندوستان میں آریاؤں نے ذات پات اور چھوت چھات کی جو بدعات جاری کیں ان کی اصل بنا ان کا نسلی تفاخر تھا۔ سفید فام آریائی فاتح اپنے خون کو کالے کلوٹے اور چپٹی ناک والے مفتوحین کے خون سے پاک رکھنا چاہتے تھے، اس آمیزش کا قطعی طور پر راستہ روکنے کے لیے مفتوح قوم کو نہ صرف غلام بنایا گیا بلکہ اسے نیچ اور نجس قرار دے کر اس کا ابدی معاشرتی مقاطعہ کر دیا گیا۔

ہر چند کہ آریاؤں کا اپنا مجلسی اور سیاسی نظام بڑی حد تک جمہوری نوع کا تھا، لیکن جب ان کے سفید خون کو آمیزش کا خطرہ نظر آیا تو انہوں نے جھٹ اپنی جمہوری روایات کو خیرباد کہہ کر استبداد اور تنگ نظری کا راستہ اختیار کیا۔ کم و بیش یہی راہ نئی دنیا کے سفید آبادکاروں نے اختیار کی۔ یہ وہ لوگ تھے جنہوں نے اپنے آبائی وطن کو ضمیر کی خاطر چھوڑا تھا۔ جن لوگوں نے اول اول یورپ سے ہجرت کر کے امریکہ میں اقامت اختیار کی یہ وہ لوگ تھے جو آزادیٔ فکر، آزادیٔ ضمیر اور حقوق انسانی کے سرگرم حامی تھے۔ وہ مذہب، نسل اور رنگ سے قطع نظر تمام انسانوں کے لیے یکساں حقوق کے دعویدار تھے۔ جب آزادیٔ ضمیر کی خاطر انہوں نے خویش و اقارب اور گھربار کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے چھوڑ دیا تو نئی دنیا میں بے پناہ قدرتی دولت کے ذخیروں نے ان کا استقبال کیا، اس دولت سے ہاتھ رنگنے کے لیے غلاموں کی ضرورت محسوس ہوئی اور دیکھتے ہی دیکھتے تاریک براعظم سے

دھڑا دھڑ حبشی غلام درآمد ہونے لگے! انسانی عظمت کے علم برداروں اور انسانی مساوات کے دعویداروں کو جلب منفعت کی دھن میں یہ بات یاد نہ رہی کہ افریقی حبشی بھی انہی جیسے انسان تھے۔

حبشی غلاموں سے صرف خدمت لینے پر اکتفا کی جاتی تو شاید یہ بات کچھ زیادہ قابل اعتراض نہ ہوتی رحمت العالمین صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی غلامی کو برداشت کیا تھا۔ مگر اس کے ساتھ ہی آخری دم تک یہ تاکید فرمائی تھی کہ اپنی لونڈی اور غلاموں کا خیال رکھو، جو خود کھاؤ انھیں کھلاؤ، جو خود پہنو انھیں پہناؤ خبردار انھیں غلام یا لونڈی کے نام سے نہ پکارو، بلکہ "بیٹا" اور بیٹی کہہ کر پکارو۔ غرض رحمت عالم ؐ نے جس غلامی کو برداشت فرمایا تھا اس پر آقا ئی بھی قربان کی جاسکتی تھی؛ لیکن یورپ کے جمہوریت پسندوں نے صدیوں بعد نئی دنیا میں جس غلامی کو زندہ کیا وہ انسانی شرف کی بدترین تذلیل تھی، حبشی غلاموں کو حیوانوں کا درجہ دیا گیا۔ انھیں انسانیت سے عاری قرار دیا گیا، ان کے معاملے میں تمام جمہوری تقاضے معطل ہو کر رہ گئے۔ اس ستم ظریفی کی تہ پر بھی فی الحقیقت جو جذبہ کام کر رہا تھا وہ نسلی تفاخر کا جذبہ تھا، سید سے نقوش اور گورے رنگ والے آقاؤں کو اس خیال تک سے وحشت آتی تھی کہ موٹے ہونٹوں اور گھونگھردار بالوں والے سیاہ فام افریقیوں کا خون ان کے خون کے ساتھ ملے۔ اس خطرے کا موثر سد باب کرنے کے لیے حبشیوں کو انسانیت سے ہی خارج کر دیا گیا!

جمہوریت اور مفاہمت

اسلام نے جس جمہوری زندگی کا نقشہ کھینچا ہے وہ سچائی کے معاملے میں کسی مفاہمت کا قائل نہیں اس کے برعکس مغربی جمہوریت سچائی کے ساتھ ایسی غیر متزلزل وفاداری میں یقین نہیں رکھتی۔ امریکی سیاسی فکر کا ایک مانا ہوا کلیہ یہ ہے کہ ایک جمہوریت میں حکومت کا کام افہام و تفہیم سے انجام پانا چاہیے اور جہاں کسی مسئلہ پر اختلاف رائے موجود ہو وہاں ہمیشہ درمیانی راہ اختیار کر لینی چاہیے۔ صاف تر زبان میں اس کا مطلب یہ ہوا کہ جہاں دو جماعتوں کے درمیان اصولی اختلاف رونما ہو وہاں ہر جماعت کو چاہیے کہ تھوڑی سی سچائی قربان کر کے کچھ غلطی قبول کر لے، تاکہ دونوں فریق ایک موقف پر جمع ہو سکیں۔

اس افسوسناک طریق مفاہمت کی کئی مثالیں اس وقت دیکھنے میں آئیں، جب امریکی دستور

ب کیا جا رہا تھا۔ ان میں سے سب سے زیادہ نمایاں مثال غلاموں کی حیثیت کا مسئلہ تھا۔ ایک گروہ کہتا تھا کہ اموں کی حیثیت بھیڑ بکریوں یا دوسرے مویشیوں کی سی ہے۔ جس طرح مالک کو دوسرے حیوانوں پر یس ادا کرنا پڑتا ہے، اسی طرح اسے اپنے غلاموں پر بھی ٹیکس ادا کرنا چاہیے۔ دوسرے فریق کا کہنا تھا کہ لام دوسرے انسانوں کی طرح انسان ہیں۔ انہیں باقی آبادی میں شمار کر کے حق رائے دہی دینا چاہیے۔ اس وال پر فریقین کے درمیان جو مفاہمت ہوئی وہ ہمیشہ یادگار رہے گی۔ ہر فریق نے اپنے موقف کی ہ سچائی قربان کر دی، اور اس کی بجائے غلط بات تسلیم کر لی، دستور میں یہ لکھ دیا گیا کہ غلام ۳/۵ حصہ انسان ہیں ور ۲/۵ حصہ حیوان۔ بعد ازاں دستور اساسی کو اس انسانیت سوز جھوٹ سے پاک کرنے کے لیے امریکہ کو مانہ جنگی اور خون ریزی میں سے گزرنا پڑا۔ تاریخ عالم کا تلخ فیصلہ ہمیشہ یہی رہا ہے کہ جہاں کہیں سچائی و وقتی مصلحت پر قربان کیا جائے گا اس کی قیمت زرد و یدیر خون کی ندیوں کی صورت میں ادا کرنی پڑے گی۔

صلح کا راستہ

مفاہمت کے مقابلے میں صلح کا راستہ ہے۔ صلح سے مراد یہ ہے کہ دونوں فریق اپنے مدمقابل کے نقطہ نگاہ کے اس حصے کو تسلیم کر لیں جو سچائی پر مبنی ہے اور اس کے غلط حصے کو نظر انداز کر دیں۔ تاریخ میں صلح کے راستے کی بہترین مثال فتح مکہ ہے۔ سرورِ کونین ؐ نے اہل قریش کی قائدانہ حیثیت کو قائم رکھا، اور قریش نے اللہ تعالیٰ کی توحید کو تسلیم کر لیا۔ صلح کا راستہ چوں کہ سچائی کی واضح فتح کا راستہ ہے، اس لیے اس کے بعید المدت نتائج بھی ایسے خوش گوار ثابت ہوتے ہیں جتنے اس کے فوری نتائج۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن حکیم نے صلح کے راستے کو کلی طور پر خیر کا راستہ کہا ہے۔

امریکی حبشیوں کی تعلیم کا مسئلہ

آج کل امریکہ میں حبشی بچوں کی تعلیم کا مسئلہ گرماگرم بحث کا موضوع بنا ہوا ہے۔ ملکی قانون کی رو سے ہر امریکی شہری کو قطع نظر اس کے کہ وہ مرد ہو یا عورت۔ گورا ہو یا کالا، تعلیم کی ایک سی سہولتیں بہم پہنچائی جانی چاہئیں۔ امریکی ریاستوں نے اس آئینی ذمہ داری سے عہدہ برا ہونے کی یہ صورت نکالی کہ گورے بچوں کے لیے الگ مدرسے قائم کر دیے اور کالے بچوں کے لیے الگ۔ مساوات کی شرائط پوری کرنے کے لیے یہ کر دیا کہ دونوں

نسلوں کے مدرسوں پر خرچ کا تناسب برابر کر دیا۔

حبشی اس صورت حال سے مطمئن نہ ہوئے، حقیقت یہ ہے کہ حبشیوں کو تعلیم حاصل کرنے کی آسانیاں زیادہ تر دوسری عالمی جنگ کے بعد ہی میسر آئی ہیں، پہلے ان بیچاروں پر تعلیم کے دروازے تقریباً بند تھے، اب جب ان کے الگ مدرسے قائم کر دیے گئے تو بھی وہ اس صورت حال سے مطمئن نہ ہوئے، ان کا کہنا تھا کہ حبشی مدرسوں کی پڑھائی گورے مدرسوں کے ہم پلہ نہیں کیونکہ ثانی الذکر مدرسے استادوں کی تعلیمی قابلیت اور ساز و سامان کے لحاظ سے زیادہ بلند سطح پر ہیں۔ کوئی دو سال ہوئے حبشیوں کی طرف سے یہ معاملہ سپریم کورٹ میں لے جایا گیا۔ سپریم کورٹ نے فیصلہ دیا کہ یکساں تعلیمی مواقع کی آئینی ذمہ داری اس صورت میں پوری ہو سکتی ہے، جب گورے اور کالے کے ایک ساتھ ملے جلے مدرسوں میں تعلیم پائیں۔

رائے عامہ کی ہٹ دھرمی

سپریم کورٹ نے فیصلہ تو دے دیا، لیکن دو سال گذر جانے پر بھی اس فیصلے کو پوری طرح عملی جامہ نہیں پہنایا جا سکا۔ وجہ گوری آبادی کی شدید مخالفت ہے، دراصل حبشی مسئلہ امریکہ کی جنوبی ریاستوں سے تعلق رکھتا ہے۔ جہاں ان کی آبادی کے بڑے بڑے جماؤ ہیں۔ شمالی ریاستوں میں حبشی آبادی کا تناسب بہت کم ہے وہاں سپریم کورٹ کے فیصلے سے پہلے بھی حبشی بچے گورے بچوں کے ہمراہ تعلیم پاتے تھے۔

جنوبی ریاستوں کی گوری آبادی پر آمیزش خون کا خوف بری طرح سوار ہے، اور وہ کسی طرح اس خطرے کو مول لینے پر آمادہ نہیں ہوتی۔ اس صدیوں پرانے جذباتی خوف کے منطقی جواز میں طرح طرح کی دلیلیں تراشی جاتی ہیں۔ مثلاً یہ کہا جاتا ہے کہ جنوبی ریاستوں کے بعض حصوں میں حبشی آبادی گوری آبادی کے مقابلہ میں چوگنا ہے۔ ایسے علاقوں میں گورے بچے اپنی نسلی پاکیزگی کو قائم نہیں رکھ سکیں گے۔ اکثر والدین کے لیے یہ تصور بے حد وحشت ناک ہے، وہ اس بات کے لیے کسی قیمت پر آمادہ نہیں ہو سکتے کہ ان کے پوتے دوغلی نسل کے ہوں۔

جو لوگ گوری نسل کی ہٹ دھرمی کے جواز میں اس قسم کا استدلال اختیار کرتے ہیں وہ اس تاریخی حقیقت کو بھول جاتے ہیں کہ سالہا سال تک امریکی حبشی اپنے سفید آقاؤں کے رحم و کرم پر تھے۔ اس زمانے میں ان کے لیے یہ قطعاً ناممکن تھا کہ وہ اپنے خون کو سفید آمیزش سے پاک رکھ سکیں۔ چنانچہ سفید آقاؤں کی ہوس پرستی نے

حبشی خون کو خالص نہ رہنے دیا۔ آج امریکہ میں آدھے سے زیادہ حبشی آبادی کی رگوں میں سفید خون کی آمیزش موجود ہے۔ اب جب انقلاب زمانہ حبشیوں کو بھی یہ موقع دینا دکھائی دیتا ہے کہ وہ جنسی تعلقات کے بارے میں اپنے سفید آقاؤں کی راہ پر چلیں تو ان جمہوریت نو ناقدوں کے اوسان خطا ہوتے نظر آتے ہیں۔

علاج کی تلاش

گوری نسل کی تمام ہٹ دھرمی کے باوجود تلخ حقائق اپنی جگہ موجود ہیں۔ سپریم کورٹ کا فیصلہ ملکی قانون کی حیثیت رکھتا ہے، اور اسے بہت دیر تک نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ نیز حبشی آبادی میں احساس خودداری تیزی سے بڑھ رہا ہے۔ عالمی حالات اس احساس پر مہمیز کا کام کر رہے ہیں۔ ان حالات میں گوری نسل کی ہٹ دھرمی حبشی مطالبے کو شدید شکل دے رہی ہے۔ حبشیوں کا پیہم اور پر زور مطالبہ یہ ہے کہ مدرسوں کی علیحدگی کو فوراً ختم کر دیا جائے اور سپریم کورٹ کے فیصلے کو جلد از جلد ملک کے تمام حصوں میں نافذ کیا جائے، اس کے بغیر تعلیمی مواقع کی یکسانیت محض ایک ڈھونگ ہے، اور یہ امر دستور اساسی کی ایک بھونڈی کا مذاق ہے۔

سپریم کورٹ کے واضح فیصلے کے باوجود جنوبی ریاستوں کی گوری آبادی نے اس بات کی سخت مخالفت کی ہے کہ اس کے بچے (لڑکے اور لڑکیاں) حبشی بچوں کے ساتھ ایک ہی مدرسے میں پڑھیں۔ اس مخالفت کی پشت پر بہت قوی نفسیاتی اور تاریخی توجیہیں موجود ہیں۔ بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ مخلوط تعلیم کو کسی قیمت پر بھی قبول نہیں کیا جائے گا۔ اس صورت حال نے امریکی رہنماؤں کو کافی پریشان کر رکھا ہے اور وہ کسی ایسی درمیانی راہ کی تلاش میں ہیں جس سے حبشی بھی مطمئن ہو جائیں اور گوری آبادی کے خطرات بھی دور ہو جائیں۔

چند ماہ ہوئے امریکی تعلیمی رسالے "سکول اینڈ سوسائٹی" میں ایک مضمون نگار نے اس مشکل مسئلے کا ایک حل پیش کیا تھا۔ مسئلے کے تمام پہلوؤں پر بحث کرنے کے بعد مضمون نگار نے حبشی مطالبے اور گوری نسل کی مخالفت دونوں کو اپنی اپنی جگہ حق بجانب قرار دیا اور ان دونوں بظاہر متضاد نقطہ ہائے نگاہ کے درمیان ایک قابل عمل راہ تجویز کی۔ وہ درمیانی راہ یہ ہے کہ جہاں اس وقت کالے اور گورے بچوں کے لیے الگ الگ مدرسے ہیں، لیکن ہر نسل کے لڑکے اور لڑکیاں ایک ساتھ پڑھتے ہیں وہاں آئندہ یوں ہو کہ لڑکوں اور لڑکیوں کی تعلیم الگ الگ مدرسوں میں ہو۔ مگر لڑکوں کے مدرسوں میں گورے اور کالے لڑکے

ایک ساتھ پڑھیں اور لڑکیوں کے مدرسوں میں گوری اور کالی لڑکیاں ایک ساتھ، اس طرح حبشی طالبہ بھی پیدا ہو جائے گا اور گوری نسل کی آمیزش خون کا جو خطرہ لاحق ہے وہ بھی جاتا رہے گا۔ مضمون نگار مضمر یہ کہا ہے کہ لڑکوں اور لڑکیوں کو الگ الگ مدرسوں میں ...... تعلیم دینے کی ضرورت صرف ثانوی مدارس میں پیش آئے گی۔ ابتدائی مدرسوں میں گورے اور کالے بچوں کے ایک ساتھ پڑھنے میں قطعاً کوئی قباحت نہ ہو گی۔

جنسی علیحدگی کے حق میں استدلال

ریاست ہائے متحدہ امریکہ لڑکوں اور لڑکیوں کی مخلوط تعلیم کا سب سے بڑا علمبردار ہے، اس کے سرکاری مدرسوں میں مدتوں سے نوجوان لڑکے اور لڑکیاں ایک ساتھ تعلیم پاتے آئے ہیں، اب تک اس بات کو ترقی پسندی اور جمہوریت نوازی کی ایک کھلی دلیل خیال کیا جاتا رہا ہے، یہاں تک کہ بعض امریکی مشیر پسماندہ ملکوں کو بھی یہ مشورہ دیتے رہے ہیں کہ وہاں سچی جمہوری قدریں اس وقت جڑ پکڑیں گی جب مخلوط تعلیم رائج کر دی جائے گی۔ مگر حالات کی ستم ظریفی دیکھیے کہ اب مخلوط تعلیم کا یہی پرچارک جنسی علیحدگی کے حق میں دلیلیں تلاش کرنے پر مجبور ہے۔

"سکول اینڈ سوسائٹی" کے مضمون نگار نے جنسی علیحدگی کی ضرورت بیان کرنے کے بعد اس کے حق میں کئی ایک دلیلیں پیش کی ہیں۔ مضمون نگار کو اس بات کا کافی احساس معلوم ہوتا ہے کہ امریکہ میں جہاں مخلوط تعلیم کی روایات بے حد راسخ ہیں جنسی علیحدگی کی تجویز پیش کرنا آسان بات نہیں، چنانچہ اس نے اپنی تجویز کے حق میں حالات کے علاوہ تاریخ اور نفسیات سے بھی وزنی سندیں پیش کی ہیں۔ یہ استدلال جو دلچسپ ہونے کے ساتھ ہی سبق آموز بھی ہے من و عن ہدیۂ ناظرین ہے۔

مسئلے کا یہ حل کوئی انقلاب آفریں حل نہیں ہے، یہ طریق کار صدیوں سے زیر عمل رہا ہے، خود اس ملک امریکہ میں ثانوی اور کالج کے درجہ کے چیدہ ترین پرائیویٹ تعلیمی ادارے جنسی علیحدگی کے اصول پر عمل پیرا رہے ہیں، دراصل مخلوط تعلیم کا رواج سرحدی علاقوں سے شروع ہوا تھا، جہاں کی آبادی اور مالی ذرائع کی کمی کے باعث ان علاقوں میں مخلوط تعلیم ہی واحد طریقۂ تعلیم ہو سکتی تھی۔ پرانے آباد شدہ رقبوں میں عام طور پر

لڑکوں اور لڑکیوں کے لیے الگ الگ پرائیویٹ مدرسے قائم کرنے کا دستور تھا. مشرق اور جنوب کے بڑے بڑے شہروں میں سرکاری مدرسے بھی لڑکوں کے لیے الگ تھے اور لڑکیوں کے لیے الگ۔

جو لوگ بڑے بڑے ثانوی مدرسوں کے حالات کو اچھی طرح جانتے ہیں انہیں علم ہے کہ آغاز بلوغت کے نازک دور میں لڑکوں اور لڑکیوں کا بڑی تعداد میں برآمدوں اور کمروں میں ایک ساتھ جمع ہو جانا کس قسم کے نفسیاتی مسائل پیدا کرتا ہے، ایک ایسے دور میں جب ان کے جنسی قوا پختگی حاصل کر رہے ہوتے ہیں یہ نوجوان لڑکے اور لڑکیاں دن بھر لگاتار غیر معمولی جنسی تحریک کا شکار رہتے ہیں۔ گو اس عمر میں جنس مخالف کے ساتھ مجلسی تعلقات قائم کرنا ضروری بھی ہے اور قدرتی بھی، لیکن مخلوط تعلیم سے جو غیر معمولی جنسی تحریک پیدا ہوتی ہے وہ جنس مخالف کے متعلق صحت مند رویہ پیدا کرنے کا بہترین طریقہ نہیں۔

درس عبرت

مندرجہ بالا سطور ان لوگوں کے لیے آنکھیں کھولنے والی ثابت ہونی چاہئیں جو مغرب کی ہر بے راہروی کو ترقی پسندی کا معراج خیال کرنے کے عادی ہیں۔ ہمارے ملک میں ایسے لوگ موجود ہیں جو یہ خیال کرتے ہیں کہ مغرب کی مادی ترقی جن اسباب کی پیداوار ہے ان میں مخلوط تعلیم بھی شامل ہے۔ حالاں کہ مغرب کی سائنسی ترقی کے اسباب یکسر مختلف ہیں اور یہ اسباب (جن کا تعلق اجتماعی شعور کے ساتھ ہے) اس قدر قوی ہیں کہ چند درچند مجلسی برائیوں کے باوجود نتیجہ خیز ثابت ہو رہے ہیں، اس سے یہ مجلسی خرابیاں اچھائیوں میں تبدیل نہیں ہو جاتیں، وہ بدستور برائیاں ہیں۔ اس امر کا اعتراف خود مغرب کے اہل نظر کو بھی ہے اور حالات کی مجبوری بعض اوقات ان کے منہ سے سچی بات برملا طور پر نکلوا کر چھوڑتی ہے، اوپر کا اقتباس اسی قسم کی ایک شدید مجبوری کا نتیجہ ہے۔

امریکی تعلیم کے لیے مشکل معمہ

غرض جبشی مسئلہ آج کل امریکی تعلیم کے لیے ایک مشکل معمہ ثابت ہو رہا ہے۔ امریکہ جمہوری اقدار کے احترام کا دنیا میں سب سے بڑا علمبردار ہے۔ جمہوری اقدار میں آزادی اور مساوات کو دو اہم ترین ستونوں کا مرتبہ حاصل ہے. حبشی انسانی مساوات کا واسطہ دے کر یہ مطالبہ کر رہے ہیں کہ ان کے بچوں کو گوروں کے بچوں کے

ساتھ تعلیم پانے کا حق دیا جائے، سپریم کورٹ نے ان کے اس مطالبے کی تائید کر کے اس مطالبے کے لیے قانونی تائید کا سامان بھی پیدا کر دیا ہے۔ دوسری طرف گورے آزادی کی دہائی دے رہے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ایک جمہوری معاشرے میں ہر چیز شہریوں کی آزاد پسند پر موقوف ہونی چاہیے۔ یہ آزادی عمل ذاتی معاملات میں اور بھی زیادہ ضروری ہے، بچوں کی تعلیم اور ان کے ازدواجی مسائل والدین کے لیے صد درجہ ذاتی مسائل ہیں۔ قانون کو کوئی حق حاصل نہیں کہ یہ ذاتی حق ان سے چھینے اور انہیں اس بات پر مجبور کرے کہ وہ اپنے بچوں کے ازدواجی تعلقات ایک ناپسندیدہ نسل کے ساتھ قائم کریں۔ اگر قانون نے جبر سے کام لیا تو وہ اپنی اولاد کو اَن پڑھ رکھنا گوارا کریں گے، لیکن یہ بات گوارا نہیں کریں گے کہ ان کی آنے والی نسلیں خون کی پاکیزگی سے محروم ہو جائیں اس مشکل مسئلے کا حل امریکی ماہرین تعلیم کی بصیرت کا کڑا امتحان لے گا۔ دنیا بڑی دل چسپی کے ساتھ اس سوال کے تسلی بخش حل کی منتظر ہے ؞

تعلیم بالغاں کی نئی ذمہ داری

زبیدہ بانو

ہمارے یہاں تعلیم بالغاں سے مراد ایسے لوگوں کو خواندگی کی تعلیم دینا لیا جاتا ہے جو بچپن میں مدرسے میں نہیں جا سکتے تھے۔ گویا تعلیم بالغاں کو خواندگی کی تعلیم کے ہم معنی سمجھا جاتا ہے۔ تعلیم بالغاں کا یہ مفہوم بہت محدود ہے، یہ درست ہے کہ تعلیم بالغاں کا کام جب دنیا میں پہلے پہل شروع کیا گیا تو اس سے مراد خواندگی کی تعلیم ہی تھا۔ مگر مغرب میں یہ محدود مفہوم مدت ہوئی ختم ہو چکا۔ اب وہاں تعلیم بالغاں سے مراد لوگوں کو پڑھنا لکھنا سکھانا نہیں بلکہ مزید تعلیم دینا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بعض ماہرین تعلیم اسے تعلیم بالغاں کی بجائے "مزید تعلیم" کا نام دینا پسند کرتے ہیں، اس کے مقابلے میں وہ لکھنا پڑھنا سکھانے کو "خواندگی کی تعلیم" کا نام دیتے ہیں۔

تیز رفتار معاشرتی انقلاب

آج دنیا میں ہر جگہ ایک تیز رفتار معاشرتی انقلاب برپا نظر آتا ہے۔ ہم میں سے بعض لوگ عموماً تیزی سے بدلتی ہوئی معاشرتی قدروں کا رونا روتے نہیں تھکتے۔ انہیں سخت شکایت ہے کہ پچھلے آٹھ دس سالوں میں عام رہنے سہنے کے طریقے اس قدر بدل گئے ہیں اور مروجہ اقدار میں اس قدر فرق آ گیا ہے کہ اب زندگی ہی دوبھر نظر آنے لگی ہے۔ ایسے لوگوں کو یہ علم نہیں کہ جس چیز کے وہ شاکی ہیں وہ محض پاکستان یا کسی اور ملک کے ساتھ مخصوص نہیں۔ بلکہ یہ اس عالم گیر معاشرتی انقلاب کا ایک کرشمہ ہے جس نے آج ساری دنیا کو گرفت میں لے رکھا ہے۔

اس تیز رفتار معاشرتی انقلاب کے اسباب کیا ہیں؟ اس کا مختصر جواب یہ ہے کہ اس کی اصل جڑ سائنس اور ٹکنالوجی کی وہ برق رفتار ترقی ہے، جس نے پچھلی دو تین دہائیوں میں انسانی معیشت کی بنیادوں کا حلیہ بدل کر رکھ دیا ہے۔ تہذیب کے آغاز سے لے کر موجودہ صدی کی ابتدا تک انسانی معیشت کا واحد سہارا قدرتی اور زرعی پیداوار تھی۔ انسانی آبادی کرۂ ارض کے سرسبز خطوں۔ معدنی ذخیروں۔ دریاؤں اور

سمندروں کے ساحلوں کے ساتھ ساتھ بکھری پڑی تھی۔ ہرچند کہ اٹھارھویں اور انیسویں صدی کی مشینی ایجادوں نے انسان کو ایسی بھاری بھرکم اور عفریت نما مشینیں عطا کر دی تھیں جو مہینوں اور دنوں کی انسانی محنت کو گھنٹوں میں انجام دینے لگی تھیں پھر بھی انسان خام اشیاء اور خوراک کے لیے فطرت کے رحم و کرم پر تھا۔ اس کا علم اور اس کی مشینیں قدرتی اور زرعی پیداوار کو طرح طرح کی شکل دے سکتی تھیں۔ وہ خود کوئی نئی چیز پیدا نہ کر سکتی تھیں۔

لیکن پچھلی دو تین دہائیوں میں سائنس اور ٹکنالوجی کا علم ایک نئی سطح پر پہنچ گیا ہے۔ ایک ایسی سطح جو آج سے صرف ربع صدی پہلے انسانی وہم و گمان میں بھی نہ تھی۔ انسان اب اس قابل ہو چکا ہے کہ مادے کے چھوٹے سے چھوٹے ذرے کے دل کو چیر کر دیکھ سکے اور اس دل میں چھپے ہوئے بے پناہ قوت کے خزانوں کو آزاد کر کے ان سے خدمت لے سکے۔ اس طرح انسان اب اس قابل ہو گیا ہے کہ فطرت کے مہیا کردہ مواد میں حسب منشا رد و بدل کر سکے، اس نے اپنے علم اور ٹکنالوجی سے کام لے کر کئی نئے مفردات پیدا کر لیے ہیں۔ حالاں کہ کل تک سائنس کا یہ اعتقاد تھا کہ مفردات کی تعداد فطرت کی طرف سے مقرر ہے۔ اس میں کمی بیشی نہیں ہو سکتی۔ انسان موجودہ مفردات کی خاصیت تک بدلنے میں کامیاب ہو چکا ہے۔ اس کے بنائے ہوئے غبارے فضا میں کوئی پندرہ میل کی بلندی تک انسان کو لے جا چکے ہیں اور اب کرۂ ہوائی سے آگے فضائے بسیط میں سفر کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔ انسان کا بنایا ہوا چاند بہت جلد فضا میں پہنچنے والا ہے۔ غرض سائنس اور ٹکنالوجی نے ایسے ایسے کرشموں کو امکان کی حدود میں لا کھڑا کیا ہے جو صرف چند برس پہلے الف لیلیٰ کے قصوں کا جزو خیال کیے جاتے تھے۔

سائنس اور ٹکنالوجی کی اس ہوشربا ترقی نے انسانی معیشت پر بنیادی اثر ڈالا ہے۔ قدرتی اور زرعی پیداوار آج بھی اہم ہے۔ لیکن اب انسان کی بنائی ہوئی مشینیں بڑے بڑے کارخانوں میں خود نئے مفردات اور نئے مرکب اور ان سے طرح طرح کی چیزیں تیار کرنے لگی ہیں۔ تاریخ میں پہلی بار انسان فطرت کے عملیات کو نئی نئی شکل دینے کی بجائے ان میں اضافے بھی کرنے لگا ہے اور یہ کام بڑے بڑے شعبوں اور صنعتی مرکزوں میں انجام پا رہا ہے۔

سائنس اور ٹکنالوجی کی اس معرکتہ الآرا کامیابی نے دیہات کی جیدری آبادیوں کو بڑے بڑے شہری آبادیوں میں جمع کرنا شروع کر دیا ہے۔ یہ عمل اگرچہ پچھلے ۵۰ سالوں سے جاری تھا، مگر اس کی رفتار اب کئی گنا تیز ہو گئی ہے۔ کھلی ہوا میں بسنے والی دیہاتی آبادی ہر جگہ شہری اور صنعتی زندگی کی طرف کھنچی چلی آرہی ہے۔ یہ کیفیت صرف پاکستان ہی میں نہیں بلکہ امریکہ جیسے ترقی یافتہ ملک میں بھی ہے۔ دیہات سے نقل مکانی کر کے شہروں میں آبسنے کا سلسلہ دنیا کے ہر ملک میں جاری ہے اور اسے کوئی قوت روک نہیں سکتی۔ ایک ملک سے دوسرے ملک میں آباد ہونے پر پابندی لگائی جا سکتی ہے۔ مگر دیہاتی زندگی سے شہری صنعتی زندگی میں منتقل ہونے کو کوئی نہیں روک سکتا۔

شہری صنعتی زندگی کی توسیع نے طرح طرح کے معاشرتی مسائل پیدا کیے ہیں۔ دیہاتی زندگی کا سب سے نمایاں خاصہ اس کے گہرے انسانی مراسم ہیں۔ گاؤں کی معاشرتی زندگی ایسے چھوٹے چھوٹے گروہوں میں بسر ہوتی ہے، جہاں گروہ کا ہر فرد دوسرے کو بہت اچھی طرح جانتا ہے وہاں فرد کے لیے یہ ممکن نہیں کہ دوسروں کی نگاہ سے اوجھل ہو کر موثر معاشرتی زندگی کا کوئی حصہ بسر کر سکے۔ زندگی کے معاشی سیاسی اور اخلاقی گوشوں میں وہ دوسروں کے ساتھ دو بدو بات چیت کرتا اور اجتماعی زندگی میں حصہ لیتا ہے۔ شہری صنعتی زندگی میں یہ بات ختم ہو جاتی ہے، وہ ایک انبوہ میں ڈوب کر رہ جاتا ہے۔ اس کے ہمسائے اس کے حال سے بے خبر اور وہ ہمسائیوں کے حال سے بے خبر رہتا ہے۔ وہ جس کارخانے میں محنت مزدوری کرتا ہے وہاں اسے مشین کی طرح دن بھر معروف رکھا جاتا ہے۔ اسے یہ مہلت نہیں ملتی کہ کسی گروہی زندگی میں موثر حصہ لے۔ شہر میں زندگی کی بھاگ دوڑ اس قدر تیز، اور معاشی ضرورتوں کے تقاضے اتنے شدید بن جاتے ہیں کہ ایک عام محنت کار دوسروں کے ساتھ گہرے مراسم قائم کرنے کی فرصت ہی نہیں پاتا۔ اور اگر کسی طرح اسے یہ فرصت میسر آبھی جائے تو وہ دوسروں کو اس کے لیے آمادہ نہیں پاتا، وہ زیادہ سے زیادہ یہ کر سکتا ہے کہ کسی مزدور انجمن یا اس قسم کی کسی اور بڑی جماعت کا رکن بن جائے۔ لیکن ان جماعتوں کی باگ ڈور اس قدر دور دراز ہاتھوں میں ہوتی ہے کہ اسے ان کے معاملات میں موثر حصہ لینے کا موقع نہیں ملتا۔

تعلیم کی نئی ذمہ داری: - جو لوگ دیہاتی زندگی چھوڑ کر شہری صنعتی زندگی میں داخل ہوتے ہیں، وہ

اپنے آپ کو ایک نئی صورت حال سے دوچار پاتے ہیں، پڑھے لکھے ہونے کے باوجود وہ دیکھتے ہیں، کہ شہری صنعتی زندگی میں معاشرتی نہج پر چل رہی ہے۔ مدرسے کی رسمی تعلیم نے انہیں اس کی تربیت نہیں دی تھی۔ زود بدیر نئی معاشرتی زندگی کے تقاضے انہیں اپنے ڈھب پر لے آتے ہیں۔ لیکن یہ تعلیم غیر رسمی نوعیت کی تعلیم ہے۔ مدرسے کی رسمی تعلیم نے اس ضمن میں کچھ نہیں کیا تھا۔

غرض معاشرتی زندگی کا نیا اسلوب یہ ہے کہ یہ ایک بہت وسیع پیمانے پر رسمی گروہوں کی شکل میں منظم ہے، اور اس کے خدوخال معین کرنے والی قوت خصوصی مہارت کی قوت ہے۔ ہر شخص عملی پیداوار کے ایک چھوٹے سے حصے میں خصوصی مہارت پیدا کر لیتا ہے۔ اس کی اکیلی کوشش کچھ چیز پیدا نہیں کر سکتی بلکہ وہ اپنے جیسے سینکڑوں ہزاروں ماہرین کے ساتھ مل کر کام کرتا ہے، اور ان سب کی مشترکہ کوششوں سے ایک چیز وجود میں آتی ہے۔ جو لوگ بالکل اسی مہارت کے مالک ہوں جس کا وہ تمام مل کر ایک انجمن قائم کر لیتے ہیں، اس قسم کی بہت سی چھوٹی چھوٹی انجمنیں مل کر ایک عظیم الشان مزدور انجمن کی شکل اختیار کر لیتی ہیں۔ اس طور پر اس کے معاشی مفاد کی نگہداشت کا بندوبست ہوتا ہے۔ تقریباً قریباً یہی حال سیاسی اور اخلاقی امور کا نظر آتا ہے۔

معاشرتی زندگی کے اس نئے اسلوب اور اس کے عملی تقاضوں کو ترقی یافتہ ملکوں کے مدرسوں نے بھی ابھی پوری طرح نہیں سمجھا۔ تعلیم ابھی لوگوں کو پوری طرح اس قابل نہیں بنا رہی کہ وہ جدید قسم کی معاشرتی زندگی میں موثر اور بھرپور حصہ لے سکیں۔ اپنی نئی ذمہ داری کو نہ سمجھنے کے باعث مدرسے ایسے شہری تیار کر رہے ہیں جو اجتماعی زندگی کی نئی ذمہ داریوں کو اچھی طرح پورا نہیں کر سکتے۔ نتیجہ یہ ہے کہ سماجی زندگی میں جگہ جگہ خلا اور الجھے ہوتے مسائل نظر آ رہے ہیں۔ ترقی یافتہ ملکوں میں اس صورت حال کا مقابلہ کرنے کے لیے تعلیم بالغاں کے مختلف منصوبے تیار کیے گئے ہیں۔ یہ تعلیمی منصوبے عوام کی ایک حقیقی معاشرتی ضرورت پیدا کرتے ہیں۔

بنیادی اصول

جیسا اس مضمون کے آغاز میں کہا گیا تھا تعلیم بالغاں کا یہ وسیع تصور ابھی ہمارے ملک میں پیدا

نہیں ہوا۔ تاہم اس کی ضرورت سے انکار کرنا محال ہے۔ ہماری تعلیم کو صرف یہی مسئلہ درپیش نہیں کہ اس ملک کے کروڑوں باشندے ابھی ان پڑھ ہیں۔ اس کے سامنے وہ دوسرا سوال بھی موجود ہے جس کا سامنا آج ترقی یافتہ ملکوں کو بھی ہے۔ ہمارا پڑھا لکھا طبقہ بھی معاشرتی زندگی کے اس نئے اسلوب کے لیے تیار نہیں جو بے پناہ معاشی قوتوں کے طفیل تیزی سے وجود میں آرہے ہیں، پس اس ملک کے لیے تعلیم بالغاں کا جو منصوبہ بھی بنایا جائے، اسے دونوں مسائل کے حل ڈھونڈنے ہوں گے۔

تعلیم بالغاں کا کوئی منصوبہ تیار کرتے وقت مندرجہ ذیل اصولوں کو پیش نظر رکھنا چاہیے۔

(۱) بالغوں کے جس گروہ کے لیے تعلیم کا بندوبست کیا جا رہا ہو، پہلے اس کا اچھی طرح مطالعہ ہونا چاہیے ہر تعلیمی منصوبے کی کامیابی کے لیے پہلی ضروری شرط یہ ہے کہ وہ طالب علموں کے حسب حال ہو۔ بالغوں کے لیے موزوں تعلیمی منصوبہ وہ ہوگا جو ذیل کی باتوں کا لحاظ رکھ کر تیار کیا جائے گا۔

(ا) تعلیم پانے والے لوگوں کے دیرینہ معاشرتی مراسم کن کن سے اداروں اور جماعتوں کے ساتھ ہیں یہ واقفیت اس لیے ضروری ہے کہ یہ تمام ادارے اور جماعتیں اپنے اراکین کی زندگیوں کو ایک مخصوص سانچے میں ڈھالنے کے لیے کوشاں رہتے ہیں۔ انہیں نظر انداز کر کے کوئی تعلیمی کوشش کامیاب نہیں ہو سکتی۔

(ب) تعلیم پانے والے لوگوں کی عام ضروریات کے پورا ہونے کے رسمی طور طریقے کیا ہیں؛ خرید و فروخت کے کیا طریقے مروج ہیں۔ ملکی امن و امان برقرار رکھنے کے لیے کیا ذرائع استعمال ہو رہے ہیں؛ ثقافتی ضرورتوں کے پورا ہونے کی کیا صورت ہے؛ بچوں کی تعلیم کا کیا انتظام ہے؛ بیماری اور حادثات کی روک تھام اور ان سے بچاؤ کا کیا بندوبست ہے۔

(۲) جو مقاصد تعلیمی منصوبے کی تہ کار فرما ہیں کیا وہ بجا ہیں؛ اس سے مراد یہ ہے کہ بالغ لوگوں کے معاشرتی اور نفسیاتی مسائل کے جو حل تجویز کیے گئے ہیں اور ان کے نقطۂ نگاہ میں جو تبدیلی پیدا کرنا مطلوب ہے آیا وہ ممکن الحصول ہے، اور اگر ہے تو کیا مجوزہ ذرائع حصول مقصد کے ضامن ہوں گے؛ اس امر کا فیصلہ کرنا بے حد دشوار ہے اور اہم بھی، کیونکہ یہاں مختلف قدروں کے درمیان انتخاب کرنا پڑتا ہے۔

اس سلسلے میں بڑی دشواری ایسے معیاروں یا ضابطۂ عمل کا انتخاب ہے جسے عوامی پسندیدگی حاصل ہو سکے۔ یہ معیار ایسے ہوں جو گروں کے اخلاقی اور معاشرتی شعور سے زیادہ سے زیادہ قریب ہوں یہ مسئلہ دو گونہ مشکل کا حامل ہے۔ اول معیاروں کی تشکیل کے وقت ان کا پورا پورا جائزہ، دوم ان کے حصول کے لیے موزوں تکنیکوں کی تلاش۔

(۳) تیسرا اہم سوال مجوزہ معیاروں کے حصول کے لیے موزوں وسائل کا بہم پہنچانا ہے۔ تعلیمی منصوبے پر عمل پیرا ہونے والوں کو پہلے یہ دیکھنا پڑتا ہے کہ مقامی طور پر کون کون سے وسائل دستیاب ہیں، اور ان سے کس حد تک خدمت لی جا رہی ہے، یہ مسئلہ محض معاشی یا منطقی نہیں بلکہ ایک نفسیاتی مسئلہ بھی ہے مجوزہ منصوبے کی رفتار ترقی اور اس کی آخری کامیابی زیر تعلیم بالغوں کے ولولۂ عمل اور ان کے نقطۂ نگاہ پر گہرا اثر ڈالنے والی ثابت ہوگی۔ اس لیے منصوبے چلانے والوں کے لیے یہ بات بے حد اہم ہے کہ ان کے پاس حصول کامیابی کے کون سے ذرائع ہیں اور ان ذرائع سے موثر خدمت لینے کی بہترین صورت کیا ہے؟

(۴) چوتھا اہم سوال یہ ہے کہ مجوزہ منصوبہ کا آغاز کس طور پر کیا جائے کہ اس کے متعلق زیادہ سے زیادہ سرگرمی پیدا ہو سکے۔ یہ نکتہ کامیابی کے لیے بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ ماہرین تعلیم اس حقیقت سے اچھی طرح آگاہ ہیں کہ جہاں عوام کسی معاشرتی تبدیلی کی ضرورت کا احساس بھی رکھتے ہوں۔ وہاں بھی ایسی تبدیلی کے بارے میں بالعموم خوف کے جذبات کا اظہار کیا جاتا ہے۔ لیا اوقات تعلیم بالغاں کے منصوبے کی مخالفت کی اصل وجہ یہ خوف ہوتا ہے نہ کہ مجوزہ تبدیلی سے عدم اتفاق، اس ڈر کو سرگرمی سے تبدیل کرنا منصوبہ چلانے والوں کی ذہنت نگاہ اور ہوش مندی کا کڑا امتحان لیا کرتا ہے۔

(۵) پانچواں مسئلہ تعلیمی منصوبے کی کامیابی کا آخری جائزہ لینا ہے، یہ کام منصوبے کی آخری منزل پر انجام پائے گا۔ معاشرتی تجربات میں یہ امر تقریباً یقینی ہے کہ منصوبے کے بعض حصے متوقع نتائج پیدا نہیں کریں گے۔ عین ممکن ہے کہ منصوبہ جہاں بعض واضح طور پر پسندیدہ نتائج پیدا کرے وہاں اس کے بعض نتائج ضرر رساں بھی ہوں۔ پس مجموعی نتائج کی پیمائش کے لیے قابل اعتماد آلات پیمائش کا وضع کرنا ضروری ہے۔

تعلیم بالغاں کا اس قسم کا منصوبہ اپنی تشکیل اور کامیابی کے لیے نہ صرف تعلیمی نظریات کے علم کا مطالبہ کرتا ہے، بلکہ تحقیقاتی مطالعہ کا بھی۔ جہاں اور جب اس قسم کا مطالعہ ممکن ہو اس سے پورا پورا فائدہ اٹھانا چاہیے۔ تعلیمی نظریات کا علم اور گذشتہ تعلیمی تجربوں کے نتائج ہی وہ قابل اعتماد رہنما ہیں جو تعلیمی منصوبہ بندی سے حسب خواہش نتائج پیدا کرنے کے ضامن ہو سکتے ہیں۔

تعلیمی تحقیقات کی مدد سے تعلیم بالغاں کے منصوبوں کو خاصی آسانی سے کامیاب بنایا جا سکتا ہے، اسکی مدد سے اہم اعداد و شمار فراہم کیے جا سکتے ہیں۔ بالغوں کے گروہ کی دلچسپیوں، ضروریات، اور معاشرتی تعاملات کا جائزہ لیا جا سکتا ہے۔ ان حقائق کو بنا قرار دے کر وہ تعلیمی آلات مرتب کیے جا سکتے ہیں، جن سے منصوبے کی رفتار ترقی اور اس کے آخری نتائج کی پیمائش ہو سکتی ہے۔ ان تمام باتوں کے علاوہ تعلیمی تحقیقات کی مدد سے کسی تعلیمی منصوبے کے متوقع نتائج کا قبل از وقت اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ غرض تعلیمی تحقیقات تعلیم بالغاں کی کامیابی کے لیے ازبس لازمی ہے۔

یونیورسٹی تعلیم کا مقصد

شاہد اشرف

یونیورسٹیاں کیوں وجود میں آتی ہیں؟ انہیں وظیفے اور اوقاف کیوں دیے جاتے ہیں؟ حکومتیں ان کی کیوں حوصلہ افزائی کرتی ہیں؟ طلبہ ان میں کیوں داخلہ لیتے ہیں؟ مختلف ملک اپنی یونیورسٹیوں پر کیوں فخر کرتے ہیں؟

یہ وہ سوال ہیں جو ہر یونیورسٹی کو لگاتار اپنے آپ سے پوچھتے رہنا چاہئیں۔ حقیقت یہ ہے کہ یونیورسٹیوں کو وجود میں لانے والی بنیادی قوت وہی علمی پیاس ہے جو آج سے ہزاروں برس پہلے علم و حکمت کے متلاشیوں کو قدیم یونان اور ہندوستان کے حکیموں کے گرد جمع کر دیا کرتی تھی۔ علم کے ان پیاسوں کے سامنے صرف ایک سوال ہوتا تھا، وہ یہ کہ حکمت اور فہم کے حاصل کرنے کے لیے کس دروازے پر دستک دی جائے۔

جدید یونیورسٹیوں کا آغاز

یورپ میں یونیورسٹیوں کی داغ بیل آج سے آٹھ سو برس پہلے اس وقت پڑی جب تحریک احیائے علوم کے زیر اثر یورپ نے قرون مظلمہ سے قدم باہر رکھا۔ اول اول ان کی نوعیت استادوں اور عالموں کے ایک بھائی چارے کی تھی۔ یہ عالم یورپ بھر سے سمٹ سمٹا کر چند مرکزوں میں جمع ہو گئے تھے، ان سب کے درمیان قدر مشترک علم کے ساتھ عشق تھا، ان کے پیش نظر صرف یہ مقصد تھا کہ مطالعہ کی زندگی کو ممکن بنایا جائے خواہ یہ مطالعہ چند سالوں پر محیط ہو اور خواہ مدت العمر پر۔ اس مطالعہ کا امتیازی نشان یہ قرار دیا گیا تھا کہ استاد اور استاد، شاگرد اور شاگرد، استاد اور شاگرد کے درمیان ایک سرگرم رشتہ قائم کیا جائے۔"

ان علمی مرکزوں کا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے اپنے زمانے کی ثقافت کو نہ صرف محفوظ رکھا، بلکہ اسے نئی پود کے حوالے کیا۔ انہوں نے پرانی ثقافتوں کا مطالعہ کیا اور یہ جلد ہی ایسی تربیت گاہوں میں تبدیل ہو گئے جہاں مذہبی اداروں اور حکومت میں کلیدی اسامیوں پر فائز ہونے والے لوگ تیار کیے جانے لگے۔ یہ تربیتی مرکز

اپنے فارغ التحصیل طلبہ کو ایم۔ اے کی ڈگری دیتے تھے۔ یہ ڈگری دوسری یونیورسٹیوں میں تسلیم کی جاتی تھی اور ڈگری کے مالک کو معلمی کا حق دلاتی تھی۔ علم کے پیاسے لوگوں کی یہ جماعتیں رفتہ رفتہ وقار اور اقتدار حاصل کرتی گئیں، اور آج ہم انہیں یورپ کی مشہور عالم یونیورسٹیوں کی شکل میں دیکھتے ہیں۔

موجودہ مقاصد

جدید یونیورسٹیوں کی تاریخ پر ایک نگاہ ڈالنے کے بعد فوراً ذہن میں یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ موجودہ دور میں ان کا منصب اور مقصد کیا ہونا چاہیے؟ اس سوال کا تسلی بخش جواب معلوم کرنے کی بہتر صورت غالباً یہ ہوگی کہ پہلے وہ چیزیں معلوم کرلی جائیں جو یونیورسٹی کے مقاصد میں شامل نہ ہونی چاہئیں۔ یونیورسٹی کسی ایسے ادارے کا نام نہیں جو مدرسے کی تعلیم کو جلا دے کر اسے آخری شکل دیتا ہو، یہ کوئی ٹیکنیکل یا تجارتی کالج نہیں۔ یہ کوئی تحقیقاتی انسٹیٹیوٹ نہیں، یہ کوئی ایسی تربیت گاہ نہیں جو کسی مخصوص سیاسی یا مذہبی عقیدے کی تعلیم دیتی ہو تاہم یہ ممکن ہے کہ یونیورسٹی میں مندرجہ بالا شعبوں میں سے کچھ یا سب کے سب شعبے شامل ہوں۔ ایک یونیورسٹی کا نمایاں خاصہ اس کی کثیر المقصدیت ہے۔ یہ بیک وقت بہت سے مقاصد کو پورا کرنا چاہتی ہے اور ان مقاصد کی ایک ساتھ تکمیل ان میں سے ہر مقصد کو سہارا دینے والی ثابت ہوتی ہے۔

ایک جدید یونیورسٹی کا ایک مقصد یہ ہے کہ علمی پیشوں میں داخل ہونے والے لوگوں کو عام قسم کی ابتدائی تربیت دے۔ پہلے دن سے ہی ان علمی پیشوں میں، وکیلوں، طبیبوں اور مذہبی رہنماؤں کا شمار ہوتا چلا آیا ہے آج ان پیشوں میں دوا سازوں، انجینئروں اور ماہرین زراعت کا شمار بھی ہوتا ہے۔ بلکہ اس زمرے میں وہ تمام لوگ شامل ہیں، جو انسانی کوشش کے کسی بھی میدان میں رہنمائی کی خدمت انجام دے رہے ہوں۔ تاہم یونیورسٹی تعلیم کا یہ مقصد ہرگز نہیں کہ مختلف فنی میدانوں کے لیے ماہر کاریگر پیدا کرے۔ اس کا مقصد صرف یہ ہے کہ ان سائنسی اصولوں کا گہرا اور پُر معنی فہم پیدا کرے، جن پر ہر قسم کی مہارت کا آخرالامر مدار ہے۔ مثلاً طبی میدان میں ماہر طبیب اسے شمار کیا جائے گا جس کے سائنسی فہم کی پرکھ ہو چکی ہو۔ موجودہ دنیا کو ماہرین فن کی روز افزوں تعداد میں ضرورت ہے۔ جدید یونیورسٹیاں اس قسم کے ماہرین کی تربیت کر کے نوع انسان کی خدمت انجام دے رہی ہیں، اس کے ساتھ ہی وہ افراد کی خدمت بھی انجام دیتی ہیں، وہ خود کو اس قابل بناتی ہیں کہ اپنی

صلاحیتوں کو معلوم کر کے انہیں ترقی کے اونچے سے اونچے مقام تک لے جائے ۔

لیکن اگر یونیورسٹیاں مخصوص ماہرین پیدا کرنے پر ہی اکتفا کر دیں تو ان کی تعلیم بڑی حد تک غلط انداز قسم کی ہوں گی۔ ایسی یونیورسٹیاں ایسے ماہرین فن پیدا کریں گی جو اصحاب اقتدار کے ہاتھ میں کٹھ پتلیاں بن کر رہ جائیں گے۔ ایسے ماہرین فن انسانی بہبود کے وسیع تر مقاصد سے بالکل بے خبر ہوں گے، اور ان کی مہارت کسی بلند تر مقصد کی خدمت نہیں کر سکے گی۔

اس خطرے کے سد باب کی ایک ہی صورت ہے وہ یہ کہ یونیورسٹی ایک وسیع المشرب تعلیم کا اہتمام بھی کرے۔ ایسی تعلیم جو آزاد اور ذمہ دار شہری پیدا کرے۔ یونیورسٹی تعلیم کا منصب محض کاروبار کی تعلیم دینا نہیں بلکہ اوقات فراغت کو پُر نفع طور پر گزارنے کی تعلیم دینا بھی۔ لہٰذا یونیورسٹی تعلیم کا ایک اہم فرض یہ ہے کہ طلبہ کو ان کے روحانی ورثہ کا شیدائی بنا کر ان کی ذہنی دنیا کو مالا مال کر دے۔ اس روحانی ورثہ میں مذہب، ادب اور فنون کے شاہکاروں کو شمار کیا جائے گا۔

یونیورسٹی تعلیم کا یہ بھی فرض ہے کہ نوجوانوں کو ان اپنے زمانے کے اہم تصورات سے آگاہ کرے۔ وہ انہیں مروجہ غالب فلسفوں سے آشنا کرے اور بتائے کہ ان فلسفوں کے مطابق نظام عالم اور انسان کو کیا درجہ دیا گیا ہے، اور یہ درجہ خود ان کے اپنے فلسفے کے مقابلے میں کیا مقام رکھتا ہے۔ یہ علم اور اعتقاد نوجوانوں کو اس قابل بنا سکتا ہے کہ اپنی فنی مہارت سے ایک آزاد دنیا میں ذمہ داری کے ساتھ خدمت بھی انجام

جدید زندگی کی پیچیدگی

لیکن موجودہ دور میں اتنا کچھ کر لینے کے بعد بھی یونیورسٹی تعلیم اطمینان کے ساتھ نہیں بیٹھ سکتی

پرانے وقتوں میں جب دنیا کا معاشی اور سیاسی نظام بالکل سادہ تھا۔ فنی تعلیم اور وسیع المشرب تعلیم مل کر ایک شریف آدمی کے لیے کفایت کر سکتی تھیں۔ وہ اسے اس قابل بنا سکتی تھیں کہ زندگی کے مختلف میدانوں میں رہنمائی کا بوجھ خوبی اور قابلیت کے ساتھ سنبھال سکے۔ موجودہ دنیا بہت مختلف قسم کی ہے اس کی آبادی بے حد گھنی ہو چکی ہے اور اس کی معاشی اور سیاسی زندگی کے رشتے اس طرح الجھے ہوئے کہ ایک عام آدمی ان کے متعلق کچھ نہیں سمجھ سکتا۔ موجودہ دور کا سب سے مشکل مسئلہ یہ ہے کہ ایک طرف

کروڑوں انسان بھوک، غلاظت اور بیماری کے چنگل میں گرفتار ہیں اور دوسری طرف سائنس اور ٹکنالوجی کی ترقی پر بجلی کی تیزی کا گمان ہوتا ہے۔ آج دنیا کی قسمت کی باگ ڈور جن ہاتھوں میں ہے، ان کے لیے سب سے بڑا سوال یہی ہے کہ نوع انسان کا جو بڑا حصہ تباہی کے گڑھے کے کنارے کھڑا ہے اسے سائنس اور ٹکنالوجی کی مدد سے کیوں کر بچایا جائے۔ یونیورسٹی تعلیم بنیادی طور پر رہنمائی کا بوجھ سنبھالنے کی تربیت ہے، موجودہ دور کے رہنماؤں کو ایشیا اور افریقہ کے کروڑوں انسانوں کو فاقہ مستی، غلاظت اور بیماری کے گڑھے سے باہر نکالنا ہے۔ اگر یونیورسٹی تعلیم سائنس اور ٹکنالوجی کی مدد سے اس مشکل مسئلہ کا شافی حل پیش نہیں کرتی تو وہ تعلیم یقیناً ادھوری ہے۔

پرانے وقتوں کی یونیورسٹیاں پرانی روایات کو محفوظ رکھنا اپنا بہت بڑا کارنامہ خیال کرتی تھیں۔ جدید دور تبدیلی اور انقلاب کا دور ہے۔ سائنس اور ٹکنالوجی کی ہوش ربا ترقی نے نہ صرف دنیا کے معاشی نظام کی کایا پلٹ دی ہے۔ بلکہ فاصلے کے معدوم ہو جانے سے نوع انسان کے مختلف گروہ ایک دوسرے سے اسقدر قریب ہو گئے ہیں کہ آج دنیا میں ہر جگہ ایک فقید المثال معاشرتی انقلاب برپا نظر آتا ہے۔ مغرب کی غالب ثقافت دنیا کے دور دراز گوشوں تک وارکر رہی ہے اور پسماندہ ملکوں کی ثقافتیں حفاظت نفس کی خاطر ایک آخری اور فیصلہ کن جنگ میں ایڑیاں رگڑتی نظر آتی ہیں۔ معاشرتی انقلاب کے اس دور میں اکثر یونیورسٹیوں کے لیے یہ ممکن نہیں رہا کہ وہ پرانی روایات کے تحفظ کو ایک اہم مقصد بنائے رکھیں۔ پہلے وقتوں کی یونیورسٹیوں کے لیے کسی بڑے آدمی یا مشہور عالم کا قول بطور سند نقل کر دینا کافی ہوا کرتا تھا۔ جدید یونیورسٹیوں کے لیے یہ بات ممکن نہیں رہی۔

ان غیر معمولی حالات نے یونیورسٹی کے ذمہ تیسرا اہم فرض یہ عائد کیا ہے کہ وہ علم و سائنس کے تمام میدانوں میں آزادانہ تحقیق و مطالعہ کو ترقی دے۔ یہ فرض اسی صورت میں پورا ہو سکتا ہے جب یونیورسٹی کے اساتذہ، تحقیق و جستجو کے میدان میں رہبری کا کام انجام دیں، اگرچہ ماضی میں ایجاد و انکشاف کا بہت سا کام اکیلے ذہنوں کی پیداوار تھا۔ لیکن اب سائنس اور ٹکنالوجی ترقی کے اس درجہ پر پہنچ چکی ہیں، جہاں اکیلے ذہنوں کی بجائے بہت سے سلجھے ہوئے ذہن باہم مل کر زیادہ مفید خدمت انجام دے سکتے ہیں۔ مزید برآں یہ

بات بھی قابل لحاظ ہے کہ کوئی حقیقت دریافت کرنے والا جب خود اس انکشاف کی ترجمانی کرتا ہے تو یہ تعلیم بدرجہا زیادہ موثر ثابت ہوتی ہے، دوسروں کے پیش کیے ہوئے نظریات کی وکالت اور دوسروں کے معلوم کردہ حقائق کی تشریح کبھی اس زندہ جذبے اور یقین کے ساتھ نہیں کی جاسکتی جو اپنے ذاتی معتقدات اور ذاتی مشاہدات کا امتیازی خاصہ ہے۔

ایک انتباہ

اس ضمن میں ایک انتباہ بے حد ضروری ہے، وہ یہ کہ یونیورسٹی اساتذہ کا تحقیقی کام طلبہ کے لیے اسی صورت میں فائدہ مند ہو سکتا ہے، جب وہ اس سعی میں طلبہ کو بھی برابر کے رفیق اور شریک کار بنائے رکھیں۔ طالب علم بدیہی طور پر نسبتاً خام طبع اور ناتجربہ کار ہوں گے۔ ان سے اس گہری نگاہ اور وسیع ذہنی پس منظر کی توقع عبث ہے، جو ایک پختہ کار استاد کا امتیازی نشان ہوا کرتی ہے۔ تاہم اگر استاد نے اپنے اور طلبہ کے درمیان فاصلہ قائم نہیں کر رکھا، اگر اس کے اور طلبہ کے درمیان سرگرم انسانی رشتہ استوار ہے تو طلبہ استاد کے سائنسی طریق کار اور اس کی دور رس نگاہ سے ایک پائدار تاثر لیں گے۔ ایک ایسا تاثر جو ان کی ساری ذہنی ساخت پر پائدار اثر باقی چھوڑے گا۔ غرض یونیورسٹی کی زندگی کا سب سے نمایاں خاصہ اشتراک عمل ہونا چاہیے تاکہ اس کی رنگا رنگ سرگرمیاں ایک دوسرے کو متاثر کریں اور اس طرح ان سب کی قوت اور افادیت میں اضافہ ہو۔

ایک اہم نکتہ

ہر جدید یونیورسٹی کا وجود ملکی مجلس قانون ساز کے کسی قانون پر مبنی ہوتا ہے، اس قانونی وجود کے علاوہ ہر یونیورسٹی کو بہت سے آلات کی ضرورت ہے۔ ان آلات میں عمارت، ساز و سامان، کتابوں اور استادوں کو اہم مقام حاصل ہے، یہ تمام چیزیں نہ صرف فراوانی کے ساتھ موجود ہونا چاہئیں، بلکہ خوبی کے لحاظ سے بھی ان کا مقام اونچا ہونا چاہیے۔ ان لوازمات کے معاملہ میں ایک کم از کم معیار بالکل ناگزیر نظر آتا ہے۔ یہ سب کچھ ہے، لیکن محض عمارت اور ساز و سامان یا لیکچر کسی ادارے کو یونیورسٹی نہیں بنا سکتے یہ عین ممکن ہے کہ ایک ادارہ ہر قسم کے ظاہری لوازمات سے لیس ہونے کے باوجود حقیقی معنوں یونیورسٹی

نہ ہو۔ یونیورسٹی بننے کے لیے اس ادارے کے پاس ظاہری لوازمات سے بڑھ کر ایک اور چیز ہونی چاہیے، اور وہ چیز ہے علمی انہماک کی فضا۔ ایک ایسی فضا جس میں اساتذہ اور طلبہ یکساں شغف کے ساتھ مطالعہ و تحقیق کی زندگی میں کھوئے ہوئے ہوں۔ سیاسی نسلی اور لسانی اختلافات کے باوجود ان سب کے سامنے ایک مشترکہ مقصد ہو، وہ یہ کہ حقائق و واقعات کے چہرے سے پردہ اٹھا کر انہیں ان کے اصل رنگ میں دیکھا جائے، استادوں اور نوجوانوں کا جو گروہ اس انہماک کے ساتھ مطالعہ میں معروف ہوگا وہ یونیورسٹی کی اصل روح ہوگی۔ یہ لوگ اپنی مختلف دلچسپیوں کے باوجود ایک ہی جذبے سے سرشار ہوں گے، ان میں سے خواہ کوئی طب کا مطالعہ کر رہا ہو یا تاریخ کا، خواہ وہ فلسفے کا طالب علم ہو یا سائنس کا، وہ سب ایک دوسرے کی اہمیت سے واقف ہوں گے، اور ایک دوسرے کا احترام کریں گے۔

ضروری عناصر

یہ علمی ماحول اور ذہنی آب و ہوا جسے یونیورسٹی کی حقیقی روح کہا گیا ہے، طویل توجہ اور محنت سے ہی پیدا کی جا سکتی ہے۔ ہر یونیورسٹی جو اپنے صحیح مقام کو حاصل کرنا چاہتی ہو اسے اس فضا کے پیدا کرنے کی فکر کرنی چاہیے۔ اس فضا کے اہم عناصر مندرجہ ذیل ہیں:۔

(۱) ایک شدید قسم کا ذہنی جذبہ، اس سے مراد ذہنی پیاس ہے جو چیزوں کی ماہیت کے علم کو بذات خود مقصود خیال کرتی ہو۔ یونیورسٹی کو ذہنی ضبط کا مرکز ہونا چاہیے، ایک ایسا مرکز جو ذہنی ضبط کے بلند معیاروں کا مطالبہ کرے، اور کسی نیم دلانہ یا نیم پختہ کوشش سے مطمئن نہ ہونا جانتا ہو، یہ ایک ایسا علمی مرکز ہو، جو ہر علمی تلاش کو انتہائی حدوں تک لے جانے کا شیدائی ہو، اور کوئی دشواری اس کے اس جذبۂ جستجو کو ٹھنڈا نہ کر سکے، غرض یونیورسٹی کا سب سے غالب مقصد علم و دانش کی تلاش ہونی چاہیے۔

(۲) یونیورسٹی کے ماحول کا دوسرا اہم عنصر اس کا والہانہ جذبۂ تکمیل ہے، وہ جس مسئلہ کو ہاتھ ڈالے اسے پورے عزم کے ساتھ ہاتھ ڈالے، اور اس کے ہر ممکن پہلو کا جائزہ لینے سے کسی کوشش اور محنت سے دریغ نہ کرے۔

(۳) یونیورسٹی کی فضا کا تیسرا اہم عنصر اس کی ذہنی ثقافت ہونی چاہیے، اس کے تمام تحقیقاتی اور عملی

منصوبوں کا غالب مقصد انکشاف حقیقت ہونا چاہیے نہ کہ حصول نتیجہ۔ واقعات و حقائق کے کسی حصے کو محض اس لیے نظر انداز نہ کر دینا چاہیے کہ وہ کسی وجہ سے سب حال نہیں۔

(۴) یونیورسٹی فضا کا چوتھا اہم عنصر عجز و انکسار ہے۔ حقیقی عالم وہ ہے جسے اپنی بے خبری کا شدید احساس ہو۔ جوں جوں اس کا علم بڑھتا ہے، اسی قدر اس کا یہ احساس بھی بڑھتا ہے کہ اس کا علم کس قدر محدود ہے۔ یونیورسٹی کی فضا میں اپنی علمی بے بضاعتی کا احساس بڑی آسانی سے پیدا ہو سکتا ہے۔ بشرطیکہ ہم اپنی معلومات اور اپنے تعصبات کو غیر معمولی قدر و قیمت دینے کے عادی نہ ہوں۔

(۵) جو یونیورسٹی مندرجہ بالا عناصر پر مشتمل ذہنی آب و ہوا پیدا کر لے، اسے اطمینان ہونا چاہیے کہ اس نے متنازعہ فیہ مسائل پر غور و خوض کرنے کے لیے صحت مند ذہنی ماحول پیدا کر لیا ہے۔ جو لوگ اس قسم کے ماحول میں تربیت پائیں گے وہ ہر نقطہ نگاہ کو ہمدردی کے ساتھ سمجھنے کے قابل ہوں گے، ان کے قلب و نگاہ میں وہ آفاقی وسعت ہوگی جو اجنبی سے اجنبی دل و دماغ کو بھی اپنا گرویدہ بنا لے گی، یہ ایسے لوگ ہوں گے جو اپنے مفروضات اور نقطہ ہائے نگاہ پر بے لاگ تنقید کر سکیں گے۔ اس قسم کا ذہنی ماحول اس بات کی سب سے بڑی ضمانت ہوگا کہ کسی مسئلہ کا سامنا کرنے سے گریز نہیں کیا جائے گا۔ خواہ یہ مسئلہ شدید قسم کے جذبات کو ابھارنے والا ہی کیوں نہ ہو اور خواہ اس کا مطالعہ ہمارے مفروضات کی بنیادیں ہلا دینے والا ہی ثابت کیوں نہ ہو۔ یونیورسٹی کا واحد مقصد حقیقت کے چہرے سے ہر قسم کے پردے اٹھانا ہے اور بس۔ تاکہ یہ چہرہ پوری تابانی کے ساتھ منظر عام پر آ جائے۔

یہ ہیں مختصراً وہ بلند مقاصد جن کا احترام دنیا کی ہر یونیورسٹی کرتی ہے، اور جن کے حصول کے لیے ہر یونیورسٹی امکان بھر کوشاں رہتی ہے۔ یہ درست ہے کہ دنیا کی کوئی یونیورسٹی یہ دعویٰ نہیں کر سکتی کہ اس نے ان تمام مقاصد کو کلی طور پر حاصل کر لیا ہے۔ تاہم غالباً ہر یونیورسٹی یہ دعویٰ کر سکتی ہے کہ وہ ان مقاصد کے حصول کے لیے کوشاں ہے۔

غرض یونیورسٹی کا اولین مقصد تلاش حق ہے۔ یونیورسٹی سے مراد ایسے لوگوں کا ایک گروہ ہے جو

تلاش حق کے لیے اپنی زندگیاں وقف کر چکے ہوں، یہ لوگ اساتذہ اور طلبہ پر مشتمل ہوتے ہیں۔ وہ باہم مل کر ایک ایسی زندگی کی داغ بیل ڈالتے ہیں جس کی بنیاد باہمی تعاون اور اشتراک پر ہوتی ہے۔ اس باہمی میل جول کی زندگی سے ایک دل دوسرے سے متاثر ہوتا ہے، اور اس طرح تعلیم و تدریس کا سلسلہ جاری رہتا ہے، اس کی مثال بالکل یہ ہے کہ ایک بھڑکتے ہوئے دل سے چنگاریاں اٹھا کر دوسرے دلوں میں آگ لگا دیں۔ اور یہ سلسلہ اسی طرح جاری رہے، جن لوگوں نے اس قسم کی ذہنی آب و ہوا میں تربیت پائی ہو، وہ خواہ دنیا کے کسی ملک یا خطے کے بسنے والے ہوں وہ سب اپنے آپ کو ایک مضبوط ذہنی رشتے میں منسلک پائیں گے۔

سرجان سارجنٹ

ہندوستانی یونیورسٹیوں کا مستقبل

ترجمہ از انیس احمد

نوٹ:- سرجان سارجنٹ ۱۹۳۳ء سے لے کر ۱۹۴۸ء تک حکومت ہند کے مشیر تعلیم تھے موصوف نے برصغیر پاک و ہند کے نظام تعلیم کا گہری نگاہ سے مطالعہ کرنے کے بعد اس کی تعمیر نو کے متعلق کارآمد مشورے دیے تھے۔ اس مضمون میں سرجان سارجنٹ نے ہماری یونیورسٹیوں اور ان کے مستقبل کے متعلق اظہار خیال کیا ہے۔ امید ہے سرجان کے یہ افکار دلچسپی سے پڑھے جائیں گے۔ مدیر معاون

اس بات کو تقریباً چھبیس برس ہونے کو آئے ہیں، جب میں نے یونیورسٹی تعلیم کمیشن کی رپورٹ کی پہلی جلد بڑی دلچسپی کے ساتھ پڑھی۔ اس کمیشن کی صدارت مشہور ماہر تعلیم ڈاکٹر رادھاکرشنن نے کی تھی۔ ان کے نو رفقائے کار یونیورسٹی تعلیم کی دنیا میں بڑے پائے کے لوگ تھے۔ ان میں سے چھ ہندوستانی تھے۔ دو امریکی اور ایک انگریز جو ایک برطانوی یونیورسٹی کا وائس چانسلر تھا۔

اس کمیشن کی تحقیقات آٹھ ماہ تک جاری رہیں۔ یہ امر ہرگز حیران کن نہیں کہ اس محنت کا نتیجہ ایک ایسی رپورٹ تھی جو اپنے مندرجات اور طوالت دونوں کے لحاظ سے حیرت انگیز تھی۔ رپورٹ میں کہا گیا تھا کہ اس کی دوسری جلد بھی شائع کی جائے گی۔ جس میں اعداد و شمار دیے جائیں گے، اور ان بے شمار شہادتوں کے خلاصے درج ہوں گے جن پر کمیشن نے اپنے نتائج کی بنیاد رکھی ہے۔ معلوم نہیں کہ مجھے اس بات پر افسوس کرنا چاہیے یا اطمینان کا اظہار کہ میں نے اس دوسری جلد کو ہرگز نہیں دیکھا۔

بے حد طویل

جگہ کی قلت کے باعث اگر یہ محسوس ہو کہ میں نے اس مضمون کا بہت زیادہ حصہ مندرجہ بالا رپورٹ کی خامیوں پر بحث کرنے کی نذر کر دیا ہے تو اس سے رپورٹ کی خوبی میں کوئی کمی واقع نہ ہوگی۔ کیوں کہ یہ رپورٹ

پختہ تجربے اور پُر دانش مشوروں پر مشتمل ہے۔

رپورٹ پڑھ کر میرا پہلا ردِ عمل یہ تھا کہ یہ بے حد طویل ہے، اتنی طویل کہ وہ معروف لوگ ــــ سیاست دان اور دوسرے لوگ ــــ جن کی تائید اور دلچسپی بالآخر اس رپورٹ کی سفارشات کو عملی جامہ پہنانے کا فیصلہ کرے گی، وہ اس طویل تحریر سے بخوبی مستفیدہ ہو سکیں گے۔ مجھے یاد ہے کہ ۱۹۴۳ء میں جب میں تعلیم کی مشاورتی کمیٹی کی رپورٹ مرتب کر رہا تھا اور جس رپورٹ کا موضوع زمانہ مابعد جنگ میں تعلیم کی تعمیر نو تھا تو میں نے فیصلہ کیا تھا کہ رپورٹ سو صفحات سے زیادہ نہیں بڑھے گی، اس میرا مقصد یہ تھا کہ یہ رپورٹ نہ صرف دلچسپی رکھنے والے عوام پڑھیں بلکہ وہ صاحب اختیار لوگ بھی جو شاید اس کے متعلق کچھ عملی قدم اٹھا سکیں، میرا یہ فیصلہ کم از کم اس لحاظ سے درست نکلا کہ یہ رپورٹ تمام سرکاری مطبوعات سے زیادہ بکی، اس کی بیس ہزار جلدیں فروخت ہوئیں، اور زمانہ جنگ کی وجہ سے کاغذ کی قلت نے اس کی مزید اشاعت پر پابندی لگا دی۔ اس رپورٹ کو پرانے اور نئے ہر دو نقطہ ہائے خیال کے لوگوں نے پسند کیا۔

چوں کہ اس رپورٹ میں تعلیم کے سارے موضوع پر بحث کرنے کی کوشش کی گئی تھی، اس لیے اس کے بارہ ابواب میں سے صرف ایک باب میں یونیورسٹی تعلیم موضوع بحث تھی، غالباً یہی وجہ ہے کہ رادھا کرشن کمیشن نے ایک دو حوالے دینے کے سوا اس رپورٹ کو درخور اعتنا نہیں سمجھا، مگر حقیقت یہ ہے کہ اگر کوئی شخص متذکرہ صدر باب کے آخر میں دی گئی سفارشات پر ایک نگاہ ڈالے تو اسے فوراً نظر آئے گا کہ ان میں سے بہت سی سفارشات رادھا کرشن کمیشن کی اہم ترین سفارشات کا پیش خیمہ ہیں۔ اس کے باوجود یہ ماننا پڑے گا کہ ۱۹۴۷ء کے بعد طرح طرح کی مشکلات کے باوجود نئی یونیورسٹیاں قائم کرنے کے لیے جو رقوم فراہم ہوتی رہی ہیں، ان کا محرک وہ اثر ہے جو کمیشن کی رپورٹ نے متعلقہ حکومتوں پر کیا۔

اگر چہ واقعات نے میرے پہلے ردِ عمل کو کسی نہ کسی حد تک کم کر دیا ہے، میرا دوسرا ردِ عمل جو زیادہ اہم ہے، اب تک باقی ہے۔ جدید ہندوستان کو زندگی کے تمام شعبوں میں ماہرین کی شدید

اور فوری ضرورت تھی۔ مجھے حیرت ہے کہ آیا اس صورت میں یہ ایک دانش مندانہ فعل تھا کہ نظام تعلیم کی تعمیر نو کے لیے آغاز کار چوٹی سے کیا جائے۔ یہ اس ناگزیر ضرورت کا احساس تھا جس نے مرکزی مشاورتی بورڈ کو اس بات پر مجبور کیا تھا کہ تعلیم کی تعمیر نو کے کام میں مضبوط بنیادیں قائم کرنے پر زور دے تاکہ جلد از جلد تمام بچے مدرسوں میں لائے جا سکیں، اور ان میں سے زیادہ قابل بچوں کے لیے اعلیٰ تر تعلیم کی وافر سہولتیں بہم پہنچائی جائیں۔ صرف یہی ایک طریق کار ہے جس سے یہ یقین ہو سکتا ہے کہ موزوں قابلیت اور صلاحیت کے لڑکے اور لڑکیاں اعلیٰ تعلیم کے اداروں اور بالخصوص یونیورسٹیوں میں پہنچیں گے، اور انکی تعلیم سے پورا فائدہ اٹھائیں گے، اور اس طرح عالم ماہرین کی ایک جماعت وجود میں آئے گی۔

برطانوی عہد کے خاتمہ کے قریب یونیورسٹی تعلیم سے واسطہ رکھنے والے تمام لوگ اس بات پر متفق تھے کہ گو آبادی کے لحاظ سے ہندوستان میں کافی یونیورسٹیاں موجود نہیں (مرکزی مشاورتی بورڈ نے ان کی تعداد میں پچاس فی صد اضافے کی سفارش کی تھی) اس کے باوجود بہت سے طلبہ جو اس وقت یونیورسٹیوں میں تعلیم پا رہے ہیں اس ذہنی صلاحیت سے عاری ہیں جو یونیورسٹی تعلیم سے فائدہ اٹھانے کے لیے ضروری ہے۔ ہمیں اس بات کا بھی واضح احساس تھا کہ ان پڑھ آبادی کے انبوہ میں ایسے ذہن موجود ہیں جن سے فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے، اور یہ ذہن آسانی سے موجودہ کمی کو دور کر سکتے ہیں۔ اس کے لیے صرف اتنا کرنا پڑے گا کہ ایک معقول عرصے کے اندر اندر ابتدائی درجے پر تمام بچوں کی اچھی تعلیم کا بندوبست کر دیا جائے۔

غلط اصرار

برطانوی عہد میں انگریزی کو ذریعہ تعلیم بنا کر اعلیٰ تعلیم پر جو زور دیا گیا وہ ان بہت سی غلطیوں میں سے ایک ہے، جس کی ذمے داری اس مذموم ہستی یعنی لارڈ میکالے پر ہے (اگرچہ اس کا ارادہ بُرا نہ تھا) مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سادعا کرشن کمیشن کی سفارشوں کی کامیابی کا سارا انحصار اس بات پر ہے کہ پہلے ناخواندگی پر ایک ہمہ گیر حملہ کیا جائے۔ اس امر سے غالباً میرے استدلال کو سہارا ملتا ہے کہ یونیورسٹی کمیشن کی طویل اور گراں تحقیقات کے بعد ثانوی تعلیم کے متعلق بھی تقریباً اسی قسم کی تحقیقات عمل میں آئی۔ یہ کہا جا سکتا ہے

کو ابتدائی تعلیم کی منصوبہ بندی کے لیے وارد ھا سکیم پہلے سے موجود ہے، اور اس سکیم میں مابعد کی تحقیقات کے نتیجہ کے طور پر ترمیم ہو چکی ہے۔ ۱۹۴۷ء کے بعد تعلیمی میدان میں جو کچھ کیا گیا ہے، میں آخری شخص ہوں گا جو اس کی قدر و قیمت کو گھٹانے کی کوشش کرے گا۔ تاہم وزارت تعلیم کی رپورٹوں سے یہ بات بالکل واضح ہے کہ ابھی وہ وقت بہت دور ہے جب تمام لڑکے اور لڑکیاں ابتدائی مدرسوں میں ہوں گے۔ میرا خیال ہے کہ تمام ہندوستانی ماہرین تعلیم میرے ساتھ اس بات پر اتفاق کریں گے کہ جب تک یہ مسئلہ حل نہیں ہو جاتا اور جب تک تمام قابل بچوں کو اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کی سہولتیں بہم نہیں پہنچائی جاتیں، اس وقت تک نہ یونیورسٹیوں کو کافی تعداد میں قابل طلبہ ملیں گے نہ ہندوستان کو کافی تعداد میں قابل ماہرین۔

ایک اور خاصے اہم مسئلہ کے متعلق بھی کمیشن کی سفارش مرکزی مشاورتی کمیٹی کی سفارش سے مختلف ہے، اور یہ مسئلہ ہے انٹرمیڈیٹ کالجوں کا مستقبل۔ جن دنوں میں ہندوستان میں تھا، مجھے اس بات کا شدید احساس ہوتا تھا کہ اس ملک کے ثانوی مدرسے اس بلند علمی کام سے محروم ہیں جو انگلستان میں "چھٹے درجے کے کام" سے موسوم ہے، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ یہ کام یونیورسٹیوں کو انجام دینا پڑتا ہے، اگر یہ کام ثانوی مدرسے اپنے ذمے لے لیں اور یونیورسٹیوں کو اس قابلیت کے طلبہ بہم پہنچائیں جو انگلستان میں "اعلیٰ سند کی سطح" پکاری جاتی ہے تو یونیورسٹیاں اس کام سے آزاد ہو جائیں اور وہ اپنے تمام تر ذرائع زیادہ بلند علمی کام کے لیے وقف کر سکیں۔ میں اس بات کا کبھی قائل نہیں ہو سکا کہ انٹرمیڈیٹ درجہ کے دو سال خواہ وہ ایک علٰحدہ ادارے میں صرف کیے جائیں، اور خواہ یونی ورسٹی میں تعلیمی یا اقتصادی وجوہ کی بنا پر جائز قرار دیے جا سکتے ہیں۔

بے شک ہر شخص یہ محسوس کرتا ہے کہ ہندوستان جیسے وسیع اور بکھرے ہوئے رقبے میں بنیادی مشکل یہ ہے کہ اس قسم کے ثانوی مدرسے کافی تعداد میں کیونکر بہم پہنچائے جائیں، جہاں چھٹے درجے کی سطح کا کام موثر طور پر ہو سکے، تاہم اس قسم کے مدرسے جاری کرنا بہت ضروری ہے، اس سے دو مختلف مگر اہم نتائج پیدا ہوں گے:۔

(۱) یونیورسٹیوں کو ایسے طلبہ اور طالبات مل جائیں گے جنہوں نے مدرسے کی زندگی میں ہی اس ذمے داری کو

سنبھالنا سیکھ لیا ہے، جو طلبا یا بجا طور پر یونیورسٹی کی زندگی اور رہنماؤں کی تربیت کا امتیازی نشان سمجھی جا چکی ہے
اس طرح یونیورسٹیاں ایسے طلبہ سے نجات پا جائیں گی جو ان کی تعلیم سے فائدہ اٹھانے کے قابل نہیں میٹرکولیشن
اور انٹرمیڈیٹ درجوں پر جو افسوس ناک ضیاع ہو رہا ہے، اس طریق کار سے اس کا بھی خاتمہ ہو جائے گا
اس کے علاوہ یونیورسٹیوں کو یہ موقع ملے گا کہ وہ اپنے ذرائع کو آنرز جماعتوں، پوسٹ گریجوایٹ کام اور تحقیقاتی
کام پر مرکوز کریں مجھے یہ معلوم کرکے خوشی ہوئی ہے کہ ہندوستان نے انٹرمیڈیٹ جماعتیں الگ دینے کا
فیصلہ کیا ہے۔ ان کے عوض طلبہ کو مدرسے میں ایک سال زیادہ لگانا ہوگا، اور ڈگری کا نصاب بجائے
دو سال کے تین سال میں ختم کرنا ہوگا۔

آخری تشویش

مجھے یقین ہے کہ جو خیالات اس مضمون میں پیش کیے گئے ہیں وہ ان لوگوں کے دلوں میں موجود ہیں۔
جن کے ہاتھوں میں نئی جمہوریہ کی یونیورسٹی تعلیم ہے۔ آخری تشویش جو مجھے لاحق ہے یہ ہے کہ آیا ہندوستان
کے نئے حکمران اس بات کو کافی وضاحت کے ساتھ سمجھتے ہیں کہ یہ مسئلہ کس قدر اہم ہے، جب تک انہیں
یہ احساس نہیں ہوگا، اس وقت تک یہ امید رکھنا مشکل ہے کہ یونیورسٹی کمیشن کی توقعات پوری ہوں، بالخصوص
جبکہ محدود مالی ذرائع پر چاروں طرف سے مطالبات کی بوچھاڑ ہو رہی ہو، میری رائے یہ ہے کہ یونیورسٹی
تعلیم کے شعبے میں تعلیم کے باقی تمام شعبوں کی طرح کامیابی اسی صورت میں ممکن ہے جب تدریس کا کام مؤثر
ہو، اگرچہ ہم جذباتی تاسف کے ساتھ ان پچھلے وقتوں پر نگاہ ڈالتے ہیں، جب اچھے استاد مادی معاوضے
سے بے نیاز ہو کر تدریس کے پیشے میں کھچے چلے آتے تھے، ان کے پیش نظر بلند تر مقاصد اور پاکیزہ تر صلے
ہوتے تھے، مگر جدید زمانے میں ہندوستان جیسے بڑے ملک کو یہ بات سمجھ لینی چاہیے کہ ہر مزدور کی
قیمت کا اندازہ اس کی اجرت سے کیا جانا چاہیے۔ ہندوستان نے اپنے استادوں کی شرائط ملازمت کو بہتر
بنانے کے لیے کوشش ضرور کی ہے۔ لیکن جو اعداد و شمار میرے پیش نظر ہیں وہ مجھے مطمئن نہیں کرتے۔
مجھے امید ہے کہ میری طرح باقی لوگ بھی یہ محسوس کرنے لگیں گے کہ اعلیٰ ترین تعلیم کا اہتمام ایک جدید ریاست
کی خوش حالی بلکہ اس کی بقا کے لیے ناگزیر ہے، یہ احساس ہی ایسے حالات پیدا کر سکتا ہے، جو قابل اور مطمئن

قومی سیرت کی تعمیر میں تاریخ کا حصہ

نذیر احمد

پاکستان تاریخ کانفرنس کے ایک اہم اجلاس میں ایک جلیل القدر قومی رہنما نے کہا تھا:۔
مجھے آپ جیسے عالموں کے مجمع کو یہ بتانے کی حاجت نہیں کہ ہم دنیا کی اس بلند پایہ ثقافت کے علمبردار ہیں جس نے زمانے کے اتار چڑھاؤ کے باوجود ایک حیرت انگیز قوت حیات کا ثبوت دیا ہے۔ لیکن یہ کس قدر تعجب کا مقام ہے کہ وہی ثقافت جس نے اپنے زمانۂ اقبال میں مسعودی۔ البیرونی۔ ابن اثیر طبری اور ابن خلدون جیسے جید عالم پیدا کیے تھے۔ ایسے عالم جن کا تبحر علمی صرف تاریخ تک ہی محدود نہ تھا وہی ثقافت اپنے آخری دور میں اپنی وقائع نگاری کے لیے آرنلڈ۔ میور۔ سائکس۔ لین پول اور گلوم جیسے یورپی عالموں کی محتاج ہو کر رہ گئی۔ گو ان مغربی عالموں کی بلند علمی صلاحیتوں میں کسی کو کلام نہیں۔ لیکن اس سے یہ حقیقت نہیں مٹ سکتی کہ وہ ہماری ثقافتی روح سے بے خبر تھے، اور یہی وجہ ہے کہ اکثر مقامات پر انہوں نے واقعات کو بُری طرح مسخ کیا ہے۔ اس سے زیادہ قابل افسوس امر یہ ہے کہ ہمارے مدرسوں اور کالجوں میں اسلامی تاریخ کو یا تو سرے سے نظر انداز کر دیا گیا اور یا اسے بالکل ادنیٰ مقام دیا گیا۔ اس طرح مسلمان بچے کئی پشتوں تک ایسی درسی کتابوں سے تربیت پاتے رہے جو ان کی ماضی کو نہایت بھونڈے رنگ میں پیش کرتی تھیں، اس کا قدرتی نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے دل اپنے آباؤ اجداد کے کارناموں پر فخر و مباہات کے جذبات سے بالکل خالی رہے۔ کیونکہ انہیں ان کارناموں کی خبر ہی نہ تھی۔ ہمیں اپنی آئندہ نسلوں کو اس دوہری بدنصیبی سے نجات دلانا ہے۔ اس وقت اس بات کی سخت ضرورت ہے کہ پاکستان کے سب تاریخ دان اپنے مجموعی علم و فضل کو اس برعظیم کی ایک سچی اور بے لاگ تاریخ لکھنے کے لیے وقف کر دیں تاکہ اسلامی ثقافت کے ذہنی سرچشموں کی صحیح ترجمانی ہو سکے اور اس کے کارناموں کا جائزہ لیا جا سکے۔

تاریخ کیا ہے؟ :۔ ان خیالات کی توضیح کرنے سے پہلے یہ مناسب ہو گا کہ ہم اس بات کو طے

کرلیں کہ تاریخ سے مراد آخر ہے کیا؟ بے شک تاریخ سے مراد انسان کے ماضی کی کہانی ہے۔ مگر اس کہانی کا رنگ ہر زمانے میں مختلف رہا ہے، قرون اولیٰ کا انسان اس کہانی میں اپنے آباؤ اجداد کے خدائی اوصاف دیکھنے کا خوگر تھا۔ اس کے لیے قدرت کے پیچ در پیچ کارخانہ کی تشریح یہی تھی کہ بیتے ہوئے زمانے میں اس کے باپ دادا نے سورج۔ چاند۔ ہوا۔ بارش۔ بجلی اور دوسرے مظاہر قدرت سے جنگیں کیں، اور انہیں اپنی اور اپنی نسل کی خدمت گذاری کے لیے رام کر لیا۔ کبھی ان مظاہر قدرت کو اپنے ان بڑے بوڑھوں کی ارواحوں کا جلوہ خیال کیا جاتا تھا۔ ہندوستان، ایران، میکسیکو اور دوسرے ملکوں کی پرانی تاریخیں اٹھا کر دیکھ لیجیے، ان ملکوں کے حکمران سورج دیوتا کی اولاد ہونے کے دعویدار تھے اور ان کی نگاہ میں کوئی تاریخی کتاب جو اس عقیدے کو جھٹلانے والی ہو قابل اعتماد نہ ہو سکتی تھی۔

ازمنہ وسطیٰ میں آکر دیکھیں تو یہاں بھی تاریخ انسان کی کہانی کو ایک ایسے ڈھنگ میں پیش کرتی ہے کہ وہ مخفی بھید بن کر رہ جاتی ہے، جس کی تھاہ کو پادریوں اور پروہتوں کے سوا اور کوئی نہیں پہنچ سکتا۔ یہ ٹھیک ہے کہ اب دیوی دیوتاؤں کی جگہ ایک برتر ہستی نے لے لی ہے، جو کائنات عالم کی پیدا کرنے والی ہے اور جو وقتاً فوقتاً اپنے برگزیدہ بندے دنیا کو راستہ دکھانے کے لیے بھیجتی رہی ہے۔ مگر یہ برگزیدہ بندے اب بھی سطح زمین پر نہیں بلکہ ہوا اور بادلوں میں چلتے پھرتے نظر آتے ہیں۔ اور قرون وسطیٰ کا انسان خوف و عقیدت سے سر جھکائے ان ناقابل فہم داستانوں گزرے ہوئے وقتوں کی سچی تاریخ خیال کرتا ہے۔ اس تاریخ کے بارے میں کسی عقلی شک و شبہ کو دل میں جگہ دینا گویا اپنے مذہب سے منہ موڑنا اور دوزخ میں جگہ خریدنا ہے۔

اسلام کی آمد

اسلام کے آتے ہی تاریخ ایک نئے باوقار دور میں داخل ہوتی ہے اور وہ دور اب تک باقی ہے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم ہی دنیا کے وہ بانی مذہب ہیں، جن کی شخصیت تاریخ کے اجالے میں نمودار ہوئی اور جن کی زمانہ بعد از بعثت کی زندگی کا ہر پہلو تاریخ کی پوری روشنی میں دیکھا جا سکتا ہے، مسلمان کی دینی اور دنیاوی نجات اسی میں ہے کہ وہ اسوہ نبوی کی پوری پوری پیروی کرے، اس لیے یہ ضروری ہے کہ اسوہ نبوی کو سچے اور بے لاگ رنگ میں دیکھا جائے، اس ضرورت نے تاریخ کو دفعتہً قصے کہانیوں کی پست سطح سے

اٹھا کر ایک باقاعدہ سائنس کے بلند مقام پر پہنچا دیا، اور مسلمانوں نے موادِ تاریخ کو فراہم کرنے اور اس کی تنقید و تجزیہ کے لیے ایسے اصول وضع کیے جو ہمیشہ کے لیے اس کی بنیاد قرار پائے۔ اس لحاظ سے یہ کہنا بالکل درست ہے کہ جدید علمِ تاریخ کے موجد مسلمان ہیں۔ دنیائے علم پر اسلام کا یہ ایسا احسان ہے، جس کا اعتراف مخالفوں نے بھی کیا ہے، اگرچہ مسلمانوں نے علم کی دوسری شاخوں میں بھی قابلِ قدر اضافے کیے لیکن فنِ تاریخ نویسی میں انہوں نے ایک ایسی بلند منہج کی بنیاد ڈالی جس سے بہتر کوئی اور راہ ذہن میں آ ہی نہیں سکتی چونکہ مسلمان فنِ تاریخ نویسی کے ایجاد کرنے والے تھے اس لیے قدرتی طور پر بلند پایہ مورخوں کا جو گروہ اسلام نے پیدا کیا، ان کے علمی کمالات پر آج بھی دنیا انگشت بدنداں ہے۔

تاریخ کا جدید نظریہ

مسلمان مؤرخوں نے تاریخ کا جو نظریہ قائم کیا وہ یہ ہے کہ تاریخ کا منصب واقعات کو بلا کم و کاست بیان کر دینا ہے اور بس۔ مؤرخ کے لیے لازم ہے کہ وہ ذاتی پسند کے پردے کو بیچ سے بالکل اٹھا دے اور مخالف و موافق سب شہادتوں کو اکٹھا کر کے بے لاگ عقل و منطق کی روشنی میں واقعات کو ایک زندہ تسلسل کی لڑی میں پرو دے جس کی ہر کڑی اپنے سیاق و سباق سے معنوی رشتہ رکھتی ہو، اور جس کے نکل جانے سے سارے تسلسل میں ایک خلا پیدا ہو جائے، چونکہ انسانی زندگی ایک ایسی وحدت ہے جس کا ہر جزو دوسرے اجزاء پر اثر ڈالے بغیر نہیں رہ سکتا، اس لیے مؤرخ کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ واقعات اور شخصیتوں کی ظاہری بھیڑ میں کھو کر نہ رہ جائے، بلکہ زندگی کے ہر گوشے کو نگاہ میں رکھے اور سطحی شور اور ظاہری نمائش کی تہ میں ایسے گہرے موثرات کی تلاش کرے جن کے صدہا سالہ خاموش عمل سے دفعتہً یہ گرجنے والا شور اور چندھیا دینے والی چمک پیدا ہوئی ہے۔

اسلام نے ہی سب سے پہلے دنیا کو اس حقیقت سے آگاہ کیا کہ دنیا کی ساری قومیں دراصل ایک ہی عالمگیر کنبہ کے افراد ہیں، جن کا مفاد ہر لحاظ سے مشترک ہے، اسلام کے اس بنیادی عقیدہ نے مسلمان مؤرخوں کے نظریہ میں بھی عالمگیر وسعت پیدا کر دی۔ وہ کسی ملک یا قوم کی تاریخ کو کوئی ایسی شے نہیں سمجھتے جو دوسرے ملکوں کے حالات سے اثر پذیر نہ ہو، بلکہ وہ نوعِ بشر کی ساری تاریخ کو ایک ایسا سیل رواں

سکتے ہیں، جس کا ہر قطرہ کل کی کیفیت سے متاثر ہوتا ہے، گو کسی خاص لمحہ میں اس سیل کے بعض حصے زیادہ شوریدہ اور بعض بالکل پُرسکون نظر آتے ہوں۔

اگرچہ عہدِ حاضر کی میکانکی ایجادات نے فاصلے کے بُعد کو صد درجہ گھٹا کر دنیا کے سب گوشوں کو ایک دوسرے سے اس قدر قریب کر دیا ہے کہ آج قوموں کی عالمگیر برادری زیادہ صحیح معنوں میں ایک کنبہ کے افراد کی شکل اختیار کر گئی ہے، اور پچھلی دو جنگوں کی ہمہ گیر تباہی نے مغربی دنیا کو اس امر کا بہت شدید احساس دلایا ہے، مگر سچ یہ ہے کہ مہذب دنیا نے "بعد از خرابیٔ بسیار" جو سبق آج سیکھا ہے، مسلمانوں کے لیے وہ سبق کوئی نیا سبق نہیں۔

قومیت اور وطنیت کی تحریکیں

انیسویں صدی عیسوی کے نصف آخر میں یورپ میں جگہ جگہ قومی اور وطنی تحریکوں نے سر اٹھایا۔ گو اس وقت تک یورپ تاریخ کے متذکرہ صدر سائنسی نظریہ کو اصولاً مان چکا تھا، مگر قوم اور وطن کے خود پرست اور آتش مزاج بت کسی بے لاگ رائے کے متحمل نہ تھے، چناں چہ یورپ اور امریکہ میں ہر جگہ قومی تاریخ ان بتوں کے قصیدے بن کر رہ گئی۔ عام ذہنی بیداری سے یہ حقیقت اب سب پر کھل چکی تھی کہ قوموں کی قوتِ حیات کا سارا سرمایہ وہ حرارت ہے جو قومی خون کو گرماتی ہے، اور اس حرارت کا واحد سرچشمہ وہ نظریے ہیں جو قومی ثقافت کی جان ہیں۔ چناں چہ قوم کا شاندار ماضی، اس کے مشاہیر کے کارناموں اور قومی عزم و پامردی کی روایتوں کو نئی نسلوں کے سامنے اس قدر حسین اور چکاچوند پیدا کرنے والے رنگوں میں پیش کیا گیا کہ وہ اپنے آپ کو خلافتِ ارضی کا واحد جائز حق دار سمجھنے لگیں، صرف اپنے قومی محاسن کو ہی ابھارنے کی کوشش نہ کی گئی، بلکہ دوسروں کے محاسن کو گھٹایا گیا اور اپنے تفوق کو ہر میدان میں اچھالا گیا، اور نوجوانوں کے بھڑکیلے جذبات سے اس قدر کھیلا گیا کہ دنیا کو ایک ربع صدی میں دو مرتبہ جنگ کے عالم سوز شعلوں میں کود دینے بغیر کوئی چارہ نہ رہا۔

قومیت کیا ہے؟

یہاں یہ دیکھنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ آخر قومیت ہے کیا شے، کیا ایک بولی بولنے والے لوگ

ایک قوم ہوتے ہیں؟ مشرقی اور مغربی پنجابیوں اور مشرقی اور مغربی بنگالیوں کی بولی ایک ہی ہے۔ مگر ظاہر ہے کہ وہ دونوں ہم قوم نہیں ہیں۔ کیا جغرافیائی حدود قومیت کی حدیں متعین کرتی ہیں؟ یہاں بھی خود ہندوستان کی مثال ہی اس خیال کے ابطال کے لیے کافی ہے، یورپ میں ایسی کئی مثالیں موجود ہیں۔ کیا مذہب کا رشتہ انسانوں کو ایک قوم بنا دیتا ہے؟ عیسائی یورپ کی حالیہ جنگیں اس خیال کے غلط کرنے کے لیے کافی ہیں۔ آخر ایک قوم کے افراد میں مشترک قدر ہے کونسی؟ مثلاً ایک سندھی، ایک پنجابی، ایک بنگالی، ایک سرحدی اور ایک بلوچ میں وہ قدر مشترک کونسی ہے جو ان سب کو پاکستانی بناتی ہے۔ اس سوال کا اگر کوئی تسلی بخش جواب دیا جا سکتا ہے تو وہ یہی ہے کہ ان سب کی ثقافت ایک ہے، یعنی ان کے مشاہیر نے ماضی میں کچھ ایسے کارنامے سرانجام دیے تھے، جن کا ذکر ان کے خون کو گرما دیتا ہے۔ انہوں نے ماضی میں ایک واحد نصب العین کے لیے مل کر کوشش کی تھی، اور آج بھی یہ سب اپنی متحدہ کوششوں سے اس نصب العین کا ہر ممکن بچاؤ کرنے کو تیار ہیں۔ گویا ثقافت عبارت ہے ایک ایسی روحانی قوت سے جس کو بہت سے افراد کی متفقہ کوششوں نے پیدا کیا، جو علوم و فنون کی مختلف شکلوں میں جلوہ گر ہوئی اور جسے برقرار رکھنے اور ترقی دینے کے لیے وہ افراد اب بھی ہر ممکن کوشش کے لیے آمادہ ہیں، یہی ثقافت قومیت کی جان ہے، اور خود ہم نے پاکستان کا مطالبہ صرف اسی بنا پر کیا تھا کہ ہماری ثقافت ہندوؤں سے بالکل الگ تھی، ہمارے ہیرو ہندوؤں کی نظروں میں ان کے قومی دشمن تھے، اور ان کے اکثر ہیرو ہماری نگاہ میں بے وقر۔

اسلام اور قومیت

ہم دیکھ چکے ہیں کہ اسلام انسان کی عالمگیر اخوت کا علمبردار ہے، وہ رنگ، نسل اور جغرافیائی حدود کی بنا پر انسانی دھڑا بندیوں کو پسند نہیں کرتا، وہ اس بات کا سختی سے مخالف ہے کہ محض رنگ یا نسب کی بنا پر ایک آدمی کو دوسرے سے برتر سمجھا جائے۔ اس کے نزدیک امتیاز کا واحد معیار تقویٰ ہے، جو شخص اللہ سے جتنا زیادہ ڈرتا ہے اسی قدر اس کا مقام بلند ہے، وہ قوم اور ملک کے نام پر رذائل انسانی کے جواز کا فتویٰ دینے کے سخت خلاف ہے، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ جداگانہ قومی ثقافت کا منکر ہے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک معتمد صحابی حضرت سلمان فارسی کے نام سے موسوم تھے۔

گویا ان کی قومیت ان کے نام کا جز و تھی، اور یہ امر ان کے تقویٰ کے راستہ میں حائل نہ تھا۔ قومی ثقافت ایک ذہنی قوت ہوا کرتی ہے جو قوم کے تمام افراد میں قدر مشترک کا کام دیتی ہے۔ اسلام نے اپنے عالم گیر پھیلاؤ کے زمانے میں اس قومی ثقافت کو کبھی مٹانا نہیں چاہا۔ ہاں اس نے صرف اسے زیادہ پاکیزہ اور باوقار بنانے کی کوشش کی۔

ہم یہ وضاحت کر چکے ہیں کہ ثقافت ہی وہ مشترک قدر ہے جو قوم کے افراد کو ایک رشتے میں پروتی ہے، اور اس طرح ان بکھرے ہوئے ذرّوں کو ایک مضبوط دیوار کی شکل دیتی ہے، ظاہر ہے کہ ایسی شیرازہ بند قوت بذات خود نہایت کار آمد ہے، کیوں کہ جب تک افراد کسی ایک لڑی میں پروئے نہ جائیں وہ اجتماعی زندگی کے لیے کبھی فعال عنصر نہیں بن سکتے۔ یہ بھلا کیوں کر ممکن تھا کہ اسلام جیسا دینِ فطرت ایسی کار آمد شے کو ممنوع قرار دیتا، چناں چہ اسلام کی فتوحات کے بعد بھی ایرانی، مصری اور رومی ثقافتیں باقی رہیں۔ البتہ ان کے انسانیت سوز خدوخال اسلام کے انسانیت نواز رجحانات کے زیر اثر خود بخود دست گئے، اور وہ صحیح معنوں میں کار آمد قوتیں بن گئیں۔

مغربی قومیت نوازی

اسلام فطرت اور اعتدال کا راستہ ہے۔ اس نے ایک معتدل اور قدرتی جذبہ قومیت کی کبھی نفی نہیں کی۔ مگر جس قومیت نے مغرب میں جنم لیا وہ از حد جنگجو یانہ اور تباہ کن قسم کی تھی، مغرب نے قوم اور وطن کے نام پہ ہر برائی کو روا سمجھا۔ چناں چہ مشہور اطالوی محب وطن کاؤ ور جو اطالیہ کی قومی تحریک میں پیش پیش تھا، خود اس بات کا اعتراف کرتا ہے کہ جو کچھ اس نے اور اس کے ساتھیوں نے اپنے ملک کی خاطر جائز سمجھا، اگر خود اپنی ذاتوں کے لیے روا رکھتے تو اول درجے کے بدمعاشوں میں شمار ہوتے۔ یہ طرز عمل صرف اطالویوں تک ہی محدود نہیں، بلکہ یورپ کی سیاسی لباط کے سب مہرے اسی سیاہ رنگ میں رنگے ہوئے ہیں۔ پہلی عالم گیر جنگ کی ہولناک تباہیوں نے پہلی مرتبہ مغربی سیاستدانوں کو یہ احساس دلایا کہ قومی جذبہ کو اس طرح بدلگام چھوڑ دینے کا مطلب تہذیب و تمدن کی تباہی ہوگا چناں چہ اس بدلگام گھوڑے کو رام کرنے کے لیے جمعیتِ اقوام کا چابک سوار پیدا کیا گیا۔ مگر یہ وحشی

دم خوردہ ایسے کمزور اور ناتجربہ کار ہاتھوں میں کیوں کر قابو میں رہتا۔ بلکہ کرایک ایسی دولتی جھاڑی کہ نہ صرف جابک سوار کا نام و نشان تک مٹا دیا بلکہ ساری دنیا کو پھر اک جہاں سوز جنگ کے شعلوں میں جھونک دیا۔

دوسری جنگ کے فوراً بعد پھر کوشش شروع کر دی گئی کہ قومی عصبیت کے جذبے کو جائز حدود کے اندر رکھنے کے لیے ایک با اقتدار بین الاقوامی ادارہ قائم کیا جائے۔ چنانچہ یہ ادارہ آج اتحادی اقوام کی انجمن کی شکل میں موجود ہے۔ یہ کہنا ابھی قبل از وقت ہے کہ جمعیت اقوام کے اس جانشین کی کوششیں کس حد تک کامیاب ہوں گی۔ مگر یہ بات بالکل واضح ہے کہ انسانیت کی نجات اسی میں ہے کہ وہ اسلام کے بتائے ہوئے اصولوں کے مطابق قومی اور نسلی گروہ بندیوں کو ثانوی درجہ دے اور عالمگیر اخوت کے مشترک مفاد کو زندگی کے ہر میدان میں اوّلیت دے۔

پاکستان اور قومی ثقافت

اس ساری بحث سے یہ بات اب بالکل صاف ہو گئی ہو گی کہ گو جنگجویانہ قومیت لازمی امن عالم کے لیے ایک مستقل خطرہ ہے تاہم ایک معتدل قسم کی قومی ثقافت نہ صرف قومی زندگی کی صحت کے لیے ضروری ہے، بلکہ ایک عالمی معاشرے کی تخلیق میں بھی ایک کارگر قوت ثابت ہو سکتی ہے۔ کسی قوم کی موثر اجتماعی زندگی اسوقت تک ممکن ہی نہیں جب تک قومی ثقافت کے پڑھنے پھولنے کے پورے مواقع موجود نہ ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ استبدادی فاتح قومیں مفتوحین کی قومی روح کو کچلنے کے لیے سب سے پہلا وار اس کی قومی ثقافت پر کرتی ہیں۔ برطانوی تسلط کے دو صد سالہ زمانے میں ہندی مسلمانوں کی ثقافت مسلسل جور و ستم کا نشانہ بنی رہی۔ اغیار نے ہماری قومی روح کے سرچشموں کو زہر آلود کرنے یا انہیں سرے سے خشک کر دینے کے لیے ہر حربہ استعمال کیا۔ مگر یہ امر ہماری ثقافت کی سخت جانی کا جیتا جاگتا ثبوت ہے کہ اغیار کی کوششیں اپنے مقصد میں ناکام رہیں اور بالآخر ہماری قومی ثقافت کے بڑھنے پھولنے کے لیے راستہ بالکل صاف ہو گیا۔

قومی ثقافت کسی قوم کی اجتماعی زندگی کے لیے صالح خون کا حکم رکھتی ہے، اب جبکہ ہم آزاد ہیں

اور اپنی اجتماعی زندگی کے خود نگران ہیں، ہمارا سب سے پہلا فرض یہ ہے کہ اپنی قومی ثقافت کے سرچشموں کو اس خس و خاشاک سے بالکل پاک کر دیں جس سے وہ اٹے پڑے ہیں، اور جس نے ہماری قومی روح کی سیرابی کو روک رکھا ہے۔ جب تک ایسا نہیں ہو لیتا ہماری قومی وحدت پائدار بنیادوں پر قائم نہیں ہو گی اور ایک ایسی دنیا میں جو آج بھی اپنے تمام بین الاقوامیت کے نعروں کے باوجود ابھی دلی طور پر قومیت اور وطنیت کی ہی پجاری ہے، کوئی قوم یا ملک اپنی ثقافتی زندگی کی صحت سے آنکھیں بند نہیں کر سکتا۔

قومی ثقافت کے سرچشمے

اب غالباً یہ امر کسی مزید روشنی کا محتاج نہیں کہ قومی ثقافت ایک ذہنی قوت ہے جو قوم کے تمام افراد کے دل و دماغ کو زندگی کی تر و تازگی بخشتی ہے، یہ ذہنی قوت عہد ماضی کی ان کامرانیوں یا آزمائشوں کی پیداوار ہوتی ہے، جن میں سے قوم گذری ہوتی ہے، اور آئندہ قومی عزائم کو حرکت دینے والی قوت بھی یہی ہوتی ہے۔ اس تجربے کی روشنی میں قومی تاریخ کو ایک غیر معمولی اہمیت حاصل ہو جاتی ہے۔ بلکہ سچ یہ ہے کہ تاریخ ہی وہ ابدی سرچشمہ ہے جس سے کسی قوم کی ثقافتی روح سیراب ہوتی ہے یہی وجہ ہے کہ زندہ قومیں اپنی تاریخ کے مدون کرنے اور اسے موزوں شکل میں بچوں کے سامنے پیش کرنے کے لیے بہت بڑے بڑے اہتمام کرتی ہیں، اور یہی وجہ ہے کہ تاریخ عالم میں ہم جب بھی کسی قوم کے زوال کا حال پڑھتے ہیں تو ساتھ ہی یہ بھی دیکھتے ہیں کہ یہ قوم اپنی بیتی ہوئی عظمت کو بھی ساتھ ہی ساتھ بھولتی چلی جاتی ہے تا آں کہ وہ خود اپنی نظروں میں ذلیل ہو کر رہ جاتی ہے اور اسے اپنی زندگی کے افق پر روشنی کی کوئی کرن دکھائی نہیں دیتی۔

ہماری قومی زندگی ان تمام مرحلوں میں سے گذر چکی ہے۔ ایک وقت تھا کہ مسلمان اس برصغیر میں بطور فاتح داخل ہوئے، اور صدیوں تک اس کی تقدیر کے مالک بنے رہے۔ اس دور میں ہماری تاریخ کی تدوین بھی خود ہمارے اپنے ہاتھوں میں تھی۔ پھر دفعتہً پستی کا دور شروع ہوا۔ مسلمان اس قدر اچانک گرا کہ وہ بالکل بوکھلا گیا، اور ابھی سنبھلنے کے لیے آنکھیں ہی مل رہا تھا کہ چاروں طرف سے اغیار نے نرغے میں لے لیا، چالاک دشمن نے تاک کر سب سے پہلا وار ہماری ثقافتی زندگی کے سرچشموں پر کیا، محمود غزنوی کا سا بے عدیل سپہ سالار

ایک وعدہ خلاف لٹیرا بنا دیا گیا۔ علاؤ الدین خلجی جیسا تیز فہم اور نکتہ رس مدبر ایک حریص ابن الوقت کے رنگ میں پیش کیا گیا۔ اورنگ زیب جیسا درویش منش اور اولوالعزم حکمران مذہبی دیوانہ قرار پایا۔ اکبر کی اسلام دشمنی کو اچھالا گیا، اور سیوا جی جیسے ڈاکو کی تعریف میں زمین و آسمان ایک کر دیے گئے۔ یہ محض چند موٹی موٹی مثالیں ہیں ورنہ اغیار کے معاند ہاتھوں نے اسلامی تاریخ کے تمام شاہیر کو ایک سرے سے لے کر دوسرے سرے تک ایک ہی سیاہ رنگ میں رنگ دیا، اور آخر نوبت یہاں تک پہنچی کہ خود بعض مسلمان جوشِ رواداری میں غیر مسلموں سے بھی چار قدم آگے بڑھ گئے اور انہیں اپنے اسلاف کا نام لیتے شرم آنے لگی۔

اسلامی تاریخ درسی نصاب سے سرے سے غائب تھی۔ تاریخ ہند کا اسلامی عہد اس تاریک رنگ میں پیش کیا جاتا تھا کہ جس پر وحشی قوموں کا سر بھی ندامت سے جھک جائے۔ مسلمان کسبِ معاش کے لیے مجبور تھا کہ اپنے بچوں کو اسی زہریلی تربیت کے حوالے کر دے، اسلامی تاریخ کے سب سے ثقہ راوی میور اور لین پول تھے، ایسے حالات میں یہ کیا عجب تھا کہ قوم نہ صرف اپنی عظمتِ رفتہ سے بے خبر ہو جائے بلکہ اپنے نامور آباؤ اجداد سے نسبت کرتے ہوئے بھی جھجکنے لگے۔ علامہ اقبال نے اسی کیفیت کی تصویر ان الفاظ میں کھینچی ہے۔

وائے ناکامی متاعِ کارواں جاتا رہا ٭ کارواں کے دل سے احساسِ زیاں جاتا رہا

آزاد زندگی کے تقاضے

اب پاکستان ایک آزاد ملک ہے، اور ہم ایک مستقل قوم ہیں۔ ہماری قومی زندگی کا مدار تمام تر ہماری ثقافتی روح کی قوت پر ہے، اس معاملے میں تغافل روا رکھنا اپنے اوپر سب سے بڑا ظلم کرنا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قیامِ پاکستان کے فوراً بعد قوم کی تعلیمی ضروریات کی طرف توجہ دی گئی اور کراچی میں منعقد ہونے والی ایک تعلیمی کانفرنس نے فیصلہ کیا کہ ہمارا نظامِ تعلیم اسلامی بنیادوں پر ہوگا۔ قوم کی ثقافتی روح کی بحالی کے لیے برصغیر ہند و پاک کی ایک صحیح اور مستند تاریخ کا طلبا کے سامنے پیش کرنا آج وقت کا ایک بہت بڑا تقاضہ ہے اور پاکستانی تاریخ دانوں پر یہ فرض بڑی شدت سے عائد ہوتا ہے کہ وہ ہماری ثقافتی زندگی کے سوتوں کو اس زہر کی آلائش سے پاک کریں جو اغیار کی ریشہ دوانیوں نے ان میں ملا رکھا ہے۔

تاریخ کا نیا نصاب

چند برس سے پنجاب کے مدرسوں میں تاریخ کا نیا نصاب رائج ہو چکا ہے۔ یہ نصاب ہندوستان کے اسلامی عہد کے علاوہ ساری اسلامی تاریخ۔ ایران وروم۔ بابل۔ نینوا۔ مصر وغیرہ کی مختصر تاریخ اور عہد حاضر کی مسلمان حکومتوں کی مختصر تاریخ پر مشتمل ہے۔ تاریخ کا یہ نصاب کافی غور وخوض کے بعد تیار کیا گیا ہے، اور اس میں کلام نہیں کہ اگر یہ نصاب اچھی طرح پڑھایا گیا، تو ہمارے طلبا اپنی قوم کی ثقافتی روح سے بڑی حد تک باخبر ہو جائیں گے۔

معلم تاریخ کی ذمہ داری

اب تک تدریس تاریخ کو ہمارے مدرسوں میں کوئی خاص اہمیت حاصل نہ تھی، کیوں کہ اس سے کوئی بلند مقصد پیش نظر نہ تھا۔ امتحان کی تیاری کے لیے جوں توں کر کے مقررہ نصاب رٹوا دیا جاتا تھا اور بس۔ اکثر اساتذہ اور بیشتر طلبا کا بھروسہ خلاصوں پر ہی تھا۔ معلم تاریخ بننے کے لیے کسی خاص استعداد کی ضرورت نہ تھی، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ معلمین کی تربیتی درس گاہوں میں تاریخ کا مضمون وہ لوگ لیتے تھے جو سائنس یا ریاضی کے سے اہم مضامین سے نابلد ہوتے تھے۔ سکولوں میں بھی جس مدرس کو کوئی اہم کام دینا مقصود نہ ہوتا تھا اسے تدریس تاریخ کے لیے مقرر کر دیا جاتا تھا۔ اس کی وجہ اوپر بیان ہو چکی ہے۔ تدریس تاریخ سے مطلوب ہماری اجتماعی روح کی بالیدگی نہ تھی، بلکہ اس کے برعکس اس کا کچلنا مقصود تھا۔ ایسے حالات میں تدریس تاریخ کی حالت بری بھلی جیسی کچھ بھی تھی ٹھیک تھی۔ مگر اب بدلے ہوئے حالات میں معاملہ کی نوعیت بالکل جداگانہ ہے۔

اب تدریس تاریخ کا منشا قوم کی ثقافتی روح کی پرورش اور اس کا ارتقا ہے، یہ کام ہماری اجتماعی زندگی کے لیے جس قدر اہم ہے اس کی وضاحت پہلے گذر چکی ہے۔ ایسا اہم کام اپنی انجام دہی کے لیے ایک زندہ جذبے کی قوت محرکہ چاہتا ہے۔ اگر ہم اسلامی تاریخ اور مسلمان مشاہیر کے کارناموں کی صحیح اہمیت بچوں کے ذہنوں پر مرتسم کرنا چاہتے ہیں تو اس کے لیے صرف اسی قدر ضروری نہیں کہ خود ہمیں ان واقعات پر پورا عبور حاصل ہو، بلکہ اس کے ساتھ ہی یہ بھی ضروری ہے کہ ہمارے دل ایک سچی اسلامی تڑپ سے

بھرپور ہوں، اس کے بغیر ہم اپنے طالب علموں کے دلوں میں وہ شعلہ پیدا نہیں کر سکتے جو آگے چل کر ان کی زندگی کے سارے راستے کو روشن کرنے والا ہو۔

اب تک ہمارے ہاں معلمین کی تربیت گاہوں میں جو لوگ آتے ہیں ان میں سے بہت تھوڑوں نے تاریخ کا مطالعہ اپنے ڈگری کے امتحان کے لیے کیا ہوتا ہے، اور جنہوں نے بی۔ اے میں تاریخ پڑھی بھی ہوتی ہے، وہ بھی بالعموم اسلامی تاریخ کے معاملے میں بالکل کورے ہوتے ہیں، ایسے لوگوں سے یہ امید رکھنا کہ وہ تدریس تاریخ کے نئے تقاضوں کو اچھی طرح پورا کر سکیں گے، غالباً بجا نہیں، یہ ٹھیک ہے کہ اب آئندہ یونیورسٹی کے اعلیٰ امتحانوں میں بھی اسلامی تاریخ شامل ہوگی، اور آئندہ ہمارے تاریخ کے گریجوایٹ اسلامی تاریخ سے بھی کچھ نہ کچھ آگاہ ہوا کریں گے لیکن یہ خوشگوار تبدیلی ہونے میں ابھی کچھ وقت لگے گا لہٰذا موجودہ معلمین تاریخ پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ اولین فرصت میں اسلامی تاریخ کا گہری نظر سے مطالعہ کریں۔ تاکہ وہ اپنے اہم قومی فرض کو بہتر طریق سے انجام دے سکیں۔

ان سب باتوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے ایک بات بالکل یقینی نظر آتی ہے، اور وہ یہ کہ اب معلم تاریخ بھی سکول کے عملے کا اسی طرح اہم رکن ہوا کرے گا جس طرح معلم سائنس، بلکہ ایک لحاظ سے معلم تاریخ کا مقام اس سے بھی زیادہ اہم ہے کیونکہ گو تدریس سائنس ہماری مادی ترقی کے لیے ازبس لازمی ہے مگر تدریس تاریخ کی غرض اجتماعی روح کی بالیدگی ہے، اور چونکہ روح کو جسم پر یقیناً فوقیت حاصل ہے، اس لیے تدریس تاریخ کا مقام بھی اولیت رکھتا ہے۔

تدریس تاریخ کی یہ اولیت معلم تاریخ میں بہت سے نمایاں اوصاف ڈھونڈے گی، ان میں سے اکثر اوصاف کا ذکر ضمناً گذر چکا ہے۔ اب وہ زمانہ گذر چکا جب ہر کس و ناکس معلم تاریخ کا روپ دھار لیتا تھا۔ آج اس اہم قومی خدمت کی انجام دہی کے لیے ٹھوس علم گہری نظر اور سچے جذبے کی ضرورت ہے، لیکن جس قدر یہ کام کٹھن ہے، اسی قدر اس کو کامیابی کے ساتھ پورا کرنے میں روحانی مسرت بھی زیادہ ہے۔ کیونکہ یہ فخر ایک کامیاب معلم تاریخ کے ہی حصے میں آتا ہے کہ اس نے کئی دلوں میں ایک ایسی نورانی شمع روشن کی ہے جو اس کے بعد مدتوں باقی رہے گی، اور جو قومی فلاح کے دشوار گذار راستوں کے لیے اجالا بہم پہنچائے گی۔

سکول سے خوف و تنفر کے احساس کا پس منظر

بشیر محمد اختر

مدرسہ تعلیم و تدریس اور فضیلت و تہذیب کا مرکز ہوتا ہے۔ یہی علم کا سرچشمہ ہے اور تربیت کا گہوارہ۔ مدرسہ ایک قوم کو مہذب، شائستہ اور باضمیر بنا سکتا ہے، اور یہی قوم کے افراد کو غیر مہذب اور بے حمیت بنا سکتا ہے۔ لیکن مدرسے کا اصل فرض یہ ہے کہ وہ افراد کی افتادِ طبیعت کے پیشِ نظر نہ صرف انہیں زیورِ علم سے آراستہ کرے بلکہ ان کی شخصیتوں کو اعلیٰ اخلاق اور تہذیب سے بھی مزین کرے۔ "صحیح تربیت انسان کی رہنمائی کرتی ہے، اسے سیدھا راستہ دکھاتی ہے، اسے معرفتِ نفس کا درس دیتی ہے، اسے طبعی تعذیب سے نجات دلاتی ہے، اللہ کی وحدت کے اعتقاد کو استحکام بخشتی ہے، اور انسان کو اونچے درجے تک پہنچا دیتی ہے۔" یہ قول فروبل کا تھا۔ ملٹن نے بھی کہا ہے کہ "تربیت وہ جوہر ہے جو انسان کو ہر کام کا اہل بنا دیتا ہے، خواہ وہ کسی نوعیت کا کیوں نہ ہو۔ اس سے طبیعت میں گہرائی، سوجھ بوجھ اور مہارت پیدا ہوتی ہے، زمانہ خواہ امن کا ہو یا جنگ کا۔"

بہرحال اس تہذیب، فضیلت و مہارت اور اخلاق کی تخلیق مدرسہ میں ہی کی جا سکتی ہے۔ اور مدرسہ جہاں ایسے اعلیٰ اوصاف پیدا کیے جائیں، جہاں ایسی بلند چیزیں تکمیل پائیں اور قوم کے نونہال تربیت حاصل کریں ایک قابلِ احترام اور پُرکشش مقام ہونا چاہیے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ کیا واقعی ہمارے ہاں کے طلبہ کے لیے یہ مقام قابلِ احترام اور پُرکشش ہے؟ اگر نہیں تو بچے مدرسوں سے بھاگ جانے میں حق بجانب ہیں۔ اسی لیے چھٹی کا لفظ انہیں بڑا محبوب ہے۔ وہ چھٹی کا اعلان سن کر خوشیاں منانے لگتے ہیں، اور مژدہ لانے والے کو دعائیں دیتے ہیں۔ ایک ان جانی مسرت ان کے دلوں میں کروٹ لیتی ہے اور ذہنوں میں موہوم سا اطمینان رقص کرنے لگتا ہے۔ آخر دیکھنا یہ ہے کہ مدرسے کے ساتھ تنفر اور خوف کے جذبات کیوں وابستہ ہیں؟ اس نفرت کے احساس کا پس منظر کیا ہے؟ اس کا علاج ہم مندرجہ ذیل تین عنوانات کے تحت کرتے ہیں۔

(ا) مدرسہ کی عمارت (ب) مدرسہ کا ماحول (ج) معلمین

(ا) مدرسہ کی عمارت ایسی ہونی چاہیے جو طلبہ کے لیے دلچسپی اور کشش کا باعث ہو۔ جہاں طلبہ اور ان کی ضرورتوں کا پورا لحاظ رکھا گیا ہو، اور جہاں مدرسہ کے مقاصد کی عظمت ٹپکتی ہو۔ آخر طلبہ ایک عظیم مقصد لے کر مدرسہ آتے ہیں۔ لیکن کیا انھیں اپنے مقصد کی بلندی اور اپنی عظمت کا احساس کبھی مدرسے کی عمارت سے بھی ہوا ہے؟ مدرسے کی بوسیدہ اور شکستہ عمارت بچوں کے ذہنوں میں ایک نفسیاتی تاثر پیدا کر دیتی ہے، وہ سمجھتے ہیں کہ شاید ہم ایسی ہی خستہ حال جگہوں کے لیے پیدا ہوئے تھے۔ جہاں تعلیم و تعلم کا کام ہوتا ہے، اور یہ عالیشان عمارت شاندار اعلیٰ کاموں کے لیے بنائی گئی ہیں۔ اگر مدرسہ محلے کے اندر گندی نالیوں کے کنارے واقع ہے۔ اگر وہاں شور و غوغا ہے، گرد و غبار کا طوفان ہے، چھت ٹپکتی ہے، دھوپ ہوا اور بچوں کی نشست کا معقول انتظام نہیں۔ طلبہ کی دلجوئی اور لطف و تسکین کا کوئی سامان نہیں تو آخر وہ مدرسے آنا کیوں پسند کریں؛ وہ کیوں نہ راہِ فرار اختیار کریں، اور ان کے دلوں میں تنفر کا احساس کیوں نہ پیدا ہو، اگر مدرسہ اپنے کو بچوں کے مذاق اور معیار کے مطابق تیار نہ کر سکا۔ اگر وہ بچوں کی توجہ اپنی جانب مبذول کرانے میں ناکام رہا تو یہ بچوں کا قصور نہیں، مدرسے کی خطا ہے، اہلِ مدرسہ کی کوتاہی ہے ؎

کس کو معلوم ہے ہنگامۂ فردا کا مقام
مسجد و مکتب و مے خانہ ہیں مدت سے خموش

(ب) کھیل کود میں فرحت محسوس کرنا ایک فطری امر ہے۔ بچوں کے لیے کھیل کود ایک تحفہ ہے۔ لیکن انھیں ڈانٹ ڈپٹ کر مجبور کیا جاتا ہے کہ وہ لطف اندوزی کے اس تحفے کو چھوڑ کر سکول جائیں۔ جہاں انھیں تعلیم حاصل کرنا ہے۔ گویا ان کے فطری تقاضے کو کچل دیے جاتے ہیں، اور تعلیم کا عمل غیر فطری ہوتا ہے جو بچوں کے میلان اور معیار کا نہیں ہوتا۔

بچے کھیل تماشوں کے تو رسیا ہوتے ہیں، لیکن آخر وہ پڑھنے لکھنے سے کیوں بھاگتے ہیں، بات دراصل یہ ہے کہ کھیل کود ایک تفریح ہے، اس میں کوئی غرض پیشِ نظر نہیں ہوتی۔ بچے اس طرف متوجہ رہتے ہیں، اور لطف اندوز ہوتے ہیں۔ برعکس اس کے پڑھائی لکھائی کا عمل غرض اور ضرورت کے

تحت ہوتا ہے، اس میں مقصدیت ہوتی ہے، اس لیے اس میں وہ لطف اور فرحت اور لطف محسوس نہیں کر پاتے جو دوسرے اشتغال میں۔

اگر ابتدائی تعلیم کھیل کھیل میں اور بلا کسی مقصد کے تعین کے ہو، تو وہ موثر اور نتیجہ خیز ثابت ہوسکتی ہے، اسی طرح طلبہ کو ان کی آمادگی کے بغیر پڑھانا بے سود ہوگا۔ عمل آموزش کامیاب اور موثر نہیں ہوسکتا، جب تک طلبہ کو پڑھائی کی طرف مائل نہ کرلیا جائے، اور ان کے لیے ایک پسندیدہ ماحول نہ پیدا کیا جائے۔

مدرسے کا ماحول بڑا دلکش اور حسین ہونا چاہیے، یہاں طلبہ ذرا بھی اجنبیت محسوس نہ کریں بلکہ اس ماحول سے مانوس ہوں۔ انہیں آزادی مطالعہ فطرت اور کھیل کود کی بھی اجازت ہو۔ بلکہ پورا عمل تعلم ہی کھیلوں میں ہو خصوصًا ابتدا میں۔ اور معلم ایک دوست اور راہ نما کی حیثیت سے متعارف ہو۔ بچے کی خطا اگر لاعلمی یا بھول چوک کی وجہ سے ہے تو استاد کو چاہیے کہ نصیحت کے بعد معاف کردے، اگر شرارت جان بوجھ کر کی جائے، اور خطا میں بدنیتی بھی ہو تو مناسب سزا بھی دینی چاہیے، جس سے اصلاح بھی ہو جائے لیکن ہمارے سکولوں میں بید زنی کا کھلم کھلا مظاہرہ ایک لعنت ہے، ضرورت اس امر کی ہے کہ اس لعنت کو ختم کیا جائے، اور ایک ایسا نفسیاتی اثر طلبہ پر ڈالا جائے کہ مار پیٹ کی ضرورت ہی نہ رہے۔

طلبہ کے فطری میلانات کو دبانا اور ظالمانہ دیانتی کی حد تک مار پیٹ کرنا، ان میں ردّ عمل کے طور پر دبی کھلی تمناؤں کی پرورش کا باعث ہوتا ہے، طلبہ پھر ذہنی طور پر مدرسے کے خلاف بغاوت کے لیے آمادہ ہو جاتے ہیں۔ یہی احساس ان میں نفرت کا بیج بوتا ہے، اس ذہنی بغاوت اور نفرت کا اظہار اس طرح ہوتا ہے کہ وہ مدرسے کی چاردیواری سے نکل کر کسی اور حسین مقام کا متلاشی رہتا ہے۔

(ج) کیا مدرسے میں اساتذہ طلبہ سے بے اعتنائی تو نہیں برتتے؟ ورنہ بچہ مدرسے میں ایک مشفق، کبھی ہمدرد، ہم نوا، اور ہم نشیں پا سکے تو وہ خود بخود وہاں کھنچا چلا جائے۔ لیکن معلمین کا طرز عمل دوستانہ اور ہمدردانہ نہیں ہوتا۔ ایک استاد کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے شاگردوں کی صلاحیتوں اور دلچسپیوں سے واقف ہو، ان کے طبعی میلانات اور رجحانات سے آشنا ہو۔ اس سلسلہ میں پوٹر بینڈرسل کے الفاظ یاد رکھنے کے قابل ہیں

متعلم اس وقت تک معلم نہیں کہلا سکتا جب تک کھیت میں اپنے شاگرد کے ساتھ گائے کا دودھ دوہنے پر تیار نہ ہو، جب تک وہ اس کے ساتھ نہ رہتا ہو، جب تک وہ اس کے معاشرہ کا ایک فرد نہ ہو، جب تک وہ اس کی فطرت، نفسیات سے واقف نہ ہو، جب تک وہ یہ نہ جانتا ہو کہ اسے کیا مرغوب ہے اور کیا نہیں بغیر اس کے وہ اسے پورا پورا فائدہ نہیں پہنچا سکتا، نہ اس کی فکر کو اونچا کر سکتا ہے، نہ اس کے عمل و علم میں اضافہ کر سکتا ہے، نہ اسے آئندہ زندگی کے لیے تیار کر سکتا ہے"۔

بچے کو درحقیقت ایک ایسے رہنما اور ایک ایسے نمونے کی ضرورت ہوتی ہے جس کی تقلید وہ روزمرہ زندگی میں کر سکے۔ معلم کا فرض ہے کہ وہ بچوں کی رہنمائی اور حوصلہ افزائی کرے، اور ایک قابل تقلید نمونہ بنے۔ اس کا انداز گفتگو، آداب نشست و برخاست، دوسروں کے ساتھ برتاؤ، اور اس کا کردار مثالی اور ایک اعلیٰ شخصیت کا مظہر ہو۔ لیکن افسوس کر رہے کر سکتے تھے جو اپنے زمانے کی امامت نہ وہ کہنہ دماغ اپنے زمانے کے ہیں پیرو

طلبہ مدرسے میں کچھ لینے آتے ہیں۔ معلم کا فرض ہے کہ وہ انہیں اپنی شفقتوں اور مہربانیوں سے نوازے بچے بن کھلی کلیاں ہیں۔ ان کی نشوونما معلم کا کام ہے۔ اسے چاہیے کہ وہ بچوں کو شگفتگی، حسن اخلاق اور اعلیٰ کردار کے اوصاف سے آراستہ کرے۔ لیکن کیا ہمارے سکولوں میں بچہ ان عنایات کا مستحق قرار دیا جاتا ہے؟ کیا اس سے ایک عاجز اور بے بس فرد کا سا سلوک روا نہیں رکھا جاتا؟

استاد بچے کی ناؤ کا کھیون ہار ہوتا ہے، اور تاریک راہوں میں بچے کے لیے ایک مشعل بردار کی حیثیت رکھتا ہے وہی حقیقت میں بچے کی صلاحیتوں کا رُخ متعین کرتا ہے۔ اور ان خطوط پر اس کی تربیت کر سکتا ہے جن پر اس کی آئندہ شخصیت کی تعمیر ہوتی ہے لیکن افسوس کہ معلمین کو اس فرض کا کبھی احساس نہیں ہوا۔ اور کبھی غور نہیں کیا کہ ملت نے ایک نہایت اہم کام انہیں سونپا تھا، جسے وہ بطریق احسن سرانجام نہ دے سکے۔

ان تمام عوامل کی آمیزش مدرسے سے نفرت و خوف کے جذبات میں ظاہر ہے، لازم ہے کہ یہ سب رکاوٹیں طلبہ کی راہ سے دور کی جائیں۔ تاکہ وہ آزادی اور اطمینان سے مصروف تعلیم رہیں۔ تعلیم کے عمل میں دل چسپی اور دل کشی کا سامان جزو غیر منفک ہے۔ طلبہ میں خود اعتمادی پیدا کرنے کے لیے ضروری ہے کہ انہیں خود کچھ سوچنے، جدوجہد اور کاوش کے لیے چھوڑ دیا جائے، اور صحیح انداز فکر اور طریق کار متعین کیا جائے۔ جرأت افزائی مہمیز کا کام دیتی ہے، اور

جماعت چہارم پنجم کی اُردو تدریس

انور علی قریشی

جماعت اول کی اردو تعلیم کا تجربہ ماہ اکتوبر ۱۹۵۶ء کے آموزش میں لکھا گیا ہے، اور جماعت دوم کی تعلیم کا دسمبر ۵۶ء کے آموزش میں۔ جن کی کچھ تجاویز جماعت سوم۔ چہارم و پنجم کی تعلیم دینے میں مفید ثابت ہو سکتی ہیں۔ مگر یہاں ان کا ذکر کرنا ضروری نہیں کیوں کہ ان رسالوں کے مطالعہ سے واقفیت میں اضافہ ہو سکتا ہے۔ جماعت سوم کی اردو تعلیم تو جماعت دوم کے تجربے کے مطابق ہی ہونی چاہیے، مگر جب بچے جماعت چہارم میں پہنچیں تو پھر کچھ انقلابی صورت پیدا ہو جاتی ہے۔ جس کا تجرباتی لحاظ سے ذکر کرنا ضروری ہے اور یہ جماعت چہارم و پنجم کی اردو تعلیم دینے میں مفید ثابت ہوں گی۔ تجاویز مندرجہ ذیل ہیں۔

(۱) مدرس کی تیاری (۲) تختہ سیاہ کا استعمال (۳) صحت تلفظ (۴) لغت کا استعمال (۵) مدرس کا نمونہ (۶) اجتماعی پڑھنا (۷) انفرادی پڑھنا (۸) بچوں کی لغت۔

مدرس کی تیاری:۔ خواہ جماعتیں چھوٹی ہوں یا بڑی، انھیں پڑھانے کے لیے سب سے پہلے استاد کو گھر پر تیاری کی بہت ضرورت ہے۔ گو چھوٹی جماعتوں کو پڑھانے والے استاد گھر سے تیاری کر کے نہیں آتے، کیونکہ وہ اسے اپنی توہین سمجھتے ہیں۔ مگر جب نیا سبق پڑھاتے وقت کئی مشکلات پیدا ہو جاتی ہیں، تو ان کا نہ صرف بچوں پر برا اثر ہی پڑتا ہے، بلکہ وہ استاد کی کمزوریوں کو بھی بھانپ جاتے ہیں، چھوٹے بچے ہونے کی وجہ سے استاد کے منہ پر تو کچھ نہیں کہتے۔ مگر استاد کے متعلق ان کی رائے ضرور خراب ہو جاتی ہے۔ کیوں کہ آجکل تو اردو کتب میں عربی۔ فارسی ہندی۔ بھاشا، اور سنسکرت کے علاوہ انگریزی الفاظ بھی شامل ہیں، جن کا بغیر مطالعہ کے پتہ نہیں چل سکتا اگر استاد انھیں ایک دفعہ گھر پر پڑھ لے، تو اسے کئی نئی باتیں معلوم ہو جائیں گی جن کا پہلے اسے کوئی علم نہ تھا۔ اکثر مدرسین اپنی جماعت کی اردو کی کتابیں بھی صحیح طور پر نہیں پڑھ سکتے، اور نظم کا تو کچھ نہ پوچھو، اس کی وجہ یہی ہے کہ استاد گھر پہ تیاری نہیں کرتے، ذیل کی عبارت سے پتہ چل سکتا ہے کہ درس کی تیاری کس قدر اہم ہے۔

صحت تلفظ:۔ چوں کہ اردو میں بہت سی زبانوں کے الفاظ شامل ہیں۔ جن کا بغیر مطالعہ کے پتہ نہیں چلتا۔ ان میں اکثر تو اپنی اصلی حالت میں مگر کئی ہم نے اپنے لہجوں کے مطابق تبدیل کر لیے ہیں۔ مگر اردو پڑھنے کے لیے الفاظ کا صحیح طور پر ادا کرنا نہایت ضروری ہے۔ اس لیے الفاظ کا تلفظ سیکھنے کے لیے مختلف زبانوں کے الفاظ کی شناخت بھی ضروری ہے، اور ہر ایک حروف کا علیحدہ علیحدہ ٹھیک طور پر ادا کرنا بھی لازمی ہے، جس کے لیے مختلف حروف کے صحیح مخرج کا جاننا بھی ضروری ہے۔ مثلاً حروف قمری و حروف شمسی۔

حروف قمری وہ حروف ہیں جو حلق، تالو اور ہونٹ سے نکالے جاتے ہیں مثلاً

ح ۔ خ ۔ ہ ۔ الف ۔ ع ۔ غ ۔ ک ۔ ی ۔ ج ۔ ق ۔ م ۔ ب ۔ و ۔ ف ۔

حروف شمسی وہ حروف ہیں جو دانت اور زبان سے نکالے جاتے ہیں جیسے ۔

ط ۔ ظ ۔ ل ۔ د ۔ ذ ۔ ت ۔ ث ۔ ر ۔ ز ۔ ص ۔ ض ۔ س ۔ ش ۔

اکثر بچے ان حروف کے تلفظ میں عام طور پر غلطی کرتے ہیں۔ کیوں کہ میں نے کئی لڑکوں کو کئی دفعہ عبدالستار کی بجائے عبدال ستار بولتے سنا ہے۔ جس کی وجہ یہی ہے کہ عام طلبہ تلفظ کے اصولوں سے واقف نہیں۔ پڑھے لکھے بہت کم طلبہ ہیں جن کو یہ معلوم ہے کہ ال جب شمسی حروف کے ساتھ آئے گا تو بولا نہیں جائے گا، بلکہ قمری حروف کے ساتھ بولنے میں آئے گا۔ مثلاً عبدالمجید۔ عبدالحمید۔ عبدالوحید۔ عبدالکریم۔

بعض ایسے الفاظ بھی ہیں جو ہم وزن ہیں، اور جن کے حروف بھی ہم مخرج ہیں۔ ان کے معنوں میں تمیز کرنا اردو زبان کے طالب علم کے لیے نہایت ضروری ہیں مثلاً کثرت۔ کسرت۔ علم۔ الم۔ آم۔ عام۔ ارض۔ عرض۔ اصل۔ عسل۔ سدا۔ صدا وغیرہ بچوں کو اتنی واقفیت حاصل ہونے کے بعد طلبا کو ایسے الفاظ کی واقفیت حاصل ہونا بھی ضروری ہے۔ جو معنی اور زبان کے لحاظ سے تو مختلف ہیں۔ مگر ہم وزن اور ہم صورت ہوں۔ مثلاً

الفاظ	زبان	معنی	الفاظ	زبان	معنی
دار	عربی	گھر	بال	انگریزی	ناچ
دار	ہندی	والا	پاس	ہندی	نزدیک
دار	فارسی	سولی	پاس	انگریزی	اجازت نامہ
بال	ہندی	بچہ	پاس	انگریزی	کامیابی

چوں کہ بچوں میں تقلید کا مادہ ہوتا ہے، اور وہ استاد کی عام طور پر نقل کرتے ہیں۔ اگر استاد کا تلفظ درست نہیں تو بچوں کا تلفظ بھی ٹھیک نہیں ہوگا۔ اور بار بار کے استعمال سے جب غلط تلفظ بچوں کے ذہن نشین ہو جائے گا۔ تو پھر اس کا چھوٹنا بہت مشکل ہے کیوں کہ کسی کام کے بار بار کرنے کا نام عادت ہے، اور عادت کا بدلنا مشکل ہو جاتا ہے۔ اس لیے اگر استاد اپنا وقار مجالس میں قائم رکھنا چاہتا ہے تو اسے لغت کا مطالعہ کر کے الفاظ کا تلفظ معلوم کر کے اسے بار بار استعمال کرنا چاہیے۔

عربی زبان کے جو الفاظ اردو میں پائے جاتے ہیں۔ ان کے تلفظ میں بہت احتیاط کی ضرورت ہے، کیوں کہ بہت سے ایسے الفاظ ہیں کہ زیر، زبر، پیش کے ذرا سے فرق سے ان کے معنی کچھ سے کچھ ہو جاتے ہیں۔ اور چوں کہ عام کتب میں اعراب نہیں لگائے جاتے، اور نہ ہی وہ روزمرہ کی گفتگو میں استعمال ہوتے ہیں، اس لیے تلفظ کی غلطیوں سے بچنے کے لیے کسی اچھی لغات کا استعمال کرنا بھی ضروری ہے۔ اور یہ تمام کام تب ہی ہو سکے گا، جبکہ مدرس گھر پر خود تیاری کرے گا۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ مدرس کی گھر پر تیاری کتنی اہم اور ضروری ہے، جس کی طرف مدرسین توجہ نہیں دیتے، اور اپنی ہتک خیال کرتے ہیں۔

تختہ سیاہ کا استعمال:۔ جماعت کو نیا سبق پڑھاتے وقت پہلے نئے اور مشکل الفاظ کو بلیک بورڈ پر موٹا اور خوشخط لکھ دینا چاہیے، پھر استاد کو ایک دو دفعہ ہجے بھی کرا دینا چاہئیں، اور تمام جماعت اجتماعی طور پر تقلید کرتی جائے اس کے بعد لغیر ہجوں کے استاد ایک ایک لفظ کو علیحدہ علیحدہ پڑھتا جائے، اور تمام جماعت اس کی تقلید کرتی جائے جب تمام الفاظ تین چار دفعہ کہلوائے جائیں تو وہ الفاظ چوں کہ ہوشیار طلبہ کو یاد ہو جائیں گے، اس کے بعد چند ہوشیار طلبہ سے باری باری وہ الفاظ کہلوائے جائیں، باقی تمام جماعت سے ان کی اجتماعی تقلید کرائی جائے تاکہ نئے اور مشکل الفاظ کا تصور بچوں کے ذہن نشین ہو جائے، اور وہ پڑھنے میں غلطی نہ کریں۔

اب استاد کو اپنا پڑھنے کا نمونہ دینے سے پہلے تمام جماعت کو نئے سبق کی کہانی کا مختصر طور پر حال بیان کرنا چاہیے۔ مثلاً نصیحت آمیز یا اخلاقی کہانی جس کا اخلاق پر بہت اچھا اثر پڑے۔ سچائی کے فائدے جھوٹ کے نقصان، یا کوئی بہادری کا کارنامہ وغیرہ کا مختصر طور پر حال بیان کرنا چاہیے۔ تاکہ طلبہ میں دلچسپی پیدا ہو جائے اور وہ مدرس کے نمونہ کا خیال رکھیں، اور بعد میں اسی طرح پڑھ سکیں، کیوں کہ مزے کے پڑھنے

سے یہ مراد ہے کہ پڑھنے والے کا اس طرح پڑھنا کہ نہ صرف قارئین بلکہ سامعین بھی پڑھی ہوئی عبارت کا مطلب سمجھ سکیں، اور الفاظ کی تمیز ہو سکے۔ عبارت کے الفاظ و حروف کو بغیر جھجک کے رواں پڑھا جا سکے۔ الفاظ و حروف کی آوازیں صحیح طریقہ سے ادا کی جائیں۔ مگر یہ الفاظ کی شناخت پر منحصر ہے۔

مدرس کا نمونہ:- جب چند ہوشیار طلبہ تختہ سیاہ پر لکھے ہوئے نئے اور مشکل الفاظ کہلوا چکیں تو مدرس جتنا سبق پڑھانا چاہتا ہے، اس میں سے اس کا کچھ حصہ طلبہ کے سامنے اور صاف خوشنوائی کو مد نظر رکھ کر پڑھ کر خود سنائے۔ کیوں کہ بچوں میں نقل کی عادت ہوتی ہے، اور وہ ہمیشہ اپنے استاد کی نقل اتارتے ہیں، اور اچھا پڑھنے کے اوصاف (خوشنوائی) پیدا کرنا مدرس کی ذات پر منحصر ہے، اس لئے ضروری ہے کہ جماعتیں ادنیٰ ہوں یا اعلیٰ مدرس کا پڑھنے کا نمونہ بہترین ہو۔

مدرس جب طلبہ کے سامنے پڑھنے کا نمونہ پیش کرے گا تو اس سے مشکل الفاظ کے تلفظ کے متعلق بچوں کی اچھی طرح تسلی بھی ہو جائے گی، اور ان کی مشکلات بھی دور ہو جائیں گی۔ کیوں کہ بچوں کو مناسب جگہ پر ٹھہرنے اور مناسب جگہ پر زور دینے کا علم بھی ہو جائے گا۔

اجتماعی پڑھنا- چھوٹی جماعتوں میں استاد ایک ایک لفظ صاف آواز میں آہستہ آہستہ پڑھتا جائے اور تمام بچے مل کر اس کی تقلید کریں۔ اس سے پڑھنے کے اکثر نقائص دور ہو جاتے ہیں۔ شرمیلے بچوں کی جھجک دور ہو جاتی ہے۔ جلد اور آہستہ پڑھنے والے بچے اعتدال پر آ جاتے ہیں۔ مگر مدرس کو اس میں نگرانی کرنے کی سخت ضرورت ہے۔ کیوں کہ اجتماعی طور پر پڑھنے میں کئی طلبا سبق کی طرف توجہ نہیں دیتے، اس بات کا خاص خیال رکھنے کی ضرورت ہے۔

انفرادی پڑھنا- مدرس تختہ سیاہ پر نئے اور مشکل الفاظ لکھ کر بچوں کی مشکلات کو دور کر چکا ہے، اپنا پڑھنے کا نمونہ بچوں کے سامنے پیش کر چکا ہے، اب ہوشیار طلبہ سے انفرادی طور پر نیا پڑھا ہوا سبق سننا شروع کر دے۔ جب تمام ہوشیار طلبہ سبق سنا چکیں تو بعد میں درمیانے طلبہ سے وہی سبق سنا جائے، اس کے بعد کمزور طلبہ سے۔ اگر کچھ کمزور بچے سبق سنانے سے قاصر رہیں تو انھیں گروہوں میں تقسیم کر کے ہوشیار طلبہ کی مدد سے سبق یاد کروا دینا چاہیے۔ مگر اتنا خیال ضرور رکھنا چاہیے کہ اگلے روز سابقہ سبق سنتے وقت سب سے پہلے

کمزور طلبہ کا سبق سنا جائے۔ تاکہ کمزور بچے سبق کو توجہ سے یاد کریں، اور کمزور طلبہ کی ایک فہرست بھی کمرہ میں لٹکا دینی چاہیے۔ اور اگلے روز سابقہ سبق سنتے وقت کمزور بچوں کی فہرست استاد کو اپنے پاس رکھ کر تمام کمزور بچوں کا سبق سننا چاہیے۔ تاکہ وہ نظر انداز نہ ہو جائیں۔ اور سبق یاد کرنے میں تساہل نہ کریں۔ ہوشیار طلبہ اور درمیانے طلبہ کا سبق تو پہلے روز ہی یعنی نیا سبق پڑھانے کے بعد ہی سنا جا چکا ہے۔

اس کے علاوہ ہوشیار طلبہ کی فہرست اور درمیانے طلبہ کی فہرست بھی کمرۂ جماعت میں آویزاں ہونی چاہیے۔ تاکہ کمزور اور درمیانے طلبہ میں رشک پیدا ہو۔ اور وہ ہوشیار بننے کی کوشش کریں۔ جب کوئی کمزور طالب علم ذرا بھی ترقی کرتا ہوا نظر آئے تو فوراً اس کا نام کمزور طلبہ کی فہرست سے کاٹ دیا جائے، اور درمیانے طلبہ کی فہرست میں اس کا نام لکھ دیا جائے۔ اور اگر کوئی درمیانے طلبہ سے ترقی کرتا ہوا نظر آئے تو اس کا نام بھی درمیانے طلبہ کی فہرست سے کاٹ دیا جائے اور ہوشیار طلبہ کی فہرست میں لکھ دینا چاہیے۔ تاکہ ان کی حوصلہ افزائی ہو جائے، اور وہ پڑھنے میں بہت اچھی طرح کام کریں۔ جو لڑکا ہوشیار طلبہ میں سے ذرا تساہل سے کام کرتا ہوا نظر آئے، اس کا نام ہوشیار طلبہ کی فہرست سے کاٹ دیا جائے اور درمیانے طلبہ کی فہرست میں لکھ دیا جائے۔ اسی طرح درمیانے طلبہ کے تساہل سے کام کرنے پر کمزور طلبہ کی فہرست میں نام لکھ دیا جائے۔ اس طرح کوئی بھی طالب علم تساہل سے کام کرتا ہوا نظر نہیں آئے گا۔ جماعتیں ادنیٰ ہوں یا اعلیٰ ان کے کمزور اور درمیانے اور ہوشیار طلبہ کو ملا کر گروہوں میں تقسیم کر دینا چاہیے۔ تاکہ وہ اپنے کمزور ساتھیوں کی مدد کرنے میں مفید ثابت ہوں۔ گروہوں میں تقسیم کرنے کا طریقہ ماہ اکتوبر سنہ ۱۹۵۶ء کے آموزش میں لکھا جا چکا ہے اس طرح ہر ایک گروہ بہت جلد کوشش کرے گا کہ اس کے تمام کمزور و درمیانے طلبہ بہت جلد ہوشیار ہو جائیں اور ایک دوسرے گروہ کے مقابلے میں مقابلہ کا جذبہ بھی پیدا ہو گا۔

انفرادی طور پر پڑھنے سے ہر ایک لڑکے کی غلطیاں دور ہو سکیں گی کیونکہ جس وقت کوئی لڑکا غلطی کریگا تو باقی لڑکے فوراً اپنا ہاتھ کھڑا کر دیں گے اور اسے ٹوک دیں گے۔ اس طرح غلطیوں کی اصلاح بچوں سے ہو جائے گی۔ بڑی جماعتوں میں صرف انفرادی پڑھانا ہی کافی ہے۔

بچوں کی لغت :۔ کتاب کا نیا سبق جتنا پڑھانا مقصود ہو، اس کے مشکل الفاظ کے معنی بچوں کو بلیک بورڈ

تیا سبق پڑھاتے وقت مدرس کو لکھ دینا چاہیے۔ تاکہ چھوٹی جماعتوں کے بچے الفاظ کے معنی آسانی سے اپنی کاپیوں پر لکھ سکیں اور کسی لفظ کے معنی لکھنے نہ چھوڑ جائیں۔ یا کسی لفظ کا معنی غلط نہ لکھ لیں۔ اس کے لکھنے کا طریق یہ ہے کہ پڑھی ہوئی کہانی کا نام موٹی قلم سے لکھیں۔ اور جس صفحے کے الفاظ کے معنی لکھے جائیں اس صفحے کا نمبر بھی لکھ دیا جائے۔ پھر الفاظ کو ذرا موٹے قلم سے خوش خط لکھ دیا جائے، اور اس لفظ کے سامنے اس کے معنی ذرا باریک قلم سے خوش خط لکھ دیا جائے۔ اس کے علاوہ جن محاورات کا مطلب سمجھانا ضروری ہو، یا خاص ترکیبیں جن کی تشریح کی ضرورت ہو، یا ایسے الفاظ جن کا فقرات میں استعمال کرانا مقصود ہو، بلیک بورڈ پر لکھ دینے چاہئیں۔ تاکہ بچوں کے ذہن نشین ہو جائیں، اور وہ تختہ سیاہ پر سے دیکھ کر اپنی کاپیوں پر لکھ سکیں، اور انھیں اپنی کتاب کے الفاظ کے معنی یاد کرنے میں سہولت رہے۔ اگر کسی لفظ کے معنی تلاش کرنا ہوں تو بچوں کو دقت پیش نہ آئے۔ کتاب کا صفحہ دیکھا اور الفاظ دیکھا، اور معانی کی کاپی سے وہ صفحہ نکالا اور لفظ تلاش کیا اور اس کا معنی یاد کر لیا۔ جب بچے تمام کتاب کے الفاظ کے معنی لکھ چکیں، تو پھر ان سے یہ کہہ دینا چاہیے کہ وہ جب کوئی نیا لفظ پڑھیں یا کسی سے سنیں تو فوراً اپنی کاپی میں نوٹ کر لیں۔ اس طرح بچے اپنی لغت خود ہی تیار کر لیں گے۔ استاد کے خیال میں جن الفاظ کا تلفظ غلط ہونے کا امکان ہو، ان کی فہرست سبق کے وقت بھی مرتب کرنا ضروری ہے، جس میں سبق کے دوران میں ضرورت کے مطابق توسیع بھی کی جا سکتی ہے ایسی لغت کا استعمال بچوں کے لیے نہایت مفید ثابت ہوگا۔ اس طرح لغت تیار کرنے کا یہ بھی فائدہ ہوگا کہ بچے جو کہانی پڑھتے گئے ہیں، اس کے ساتھ ہی اسی کہانی کے معانی بھی لکھے گئے ہیں، اور جب سابقہ کہانی استاد نے بچوں سے سنی ہوگی، وہ اس کے معانی بھی طلبہ سے پوچھتا گیا ہوگا، جس کا نتیجہ یہ نکل سکتا ہے کہ بچے ہر روز پڑھی ہوئی کہانی کے معنی بھی یاد کرتے گئے ہیں۔ جب تمام کتاب ختم ہو جائے تو بچوں کو اپنے اپنے گروہوں میں بٹھا کر ایک دوسرے لڑکے کی مدد سے تھوڑے تھوڑے کر کے تمام کتاب کے معنی یاد کروانا چاہیے تاکہ بھولے ہوئے معنی از سر نو یاد ہو جائیں، اور معنی سنتے وقت گروہوں کے لیڈروں کو مخالف گروہوں پر مقرر کر کے معنی سننا چاہیے۔ تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ کس گروہ کے زیادہ طلبہ نے معنی یاد کیے ہیں۔ تاکہ ہر ایک گروہ اپنے تمام طلبہ کو معنی یاد کرا لینے میں ایک دوسرے لڑکے کی مدد کرے۔ اور اس کا گروہ، اگلے روز اپنے استاد کے

سامنے دوسرے گروہ سے سبقت لے جانے کی کوشش کرے، جب کتاب کے تمام معنی بچوں کو یاد ہو جائیں، پھر وہ ہر روز اپنی کتاب کے تمام معانی ایک دوسرے کو سنایا کریں، اور کبھی کبھی استاد کو بھی معنی سننے چاہئیں۔ تاکہ طلبہ لاپرواہ نہ ہو جائیں۔

جب استاد اتنا کام کرا چکے تو پھر ہر روز کتاب کی کئی کئی کہانیاں ایک دن میں ہی ختم ہو جایا کریں گی، اور ان تمام کے معنی بھی ساتھ ہی پوچھے جائیں گے۔ اور کتاب ایک ماہ میں کئی دفعہ ختم ہو گی، جس کا سال کے آخر تک کافی اعادہ ہو جائے گا، جو کہانی کا سبق بچوں سے سنا جائے اس کے بعد اس کہانی کا مختصر حال بھی بچوں کی زبانی سننا چاہیے۔ اس طرح بچوں کو کتاب کی تمام کہانیوں کے مختصر حال زبانی یاد ہو جائیں گے جو ان کی حیات درسی میں مفید ثابت ہوں گے، اور کبھی کبھی ان کہانیوں کے مختصر حال بچوں سے لکھوانا بھی چاہئیں۔ مجھے تجربہ ہے کہ جب اس طریق سے بچوں کو کام کرایا جائے گا تو بچے جماعت سوم کی تعلیم حاصل کر لینے کے بعد اس قابل ہو جائینگے کہ اگلی جماعت کی کتابیں بغیر استاد کے خود بخود پڑھ سکیں۔ اگر کوئی ایسا مشکل لفظ جو انہوں نے پہلے نہیں پڑھا ہو آجائے تو وہ سبق پڑھنے سے پہلے استاد سے پوچھ لیں گے، اور بچوں کا نیا سبق پڑھنا ایسا معلوم ہوگا، جیسا کہ بچوں نے پہلے پڑھا ہوا ہے۔ اور وہ سابقہ سبق سنا رہے ہیں۔ اس طریق سے بچوں کے پڑھنے کی رفتار بہت تیز ہو جائے گی، اور سال بھر میں کافی اعادہ بھی ہو جائے گا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ سال کے آخر میں شاید ہی ایک دو طلبہ کمزور رہیں۔ کیونکہ ایسے طریقوں پر میں نے خود کام کر کے تجربہ کیا ہوا ہے۔

ایسے طریقوں سے بچوں کو فر فر پڑھنا آجاتا ہے۔ روانی درست ہو جاتی ہے، بچوں کی جھجک دور ہو جاتی ہے، بچے استاد سے خوف نہیں کھاتے، بلکہ استاد کو اپنا ہمدرد سمجھتے ہیں، اور ہر ایک لڑکا استاد سے شاباش حاصل کرنے کا خواہش مند ہوتا ہے۔ بچوں میں اوصاف خوشخوانی پیدا ہونے کے علاوہ تیسری جماعت کے بچے اپنے اعزہ کو خطوط لکھنے کے قابل ہو جاتے ہیں۔ مندرجہ بالا طریق پر کام کرنے سے بچوں کی بنیادی کمزوری دور ہو جاتی ہے، اور ہائی کلاسز میں پہنچ کر ایک اچھے مقرر ثابت ہو سکتے ہیں۔

نظم خوانی:- نثر کے ساتھ ہی بچوں کو نظم پڑھنی بھی سکھانا چاہیے۔ چھوٹے بچے جب پہلے پہل سکول میں پڑھنے کے لیے آتے ہیں تو وہ اکثر اپنے گھروں میں یا باہر کھیل کود کے میدان میں راگ الاپ

گیت گاتے پھرتے ہیں۔ جب وہ سکول میں آتے ہیں تو گھر اور سکول میں فرق معلوم کرتے ہیں۔ اس لیے ان بچوں سے گیت سننے چاہئیں تاکہ بچوں کو صاف اور صحیح بولنے کی عادت ہو جائے۔ بعد میں انہیں دو تین چھوٹی چھوٹی اچھی نظمیں بطور راگ یاد کرا دینی چاہییں۔ جیسے آجا پیاری چڑیا آجا۔ اپنی بانکی چال دکھا جا۔ سیدھی سادھی صورت تیری۔ پیاری پیاری مورت تیری ننھے ننھے پنجے تیرے۔ دل کو لبھانے والے میرے چونچ ذرا سی چگنے والی۔ دانہ دنکا چننے والی۔ چھوٹے چھوٹے تیرے بازو۔ بل پرجن کے اڑتی ہے تو۔ آجا پیاری چڑیا آجا۔ اپنی بانکی چال دکھا جا۔ یا گھڑی کی نظم۔

سویرے سویرے جگایا اسی نے۔ بچھونے سے تم کو اٹھایا اسی نے۔ سبق یاد سارا کرایا اسی نے جو کرنا ہے کر لو بتایا اسی نے۔ کٹا کٹ کٹا کٹ چلی جا رہی ہے۔ بچے ایسی نظموں کو خوشی سے گاتے پھریں گے جس سے صاف اور صحیح بولنے کی کافی مشق ہو جائے گی۔ اس کے بعد مدرس کو نظم خوانی کے لیے مندرجہ ذیل تجاویز پر عمل کرنا چاہیے۔

(۱) شعر پڑھنا :- چھوٹی جماعتوں کے بچے تو درکنار بڑی جماعتوں کے بچے بھی اشعار درست نہیں پڑھ سکتے۔ اس لیے استاد کو چاہیے کہ وہ اچھی نظمیں اور شعر بچوں کو پڑھ کر سناتا رہے، تاکہ بچے تقلید کرنے کی کوشش کرتے رہیں۔

(۲) نظم پڑھنا :- شعر کا پڑھنا اصل میں سننے کے برابر ہے۔ شعر کو جب تک بلند آواز سے نہ پڑھا جائیگا اس کا مطلب سمجھ میں نہیں آئے گا، اور جب تک زبان سے ادا نہ کیا جائے گا، اس کی خوبیاں ظاہر نہ ہوں گی۔ اس لیے بچوں کو بلند آواز سے نظم پڑھنے کی مشق کرانا ضروری ہے، درسی کتب میں جو نظمیں موجود ہیں۔ ان سے مذاق سخن پیدا نہیں ہوتا۔ اس لیے بچے بد دل ہو جاتے ہیں، اور اچھے برے شعروں میں تمیز نہیں کر سکتے بلکہ نظم سے انہیں بہت نفرت ہو جاتی ہے، اس لیے استاد کو چاہیے کہ وہ دلچسپ اشعار انتخاب کرے جو بالکل سادہ بحر کے ہوں اور آسان بھی ہوں اور بچوں کی قابلیت کے مطابق ہوں۔

(۳) اشعار کا سمجھانا :- جو نظمیں جماعت میں پڑھی جائیں۔ ان کا مطلب بھی بچوں کے ذہن نشین کرنا

ضروری ہے۔ مگر مدرس ہر ایک شعر کی تشریح کو اتنا لمبا نہ کر دے کہ بچوں کی دلچسپی جاتی رہے۔ استاد کا تو صرف اتنا ہی فرض ہے کہ وہ بچوں کے سامنے نظم کو صحیح طریقے سے پڑھنے کا نمونہ پیش کرے۔ تاکہ بچے پڑھنے کا صحیح طریقہ سیکھ جائیں اور اشعار کا ادا کرنا بھی مطلب وہ خود بخود سمجھ لیں گے۔

(۴) جب بچے کئی نظمیں پڑھ چکیں اور بہت سے شعر سن چکیں تو ان سے یہ کہا جائے کہ وہ ایسے شعر یاد کریں جو انہیں پسند ہوں۔ پھر ہفتہ میں کوئی ایک دن مقرر کر کے بچوں سے مشاعرہ کرایا جائے۔ تاکہ وہ ان کی خوبیاں دریافت کر سکیں۔ اس سے بچوں میں اچھے اور بُرے شعروں کی تمیز پیدا ہو جائے گی۔ اس کے بعد بچوں کو یہ بھی تاکید کی جائے کہ وہ اپنے پاس نوٹ بکیں رکھیں اور جب کوئی اچھا پڑھیں یا سنیں تو اپنی نوٹ بک میں اسے لکھ لیں۔ اس طرح بچوں میں مذاقِ سخن پیدا ہونے میں کافی مدد ملے گی۔

(۵) بچوں کو نظمیں یاد کرانا:۔ استاد جب نظم کے مضمون کا بچوں پر اثر ڈالے گا تو ان میں نظمیں یاد کرنے کا خود بخود شوق پیدا ہو جائے گا۔ اور وہ نظم کے محفوظ رکھنے کے خواہش مند ہو جائیں گے۔ مگر بچوں کی چونکہ مختلف طبیعتیں ہوتی ہیں۔ اس لیے مدرس کو چاہیے کہ اچھی اچھی نظموں کی فہرست طلبہ کے سامنے پیش کر دے۔ تاکہ ہر ایک لڑکا اپنی اپنی پسند کے مطابق ان میں سے نظمیں انتخاب کر لے۔ اس طرح نظمیں یاد کرنے میں بچے بے حد دلچسپی لیں گے۔

(۶) جب بچے نظمیں یاد کر لیں تو استاد کو چاہیے کہ طلبہ سے زبانی مختلف نظمیں سنے۔ جو طلبہ صحیح طور پر صحیح نظمیں سنائیں، ان کی حوصلہ افزائی کی جائے۔ اور کبھی کبھی معمولی سا انعام بھی دیا جائے۔ تاکہ ان میں زبانی نظمیں سنانے اور یاد رکھنے کا ذوق بڑھے۔

اگر استاد چھوٹے بچوں میں بچہ بن کر کام کرے گا تو بچے کافی دلچسپی لیں گے۔ یہ اصول مدرس کو کسی حصہ میں بالکل نہیں چھوڑنا چاہیے۔ اس طرح بچوں کی تعلیم ہنسی خوشی میں پرائمری تک آسانی سے مکمل ہو جاتی ہے، اور بچے بھی استاد سے خوش رہتے ہیں۔

تعلیمی دنیا پر ایک نظر

عرب مہاجرین کے لیے تعلیم کا نازک دور

اقوام متحدہ کے سائنسی تعلیمی، اور ثقافتی ادارے (یونیسکو) کے ڈائرکٹر جنرل نے ادارے کی مجلس انتظامیہ کو جس کا اجلاس پیرس میں ہو رہا ہے باخبر کر دیا ہے کہ فلسطین کے عرب مہاجرین کی تعلیم کا مسئلہ ایک نازک دور سے گزر رہا ہے۔

ڈاکٹر لیوتھر ایونز نے اراکین مجلس کو بتایا کہ نزاکت حالات کا صحیح اندازہ ابھی نہیں ہو سکتا۔ لیکن رقم تیزی سے خرچ ہو رہی ہے، اور اب اتنا روپیہ باقی نہیں ہے کہ موجودہ تعلیمی سال کے آخر تک اسے پورا کیا جا سکے۔ یونیسکو نے اس علاقے میں اپنا پروگرام پہلے ہی کم کرنا شروع کر دیا ہے۔ مدرسوں کی تعمیر روک دی ہے۔ بہت جلد فنی اور پیشہ ورانہ تربیت کا کام معطل کر دیا جائے گا جب تک مالی حالت بہتر نہ ہو۔ ہمیں ابتدائی اور ثانوی مدارس روک دینے ہی پڑیں گے۔ اس پریشان کن صورت حالات کا سامنا ان بدقسمت بچوں کو کرنا پڑ رہا ہے جن کی تعلیمی دیکھ بھال ہمارے سپرد کر دی گئی ہے۔

کئی سال سے یونیسکو کے پروگرام میں عرب مہاجرین کے لیے ہنگامی تعلیمی امداد ایک اہم جزو بن گئی ہے۔ یہ امداد اقوام متحدہ کے ادارہ بحالیات و امور برائے مہاجرین فلسطین (انروا) کے ساتھ مل کر دی جاتی ہے، جو اس علاقے کے ۹ لاکھ مہاجرین کی خوراک، رہائش، صحت و تندرستی اور آبادکاری کا خیال رکھتا ہے۔ انروا کے بجٹ میں سے تعلیم کے لیے ۳۰ لاکھ ڈالر مخصوص کیے گئے ہیں۔ تعلیمی پروگرام کی فنی ذمہ داری یونیسکو پر عائد ہوتی ہے، جو ڈیڑھ لاکھ بچوں کی ابتدائی تعلیم کا، ۲۵ ہزار کی ثانوی تعلیم کا اور ۴۴ ہزار اشخاص کی بنیادی تعلیم کا انتظام کرتا ہے۔

انروا کو رضاکارانہ طور پر چندے زیادہ تر حکومتوں سے ملتے ہیں۔ بیزان کی ۸۵ فی صد رقم ریاست ہائے متحدہ اور برطانیہ سے وصول ہو جاتی ہے۔ باقی ۴۵ ملک دیتے ہیں۔ انروا کو بھی اس رقم کی کمی کا خدشہ

سامنا کرنا پڑ رہا ہے کیوں کہ چندوں کی رقمیں زیادہ نہیں ہیں، اور وقت پر کام چلانے کے لیے ان کی فوری ادائیگی نہیں ہوتی۔ انروا کے ڈائرکٹر جنرل سے اس موضوع پر تبادلہ خیالات کریں گے۔ اس کے بعد ریاست ہائے متحدہ اور کینیڈا جاکر وہاں کی حکومتوں اور سرکاری افسروں سے اسی سلسلے میں بات چیت کریں گے۔

انروا کے ڈائرکٹر نے تعمیری سرگرمیوں کا سلسلہ روک دیا ہے۔ اس سے تعلیمی پروگرام پر بُرا اثر پڑے گا کیونکہ اس طرح نئے مدرسوں کے لیے کمرے اور پیشہ ورانہ تربیت کے مرکز رک جائیں گے۔ ہر سال تقریباً دو سو نئے کروں کی ضرورت لاحق ہوتی ہے۔ کیوں کہ مہاجرین کی آبادی بڑھ رہی ہے۔ تعمیر روک دینے کا مطلب یہ ہوگا کہ بعض طلبا کو خیموں میں تعلیم دی جائے گی۔ باقی پانچ سال سے ایسا ہی ہو رہا ہے۔

اس سال کے پروگرام میں ۲۲ لاکھ ۰ ۵ ہزار ڈالر کی رقم پیشہ ورانہ تربیت کے مرکز تعمیر کرنے کے لیے مخصوص کی گئی تھی۔ لیکن شاید ان کی تکمیل ممکن نہیں ہو سکے گی۔ اگر انروا کے فنڈ میں بہت جلد اضافہ نہ ہوا تو ابتدائی تعلیم کے پروگرام کو کم کر دینا ہوگا اور استادوں کی تربیت کے کالج بھی عارضی طور پر روک دیے جائیں گے اور جیسا کہ ڈاکٹر لیبو نئر نے مجلس انتظامیہ کو آگاہ کیا ہے۔ ابتدائی اور ثانوی مدرسے بھی بند کر دینے پڑیں گے۔

بین الاقوامی طبقات الطبیعی سال

اقوام متحدہ کے تعلیمی، سائنسی، اور ثقافتی ادارے (یونیسکو) نے حال ہی میں ۱۰ صفحات کا ایک مصور کتابچہ آسان زبان میں بین الاقوامی طبقات الطبیعی سال کے عنوان سے شائع کیا ہے۔ جس میں مبسوط مضامین کے علاوہ تصویروں اور خاکوں کے ذریعہ اس عظیم الشان مہم کے اغراض و مقاصد اور اس کی کامیابی کے امکانات پر روشنی ڈالی گئی ہے، جو اس کرۂ ارض کو بہتر طریقے پر سمجھنے کے لیے شروع کی جائے گی۔ پچاس سے زیادہ قوموں کے اعلیٰ سائنسدان یکم جولائی سے تحقیقات کے ایک بین الاقوامی پروگرام پر غور کریں گے، تاکہ اس حصے کے اسرار و رموز کو سمجھا جا سکے۔ جہاں اس کرۂ ارض کی حدیں ختم ہوکر کائنات کی لامتناہی وسعتیں شروع ہوتی ہیں۔

کتابچے کے مصنف مسٹر ورنر یو ڈیلر نے زمین کے ان مصنوعی طفیلی سیاروں کا ذکر کیا ہے جو امریکی اور روسی پروگرام کے مطابق فضا میں چھوڑے جانے والے ہیں۔ ریاست ہائے متحدہ کے منصوبے میں متعدد سیارے شامل ہیں جن کا قطر ۰ ۵ سینٹی میٹر، وزن ۱۰ کلوگرام اور دائرۂ گردش ڈھائی سو سے پانچ سو کلومیٹر

تک ہوگا. کتابچے میں اس حیرت انگیز سائنسی مہم کی تشریح کی گئی ہے۔ کرۂ ارض کے گرد یہ مصنوعی سیارے ۲۸ ہزار کلومیٹر فی گھنٹہ کی رفتار سے گھومیں گے۔ روس نے صرف ایک سیارہ چھوڑنے کا اعلان کیا ہے جو غالباً امریکی سیارے سے بڑا ہوگا۔

ان کے علاوہ ایک روکٹ پروگرام بھی مرتب کیا گیا ہے، جس میں ریاست ہائے متحدہ برطانیہ، فرانس جاپان اور شاید چند اور ملک حصہ لیں گے۔ اس پروگرام کے مطابق بہت بلندی تک جانے والے راکٹ چھوڑے جائیں گے۔ تاکہ وہ بالائی سطح کی کیفیات کا ریکارڈ تیار کر سکیں۔

طبقات الطبیعی سال کا سب سے اہم پہلو یہ ہے کہ قطب جنوبی کی سیاحت و مشاہدات پر سب سے زیادہ توجہ دی جائے گی۔ اس سے قبل پہلا قطبی سال ۸۳-۱۸۸۲ء اور دوسرا قطبی سال ۳۳-۱۹۳۲ء میں منایا گیا تھا۔ یونیسکو کے کتابچے میں درج ہے کہ سائنسدانوں کو قطب جنوبی کی تحقیقات سے بہت سی امیدیں وابستہ ہیں۔ اور ان سائنسی مقاصد کے پس منظر میں کچھ اقتصادی اور سیاسی امکانات بھی پوشیدہ ہیں۔ پروگرام کے مطابق اس بین الاقوامی طبقات الطبیعی سال، کے ۱۲ مرکز قائم ہوں گے۔ جہاں سے کائنات کا مشاہدہ کیا جائے گا۔ تحقیقات کا یہ سلسلہ ۳۱ دسمبر ۱۹۵۸ء تک جاری رہے گا، اٹھارہ ماہ کے اس "سال" میں سائنسدان جن کاموں میں مصروف رہیں گے، ان پر کتابچے میں روشنی ڈالی گئی ہے۔ مثلاً کرۂ ارض پر شمسی اثرات کا مناقی تابکاری اور شہاب ثاقب۔ کائنات کی ہیئت و ترکیب، زمین کی پیمائش، اور سمندر کے اسرار و رموز یونیسکو نے ان تحقیقات کے ضمن میں انٹرنیشنل کونسل آف سائنٹفک یونینز کو جو مالی امداد دی ہے اس کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔

مذکورہ بالا تحقیقات کی مشترکہ کوششوں میں ان ۲۵ ملکوں کے سائنسدان فی الحال شریک ہوئے ہیں۔ پاکستان، ارجنٹائن۔ آسٹریلیا۔ آسٹریا۔ بلجیم۔ بولیویا۔ برازیل۔ بلغاریہ۔ کنیڈا۔ چلی۔ کولمبیا۔ چیکوسلواکیہ ڈنمارک۔ ایکوئیڈور۔ مصر۔ حبشہ۔ فن لینڈ۔ فرانس۔ وفاقی جمہوریت۔ جرمنی۔ جمہوریت جرمنی۔ یونان ہنگری۔ آئس لینڈ۔ بھارت۔ انڈونیشیا۔ ایران۔ آئرلینڈ۔ اسرائیل۔ اٹلی۔ جاپان میکسیکو۔ مراقش۔ نیدرلینڈ۔ نیوزی لینڈ۔ ناروے۔ عوامی جمہوریت چین۔ پیرو۔ فلپائن۔ پولینڈ۔ پرتگال۔ رومانیہ۔ اسپین۔ سویڈن۔ سوئیٹزرلینڈ

ٹیونس۔ جنوبی افریقہ۔ برطانیہ۔ روس۔ ریاست ہائے متحدہ امریکہ۔ اروگوئے۔ وینی زوئیلا۔ یوگوسلاویہ۔

منشیات سے متعلق مجوزہ ضابطۂ قانون

نشہ آور ادویات سے متعلق اقوام متحدہ کے کمیشن کے بارھویں اجلاس میں سب سے بڑا کام یہ ہوا کہ مجوزہ واحد ضابطۂ قانون کو ترقی دی گئی۔ جو منظور ہو جانے کے بعد نشہ آور ادویات سے متعلق موجودہ نو معاہدوں کی جگہ لے لے گا۔

نشہ آور ادویات کا کمیشن اقتصادی اور معاشرتی کونسل کے آٹھ عملی کمیشنوں میں سے ایک ہے۔ اور حقیقتاً یہی ایک ادارہ ہے جو نشہ آور ادویات کے بین الاقوامی احتساب کے لیے آئین اور حکمت عملی کے قاعدے مرتب کرتا ہے۔ ان کے علاوہ دو اور ادارے افیون کا مستقل مرکزی بورڈ اور نگرانی ادویات کی جماعت کہلاتے ہیں۔ لیکن ان کی حیثیت فنی اور نیم آئینی ہے۔

کمیشن میں ۱۵ ملکوں کے نمائندے شامل ہیں، اور سال میں ایک بار اس کا اجلاس ہوتا ہے۔ اس کے اراکین ایسے ملکوں سے منتخب کیے جاتے ہیں جن کو منشیات کی پیداوار یا صنعت کے سلسلے میں اہمیت حاصل ہوتی ہے۔ یا پھر ایسے ملکوں سے جہاں ایسی ادویات کی ناجائز خرید و فروخت ایک نازک مسئلہ بن گئی ہے۔ دس اراکین ایک لامحدود مدت کے لیے منتخب ہوتے ہیں۔ اس سال ان ملکوں کے نام یہ ہیں۔ کنیڈا۔ چین۔ فرانس۔ بھارت۔ پیرو۔ ترکی۔ روس۔ برطانیہ۔ ریاست ہائے متحدہ اور یوگوسلاویہ۔ باقی پانچ ممبر تین سال کے لیے منتخب ہوئے ہیں۔ اس وقت ان کے نام یہ ہیں۔ آسٹریلیا۔ ہنگری۔ ایران اور میکسیکو۔ اجلاس میں مذکورہ بالا دو اداروں کے علاوہ عالمی ادارۂ صحت اور مجرمین کا بین الاقوامی ادارہ پولیس بھی شریک ہوتا ہے۔ بعض ملکوں کے مبصرین کو شرکت کی دعوت دی جاتی ہے، چناں چہ حالیہ اجلاس میں ۱۹ ملکوں کے مبصرین موجود تھے۔

اقوام متحدہ نے فروری سنہ ۱۹۴۶ء میں نشہ آور ادویات کے بین الاقوامی احتساب کی وہ ذمہ داریاں اور اختیارات خود سنبھال لیے جو اس سے قبل مجلس اقوام کے سپرد تھے۔ چناں چہ اقوام متحدہ کی اقتصادی اور معاشرتی کونسل کے زیر ایوان کمیشن عمل میں آگیا، دراصل سنہ ۱۹۱۲ء سے منشیات کی روک تھام کا ایک

نظام تشکیل پارہا تھا، اور اس ضمن میں بتدریج کارروائی ہو رہی تھی۔

کمیشن کا پہلا کام یہ تھا کہ لڑائی کے بعد منشیات کے بین الاقوامی احتساب کا قانون پوری طرح بحال ہو جائے۔ اس کے ساتھ ہی سنہ ۱۹۴۷ء کے شروع میں واحد ضابطۂ قانون نافذ کرنے کی تجاویز پیش ہونے لگیں۔ کیونکہ یہ محسوس کر لیا گیا تھا کہ قانونی دفعات کی یکسر چھان بین ضروری ہے، تاکہ موجودہ نقائص دور ہوں اور احتساب کے طریقے بھی آسان ہو جائیں۔

سنہ ۱۹۴۸ء میں اقتصادی اور معاشرتی کونسل نے سیکرٹری جنرل سے درخواست کی کہ وہ نئے آئین کا ایک بنیادی مسودہ تیار کریں۔ اور ایک سال بعد کمیشن نے کونسل سے یہ اختیار لے لیا، تاکہ نشہ آور ادویات سے متعلق جملہ بین الاقوامی قوانین کو ملا کر ایک نیا ضابطہ مرتب کرے۔ اس ضمن میں جو تجاویز وصول ہوئیں، ان پر کمیشن نے سنہ ۱۹۵۰ء سے تبادلۂ خیالات شروع کر دیا۔

ضابطۂ قانون کا اصل مقصد یہ ہے، کہ موجودہ متعدد معاہدوں کی بجائے صرف ایک ضابطۂ قانون عمل میں آئے۔ نئی تکنیکی ترقیوں کی روشنی میں یہ کام دشوار نہیں ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہر ملک کے قانون میں سہولت کے ساتھ ساتھ لچک پیدا ہو۔ وہ زیادہ موثر ہو، اور اسے عمل میں لانے کے ذرائع بھی پیدا ہو جائیں۔ عملی نظام کو درست کرنے کی اہمیت پر اس لیے زور دیا گیا کہ منشیات کی بین الاقوامی روک تھام سے متعلق مختلف ادارے کام کر رہے تھے اور ان سب کا طریقۂ کار جداگانہ تھا۔ علاوہ ازیں عالمی ادارہ صحت جو لڑائی سے پہلے قائم نہیں تھا، وجود میں آ چکا تھا، اور اس کے ماتحت ماہرین کی کمیٹی ان ادویات سے متعلق مقرر ہو گئی تھی جن کے استعمال سے نشے کی لت ممکن ہو سکتی ہے۔

یہ بتا دینا مناسب ہے کہ منشیات کے بین الاقوامی احتساب کا اصل مقصد یہ ہے کہ خطرناک ادویات کا غلط استعمال روک دیا جائے۔ لیکن دنیا کی اقتصادی، معاشرتی اور فنی ترقی کے باعث منشیات کا علم بھی زیادہ وسیع ہو گیا، اور اس طرح اس کے ناجائز استعمال کے مواقع بڑھ گئے۔ لہٰذا واحد ضابطۂ قانون تجویز کرنے کا ایک بڑا مقصد یہ بھی ہے کہ احتساب کے طریقے کو تقویت پہنچ جائے۔

ضابطے کا متن :۔ بین الاقوامی آئین کی دنیا میں کوئی ضابطۂ قانون مرتب کرنا اس لیے مشکل ہے کہ

چند ملک بعض اصولوں کو موجودہ حالات کے ماتحت قبول کر سکتے ہیں۔ لیکن نئی صورتیں پیدا ہونے پر نظرثانی کرنے کے بعد انہیں محال سمجھا جا سکتا ہے۔ اور جب منشا یہ ہو کہ دنیا کے سب ملک اس میں شریک ہوں تو زیادہ سوچ بچار سے کام لینا پڑتا ہے۔

بارھویں اجلاس میں تبادلۂ خیالات کے وقت بتایا گیا کہ قانون سازوں کی معلومات اور سائنسدانوں بالخصوص منشیات پر احتساب کرنے والے ماہروں کے تجربات کو کس طرح یکجا کیا گیا ہے۔ تاکہ ضابطۂ قانون کا مسودہ ہر لحاظ سے مکمل اور جامع اور سب کے لیے قابل قبول ہو۔ متن تیار کرنے کے لیے ایک مختصر سی کمیٹی مقرر کر دی گئی تھی تاکہ وہ تمام پہلوؤں پر غور کر لینے کے بعد کمیشن کے سامنے مسودہ پیش کرے۔ کمیٹی نے ان جوابات کو خاص طور پر مدنظر رکھا جو سیکرٹری جنرل کے استفسار پر حکومتوں نے بھیجے تھے۔ کمیٹی ۲۰ مئی کو مقرر کی گئی تھی جس میں کنیڈا۔ منگری اور بھارت شامل تھے۔ کنیڈا کے نمائندے مسٹر کرن اس کے صدر تھے۔

موجودہ معاہدوں کے مطابق بعض منشیات کی تیاری اور تقسیم قابل اجازت ہے۔ اور ایسی ادویات کو علاج معالجے میں استعمال کرنے کے لیے جائز قرار دیا گیا ہے۔ نئے ضابطے کے بموجب ان تمام معاہدوں کو ممنوع ٹھہرایا جائے گا۔ جن کے غلط استعمال سے صحت انسانی پر برا اثر پڑ سکتا ہو، جیسا کہ آج کل بھی ہوتا ہے۔ اس کی ایک آسان صورت یہ ہے کہ علاج کی غرض سے تیار ہونے والی ادویات کی ناجائز فروخت کو رد کرنے کے لیے یہ قاعدہ بنایا گیا ہے کہ وہ صرف طبی اور سائنسی اداروں کو فراہم کی جائیں۔ نئے ضابطے کے بموجب ایسی ادویات کی جانچ پڑتال، تیاری اور درآمد میں زیادہ احتیاط برتی جائے گی۔ بعض ملکوں میں ایسی ادویات کی تجارت کے جو طریقے رائج ہیں، ان میں بھی نئے ضابطے کے تحت تبدیلی کی جائے گی۔ مثلاً ایسے تمام پودوں کی کاشت کرنے والوں کو لائسنس دیا جائے گا۔ جن سے نشہ آور ادویات حاصل ہو سکتی ہوں۔ اس میں افیون۔ کوکین۔ بھنگ وغیرہ کو شامل کیا جائے گا۔ ماہرین کی یہ بھی رائے ہے کہ بھنگ کا کسی بھی صورت میں طبی استعمال ترک کر دینا چاہیے کیونکہ وہ ہر حالت میں مضر ثابت ہوتی ہے۔

نئے ضابطے کی ایک اور خصوصیت یہ ہوگی کہ اس کے بموجب نشے کی لت میں مبتلا لوگوں کا علاج کیا جائے گا اور ان کو مفید کاموں میں لگانے کی کوشش کی جائے گی۔ تاہم قانونی شرائط میں اتنی لچک رکھی گئی ہے کہ وہ مختلف

ملکوں میں مختلف حالات کا ساتھ دے سکیں۔

نئے ضابطے میں ایسی نئی مرکب نشہ آور ادویات کا بھی ذکر ہے جو ۱۹۳۹ء کے بعد سے تیار ہونے لگی ہیں ان میں سے بعض کوئلے، کولتار اور پٹرولیم سے ترکیب پاتی ہیں۔ ان کے برعکس تمام پرانی منشیات نباتاتی ہوتی ہیں بعض ملکوں میں مجرموں کی گرفتاری کے قوانین جداگانہ ہیں، خصوصاً غیر ملکی باشندوں کو اصل مالک کے حوالے کرنے کے قوانین میں بڑا فرق پایا جاتا ہے۔ نئے ضابطے کے بموجب منشیات کی ناجائز درآمد و برآمد اور خرید و فروخت کرنے والوں کے ساتھ یکساں قسم کا برتاؤ کیا جائے گا تاکہ ان کی مذموم حرکتوں کو مؤثر طریقے پر روکا جا سکے۔

ایشیا سے باہر انفلوئنزا کی وبا

انفلوئنزا (وبائی نزلہ) کا نیا وائرس جس نے ایشیا میں آج کل وبائی صورت اختیار کر رکھی ہے۔ اب اس براعظم کی حدود سے نکل کر یورپ اور آسٹریلیا تک پہنچ گیا ہے۔ اور یقین کیا جا رہا ہے کہ وہ شمالی امریکہ میں بھی سرایت کر گیا ہے۔ یہ اطلاع ۱۹ جون کو عالمی ادارۂ صحت کے صدر مقام پر موصول ہوئی ہے۔ اگرچہ یہ یقین ہے کہ انفلوئنزا کا وائرس ان نئے علاقوں میں وسیع پیمانے پر پیوست ہو گیا ہے۔ تاہم وہاں یہ بیماری ہولناک صورت اختیار نہیں کر سکی، اور توقع ہے کہ اس سال موسم گرما کے ختم ہونے تک یہ علاقہ اس وبا سے محفوظ رہیں گے۔

نیا وائرس اے۔ سنگاپور/۱/۵۷ کہلاتا ہے۔ کیونکہ اسی شہر کی تجربہ گاہ میں پہلی بار اسے تحقیق کیا گیا تھا۔ تاہم آسٹریلیا کے دو شہروں۔ وکٹوریہ اور کیبرو میں اور نیدرلینڈز کے صدر مقام ہیگ میں بھی اس کا پتہ لگا ہے۔ ریاست ہائے متحدہ سے انفلوئنزا میں مبتلا ایسے مریضوں کی اطلاع ملی ہے جو بحری جہازوں کے ذریعہ سان فرانسسکو کیلی فورنیا، سے وہاں پہنچے تھے۔ لیکن تجربہ گاہوں میں جانچ پڑتال کے بعد وائرس کی موجودگی کا ثبوت نہیں ملا۔

عالمی ادارۂ صحت کے دفتر میں جو اطلاعات موصول ہو رہی ہیں۔ ان میں برابر زور دیا جا رہا ہے کہ اس وائرس سے جو بیماری پھیلی ہے، زیادہ شدید نہیں ہے۔ بہت کم اموات کے بارے میں ثابت ہو سکا ہے کہ ان کا سبب یہی بیماری تھی۔ اس کا حملہ زیادہ تر بڑی عمر کے ایسے لوگوں پر ہوا ہے جو پرانی کھانسی میں مبتلا تھے، ابھی تک انفلوئنزا کا کوئی علاج معلوم نہیں ہوا ہے کیونکہ وائرس میں جراثیم کش ادویات کا یا کسی اور طریقہ علاج کوئی اثر نہیں ہوتا ہے۔ تاہم اس کے زیر اثر جو پیچیدگیاں پیدا ہو رہی ہیں (مثلاً نمونیہ) انہیں دور کرنے کے لیے

پنسلین اور ایسی ہی دوسری ادویات استعمال کی جارہی ہیں۔

انفلوئنزا کی اس نئی قسم کو وبائی صورت میں پھیلنے سے روکنے کے لیے بعض ملکوں نے ویکسین تیار کرنے شروع کردیے ہیں۔ اس مقصد کے لیے وائرس کے انہی نمونوں کو مدّنظر رکھا جارہا ہے، جو عالمی ادارۂ صحت نے ۷۸ ملکوں میں انفلوئنزا کے ۷۰ مرکزوں کو بھیجے ہیں۔ اس کام میں انفلوئنزا کا وہ عالمی مرکز تعاون کررہا ہے جو ادارے کی طرف سے لندن میں قائم ہے۔

عالمی ادارۂ صحت کو یقین ہے کہ انفلوئنزا کی وبا کو قرنطینہ کے ذریعہ روکنا ناممکن ہے۔ کیونکہ ایسی تدابیر مہنگی ہونے کے علاوہ موثر بھی ہیں۔ اس لیے مسافروں کی بین الاقوامی آمدورفت میں کوئی رکاوٹ پیدا نہیں کرنی چاہیے۔ البتہ ایسے مریضوں کو الگ رکھا جاسکتا ہے۔ جن کی بیماری شدید صورت اختیار کرگئی ہو۔

دنیا کا پہلا ایٹمی گھنٹہ

برٹش فزیکل سوسائٹی کی نمائش گذشتہ دنوں لندن میں ہوئی تھی۔ اس میں دنیا کا سب سے پہلا ایٹمی گھنٹہ رکھا گیا تھا۔ یہ بآسانی ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جایا جاسکتا ہے۔ جس میں گھڑی کے ارتعاش کو گننے کے لیے کیسیم ایٹم استعمال کیا گیا تھا۔ اس کی تیاری کے سلسلے میں امریکی اور برطانوی لیباریٹریوں نے تحقیق و تدقیق کی۔ یہ گھنٹہ بہت صحیح وقت دیتا ہے۔ اجزا کے کروڑویں حصے تک کو ناپ سکتا ہے۔

اس وقت تک تو اجزا کے شمار کرنے اور وقت کے چھوٹے چھوٹے حصے کو ناپنے کا کام لیباریٹریوں کی بھاری مشینوں کے ذریعہ سے کیا جاتا تھا لیکن اب ناپ تول کے اس آلے کو ڈھائی فٹ (پچھتّر سینٹی میٹر) لمبی نالی میں جو کہیں سے بھی تین انچ (ساڑھے سات سینٹی میٹر) سے زیادہ چوڑی نہیں ہے میں بند کیا گیا ہے۔ اور یہ آلہ قطب شمالی اور گرین لینڈ میں اسی خوبی سے کام دے سکتا ہے، جس خوبی سے لندن یا نیویارک میں کام دیتا ہے۔ ایسے آلے کہ جو ریڈیائی ارتعاشات کے شمار کرنے یا وقت کا صحیح اندازہ کرنے کے لیے استعمال کیا جاسکتا ہے۔

تعلیمی ماہ نامہ

آموزش

لاہور

جنوری سنہ ۱۹۵۹ء

جلد ——————— ۱۱

شمارہ ——————— ۱۰

سالانہ چندہ

پاکستان کے لیے ۶ روپے

غیر ممالک کے لیے ۸ روپے

قیمت فی پرچہ دس آنے

پبلشرز

یونی ورسٹی بک ایجنسی لاہور

آر، ایچ، ڈی خالد پرنٹر پبلشر نے دین محمدی پریس، لاہور میں طبع کرا کے
یونی ورسٹی بک ایجنسی ۲ کچہری روڈ لاہور سے شائع کیا

تربیت کردار کی ضرورت

ایم، اے مخدومی

راول پنڈی میں سکاؤٹوں کی سالانہ کیمپ فائر پر انعامات تقسیم کرتے ہوئے پاکستانی افواج کے کمانڈر انچیف جنرل محمد موسےٰ نے سکاؤٹوں کو مشورہ دیا کہ انھیں سچے اسلامی کردار کے حامل بننا چاہیے اور ذاتی نفع نقصان کے مقابلے میں اپنی اور اپنے ملک کی آبرو کو مقدم سمجھنا چاہیے۔ نوجوانوں کے اس مجمع کو خطاب کرتے ہوئے جنرل موسےٰ نے کہا۔

"سکاؤٹ تحریک میں شامل ہو کر آپ نے اس بات کا ثبوت دیا ہے کہ آپ اپنے وقت، اپنے خیالات اور اپنی توانائی کا کچھ حصہ دوسروں کی خدمت کے لیے صرف کرنے کو تیار ہیں۔ آپ کی گروہی سرگرمیاں آپ کو اس بات کی تربیت دیتی ہیں کہ آپ دوسروں کے ساتھ مل کر کام کریں، یہ وہ خوبیاں ہیں جو ایک تعاون پسند معاشرے کی نشوونما میں بہت مدد دیتی ہیں۔ جو قوم موجودہ دور میں ترقی کرنا چاہے اس کے تمام افراد کے لیے ضروری ہے کہ مل کر کام کریں اور ایک ہی سمت میں قدم بڑھائیں۔ بوائے سکاؤٹوں کی حیثیت سے آپ کو پاکستان کے مستقبل کے شہریوں کے فرائض سیکھنے چاہئیں۔ مسابقت کے موجودہ دور میں صرف بہترین لوگ ہی چوٹی پر آ سکتے ہیں۔ پڑھائی کے معاملے میں دل و جان سے کام لیجیے۔ فارغ اوقات صحت مند کھیلوں میں گذاریے۔ اور سب سے اہم چیز یہ ہے کہ ایک سچا اسلامی کردار پیدا کیجیے سکاؤٹنگ تمہیں آبرومند زندگی کا سبق سکھاتی ہے۔ اپنی اور اپنے ملک کی آبرو کو ذاتی نفع نقصان سے مقدم سمجھیے۔"

کمانڈر انچیف کے ان خیالات سے ملک کے ماہرین تعلیم نقطہ بہ نقطہ اتفاق کریں گے۔ تربیت کردار آج ہماری تعلیم کی منہ بولتی ضرورت ہے۔ یہ وہ سبق ہے جو نہ صرف سکاؤٹوں کو بلکہ سکولوں اور کالجوں کے

طالب علموں کو اچھی طرح پلے باندھنا چاہیے۔ جدید دور نہ صرف بین الاقوامیت کا دور ہے۔ بلکہ اس کے ساتھ ہی سائنس اور ٹیکنالوجی کی برق رفتار ترقی کا دور ہے۔ اس لحاظ سے یہ اقوامِ عالم کی مسابقت کا دور ہے۔ جدید سائنس نے مختلف قوموں اور ملکوں کو قریب تر کر کے مسابقت کی دوڑ کو اس قدر تیز کر دیا ہے جس کی مثال دنیا کی تاریخ میں نہیں۔ ایسے دور میں قوموں کے بھائی چارے میں آبرو کا مقام اسی قوم کو حاصل ہو سکتا ہے جو صحیح معنوں میں اچھے اوصاف کی حامل ہو۔

پاکستان کے بننے والے شہریوں کو اچھے اوصاف عطا کرنا تعلیم کی پہلی ذمہ داری ہونی چاہیے۔ جنرل موسیٰ نے اچھے کردار کے بنیادی اوصاف کی طرف بڑے جامع الفاظ میں اشارہ کیا ہے۔ طالب علموں کو چاہیے کہ جس مقصد کے لیے انھیں سکولوں کالجوں میں بھیجا گیا ہے اس کے لیے پوری تندہی سے کام کریں یعنی انھیں پڑھائی میں پوری محنت کرنی چاہیے۔ اس کے پہلو بہ پہلو انھیں چاہیے کہ طرح طرح کی صحت مند کھیلوں میں بھرپور حصہ لیں اور فارغ اوقات کو غیر پسندیدہ اور بیکار مشاغل کی نذر کرنے کی بجائے انھیں صحت بخش کھیلوں اور تفریحوں میں صرف کریں۔ ان ذہنی اور جسمانی اوصاف کے ساتھ ہی طلبہ کو بلند اخلاقی قدروں کا شیدائی بھی بننا چاہیے۔ انھیں چاہیے کہ ذاتی اور قومی آبرو کا ایک جیتا جاگتا شعور پیدا کریں تاکہ جب وہ زندگی میں داخل ہوں اور طرح طرح کی ذمہ داریوں کے بوجھ سنبھالیں تو ذاتی اور قومی آبرو کے لیے ہر قیمت دینے کے لیے تیار ہوں۔

آزادی کی آمد کے جلد بعد ملکی معاملات نے جو افسوس ناک صورت اختیار کر لی تھی، اس کی سب سے بڑی وجہ اچھے کردار کا فقدان تھا۔ سیاسی اور کاروباری زندگی میں اکثر لوگ معمولی سے ذاتی مفاد کو جماعتی قومی آبرو پر مقدم سمجھنے لگے تھے۔ اس مرض کا علاج آج وقت کی سب سے بڑی ضرورت ہے اور اس کام میں تعلیم کو مرکزی کردار ادا کرنا ہے۔

جدید دور اور ہیرے

فضل احمد

پتھروں کا بادشاہ

ہیرے کی سختی ہمیشہ سے ضرب المثل چلی آئی ہے کیوں کہ وہ ہر دوسری چیز کو کاٹ سکتا ہے۔ اور حال ہی تک اس پر کوئی دوسری چیز خراش پیدا نہ کر سکتی تھی۔ قدیم زمانوں سے اسے پتھروں کا بادشاہ سمجھا گیا ہے۔ پرانے وقتوں کے لوگ ہیرے کو ناقابلِ فنا سمجھتے تھے۔ انگریزی میں ہیرے کے لیے "ڈائمنڈ" کا لفظ استعمال ہوتا ہے جو یونانی لفظ ایڈمس سے نکلا ہے اور جس کے معنی ناقابلِ تسخیر کے ہیں۔ پلینی نامی ایک یونانی عالم پہلی صدی عیسوی میں ہیرے کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ :- "ان پتھروں کی آزمائش لوہار کی آہرن پر کی جاتی ہے۔ وہ اتنے سخت جان ہیں کہ نہ صرف ہتھوڑے کی ضرب کو الٹے پاؤں واپس لوٹا دیتے ہیں بلکہ خود آہرن کو پھوڑ کر رکھ دیتے ہیں"۔

ہیرا نہ صرف سخت سے سخت دھات اور ہر دوسری سخت چیز کو کاٹ سکتا ہے، بلکہ کوئی تیزاب اس پر اثر نہیں کرتا۔ تاہم ہیرا ناقابلِ فنا نہیں۔ اسے خوب گرم کیجیے اور یہ ایک بے رنگ گیس یعنی کاربن ڈائی آکسائڈ میں تبدیل ہو کر غائب ہو جائے گا۔ اسی طرح ہیرا دنیا کا سخت ترین پتھر ہونے کے باوجود ناقابلِ شکست نہیں۔ انسان نے صدیوں سے "پتھروں کے بادشاہ" کو کاٹنا اور تراشنا سیکھ رکھا ہے۔ کیوں کہ ہیروں کو جواہرات میں تبدیل کرنے کے لیے ان کے پہلوؤں کی اس طرح کانٹ چھانٹ کرنا پڑتی ہے کہ اس کی قدرتی آب و تاب پوری طرح ظاہر ہو جائے اور وہ حقیقی معنوں میں "کوہِ نور" یا "دریائے نور" کا درجہ حاصل کرلے۔

ہیرے کو توڑنا اور کاٹنا اس طرح ممکن ہوا کہ جس طرح لکڑی رگیں رکھتی ہے، بالکل اسی طرح ہیرے کے ذرات بھی رگوں کی شکل میں باہم پیوست ہوتے ہیں۔ قدرت نے ان ذرات کو بے پناہ برقی کشش کے طفیل باہم پیوست کر رکھا ہوتا ہے، لیکن بعض مقامات پر یہ برقی کشش نسبتاً کم ہوتی ہے۔ جوہریوں نے یہ راز مدتوں سے معلوم کر رکھا ہے۔ جب کوئی ان تراشا ہیرا جوہری کی دکان پر جاتا ہے تو ہنستے بلکہ جیسے اس کی

چھان بین پر صرف ہو جاتے ہیں حتیٰ کہ یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ اس کی کمزور رگیں کونسی ہیں۔ اور اس کی چمک دوبالا کرنے کے لیے اسے کس طور پر کاٹنا چاہیے۔ کاٹنے اور تراشنے کے بعد اس کی سطح کو خوب چمکایا جاتا ہے۔ تب کہیں جاکر یہ ہیرے سے جواہر کی شکل اختیار کرتا ہے۔ چھوٹے چھوٹے جواہرات جو بڑے جواہرات کے "گردفرش" کا کام دیتے ہیں، عموماً سولہ رُخ رکھتے ہیں۔ لیکن بڑے بڑے جواہرات جو بڑی آب وتاب رکھتے ہیں اٹھاون رخ رکھتے ہیں۔ غرض کانوں سے نکلے ہوئے ان تراشے ہیروں کو بیش قیمت جواہرات میں تبدیل کرنا ایک محنت طلب اور وقت طلب کام ہے جو قدیم زمانوں سے ایک صنعت کی شکل اختیار کر چکا ہے۔ مغربی یورپ کا شہر ایمسٹرڈم اس صنعت کا پرانا مرکز ہے۔ لندن اور نیویارک ہیروں اور جواہرات کی دو بڑی منڈیاں ہیں۔

دنیا کا سب سے بڑا ہیرا

علامہ اقبال کا ایک مشہور شعر ہے :-

پھول کی پتی سے کٹ سکتا ہے ہیرے کا جگر ؏ مردِ ناداں پر کلامِ نرم ونازک بے اثر

اس شعر سے حضرت علامہ کی مراد یہ ہے کہ ہیرے جیسی سخت چیز کو پھول کی پتی سے کاٹنا ممکن ہو سکتا ہے لیکن جس بدنصیب کے دل پر جہالت اور تعصب کے قفل پڑے ہوں اسے کوئی بات متاثر نہیں کر سکتی۔ تاہم اس سے یہ نہ سمجھ لینا چاہیے کہ ہیرے کا کاٹنا کوئی آسان کام ہے۔

اَن تراشے ہیرے جو کانوں یا دریا کی گذرگاہوں سے ہاتھ لگتے ہیں مختلف ضخامتوں کے ہوتے ہیں لیکن اگر دو ہیرے ایک ہی وزن کے ہوں تو ان کی قدر وقیمت کا برابر ہونا ضروری نہیں۔ زیادہ قدر وقیمت صرف اس ہیرے کی ہوتی ہے جو بالکل شفاف اور بے داغ ہو۔ جن ہیروں میں کہیں دوسری چٹان کے کچھ ذرات رہ گئے ہوں وہ جواہرات کے طور پر بیکار ہو جاتے ہیں۔ ہاں بعض ہیروں کو کسی قدرتی آمیزش نے کوئی خوش نما رنگ عطا کر رکھا ہوتا ہے۔ مثلاً گلابی یا نیلا۔ یا سبز یا اودا وغیرہ۔ اس قسم کے ہیرے قدر وقیمت میں بہت بڑھ جاتے ہیں کیونکہ ان کا شمار نوادرات میں ہونے لگتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ "ہوپ" نامی ہیرا جو نیلے رنگ کا ہے اپنے دوسرے ہم وزن ساتھیوں سے قدر وقیمت میں بڑھا ہوا ہے۔

ہیرے کو کاٹ کر جواہر کی شکل دینے کے لیے جواہر ساز کو جن مرحلوں سے گذرنا پڑتا ہے اس کا کچھ اندازہ

تاج برطانیہ کے مشہور ہیرے کلی نن کی کہانی سے ہو سکتا ہے۔ یہ ہیرا جنوبی افریقہ سے ہاتھ لگا۔ ٹرانسوال کے صوبے کی پریمیئر کان میں ہیروں کی کھدائی کا کام شروع ہوئے تین سال ہوئے تھے۔ ابھی اس کان کی حیثیت محض ایک کم گہرے گڑھے کی تھی جس کی گہرائی تیس فٹ سے زیادہ نہ تھی۔ ۱۹۰۵ء میں ایک صبح کان کا سپرنٹنڈنٹ ادھر ادھر گھوم رہا تھا۔ سورج کی سنہری کرنیں ابھی ابھی نمودار ہوئی تھیں۔ اچانک سپرنٹنڈنٹ نے دیکھا کہ گڑھے کے ایک گوشے میں نور کا ایک چشمہ ابل رہا ہے۔ یہ چشمہ سطح زمین سے صرف چند فٹ نیچے تھا۔ سپرنٹنڈنٹ نے کنارے پر جھک کر ہاتھ نیچے بڑھایا اور جیبی چاقو کی مدد سے اپنی کلائی برابر موٹا ہیرا کھینچ نکالا۔ چوں کہ پریمیئر کان کا سراغ تھامس کلی نن نے لگایا تھا۔ اس لیے اس کے نام پر اس بڑے ہیرے کا نام کلی نن رکھ دیا گیا۔ کان سے نکلنے پر اس ہیرے کا وزن ۳۱۰۶ قیراط یعنی آدھ سیر کے برابر تھا۔ یہ ہیرا شاہ ایڈورڈ ہفتم کی خدمت میں پیش کیا گیا۔ بادشاہ نے اسے کاٹنے کے لیے ایمسٹرڈم کے ایک مشہور جواہر ساز جے۔ ایشر کو چنا۔ ایشر نے مہینوں تک ہیرے کا مطالعہ کیا۔ آخر کار اس نے اس کے ایک کنارے پر چھوٹا سا جھرنا پیدا کر کے اس میں اپنا تیز کنارے والا فولادی خانہ رکھا اور پسینہ سے شرابور ہو کر اپنا بھاری ہتوڑا اس پر مارا۔ مگر ہیرے کی بجائے فولادی خانہ ٹوٹ گیا۔ اور ایشر کے اعصاب پر اس بھاری ضرب کا اتنا بوجھ پڑا کہ اسے ہسپتال میں داخل ہونا پڑا۔

جب ایشر کے اعصاب اور عضلات دوبارہ اصلی حالت پر آ گئے تو اس نے ہیرے کو کاٹنے کی دوبارہ کوشش کی۔ اس دفعہ اس کے ہتوڑے نے مطلوبہ نتیجہ پیدا کر دیا۔ ہیرا بالکل ٹھیک طور پر کٹ گیا مگر ایشر کو اس بات کا علم دوسروں کی زبانی ہوا کیوں کہ ضرب کی شدت نے اسے فوراً بے ہوش کر کے گرا دیا تھا۔ تاہم ڈاکٹر پہلے سے موقع پر موجود تھا۔ اس نے فوراً جواہر ساز کو اٹھا کر اسے ہسپتال میں پہنچا دیا۔

کلی نن ہیرا دنیا کا سب سے بڑا ہیرا ہے جو آج تک انسان کو ہاتھ لگا ہے۔ بالآخر اسے کاٹ کر ۹ بڑے شاہی جواہرات اور سو چھوٹے چھوٹے جواہرات تیار کیے گئے۔ ان میں سے سب سے بڑے جواہر کا وزن ۵۳۰ قیراط ہے اور شاہ برطانیہ کے شاہی عصا کی چوٹی پر لگا ہے۔ اسے ستارہ افریقہ کا نام دیا گیا ہے۔

ہندوستانی ہیرے قدیم زمانوں میں ہندوستان کے ہیروں اور جواہرات کی دھوم ساری دنیا

میں تھی، بلکہ ہندوستان کا نام یورپ میں جواہرات کی چمک دمک کے مترادف سمجھا جاتا تھا۔ جنوبی ہند میں گولکنڈہ کا علاقہ ہیروں کی کانوں کے لیے مشہور تھا۔ ہندوستانی راجے مہاراجے زمانۂ قبل از تاریخ سے ہیرے اور جواہرات پہنتے چلے آئے تھے۔ تاریخ کے مشہور ہیرے کوہِ نور کے متعلق مشہور ہے کہ یہ جنگ مہابھارت کے وقت ایک راجہ کے گلے کی زینت تھا۔

قدیم تاریخ کے دوسرے مشہور ہیرے بھی ہندوستان نے ہی پیدا کیے۔ مثلاً "دریائے نور" ہیرا اسی ملک کی کانوں سے نکالا تھا۔ اسی طرح روس کے پاس زار کے زمانے سے جو جواہرات چلے آتے ہیں ان میں مشہور ہیرا "اورلف" بھی شامل ہے۔ اس کے متعلق عام یقین یہ ہے کہ یہ ہندوستان کا وہ مشہور ہیرا ہے جو مغرب میں "مغلِ اعظم" کے نام سے مشہور تھا۔ یہ ہیرا جب کان سے نکالا تو اس کا وزن ۷۸۷ قیراط تھا۔ تراشا جانے کے بعد اس کا وزن ۲۸۰ قیراط رہ گیا۔ مشہور فرانسیسی سیاح ٹریورنیر نے یہ ہیرا ۱۶۶۵ء میں ایک ہندوستانی راجے کے پاس دیکھا۔ اس کے بعد یہ ہیرا پُراسرار طور پر غائب ہو گیا۔

روسی ہیرے "اورلف" کا سراغ اٹھارھویں صدی کے آغاز تک لگایا جا سکتا ہے۔ جب یہ زارِ روس کے ہاتھ آیا۔ ایک فرانسیسی سپاہی یہ ہیرا ہندوستان سے چرا کر لایا تھا۔ وہاں یہ ہیرا میسور کے ایک مشہور مندر میں ایک بڑے بت کی آنکھ میں لگا تھا۔ فرانسیسی سپاہی آنکھ بچا کر اسے لے اڑا اور فرانس جا پہنچا۔ وہاں اس نے کئی ایک جانیں لیں اور مکر و فریب کے بڑے بڑے شاہکاروں کو جنم دیا۔ بالآخر کئی ہاتھوں میں سے گزرتا ہوا یہ ہیرا ایمسٹرڈم کے شہر میں جا پہنچا۔ اس جگہ ایک جلاوطن روسی شہزادے نے جو زار کی خوشنودی حاصل کرنا چاہتا تھا اسے خرید لیا، اور زارِ روس کی خدمت میں پیش کر دیا۔ ٹریورنیر نے "مغلِ اعظم" کا جو وزن بتایا ہے "اورلف" کا وزن اس سے کم ہے۔ لیکن اس کی شکل اور تراش بالکل وہی ہے جو ٹریورنیر نے بیان کی ہے۔ اس سے اکثر لوگوں نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ "اورلف" فی الحقیقت "مغلِ اعظم" کا ہی دوسرا نام ہے۔

لیکن اٹھارھویں صدی تک ہندوستانی کانیں کم و بیش اپنے تمام ہیرے اگل چکی تھیں۔ اس [illegible] پہلے ہی [illegible] دنیا میں ہر جگہ پھیل چکی تھیں اور ہر جگہ دولت

سیٹنے کی فکر میں تھیں۔ انھیں ہر جگہ پہلی تلاش جواہرات اور سونے کی ہوتی، چناں چہ سنہ ۱۷۲۸ء میں برازیل میں ہیروں کی دریافت ہوئی۔ اور مغربی قوموں میں ایک دم برازیل پر جھپٹ پڑیں۔ کوئی چالیس سال بعد جنوبی افریقہ میں ہیرے ملنے لگے، اور دیکھتے ہی دیکھتے تاریک براعظم اس میدان میں سب سے بازی لے گیا۔

ہیروں کا گھر

اگر پہلے وقتوں میں ہندوستان ہیروں کے لیے مشہور تھا تو آج یہ شہرت تاریک براعظم یعنی افریقہ کو حاصل ہے۔ دنیا میں ہر سال جتنے ہیرے پیدا ہوتے ہیں، ان کا ننانوے فی صد حصہ افریقہ سے آتا ہے اس وقت ہیروں کی سالانہ پیداوار کوئی اڑھائی کروڑ قیراط ہے۔ یہ ہیرے زیادہ تر جنوبی افریقہ کے مختلف حصوں سے آتے ہیں۔ ہیروں کی قیمت کے اعتبار سے جنوبی افریقہ کی یونین سرفہرست ہے۔

افریقہ میں سب سے پہلا ہیرا سنہ ۱۸۶۶ء یا سنہ ۱۸۶۷ء میں ملا۔ یہ دریافت بالکل اتفاقیہ تھی۔ دریائے اورنج کے کنارے سوپ ٹاؤن کے نزدیک ایک ولندیزی کسان آباد تھا۔ ایک روز اس کے بچوں کو ایک چمکدار پتھر ملا۔ بچوں نے اسے اپنے کھلونوں میں رکھ لیا۔ ایک دن ماں کی نگاہ اس پر پڑی اور اس نے اسے اپنے پاس رکھ لیا۔ اس سے یہ چمکیلا پتھر پڑوسن نے لے لیا، جس نے اسے ایک پھیری والے کے ہاتھ چند پاؤنڈ میں بیچ دیا۔ ہوتے ہوتے یہ شفاف چمکیلی کنکری ایک تاجر کے ہاتھوں میں جا پہنچی۔ اس نے اسے ایک ماہر سائنس کے معائنے کے لیے بھیج دیا۔ کیمیائی معائنے نے ثابت کیا کہ یہ ہیرا ہے، اور ۲۱ قیراط وزن رکھتا ہے۔

اس کے بعد جنوبی افریقہ میں کئی اور ہیرے ملے۔ سنہ ۱۸۶۹ء میں ایک چرواہے کو ایک چمکیلا پتھر ملا جس کا وزن ۸۳ قیراط تھا، اس نے اسے پانسو بھیڑوں، دس بیلوں اور ایک گھوڑے کے عوض فروخت کر دیا۔ افریقی ہیروں کی خبریں یورپ پہنچیں تو طالع آزماؤں نے گروہ در گروہ جنوبی افریقہ کا رخ کیا۔ چوں کہ بیشتر ہیرے دریائے وال کے نواح میں ملے تھے۔ اس لیے ۱۸۷۰ تک اس دریا کے کنارے ہزاروں طالع آزماؤں نے ڈیرے آن ڈالے۔

اب تک ہیروں کی تلاش پتھروں اور کنکروں کے ان ڈھیروں میں ہوتی رہی تھی جو صرف دریا کے

اور ندیوں نے اپنی گذرگاہوں میں بکھیر دیے تھے۔ سال ۱۸۷۰ء میں تلاش کا رخ بدل گیا۔ ہیرے تلاش کرنے والوں نے ان چٹانوں کی تلاش شروع کی جن سے دریا ہیرے کاٹ کر لائے تھے۔ یہ تلاش جلد کامیاب ہو گئی اور سال ۱۸۷۱ء میں اس مقام پر کھدائی شروع ہو گئی جہاں آج کمبرلے کا شہر آباد ہے۔ یہ کھلا چٹانی میدان تھا جس کی اوپر کی سطح زردی مائل بھربھری مٹی سے بنی تھی۔ مگر اس کے نیچے ایک عجیب قسم کی سبزی مائل نیلی چٹان واقع تھی۔ یہ پراسرار بھاری چٹان جسے کمبرلائٹ کا نام دیا گیا ہیروں کا گہوارہ تھی۔

علم الارض کے ماہر آج تک کمبرلائٹ چٹان کی ماہیت کو پوری طرح نہیں سمجھ سکے۔ ٹوٹ پھوٹ کر یہ چٹان زردی مائل بھربھری مٹی میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ سائنس دانوں کا خیال ہے کہ کمبرلائٹ چٹان زمین کی ساخت کے ابتدائی دور میں کرۂ ارض کے پیٹ سے نالی نما سوراخوں کے راستے باہر آئی تھی۔ اس گہرائی پر درجۂ حرارت اور دباؤ اس قدر بے پناہ تھا کہ کاربن کے جو ٹکڑے اس آتشیں چٹان کے اندر موجود تھے وہ ہیروں کی شکل اختیار کر گئے۔

غرض ہیروں کی دریافت نے یورپ کی نگاہیں جنوبی افریقہ پر گاڑ دیں۔ اَن گنت طالع آزما کیمبرلے کے نواح میں آن براجمان ہوئے اور ہیروں کی کئی کانیں چل نکلیں۔ ان میں سے بعض کانیں محض اتفاق کی پیداوار تھیں۔ مثلاً ایک رات کچھ طالع آزما کیمپ میں بیٹھے دعوت اڑا رہے تھے۔ ایک نوکر سے کچھ خطا ہو گئی۔ سزا کے طور پر اسے کہا گیا کہ باہر جا کر زمین کھود دے۔ اس نے ابھی مٹی کے چند ہی بیلچے باہر پھینکے تھے کہ ایک بڑا ہیرا نکل آیا۔ اس طرح کیمبرلے کے نواح میں کوئی ۱۶۰۰ کانیں قائم ہو گئیں۔ ہر شخص نے اپنی کان کے گرد لوہے کی خاردار تار کا جنگلا لگا رکھا تھا۔ ان جنگلوں کے بیچوں بیچ آنے جانے کے راستے اور سڑکیں تھیں اور ہوا سے یہ سارا منظر مکڑی کے ایک بڑے جالے کا منظر پیش کرتا تھا لیکن جوں جوں یہ ۱۶۰۰ گڑھے گہرے ہونے لگے تو ان کی دیواروں نے گرنا شروع کیا۔ اور بہت لوگوں کو صاف نظر آنے لگا کہ ان سب کانوں کو مل کر ایک نظام کے ماتحت آنا ہو گا۔

سیسل روڈز نامی ایک انگریز نے ان حالات سے پورا فائدہ اٹھایا۔ یہ شخص ایک پادری کا بیٹا تھا۔ وہ جوانی کے زمانے میں جنوبی افریقہ پہنچا۔ اس نے دیکھا کہ کانوں سے پانی باہر نکالنے کے لیے پمپوں کی

ضرورت پڑتی ہے۔ چناں چہ اس نے کچھ پیپ خرید کر کانوں کے مالکوں کو کرائے پر دینے شروع کیے۔ ہوتے ہوتے اس کا نام آنا چکا کہ اس نے ہیروں کی کچھ کانیں خرید لیں۔ آخر نوبت یہاں تک پہنچی کہ اس نے تمام کانوں کو ایک مشترکہ کمپنی کے ماتحت کر دیا اور خود سیاہ و سفید کا مالک بن گیا۔ جب مدغم ہونے والی کمپنیوں کے حصہ داروں نے عدالت کی طرف چارہ جوئی کی اور سارا نظام کے خلاف فیصلہ کر لیا تو روڈز نے کمپنی توڑ کر تمام حصہ داروں کو ان کے حصوں کی قیمت ادا کر دی۔ ایک ہی چیک کے ذریعے کوئی چون لاکھ پونڈ کی رقم ادا کر کے وہ ہیروں کی کانوں اور ان کی تجارت کا مختار کل بن گیا۔

ہیروں کی پیداوار کے معاملے میں جنوبی افریقہ دنیا بھر کے ملکوں سے بڑھا ہوا ہے۔ دنیا میں ہیروں کی پیداوار کوئی دو کروڑ تیس لاکھ قیراط سالانہ ہے۔ ان کا نناوے فی صد حصہ افریقہ سے آتا ہے براعظم افریقہ میں جنوبی افریقہ کی یونین سب سے زیادہ مالیت کے ہیرے پیدا کرتی ہے کیوں کہ اس کی کانوں میں ملنے والے ہیروں میں جواہرات کا تناسب غیر معمولی طور پر زیادہ ہے۔ تاہم مقدار کے لحاظ سے بلجیئن کانگو کو پہلا درجہ حاصل ہے۔ ۱۹۵۷ء میں اس کی کانوں نے ایک کروڑ تیس لاکھ قیراط ہیرے پیدا کیے تھے لیکن اس پیداوار کا بچانوے فی صد حصہ ادنیٰ قسم کے ہیرے تھے۔ جنھیں بس صنعتی مصرف میں ہی لایا جا سکتا تھا۔

جنوب مغربی افریقہ کے ساحل پر جہاں دریائے اورنج سمندر میں گرتا ہے ریت کے ٹیلوں تلے ہیرے دبے پڑے ہیں۔ یہ وہ ہیرے ہیں جو دریائے اورنج اپنے ساتھ بہا لایا تھا، اور جن پر آندھیوں نے صحرائے کالاہاری سے ریت لا کر بڑے بڑے ٹیلے کھڑے کر دیے ہیں۔ اب ان ہیروں کو لاکھوں من ریت کے بوجھ کے نیچے سے نکالا جا رہا ہے۔ دوسری عالمی جنگ کے بعد سے ٹانگا نیکا۔ سرالیون۔ غنا اور فرانسیسی استوائی افریقہ میں بھی ہیرے نکالے جانے لگے ہیں۔ ٹانگا نیکا میں سیاہ کیمبر لائٹ چٹان موجود ہے۔ ساحل سے دور اندرونی علاقوں میں حبشی باشندے زمین کو ذرا سا کرید کر ہیرے نکال لیتے ہیں۔

ہیروں کی تجارت

ہیروں کی تجارت ڈی بیئرز کمپنی کا اجارہ ہے۔ اس کمپنی نے لندن میں ڈائمنڈ ٹریڈنگ کمپنی لمیٹڈ کے

نے ہیروں کی تجارت کا مرکز قائم کر رکھا ہے۔ افریقہ کے تمام ہیرے اسی مرکز کی معرفت فروخت ہوتے ہیں۔ ایمسٹرڈم اگرچہ قدیم زمانوں سے ہیروں کی تراش کا مرکز چلا آتا ہے۔ اور اب نیویارک بھی اس صنعت کا اہم مرکز بن چکا ہے۔ لیکن دنیا بھر کے جوہریوں کو ہیرے خریدنے کے لیے لندن جانا پڑتا ہے۔

ڈائمنڈ ٹریڈنگ کمپنی لمیٹڈ لندن کی طرف سے نیویارک۔ تل عفیف۔ ٹورنٹو۔ انٹورپ اور دوسرے مشہور شہروں کے جوہریوں کو سال میں باقاعدہ وقفوں سے یہ اطلاع مل جاتی ہے کہ ہیروں کی ایک کھیپ آ رہی ہے۔ فلاں تاریخ کو کمپنی کے دفتر واقع لندن میں ان کو دیکھا جا سکتا ہے۔ اگر خریدنا ہو تو اپنا نمائندہ مقررہ تاریخ کو بھیجو۔ ڈائمنڈ ٹریڈنگ کمپنی کی اجارہ داری اس قدر مکمل ہے کہ خریداروں کو پورے طور پر اس کی شرائط قبول کرنا پڑتی ہیں۔ اس اجارہ داری کی نوعیت کا اندازہ ایک مثال سے ہو سکتا ہے۔ جنوری ۱۹۵۸ء میں نیویارک کے مشہور جوہری مسٹر ونسٹن کو اطلاع موصول ہوئی کہ اس مہینے کی ۲۰ تاریخ کو ہیرے فروخت کے لیے پیش کیے جا رہے ہیں، خریدنے کا ارادہ ہو تو مقررہ تاریخ پر لندن پہنچ جائیے۔ ساتھ ہی یہ اطلاع دی گئی تھی کہ اس مرتبہ ۴۲۶ قیراط کا ایک ہیرا جو بہترین قسم کا جواہر ہے فروخت کے لیے پیش کیا جا رہا ہے۔ مسٹر ونسٹن کو معلوم تھا کہ اتنا بڑا ہیرا کوئی پندرہ سال بعد منڈی میں آیا ہے۔ لہٰذا وہ ۲۰ جنوری کو بذات لندن پہنچ گیا جہاں اس کے سامنے ہیروں کا ایک ڈبہ پیش کیا گیا۔ اس میں چھوٹے بڑے ہیرے کاغذوں میں لپیٹ کر ڈبیوں میں بند کیے گئے تھے۔ ان کی کل تعداد پچاس ہزار سے اوپر تھی۔

مسٹر ونسٹن کو کمرے میں اکیلے رہنے دیا گیا۔ کمرے میں شمال سے روشنی آ رہی تھی۔ انھیں اجازت تھی کہ اطمینان سے جتنے دن چاہیں ہیروں کا ملاحظہ کریں۔ مگر شرط یہ تھی کہ اگر خریداری منظور ہو تو سب کے سب ہیرے خریدنے ہوں گے۔ چھانٹنے یا چننے کا کوئی سوال نہ تھا۔ یا سبھی ہیرے خرید لیے جائیں اور یا کوئی بھی نہ خریدا جائے۔ مسٹر ونسٹن کے ۴۲۶ قیراط وزن کے ہیرے کی بڑی کشش تھی۔ چنانچہ انھوں نے بالآخر تمام ہیرے خریدنے کا فیصلہ کر لیا اور چوراسی لاکھ ڈالر یعنی تقریباً چار کروڑ روپے کے عوض یہ تمام ہیرے خرید لیے گئے۔

موجودہ صدی کے ابتدائی سالوں تک ہیرے تراشنے والوں کو جسمانی قوت سے کام لینا پڑتا تھا

اور ہیرے جیسے سخت پتھر کو توڑنے کے لیے اعصاب، عضلات پر اتنا زور ڈالنا پڑتا تھا کہ بعض اوقات غشی کی حالت طاری ہو جاتی تھی۔ جدید مشینوں نے اس چیز کا خاتمہ کر دیا ہے نیویارک کی مشہور شاہراہ ففتھ ایونیو سے پلٹنے والی ایک سڑک پر مسٹر ونسٹن کا کارخانہ ہے۔ اس کی چٹان نما دیواریں ڈھلے ہوئے لوہے کا پھاٹک لگا ہے اس سے اندر جائیں تو بے داغ فولاد کا چمکدار دروازہ ہے۔ اس سے آگے ہیروں کی مسک خاپ سے یہاں برقی موٹروں نے گونج پیدا کر رکھی ہے۔ یہ موٹریں تیز چلنے والی گول ساتوں کو حرکت دیتی ہیں۔ ساتوں کے کناروں پر پسے ہوئے ہیروں کی موٹی تہ چڑھی ہے۔ ان ساتوں پر جب ہیروں کو رگڑا جاتا ہے تو بعض اوقات اتنی زور کی چیخ پیدا ہوتی ہے کہ کان پھٹے جاتے ہیں۔ ہیروں کو چیرنے کے لیے کاغذ کے سے باریک کانسی کے گول قرصوں سے کام لیا جاتا ہے جو بے حد تیز رفتاری سے گھومتے ہیں۔ ان کے کناروں پر پسے ہوئے ہیروں کی تہ چڑھی ہوتی ہے۔ یہ آری ہفتوں تک ایک ہیرے کو کاٹتی رہتی ہے۔ اوپر سے زیتون کا تیل گرتا رہتا ہے تب کہیں جاکر ہیرا کٹتا ہے۔ بہرحال اب ہیروں کو ہتھوڑے کی شدید ضربوں سے کاٹنے کی ضرورت نہیں۔

زمین کا شاہکار

زمین کا سینہ جو معدنیات اگلتا ہے۔ ان میں سے ہیرا بے حد قیمتی ہے۔ ادنیٰ سے ادنیٰ قسم کا ہیرا بھی سونے سے کئی گنا زیادہ قیمت رکھتا ہے، اس اعتبار سے ہیرا زمین کا شاہکار ہے۔ مگر یہ کس چیز کا بنا ہے؟ ہیرا اسی کاربن کا بنا ہے جس سے کوئلہ بنا ہے یا جو چراغ کے دھوئیں کی سیاہی سے عبارت ہے۔ یہی کاربن جب صاف ترین شکل میں سامنے آتی ہے تو ہیرا کہلاتی ہے لیکن ہیرا بننے کے لیے کاربن کو اس بے پناہ حرارت اور دباؤ میں سے گذرنا پڑتا ہے جو زمین کے بطن میں سطح سے کوئی اڑھائی تین سو میل نیچے موجود ہے۔

تاہم اکثر ہیرے دیکھنے میں پتھر کی کنکریوں سے زیادہ نظر نہیں آتے۔ اور نہ ہی تمام ہیرے جواہرات میں تبدیل کیے جا سکتے ہیں۔ ہیرا نہ صرف کاربن کی خالص ترین شکل ہے بلکہ یہ قدرت کی مہیا کی ہوئی تمام چیزوں میں سب سے زیادہ سخت ہے۔ ہیروں کی کانوں میں سے نکالے جانے والے جن پتھروں پر ہیرے ہونے کا گمان ہو، انھیں جائزہ لینے والی مطالعہ گاہ میں بھیج دیا جاتا ہے۔ جہاں نہ صرف اس کے ہیرا ہونے کا فیصلہ ہوتا ہے، بلکہ ہیرا ہونے کی صورت میں اس کی درجہ بندی بھی کی جاتی ہے۔ جو ہیرے بالکل بے داغ ہوں

جواہرات کا درجہ پاتے ہیں۔ اور جوہریوں کے ہاں جا کر تراش خراش کے بعد زیورات وغیرہ کی شکل اختیار کرتے ہیں۔ مگر جن ہیروں میں کوئی آلائش رہ گئی ہو وہ جواہرات کے درجے سے گر جاتے ہیں۔ تاہم اس حیثیت سے بھی ان کی افادیت بڑی زیادہ ہے۔ وہ پیس کر طرح طرح کی صنعتی ضرورتیں پوری کرتے ہیں۔ حالیہ سالوں میں ہیروں کی صنعتی مانگ بے حد بڑھ گئی ہے۔

بڑے جواہرات کی مانگ میں کمی

جواہرات بنانے اور صنعتی ضرورتیں پوری کرنے کے لیے ہیروں کی مانگ لگاتار بڑھتی جا رہی ہے تاہم دنیا میں بادشاہوں کی تعداد گھٹ جانے سے زیادہ وزن کے جواہرات کی مانگ بہت گھٹ گئی ہے۔ دوسری عالمی جنگ کے بعد سے بڑے بڑے جواہرات کی مانگ اور بھی کم ہو گئی ہے۔ اب دنیا میں لے دے کر گنتی کے بادشاہ رہ گئے ہیں۔ ان میں سے بعض محض نام کے بادشاہ ہیں۔ جو حقیقی اقتدار کے مالک ہیں ان کی تعداد تین چار سے زیادہ نہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ جوہری درشتی ہیروں کو بڑے بڑے جواہرات میں تبدیل کرنے سے جھجکتے ہیں۔ وہ انھیں کاٹ کر چھوٹے چھوٹے ہیروں میں تبدیل کرنا بہتر سمجھتے ہیں۔

۱۹۳۸ء میں برازیل کے دو کسان ایک دریا کی گذرگاہ کے ساتھ ساتھ جا رہے تھے۔ ان کی نگاہ ایک انڈے جتنے بڑے شفاف پتھر پر پڑی۔ وہ اسے چھوڑ کر آگے چل دیے۔ بعد میں ان میں سے ایک پھر لوٹ آیا تاکہ پتھر کو غور سے دیکھے۔ آخر کار وہ اسے اٹھا کر لے گیا۔ وہ ۷۲۶ قیراط کا ہیرا نکلا۔ نیویارک کے جوہری مسٹر ونسٹن نے یہ ہیرا ۱۹۴۱ء میں خریدا۔ لیکن جنگ نے اس وقت تک کئی بادشاہوں کے تخت الٹ دیے تھے۔ اور کئی دوسروں کے تخت متزلزل تھے۔ چناں چہ ونسٹن نے اس ہیرے کو کاٹ کر ۲۹ چھوٹے چھوٹے جواہرات میں تبدیل کر دیا۔

اس کے بعد ونسٹن کو پندرہ سولہ سال تک غیر معمولی جسامت کا کوئی ہیرا ہاتھ نہ آیا۔ آخر جنوری ۱۹۵۸ء شروع میں اس نے افریقی کانوں سے نکلا ہوا ایک بڑا ہیرا خریدا۔ جس کا وزن ۴۲۶ قیراط تھا۔ اس ہیرے کو "برف کی ملکہ" کا نام دیا گیا۔ وجہ یہ کہ یہ ہیرا اس قدر شفاف تھا کہ جب اسے برف کے ٹکڑوں میں ملا دیا جاتا تو اس کی شناخت کرنا مشکل ہو جاتا۔ یہ ہیرا خریدنے کے بعد ونسٹن کے سامنے ایک مشکل سوال

یہ تھا کہ کیا اسے بہت سے چھوٹے چھوٹے جواہرات میں تبدیل کر دے یا ایک بڑے جواہر کی شکل میں رہنے دے۔ بہت سوچ بچار کے بعد فیصلہ کیا گیا کہ اس سے ایک بڑا جواہر تیار ہو۔ تاہم دنیا بھر میں اس جواہر کے نصف درجن سے زیادہ خریدار نہیں۔ ان میں سے دو تین مشرق اوسط کے وہ بادشاہ تھے جن کے تخت تیل پر تیر رہے تھے۔ اب اس مختصر سی فہرست میں سے شاہ عراق کا نام خارج ہو چکا ہے۔

ہیرے اور جدید صنعت

پہلے وقتوں میں ہیروں سے شاہی ٹھاٹھ قائم رکھنے کی خدمت لی جاتی تھی۔ بڑے بڑے شہنشاہ اور بادشاہ اپنی ذات اور اپنے دربار کو جواہرات کی چکا چوند کا مرقع بنانا چاہتے تھے۔ تاکہ دیکھنے والوں کی آنکھیں چندھیا جائیں اور ان کے دلوں پر ہیبت طاری ہو جائے۔ بالکل حال ہی تک ہیروں کا سب سے بڑا فائدہ یہی سمجھا جاتا تھا۔ لیکن سائنس کی ہوش ربا ترقی نے جہاں زندگی کے باقی شعبوں میں انقلاب پیدا کر دیا ہے۔ وہاں ہیروں کی افادیت کا تصور بھی سرے سے بدل کر رکھ دیا ہے۔

جدید تہذیب کی بنیاد پہلے دن سے سائنس اور ٹکنالوجی پر ہے۔ مگر دوسری عالمی جنگ کے بعد سائنس اور ٹکنالوجی نے جس دور میں قدم رکھا ہے۔ اس کی برق رفتاری انسانی تصور کو بھی چکرا دینے والی ہے۔ انسان اس تیرہ دان خاکی سے باہر نکل کر فضائے بسیط کی وسعتوں کو پامال کرنا چاہتا ہے۔ اور اس میدان میں اسے خاطر خواہ کامیابی حاصل ہو رہی ہے۔ مگر سائنس اور ٹکنالوجی کی یہ ساری کامیابی ان حیرت انگیز آلوں اور مشینوں کی رہین منت ہے جو انسان نے ایجاد کیے ہیں۔ ان آلوں کا امتیازی خاصہ ان کی حیرت انگیز ذکاوت حس اور صحت ہے۔ مثلاً دنیا کے ریڈیو سٹیشنوں سے جو گانے اور دوسرے ریکارڈ شدہ پروگرام نشر کیے جاتے ہیں۔ ان کے ریکارڈوں کو آواز میں تبدیل کرنے کے لیے ہیروں کی سوئیاں استعمال ہوتی ہیں یہ سوئیاں ہیروں کی چھوٹی چھوٹی قلموں سے تیار ہوتی ہیں جو دیکھنے میں ریت کے بڑے بڑے دانوں کی مانند نظر آتی ہیں۔ ان میں سے ہر قلم کا وزن ۱/۵۰ قیراط کے لگ بھگ ہوتا ہے۔ مگر کارخانوں میں چھیلے تراشے جانے کے بعد اسے ایک ایسی سوئی میں تبدیل کر دیا جاتا ہے جس کا سرا انسانی بال سے تیس گنا زیادہ باریک ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ سوئی کارخانے سے نکل کر پچاس روپے سے کم میں فروخت نہیں ہوتی۔ اگرچہ

ہیرے کے ننھے سے ذرے کی قیمت چند روپوں سے زیادہ نہ تھی۔

صرف اعلیٰ قسم کی گراموفون سوئیوں پر ہی بس نہیں بلکہ طرح طرح کے بنیادی اوزاروں کے لیے ہیرا ایک ناگزیر وجود ہے۔ سخت چٹانوں میں سوراخ کرنے اور تیل کے کنوؤں کا پتہ لگانے کے لیے ہیرے کی ضرورت پڑتی ہے۔ کاٹنے اور چیرنے والے اوزاروں کے لیے ہیرا ناگزیر ہے۔ پیسنے اور چمکانے والے آلوں کے لیے ہیرے سے کام لیے بغیر چارہ نہیں۔ غرض ہیرا جدید صنعت کے لیے رگ و جان کا درجہ حاصل کر چکا ہے۔ صنعتی ترقی، قومی خوش حالی، بلکہ قومی دفاع کے لیے ہیرا اب اس قدر ضروری بن چکا ہے کہ کوئی قوم اس کی اہمیت کو نظر انداز نہیں کر سکتی۔ اگر پہلے وقتوں میں ہیرے شاہی رعب و دبدبہ قائم رکھنے کے لیے ضروری تھے تو آج یہ قومی خوش حالی اور سربلندی کے لیے ضروری ہیں۔

جدید صنعت کے لیے ہیرے کی غیر معمولی اہمیت دو ایک مثالوں سے خوب واضح ہو جائے گی کانسی ایک سخت دھات ہے۔ اسے کاٹنے کے لیے سخت سے سخت فولادی دھار بھی، پانچ میل کٹائی کے بعد کند ہو جاتی ہے۔ اگر فولاد کے بجائے ٹنگسٹن کاربائڈ کے اوزار سے کام لیا جائے تو ۱۲ میل کٹائی کر سکے گا اس کے مقابلے میں ہیرا ۱۲۰۰ میل لمبی کٹائی کر سکتا ہے۔ جدید صنعتی اور سائنسی آلوں کے لیے جن غیر معمولی طور پر سخت دھاتوں سے کام لیا جاتا ہے۔ انھیں ہیرے کے علاوہ کوئی دوسری چیز کاٹ نہیں سکتی۔ موٹریں بنانے والے ایک امریکی کارخانے نے ۱۹ قیراط وزن کا ایک صنعتی ہیرا ۱۹۳۰ میں خریدا تھا۔ یہ پورے سولہ سال تک ایک ناگزیر آلے میں لگا کام کرتا رہا۔ اس عرصے میں اسے ۱۰۵ مرتبہ باہر نکال کر تیز کرنا پڑا۔ آخر کار جب گھس گھس کر اس وزن صرف ایک چوتھائی قیراط رہ گیا تو اسے نکال کر پیس لیا گیا اور یہ از سر نو صنعتی خدمات دینے لگا۔ غرض جدید صنعت کے حد درجہ قابل اعتماد اوزاروں کے لیے ہیرے کے علاوہ کسی دوسری چیز سے خدمت نہیں لی جا سکتی۔

ہیرے کی صنعتی افادیت جس تیزی سے بڑھ رہی ہے اس کا اندازہ صرف اس بات سے کیا جا سکتا ہے کہ ریاست ہائے متحدہ امریکہ نے ۱۹۵۰ء میں ایک کروڑ تیس لاکھ قیراط صنعتی ہیرے درآمد کیے حالاں کہ سنہ ۱۹۳۰ء میں صنعتی ہیروں کی درآمد اس کے سویں حصے سے بھی کم تھی۔ صنعتی ہیروں کی

مانگ میں یہ حیرت انگیز اضافہ سائنس اور ٹیکنالوجی کی ترقی نے پیدا کیا ہے۔ جو ملک آج صنعت کے میدان میں دنیا کی رہنمائی کر رہے ہیں، انھیں صنعتی ہیروں کی سخت ضرورت ہے۔ یہ ضرورت اس ضرورت سے کہیں زیادہ شدید ہے جو پہلے وقتوں کے بادشاہوں اور شہنشاہوں کو ہوا کرتی تھی۔ مطلق العنان حکمرانوں کے سامنے محض نمائش کا مقصد ہوتا تھا۔ مگر جدید صنعت کے لیے ہیرے رگ جان کا درجہ رکھتے ہیں۔ صنعتی ہیروں سے خدمت لیے بغیر جدید صنعت کی گاڑی چل نہیں سکتی۔

ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں کئی کارخانے ایسے ہیں جہاں صنعتی ہیروں کی بوریاں بھری آتی ہیں یہ ہیرے جو دیکھنے میں محض کنکریاں نظر آتی ہیں، مشینوں میں جھونک دیے جاتے ہیں اور پسے ہوئے سفوف کی شکل میں باہر آتے ہیں۔ اس سفوف سے طرح طرح کے صنعتی اوزار اور آلے تیار ہوتے ہیں۔ کئی اوزاروں میں سالم ہیرے استعمال ہوتے ہیں۔ مگر ہیروں سے تیار ہونے والے تمام اوزار جدید صنعت میں کلیدی کردار ادا کرتے ہیں۔ ہیرے کی اس صنعتی افادیت کا ہی نتیجہ ہے کہ گھٹیا سے گھٹیا قسم کے ہیرے بھی سونے سے پندرہ بیس گنا زیادہ قیمت پاتے ہیں۔

مصنوعی ہیرے

ہیرے خواہ جواہرات کے طور پر استعمال ہوں خواہ صنعتی اغراض کے لیے ان کی قدر و قیمت دونوں صورتوں میں بہت زیادہ ہے۔ لہٰذا یہ قدرتی تھا کہ انسان مصنوعی ہیرے بنانے کی کوشش کرے مگر یہ کوششیں حال ہی تک کامیاب نہ ہو سکی تھیں۔ سنہ ۱۸۸۰ء میں ایک سکاچ سائنس دان نے مختلف کیمیائی مرکبوں کو لوہے کی موٹی نالیوں میں ڈال کر انھیں بہت بلند درجۂ حرارت تک گرم کیا۔ مگر یہ نالیاں پھٹ جاتی رہیں۔ اور تجربہ گاہ تباہ ہو جاتی رہی۔ اس کے بعد ایک فرانسیسی سائنسدان نے ایک کوشش کی۔ اسے معلوم تھا کہ بعض اوقات زمین پر گرنے والے شہاب ثاقب میں سے بھی ہیرے برآمد ہوتے ہیں۔ اس سے اس نے نتیجہ نکالا، کہ اگر کاربن کو بے حد گرم کر کے پھر یک دم ٹھنڈا کر دیا جائے تو وہ ہیرے میں بدل جائے گی۔ چنانچہ اس نے کاربن کو پگھلے ہوئے لوہے میں ڈالا۔ اور پھر اس مرکب کو یکدم سرد کر دیا مگر یہ تجربہ بھی ناکام رہا۔

سنہ ۱۹۵۰ء میں ایک اور تجربہ امریکہ کی ہاورڈ یونیورسٹی میں کیا گیا۔ اس یونیورسٹی کے ایک پروفیسر نے کاربن پر ساڑھے لاکھ پونڈ فی مربع انچ کے حساب سے دباؤ ڈالا۔ مگر درجہ حرارت عام کمرے کا تھا۔ لہٰذا یہ تجربہ بھی ناکام رہا۔

تاہم انسان کی تلاش جاری تھی۔ آخر فروری سنہ ۱۹۵۵ء میں جنرل الیکٹرک کمپنی (امریکہ) کے شعبۂ تحقیق نے اعلان کیا کہ منزل مقصود ہاتھ آگئی ہے اور مصنوعی ہیرے تیار کر لیے گئے ہیں۔ تجربے کو کامیاب بنانے کے لیے جنرل الیکٹرک کمپنی کو ایک خاص قسم کی مشین تیار کرنا پڑی، جس کے پیٹ میں درجہ حرارت پانچ ہزار فارن ہائٹ تھا اور دباؤ چوبیس لاکھ فی مربع انچ تھا۔ یہ وہ کیفیات ہیں جو سطح زمین سے اڑھائی سو میل نیچے پائی جاتی ہیں۔

جنرل الیکٹرک کمپنی نے جو ہیرے تیار کیے۔ ان میں سے سب سے بڑا ہیرا لمبائی میں انچ کا سولھواں حصہ تھا اور اس کا وزن ایک قیراط کا سواں حصہ۔ یہ ہیرے دیکھنے میں ریت کے ذرات سے زیادہ نظر نہ آتے تھے۔ تاہم ان کی تخلیق میں سائنسی تحقیق کے پورے چار سال صرف ہوئے تھے اور لاکھوں ڈالر لاگت آئی تھی۔

بعد کے تجربوں اور تحقیق سے جنرل الیکٹرک کمپنی نے بوریزون نامی ایک نئی چیز پیدا کر دی جو فطرت نے مہیا نہیں کی۔ یہ نئی چیز بورون نائٹرائڈ پر بے پناہ دباؤ ڈالنے سے پیدا کی گئی ہے۔ بوریزن میں کم و بیش ہیرے کے تمام اوصاف موجود ہیں۔ یہ ہیرے کی طرح سخت ہے اور ہیرے پر بھی خراش پیدا کر سکتا ہے۔ بلکہ ایک لحاظ سے بوریزن ہیرے پر بھی فوقیت رکھتا ہے۔ کیوں کہ ہیرا بہت بلند درجہ حرارت کی تاب نہیں لا سکتا۔ تیز چلنے والی مشینوں میں چیزیں کاٹتے وقت بعض اوقات رگڑ سے بے پناہ حرارت پیدا ہو جاتی ہے۔ بوریزن بلند درجۂ حرارت کا کامیابی سے مقابلہ کر سکتا ہے۔

حالیہ تجربوں نے ثابت کیا ہے کہ ریڈیائی تابکاری کی مدد سے ہیروں کا رنگ بدلا جا سکتا ہے۔ لیکن کیا انسان اس قابل بھی ہو جائے گا کہ گھٹیا قسم کے صنعتی ہیروں کو ریڈیائی تابکاری کی مدد سے بڑھیا قسم کے ہیروں میں تبدیل کر دے؟ اس سوال کا جواب سر دست سائنس کے پاس موجود نہیں۔

منصوبی طریقے کے بعض مخصوص مسائل

محمد عبدالعزیز

مسلسل نمبر ٢

تنظیم جماعت | منصوبے کی تکمیل میں اختلاف رائے بعض حالات میں ناگزیر ہو جاتا ہے۔ ایک کام کی تکمیل کی کئی صورتیں ہو سکتی ہیں۔ ایک طالب علم اپنے نقطۂ نگاہ سے ایک طریقے کو بہتر سمجھتا ہے دوسرے کی نگاہ میں اس کے حصول کی راہ مختلف ہوتی ہے۔ بالخصوص ایسے منصوبوں میں جن کی تکمیل کے لیے اسکول سے باہر جانا ہوتا ہے، اختلاف کی زیادہ گنجائش ہوتی ہے۔ یہ اختلاف انفرادی بھی ہو سکتا ہے اور اجتماعی بھی لیکن اختلاف کی نوعیت خواہ کچھ ہو، جب اختلاف رونما ہو جائے تو اس میں آخری فیصلہ مدرس کا ہونا چاہیے۔ مثلاً وارسک کی بجلی کا منصوبہ۔ جب طلبہ اس کی تکمیل کے لیے ساز و سامان جمع کر لیں تو مدرس کا کام اس کی ترتیب و تنظیم میں رہنمائی کرنا ہوگا۔ ممکن ہے بند باندھنے میں اختلاف ہو جائے۔ ممکن ہے مشینوں کے لگانے میں کوئی تنازعہ پیدا ہو جائے۔ یا اسی قسم کا کوئی اور مرحلہ درپیش ہو۔ اس صورت میں صرف مدرس کی بلند نگاہی اور اس کا سلیقۂ نظم اس کے کام آ سکتا ہے۔

یہ بھی ہو سکتا ہے کہ بعض حالات میں طلبہ اپنا وقت ضائع کر دیں۔ یا یہ صورت کسی طالب علم کی کوتاہ بینی کی وجہ سے رونما ہوئی ہو۔ لیکن بہر نوع تضیع صلاحیت، تضیع صلاحیت ہے۔ اس کا موقع دینا ایک ایسی غلطی ہے جس کا ازالہ ممکن نہیں۔ اس سلسلے میں ایک یہ بھی اندیشہ ہو سکتا ہے کہ طلبہ کا ایک گروہ یا صرف ایک طالب علم توجہ گریز ہو جائے۔ اور اس میں دلچسپی ہی لینا چھوڑ دے۔ یہ انحراف توجہ اگر اس انفرادی حد تک قائم رہے تو اتنا نقصان دہ نہیں۔ لیکن اس کا سلسلہ لامتناہی ہوتا ہے۔ ایک کا رنگ دوسرے کو لگتا ہے۔ ایک نے کام میں عدم دلچسپی دکھائی تو دوسرے پر بھی وہی کیفیت طاری ہو گئی۔ اس سے نہ صرف یہ کہ کام کی رفتار تھم جاتی ہے۔ بلکہ تعلم مفقود ہو جاتا ہے۔ یہ اور اسی قسم کے اور مسائل مدرس کے لیے رونما ہوتا

ہو سکتے ہیں۔ اس کا فرض ان مسائل سے اس طرح عہدہ برآ ہونا ہے کہ طلبہ کی اکثریت اس کے تجربوں سے متمتع ہو سکے کوشش کرنا، وقت بچانا، اقدار کی تعیین اور منصوبے کی تکمیل کے بعض اور اہم پہلو۔ ان سب پر اس طرح زور دیا جائے کہ ان میں ایک قسم کی مطابقت پیدا ہو جائے۔ منصوبی طریق تدریس میں بھی بعض ایسے نازک مواقع آسکتے ہیں جو مدرس کی بصیرت کا امتحان ہو۔ اس کے لیے اسے ہر وقت تیار رہنا ضروری ہے۔

انتخاب منصوبہ منصوبے کی تنظیم کی طرح منصوبے کا انتخاب بھی کم اہم نہیں ہوتا۔ قطع نظر اس سے کہ یہ منصوبہ انفرادی ہے یا اجتماعی۔ انفرادی منصوبہ ایک طالب علم کے ذوق معلومات کو بیدار کرتا ہے۔ لیکن اس میں ساری جماعت حصہ نہیں لے سکتی۔ اس طرح اگر ہر طالب علم کا منصوبہ مختلف ہو تو مجموعی طور پر ان کی دل چسپیاں بھی جدا جدا ہوں گی۔ اس سے مدرس کا کام بھی بڑھ جاتا ہے اور طلبہ کی رفتار ترقی بھی کم ہو جاتی ہے۔ اس کے علاوہ منصوبے کی تکمیل کے لیے جس اشتراک و تعاون اور انہماک کی ضرورت ہوتی ہے اس کا میسر ہونا بھی محال ہو جاتا ہے۔ لیکن اگر طلبہ منصوبے کو اپنا منصوبہ سمجھ لیں، تو نہ صرف یہ کہ اس کی تکمیل میں آسانی ہو جائے گی بلکہ اس سے ان کا ذوق عمل اور بیدار ہو جائے گا۔

انفرادی منصوبے میں مدرس کی توجہ ایک مقام پر مرکوز نہیں ہو سکتی۔ وہ کبھی ایک منصوبے کی جانب رجوع کرے گا کبھی دوسرے کی جانب۔ کبھی ایک طالب علم کی آواز امداد اسے اپنی طرف راغب کرے گی اور کبھی دوسرے کی۔ اس صورت میں نہ منصوبوں کی صحیح نگرانی ممکن ہوتی ہے اور نہ طلبہ اس سے خاطر خواہ فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ اس انتشار سے بچنے کی ایک صورت تو یہ ہے کہ انتخاب کے وقت انفرادی منصوبوں سے اغماض برتا جائے اور اس کی بجائے ایسے منصوبے لیے جائیں جو قابل عمل ہوں اور جن کی تعلیمی افادیت مسلم ہو۔

کسی صحیح منصوبے کا انتخاب ایک ایسی ذمہ داری ہے جس سے عہدہ برآ ہونا آسان نہیں۔ اس انتخاب میں طلبہ کی امداد مدرس کا فرض ہے۔

نصاب سے مطابقت تعلیم اور نصاب دونوں ایک دوسرے سے کچھ اس طرح وابستہ ہیں کہ ایک کے بغیر دوسرے کا تصور ممکن نہیں۔ منصوبی طریق تدریس میں بھی نصاب کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا بلکہ

نصاب ہی کے سنگ وخشت پر اس کا قصرِ عالی تعمیر ہو سکتا ہے۔ تعلیم کی افادیت کے پیشِ نظر نصاب میں تسلسل کا ہونا ضروری ہے۔ آج کی تعلیم کل کی تعلیم کا پیش خیمہ ہوتی ہے۔ یہ نہیں کہ آج تو کلاس کو یہ پڑھایا گیا ہے کہ ۱۰+۵=۱۵ اور دوسرے دن اکائی کا قاعدہ۔ منصوبی طریقِ تدریس میں اس قسم کے تسلسل کا قائم رہنا ناممکن تو نہیں لیکن مشکل ضرور ہے۔ ایک منصوبہ تعلیم کا ایک مکمل واحدہ ہو سکتا ہے جس سے نصاب کے اس تسلسل کے ٹوٹ جانے کا اندیشہ ہوتا ہے۔ جو طلبہ کی ذہنی نشوونما کے لیے ضروری ہے۔ اس لیے اگر منصوبوں کی ترتیب اور ان کے انتخاب میں یہ اصول ملحوظ رکھا گیا ہے کہ تعلیمی تسلسل ٹوٹنے نہ پائے تو ان کی تعلیمی قدر وقیمت قائم رہ جائے گی ورنہ طلبہ ایک تعلیمی خلا میں قلابازیاں کھاتے نظر آئیں گے۔

مدرسے کے نظم ونسق سے مطابقت ہمارے نظامِ تعلیم میں مدرسہ ایک آزاد ادارہ نہیں ہے، بلکہ صوبائی نظام اور ایک متعین نصاب کے تابع ہے۔ ہر مضمون کے لیے وقت مقرر ہے۔ اور اسی مقررہ وقت میں اس کی تدریس ہو سکتی ہے۔ یہ نہیں کہ اردو کے پیریڈ میں تاریخ پڑھا دی جائے اور سائنس کے پیریڈ میں ڈرائنگ ثانوی مدارس میں ایک پیریڈ زیادہ سے زیادہ چالیس منٹ کا ہوتا ہے اور اسی پیریڈ میں منصوبے کی تکمیل بھی ممکن نہیں۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ منتخب منصوبوں کا مدرسے کے نظم ونسق سے ٹکراؤ تو نہیں ہوتا۔ عدم تصادم کی صورت میں منصوبے کی تکمیل ممکن ہے۔ اور اگر منصوبہ اس نوعیت کا ہو کہ مدرسے کا وقت نامہ اسے مناسب وقت نہ دے سکے تو اس کی تکمیل ناممکن ہو جائے گی۔ مثلاً کوئی زرعی یا صنعتی منصوبہ جس کی تکمیل کے لیے طلبہ کو مدرسے سے باہر جانا پڑے اور ممکن ہے اس میں خاصہ وقت بھی صرف ہو جائے۔

اس سلسلے میں دوسری دشواری یہ ہے کہ جو نظام اس وقت اس ملک میں رائج ہے اس میں ایک کلاس مختلف اوقات میں ایک ہی کمرے میں بیٹھتی ہے۔ مدرس تبدیل ہوتے رہتے ہیں۔ اردو، حساب، انگریزی، تاریخ اور دوسرے مضامین کی تدریس اس کلاس کے مخصوص کمرے میں ہوتی ہے۔ سائنس اور ڈرائنگ وغیرہ کے لیے طلبہ کسی دوسرے کمرے میں چلے جاتے ہیں۔

منصوبی طریقِ تدریس میں ایک منصوبے کی تکمیل کے لیے سادہ سامان کی ضرورت ہوتی ہے۔ کمرے میں اس [illegible] چالیس منٹ میں اسے دوبارہ سمیٹنا۔ اس میں وقت بھی ضائع ہوگا۔ منصوبے کو

تکمیل ممکن نہ ہوگی۔ اس پر مستزاد روایتی مدرسوں کا گروہ اس کی تنقیص پر کمربستہ ہوگا۔ ان سب سے عہدہ برآ ہونا آسان نہیں لیکن اس کے باوجود تجربے کیے جا سکتے ہیں کہ شاید اس سے کوئی اچھا نتیجہ مرتب ہو جائے۔

منصوبے کے انتخاب کا معیار

ان مشکلات کے پیش نظر منصوبوں کا انتخاب ایک مسئلہ بن جاتا ہے۔ اس کی وجہ منصوبوں کی پیچیدگیاں ہیں۔ دوسرے تدریسی طریقے نسبتاً کم پیچیدہ ہوتے ہیں۔ اس میں مدرس کو بھی آسانی ہوتی ہے اور طلبہ کو بھی پڑھ لینے کے علاوہ کوئی کام نہیں ہوتا۔ لیکن منصوبی طریق تدریس میں مدرس اور طلبہ دونوں کے کام کی نوعیت بدل جاتی ہے اس لیے اس کے انتخاب میں چند اصولوں کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔

تعلیمی افادیت | منصوبے کے انتخاب کے وقت یہ دیکھنا کہ اس کی تعلیمی افادیت کیا ہے، اتنا اہم ہے کہ اس کے بغیر اس کا انتخاب بے معنی ہو جاتا ہے۔ یہ تعلیمی افادیت عمومی نہ ہو بلکہ اس کا طلبہ کے تعلیمی تقاضوں سے براہ راست تعلق ہو۔ ممکن ہے ایک چیز ایک وقت میں مفید ہو لیکن دوسرے وقت وہ اتنی کارآمد نہ ہو۔ اس لیے طلبہ کی ضروریات، اس کی تعلیمی افادیت اور اس کے ضروری ساز و سامان کے پیش نظر، انتخاب کرنا، بہت سی قباحتوں سے بچا لے گا۔

حالات سے مطابقت | منصوبوں کے انتخاب میں طلبہ کے ماحول، ان کی سماجی اور ذہنی پختگی کا خیال رکھنا ضروری ہے۔ ایک منصوبہ شہری طلبہ کے ماحول اور مزاج کے مطابق ہو سکتا ہے۔ لیکن وہی منصوبہ دیہاتی طلبہ کے لیے غیر دلچسپ اور مبہم بن سکتا ہے۔ دونوں کے مزاج مختلف اور دونوں کا ماحول جداگانہ۔ اس صورت میں منصوبے کا ایک ہونا تعلیمی نقطۂ نگاہ سے غیر مفید ہوگا۔ ہمارے ملک میں شہر کا ماحول رفتہ رفتہ صنعتی ہوتا جا رہا ہے، دیہات کا ماحول ابھی تک ترقی کی برکات سے فائدہ نہیں اٹھا سکا۔ نہ گاؤں میں بجلی کے قمقمے ہیں کہ اس کی گلیوں کو چراغاں کر دیں، نہ ریڈیو کہ اس سے دنیا بھر کی خبریں سنی جا سکیں۔ زندگی کا چلن پرانا ہے جو تجدد کے تقاضوں کو پورا نہیں کر سکتا۔ اب ان دو متضاد ماحول میں اگر ایک ہی قسم کے منصوبے کا انتخاب ہو جائے تو ظاہر ہے کہ طلبا کی دلچسپی قائم نہیں رہ سکے گی۔ ایک کا ماحول نیم صنعتی اور دوسرے کا خالص زرعی۔

منصوبوں کے انتخاب کا دوسرا پہلو بھی قابل غور ہے۔ منصوبہ اس قسم کا ہو کہ اس سے نصابی ضروریات

پوری ہو جائیں۔ یا یہ کہ منصوبہ نصابی تقاضوں کے مطابق ہو۔ اس سے تدریس میں بھی ہم آہنگی پیدا ہو جائے گی اور تعلیم کا عمل بھی جاری رہے گا۔ اس سلسلے میں ایک دشواری یہ پیدا ہو سکتی ہے کہ نصاب مقرر کرنا مدرسے کا کام نہیں بلکہ محکمۂ تعلیم یا بورڈ آف سیکنڈری ایجوکیشن یا یونیورسٹی کا کام ہے اور مروجہ طریقہ یہی ہے کہ شہری اور دیہاتی طلبہ کے نصاب یکساں ہوں۔ اس طرح یہ اصول کہ گاؤں اور شہروں کے منصوبوں میں ایک امتیاز قائم رکھا جائے عملاً ممکن نہیں۔

حصولِ سامان | منصوبوں کی تکمیل میں ساز و سامان کے حصول کا مسئلہ بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ اصولی طور پر یہ درست ہے کہ ایک منصوبے کا خاکہ تیار کر لیا جائے۔ لیکن اس خاکے میں آب و رنگ بھرنے کے لیے جن چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر وہ میسر نہ آئیں تو اس کی تکمیل ناممکن ہو جاتی ہے۔ مثلاً ہمارے مدرسوں کے وسائل بہت محدود ہیں۔ ان محدود وسائل کے پیشِ نظر اگر کسی ایسے منصوبے پر کام شروع کر دیا جائے جس کی تکمیل کے لیے ضروری سامان مہیا نہ کیا جا سکے تو اس کا شروع کرنا ہی غیر موزوں ہوگا۔ اس کے علاوہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ایک زرعی منصوبے کے لیے شہری ماحول میں مناسب سامان نہ مل سکے۔ یا اسی طرح اگر کسی گاؤں میں طلبہ بجلی گھر بنانا چاہیں تو انھیں سامان کے لیے شہر کا محتاج ہونا پڑے گا اور ممکن ہے کہ ان کا یہ منصوبہ اتنا قیمتی بن جائے کہ مدرسے کی محدود آمدنی اس کی کفیل نہ ہو سکے۔

وقت اور منصوبہ | منصوبے کی تکمیل میں وقت صرف ہوتا ہے، اور وقت ہر کام میں صرف ہوتا ہے۔ لیکن دیکھنا یہ ہے کہ جو وقت ایک کام پر صرف کیا جا رہا ہے اس سے جو نتیجہ برآمد ہوگا وہ اس وقت کی قیمت کے برابر ہے۔ یا یہ کہ وقت تو زیادہ صرف ہو گیا ہے اور اس سے کوئی قابلِ قدر نتیجہ برآمد نہیں ہو سکا۔ جو وقت منصوبے کی تکمیل میں صرف ہو اس کی اہمیت اور اس کی قدر و قیمت کا اندازہ لگانا ضروری ہے۔ اگر طلبہ نے ضرورت سے زیادہ وقت صرف کر دیا ہے اور اس کا حاصل بھی مستحسن نہیں تو ایسی صورت میں اس کی ذمہ داری مدرس پر عاید ہوتی ہے کہ اس نے طلبہ کی صحیح رہنمائی نہیں کی۔

نصاب اور منصوبہ | نصاب اور منصوبے اور مدرسہ اور نصاب کے متعلق بحث ہو چکی ہے۔ مدرسہ منصوبے کی تکمیل کے لیے نصاب اور مدرسے کے نظام دونوں کے تابع ہے۔ بعض منصوبے اس قسم کے ہوتے ہیں

انھیں مدرسے کے نظام اوقات کے مطابق مکمل نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے لیے روزمرہ کے پروگرام میں ترمیم کی ضرورت ہوتی ہے۔ بہتر ہے کہ منصوبہ اس قسم کا ہو کہ مدرس کو کسی مزید ترمیم کی درخواست نہ کرنی پڑے، بلکہ جو وقت مقرر ہے، اس میں اسے مکمل کرنے کی کوشش کی جائے، اس سے مدرسے کے نظام میں خلل واقع نہیں ہوتا، اور طلبہ بھی اس سے استفادہ حاصل کر سکتے ہیں۔ اوقات میں ترمیم کی درخواست اس وقت کرنی چاہیے جب اس کے بغیر کوئی اور چارہ نہ ہو۔ اور یہ سال میں کبھی ایک یا زیادہ سے زیادہ دو مرتبہ ہو۔

تعلیمی اقدار | کسی منصوبے کی اچھائی یا برائی متعین کرنے کے لیے اس کی تعلیمی اقدار کا پرکھنا ضروری ہے یہ کہہ دینا کہ منصوبی طریق تدریس خوبیوں کا مرقع ہے، صحیح نہیں۔ محاسن کے ساتھ ساتھ اس میں کچھ نقائص بھی ہیں اس میں شک نہیں کہ اس طریق تدریس میں بعض خوبیاں ہیں جن سے خاصہ فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔ لیکن اسی طرح اس کے نقائص پر نگاہ رکھنا بھی ضروری ہے اچھائی ہے تو اس کی تعلیمی افادیت کیا ہے۔ برائی ہے تو اس سے کونسا تعلیمی نقص پیدا ہوتا ہے۔ مدرس کی بصیرت اس کا احاطہ کر سکتی ہے۔ اور پھر وہ اسی کے تابع اپنے طلبہ کی رہنمائی کر سکتا ہے۔

تکمیل منصوبہ | منصوبے کی تعلیمی افادیت کا اندازہ اس کی تکمیل کے بعد ہو سکتا ہے۔ منصوبے کی تکمیل اس لیے اور بھی ضروری ہو جاتی ہے کہ منصوبے کو ادھورا چھوڑ دینا، منصوبے کی تعلیمی افادیت پر پانی پھیر دینا ہے۔ تکمیل کے بعد طلبہ کے ردعمل، مدرس کی تنقید اور تحسین سے آخری نتیجہ مرتب ہو سکتا ہے۔ عدم تکمیل کی صورت میں اس سے طلبہ متمتع نہیں ہو سکتے۔

منصوبی طریق تدریس کے مفاد

تحریک تعلم | جدید تعلیمی تقاضوں میں تحریک تعلم کا مقصد طلبہ کے جذبہ تجسس کو اور تیز کرنا ہے۔ تحریک کے لیے محسوسات کی متوازن شاخوں کی ضرورت ہوتی ہے جنھیں منصوبہ اور اس کا عملی تکمیل پورا کر دیتا ہے۔ عمل سے کام کی جو خواہش پیدا ہوتی ہے اس سے ان کے ذوق کار پر اور صیقل ہو جاتی ہے۔ یہی جذبہ عمل جو انھیں آمادۂ کار رکھتا ہے دراصل تعلیم کی اساس ہے۔ اور منصوبی طریقہ بوجوہ احسن اسے پورا کرتا ہے۔

ذمہ داری | تعلیم کا ایک عمومی مقصد خودکاری اور ذمہ داری پیدا کرنا ہے منصوبی طریق تدریس میں

اس کے مواقع بیش از بیش ہیں۔ طالب علم خود ہی منصوبے کا انتخاب کرتا ہے۔ تکمیل کار کے لیے اس کا خاکہ مرتب کرتا ہے۔ ساز و سامان فراہم کرتا ہے۔ اسے مکمل کرتا ہے۔ پھر اس کے عواقب اور نتائج کا تجزیہ کرتا ہے۔ حتیٰ کہ وہ خود ہی اپنی کامیابی یا ناکامیابی کا فیصلہ کرتا ہے۔ یہ طریق کار اسے ذمہ دار بنا دیتا ہے۔ اور صرف ذمہ دار ہی نہیں بلکہ اس کی تخلیقی صلاحیتوں کو اس طرح بیدار کرتا ہے کہ نئے نئے خیالات اسے نئے زمین و آسمان کی تلاش کے لیے مجبور کر دیتے ہیں۔

زندگی کے مسائل منصوبی طریق تدریس مسائل کے حل کے ایسے مواقع بہم پہنچاتا ہے کہ اس سے طلبہ کی عمومی تربیت ہو جاتی ہے کہ آگے چل کر وہ اپنے مسائل کا حل خود ہی تلاش کر لیا کریں۔ مسائلی طریقہ بھی زندگی کے مسائل کا حل تلاش کرنا سکھاتا ہے۔ لیکن دونوں میں ایک مابہ الامتیاز خصوصیت یہ ہے کہ مسائلی طریقہ منطقی اور استدلالی نتیجے تک پہنچانے کے بعد اس کی عملی تربیت سے قاصر ہے۔ لیکن منصوبی طریق تدریس میں اس کی عملی تربیت کے مواقع بھی میسر آتے ہیں۔ ذہن ایک منصوبہ تیار کرتا ہے اور طلبہ اس کے عواقب سے بھی واقف ہوتے ہیں اور خود ہی عمل کر کے اس مفروضے کو صحیح ثابت کرتے ہیں۔ اس میں صرف ان کا ذہن ہی کام نہیں کرتا۔ بلکہ دوسرے حواس اتنی ہی مستعدی سے مصروف عمل رہتے ہیں۔ اس سے ان کی ایسی عملی تربیت ہو جاتی ہے کہ وہ اپنے مسائل سے گریز کرنے کی بجائے خود ان کا حل تلاش کرنے کی کوشش کرنے لگتے ہیں۔

اشتراک و تعاون قومی اور سماجی شعور کی تہذیب و تربیت کے لیے اشتراک و تعاون کار کی پرورش ضروری ہے۔ مدرسوں میں اس کی تربیت بعض گروہی کھیلوں سے کی جاتی ہے۔ طلبہ بیک وقت ایک کلاس میں بیٹھ کر اپنے دوسرے ساتھیوں کے ساتھ پڑھنے سے بھی اس جذبے کو تقویت پہنچتی ہے۔ منصوبی طریق تدریس کا تمام تر انحصار اشتراک و تعاون پر ہے۔ انفرادی منصوبوں میں اشتراک و تعاون کی تربیت ممکن نہیں۔ لیکن گروہی منصوبوں میں ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کیے بغیر اس کی تکمیل نہیں ہو سکتی گروہی منصوبوں میں ایسے حالات پیدا ہوتے رہتے ہیں کہ طلبہ اس تعاون کی ضرورت شدت سے محسوس کرنے لگتے ہیں۔

صبر و استقامت | منصوبے کی تکمیل میں عمل کی جو رفتار ہوتی ہے وہ طلبہ کو صبر کی تربیت دیتی ہے اور صبر سے استقامت پیدا ہوتی ہے۔ اور اگر غور کیا جائے تو زندگی کے مختلف مسائل صبر و استقامت ہی کے رہین منت ہیں۔ طلبہ بالعموم متوازن مزاج ہوتے ہیں جس تیزی اور اشتیاق سے ایک کام کرنے کے لیے بڑھتے ہیں، اسی تیزی سے اسے ختم بھی کر دینا چاہتے ہیں۔ اس سے ایک قباحت تو یہ پیدا ہو جاتی ہے کہ اس تیزی میں وہ بعض مدارج کو چھوڑتے ہوئے آگے بڑھ جاتے ہیں جس سے کام یا تو ادھورا رہ جاتا ہے یا اتنا ناقص کہ نہ ہونے کے برابر۔ لیکن اگر طلبہ کو صبر و استقامت اور مستعدی کے ساتھ کام کرنے کی تربیت دی جائے تو اس سے خواہ بظاہر کام کی رفتار کم ہو جائے لیکن جو کام ہوگا، اس کی حیثیت مسلم ہوگی۔

بعض اوقات یہ بھی ہوتا ہے کہ منصوبے کی تکمیل میں انھیں غیر متوقع دشواریاں پیش آتی ہیں یہ دشواریاں شکست کا موجب ہو سکتی ہیں۔ اگر شکست کا نتیجہ ترک کار ہے تو اس تعلیم سے دست بردار ہو جانا ہی موزوں لیکن اگر شکست عزم و حوصلہ پیدا کرتی ہے تو اس سے انسان بہت کچھ سیکھ سکتا ہے۔ مدرس طلبہ کو صبر کیش اور استقامت پسند بنا سکتا ہے۔ منصوبی طریقے میں اس کے بیشتر مواقع ہیں۔

رواداری | منصوبے کی تکمیل میں طلبہ جب اپنے ساتھیوں کے ساتھ مل کر کام کرتے ہیں تو ان میں رواداری پیدا ہو جاتی ہے۔ انھیں صرف اپنی رائے اور اپنے طریق کار پر اصرار نہیں ہوتا، بلکہ وہ دوسروں کے نظریات کو بھی قبول کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ طرز عمل انھیں محتاط، بالغ نظر اور وسیع القلب بنا دیتا ہے۔ ان خوبیوں کی تربیت کھیل کے میدان میں بھی ہوتی ہے۔ لیکن منصوبے بھی طلبہ کی تہذیب اور تربیت کا وہ سامان بہم پہنچاتے ہیں کہ انھیں بھلایا نہیں جا سکتا۔

منصوبے کی تکمیل میں ہر طالب علم اپنی صلاحیتوں کا جائزہ لیتا ہے اور دوسروں کے حسن کار کی تحسین کرتا ہے۔ اس میں انھیں اختلاف رائے، بحث و تمحیص اور اپنے نقطۂ نظر کے پیش کرنے کے اتنے مواقع حاصل ہوتے ہیں کہ طلبہ ان سے براہِ راست بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں۔ کبھی اس کی بات دوسرے مان لیتے ہیں اور کبھی اسے دوسروں کی بات تسلیم کرنی پڑتی ہے۔ اس طرح ضبط نفس اور

خیالات کی رواداری کی تربیت ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ منصوبے کی تکمیل کے وقت متعلم کا ذہن ایک فیصلے کی تلاش میں محو ہوتا ہے۔ لیکن تکمیل سے پہلے فیصلہ نہیں کرسکتا۔

قوتِ فیصلہ صحیح فیصلے کی تربیت آسان نہیں۔ فیصلے کا ایک معین معیار ہے جو حالات کے صحیح تجزیہ اور صحیح شدہ مواد سے صحیح نتائج اخذ کرنے پر مبنی ہے۔ منصوبے کی تکمیل کے سلسلے میں طلبہ کو جن مراحل سے گذرنا پڑتا ہے اس میں ان کی قوتِ فیصلہ کا قدم قدم پر امتحان ہوتا ہے۔ اگر اپنے تجزیے اور کلیے کی تعیین میں انھوں نے غلطی کی تو پھر اس کی تکمیل کی خواہش بے معنی ہو جاتی ہے۔ اس لیے طلبہ سوچ سمجھ کر خاصے غور و فکر کے بعد قدم اٹھاتے ہیں۔ اور ان کا اس قدر محتاط ہونا ان کی قوتِ فیصلہ کی صحیح تربیت ہے۔

تخلیقی کام منصوبی طریقِ تدریس میں طلبہ کو تخلیقی کام کا موقع ملتا ہے۔ طلبہ اس کی رہ نمائی میں ایک پل تعمیر کرتے ہیں ایک مضمون لکھتے ہیں یا ایک نظم موزوں کرتے ہیں یا ایک کہانی لکھتے ہیں۔ یا کپڑا بینے کی مشق کرتے ہیں۔ ایک چراغ دوسرے چراغ کو روشن کرتا ہے۔ ایک عملی کام اسی قسم کے دوسرے کاموں کی طرف رہ نمائی کرتا ہے۔ اس سے طلبہ کا تخلیقی شعور اس طرح بیدار ہوتا ہے کہ رفتہ رفتہ وہ تخلیقی کام کرنے کے اہل بن جاتے ہیں۔

یہ صحیح ہے کہ ہر طالب علم میں تخلیقی کام کی اہلیت نہیں ہوتی۔ لیکن اگر اس قسم کے مواقع میسر ہوں تو ان کا ذہن اور بالیدہ ہو جاتا ہے۔ ممکن ہے کہ وہ کوئی تخلیقی کام نہ کرسکیں۔ لیکن جو کام کریں گے اس کی کچھ نہ کچھ حیثیت ضرور ہوگی۔ اس کے علاوہ اگر طلبہ کی صحیح رہ نمائی کی جائے اور ان کی تخلیقی صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کی کوشش کی جائے تو کوئی وجہ نہیں کہ ان کی تخلیق جان دار نہ بن جائے۔

تدریسِ شعر

شیخ اصغر علی

(مسلسل نمبر۲)

نظم کی قراءت میں اکثر دیکھا گیا ہے کہ معلم وزن کا خیال نہ رکھتے ہوئے کسی غلط جگہ پر زور دیکر شعر کا خون کر دیتے ہیں، تاکید کا خیال نہیں رکھتے۔ تلفظ غلط ہونے کی وجہ سے شعر کے ترنم کا ستیاناس ہو جاتا ہے مؤثر قراءت کے لیے ضروری ہے کہ تفصیل، تاکید، تلفظ، روانی وغیرہ کا پورا خیال رکھا جائے۔

وحدت تاثر کو قائم رکھنے کے لیے چھوٹی نظمیں عام طور پر پوری کی پوری پڑھی جاتی ہیں۔ البتہ لمبی نظموں کے لیے ضروری ہے کہ ان کا ایک ایک بند یا دو تین مربوط بندوں کو، جن کو جدا کرنے سے مطلب فوت ہو جاتا ہو، اکٹھا پڑھا جائے۔ نظم یوں پڑھنی چاہیے کہ طلبہ کو نظم سنتے ہوئے اسے سمجھنے میں سہولت ہو، اور استاد کی قراءت کے بعد وہ اس کی نقل کر سکیں۔ بعض اوقات نظم کی ایک قراءت کافی نہیں ہوتی بلکہ اس کے تاثر کو بڑھانے اور اس کی تفہیم کو سہل بنانے کے لیے معلم کو دو مرتبہ نظم پڑھنا پڑتی ہے معلم کو دوبارہ پڑھنے سے کترانا نہیں چاہیے۔ نظم کی بحر کا خیال رکھنا بھی ضروری ہے۔ چھوٹی بحر میں غزلیں عام طور پر شدت تاثر کے اعتبار سے نشتر کی سی آبداری اور چبھن رکھتی ہیں۔ لمبی بحریں عموماً مترنم ہوتی ہیں اور ایک سماں باندھتی ہیں۔ دونوں کی قراءت میں استاد کو ایک الگ الگ انداز اپنانا ہوگا۔

استاد کے نمونہ قراءت کے بعد طلبہ کی باری آتی ہے۔ چھوٹے بچے بالخصوص اور بڑے طلبہ بالعموم استاد کی نقل اتارنے کے شائق بلکہ مشاق بھی ہوتے ہیں۔ معلم کو چاہیے کہ ان کے اس فطری ملکہ سے فائدہ اٹھاتے ہوئے انھیں اسی انداز، اسی آواز اور اسی رکھ رکھاؤ سے پڑھنے کی ہدایت کرے جس کا اس نے خود نمونہ دیتے وقت التزام کیا تھا۔ اگر بچہ نظم کو رواں دواں پڑھ رہا ہے اور پڑھتے پڑھتے کوئی غلطی کر جاتا ہے تو اسے ٹوکنے کی بجائے، اصلاح کو موخر وقت پر اٹھا رکھنا چاہیے۔ یعنی

غلطی کی تصحیح اس وقت ہو، جب بچہ قرات ختم کرلے۔ دوران قرات ٹوکنے میں روانی پہ ضرب کاری لگتی ہے۔ ہاں جہاں طالب علم پڑھتے پڑھتے بالکل رک جائے اور بغیر امداد کے آگے بڑھنے سے قاصر ہو، وہاں استاد کو لقمہ دینے یا تصحیح کرنے سے گھبرانا نہیں چاہیے۔ بعض محتاط ماہرین تعلیم کا خیال تو یہ ہے کہ معلم اپنے نمونۂ قرات کے بعد اور بچوں کی نظم خوانی سے قبل، ایسے مشکل الفاظ کا تلفظ، جن کے غلط ہونے کا امکان ہو، وضاحت سے بتادے، بلکہ ان کی اجتماعی مشق کروائے۔ معلم اپنے نمونۂ قرات کے بعد اگر کسی اچھے طالب علم سے پڑھوائے تو بہت بہتر ہے۔ اس لیے کہ اس طرح طلبہ کو بیک وقت دو بہتر نمونے میسر آجاتے ہیں، اور کمزور طلبہ کے لیے اس کے بعد پڑھنا اور آسان ہوجاتا ہے۔ لیکن کمزور طلبہ کو یکسر نظر انداز کر دینا بھی روا نہیں۔ دراصل یہ معاملہ کہ کس سے پہلے پڑھوانا ہے اور کس سے بعد میں خالص داخلی معاملہ ہے اور ہر استاد کو کلی اختیار ہے کہ وہ اپنی جماعت کے حالات کا جائزہ لے کر مناسب اقدام کرے۔

تفہیمِ شعر قراتِ شعر کے بعد تفہیمِ شعر کا نمبر ہے۔ بعض اساتذہ تو یہ غلطی کرتے ہیں کہ خود پڑھتے جاتے ہیں مشکل الفاظ کے معانی بتاتے جاتے ہیں۔ شعر کا مطلب بھی خود ہی بیان کر دیتے ہیں اور یوں ساری نظم ختم ہو جاتی ہے۔ اشعار کی وضاحت میں وہ پورا زور بیان صرف کرتے ہیں۔ یعنی قادر الکلامی کا ثبوت بھی دیتے ہیں لیکن طلبہ کے پلّے بہت کم پڑتا ہے۔ یہ طریقۂ تعلیم کالج کی اوپر کی جماعتوں میں درست سہی، لیکن مدارس میں بے کار اور نقصان دہ ہے۔ دوسرا طریقہ جو اکثر دیکھنے میں آیا ہے۔ وہ یہ کہ لڑکے سے شعر پڑھوا لیا اور مطلب خود بیان کر دیا۔ اس طرح بھی طالب علم کی حیثیت تقریباً خاموش سامع کی سی ہوتی ہے سبق کی کامیابی اور طلبہ کا فائدہ ان کے عملی اشتراک اور ذاتی تعاون پہ موقوف ہے۔ استاد کی حیثیت "بازاری خلاصہ" اور "شرح" کی نہیں ہے کہ ہر لفظ کے معنی اور ہر شعر کی تشریح اس کی طرف سے ہو۔ معلم کی حیثیت ایک راہبر اور رہنما کی سی ہے۔ اس کا کام معانی بتانا نہیں بلکہ معانی کا راستہ دکھانا ہے۔ اس کی غرض شعر کی تشریح کرنا نہیں بلکہ شعر کی تشریح کرانا ہے۔ وہ مطلب بتانے کے لیے نہیں، مفہوم اخذ کرانے کے لیے ہے۔ موزوں سوالات کے ذریعے شعر کے مفہوم تک پہنچانا استاد کا کام اور اس سے

آگے طلبہ کا فرض۔ بعض مقامات ایسے بھی آتے ہیں کہ استاد کو سب کچھ خود ہی بتانا پڑتا ہے۔ لیکن یہ صورتِ حال جس قدر کم پیش آئے بہتر ہے۔ مشکل الفاظ و محاورات، اگر جملوں میں استعمال کے ذریعے طلبہ کے سامنے پیش کیے جائیں تو طلبہ خود بخود ان کے معانی سمجھ جاتے ہیں۔ نظم میں اکثر تراکیب کی دقت پیش آتی ہے۔ معلم کو چاہیے کہ وہ ان مرکبات کا تجزیہ کرائے اور پھر معانی اخذ کرائے۔ مثلاً نسیم سحر۔ تبسم گل خرام صبا۔ ویرانی دشت۔ فلک نیلگوں۔ شادابی چمن وغیرہ کا تجزیہ کر دیا جائے تو مطلب خود بخود واضح ہو جاتا ہے۔ بچہ جو معنی خود اپنی کوشش سے دریافت کر کے استاد کو بتاتا ہے، اس میں وہ دوگونہ مسرت محسوس کرتا ہے اور یہ خود تلاش کردہ معنی اُسے دیر تک یاد رہتے ہیں۔

تشبیہات و استعارات | شعرا جب کسی حسین چیز کے حسن کو دوبالا کرنا چاہتے ہیں یا کسی بدزیب اور کریہہ منظر شے کو اور زیادہ گھناؤنا بناکر پیش کرنے کے درپے ہوتے ہیں تو تشبیہ اور استعارہ کا سہارا لیتے ہیں۔ کسی مرئی چیز سے تشبیہ دی جائے تو غیر مرئی چیز بھی تصویر بن کر آنکھوں میں پھرنے لگتی ہے۔ تشبیہ جذبہ کی شدت کو بڑھاتی۔ تاثیر کو تیز تر کرتی اور اشیا کو ایک نیا روپ دیتی ہے

انیس کا یہ مشہور شعر

کھا کھا کے اوس اور بھی سبزہ ہرا ہوا
تھا موتیوں سے دامنِ صحرا بھرا ہوا

یا میر کے یہ اشعار

شام ہی سے بجھا سا رہتا ہے ؛ دل ہوا ہے چراغ مفلس کا
ہستی اپنی حباب کی سی ہے یہ نمائش سراب کی سی ہے

وغیرہ وغیرہ تشبیہ کی عمدہ مثالیں ہیں۔ تشبیہ کے موزوں اور مرغوب صورت استعمال سے کلام کے تاثر، اور شعر کے حسن میں بے پناہ اضافہ ہو جاتا ہے۔ ایسی تشبیہات کی وضاحت نہایت ضروری ہے تاکہ طلبہ کے ذوق کی صحیح تربیت ہو سکے، اور ان کا مذاق شعر جلا پائے۔ پھر سادہ اور پیچ دار تشبیہ میں فرق واضح کرنا بھی ضروری ہے کہ تشبیہ جہاں شعر کا زیور ہے وہاں اس کا عیب بھی بن سکتا ہے

بعض اوقات شعر میں تلمیحات بھی ملتی ہیں۔ جب تک ان کی وضاحت نہ ہو شعر کا مطلب واضح نہیں ہوتا مثلاً

کشتیِ مسکین و جانِ پاک و دیوارِ یتیم
علمِ موسیٰ بھی ہے تیرے سامنے حیرت فروش

اس ایک شعر کی تشریح میں پورا قصۂ سفرِ موسیٰ و خضر علیہما الصلوٰۃ والسلام بیان نہ ہو تو نفسِ مطلب کیا پلّے پڑے گا؟

شعر کی نثر بنانا بعض پرانے مدرس شعر کی نثر بنانے کے بہت مشتاق ہوتے ہیں، ایسے لوگ غالباً فارسی کے قدیم طریقۂ تعلیم سے متاثر ہیں۔ فارسی اشعار پڑھاتے وقت، ان کی نثر بنانا دو وجہ سے ضروری سمجھا جاتا ہے۔ ایک تو یہ کہ وہ بہر حال غیر ملکی زبان ہے اور شعر فہمی کے لیے ضروری ہے کہ شعر کی عبارت آسان سے آسان صورت میں ہمارے سامنے ہو۔ دوسرے بعض فارسی شعروں میں الفاظ کی نشست اور ترکیب کچھ اس طرح سے ہوتی ہے کہ جب تک الفاظ کو نثری سانچہ میں نہ ڈھال لیا جائے مفہوم واضح نہیں ہوتا۔ اُردو میں صورتِ حال مختلف ہے اور یہاں شعر کی نثر بنانا بالکل بے کار بلکہ نقصان دہ ہے کیوں کہ اس سے استحسانِ شعر پر گہری زد پڑتی ہے۔ نثر بنانے سے شعر کا وہ لطف، تاثر اور وہ حسن جاتا رہتا ہے جو شاعر نے بڑی محنت سے اس میں پیدا کیا تھا۔ یہ کہنا کہ نثر بنا کر اس کا شعر سے موازنہ کر کے شعری خوبیوں کو اجاگر کرنا مقصود ہوتا ہے، درست نہیں اس لیے کہ تشریح سے وہ بات پیدا ہو جاتی ہے جس سے سارے محاسن شعری اجاگر کیے جا سکتے ہیں۔ نثر بنانا تو محض تضیع اوقات ہے۔

اشعار کی تشریح بعض حضرات شعر کی تشریح کے سرے ہی سے خلاف ہیں۔ ان کے خیال میں شعر ایک نازک آبگینہ ہے جو کسی تشریح کا جو مصداق ہے ٹھیس کے متحمل نہیں ہو سکتا۔ اس سے انکار نہیں کہ شعر کی مثال ایک نازک آب گینے کی ہے۔ لیکن جب تک شعر کا تجزیہ کر کے اس کی خوبیوں کو اجاگر نہ جائے، صحیح استحسان کا جذبہ کیسے پیدا ہوگا۔ اور طلبہ کے ذوقِ شعر کی تربیت کیوں کر ہو گی۔ یہ درست ہے کہ بلا ضرورت شعر کے حصے بخرے کرنے اور سہل شعروں کو خواہ مخواہ طویل تشریحات کا جامہ پہنانا بے کار ہے۔ کہ ضرورت سے زیادہ پوسٹ مارٹم واقعی شعر کے مزے کو کرکرا کر دیتا ہے۔ یہ حقیقت ہے

کہ الفاظ و محاورات کی تفہیم اور شعر کی تشریح تابع ہونی چاہیے، احساسات و جذبات کے محض لفظی مطالب سے شعر کی خوبی واضح نہیں ہو سکتی۔ ضروری ہے کہ استاد طلبہ کو شاعر کی فکر کی بلندی تک اڑنا سکھائے اگر طلبہ کی پرواز، شاعر کی حد پرواز کو چھولے تو سمجھیے کہ استاد اپنے سبق میں سو فیصد کامیاب رہا۔

تشریح میں استاد کو لکچری طریقہ کی بجائے وہی تشریحی اور سوالیہ طریقہ اپنانا چاہیے، تاکہ طلبہ کو خود سوچنے اور الفاظ کے سمندر میں غوطہ لگا کر معانی کے موتی نکالنے کا موقع ہاتھ آتا رہے۔ ایک ایک شعر کی تشریح کے بعد پورے بند اور پھر پوری نظم کا مجموعی مفہوم اخذ کرالینا چاہیے۔ تاکہ نظم میں موجود وحدت تاثر ضائع نہ ہو۔ غزل جہاں ہر شعر ایک الگ تجربے اور ایک جدا جذبے اور نئے خیال کا حامل ہو۔ اس اصول سے مستثنیٰ ہو گی۔ نظم کا خلاصہ کرانا، اور اس کے مرکزی نقطۂ خیال کا کھوج لگانا یا اس میں پوشیدہ اخلاقی سبق کی وضاحت وہ ضروری اقدامات ہیں جن کے بغیر سبق نامکمل رہتا ہے۔

استحسان تدریس شعر میں استحسان کی اہمیت اظہر من الشمس ہے۔ استحسان کا آغاز یوں تو نظم خوانی کے ساتھ ساتھ ہو جاتا ہے۔ جوں جوں استاد اور طلبہ شعر پڑھتے جاتے ہیں اس کے ترنم، اس کی غنائیت، اس کے وزن اور اس کی بندش سے لطف اٹھاتے جاتے ہیں۔ لیکن یہ استحسان کسی حد تک سطحی اور ظاہری ہوتا ہے اس سے طلبہ یہ تو سمجھ جاتے ہیں کہ یہ بحر بہت مترنم ہے۔ لیکن نفس مضمون کی تحسین، زبان، الفاظ اور تراکیب کی تحسین۔ اسلوب اور انداز کی تحسین، تشبیہات اور استعارات کی تحسین اسی وقت ذہن میں آتی ہے، جب طلبہ پر تفہیم اشعار کی منزل آسان ہو گئی ہو۔ وہ شاعر کے جذبات کا تجربہ کر چکے ہوں۔

استحسان سے مراد بچوں کے ذوق تنقید کو بروئے کار لانا، ان کی پرکھ کی قوت کو تحریک دینا اور ان کے مذاق شعر کو نکھارنا ہے۔ استحسان کی اقدار طلبہ کے معیار کے ساتھ ساتھ بدلتی رہتی ہیں جس درجہ کا طالب علم ہو گا، اسی درجہ کا اس کا ذوق شعر ہو گا، اور اسی درجہ کا جذبۂ استحسان اور شعور تنقید۔ ثانوی مدارس کی فوقانی جماعتوں کے طلبہ سے تو ہمیں یہ امید ضرور رکھنا چاہیے کہ وہ نصاب کی منظومات کے اسلوب سے واقف ہوں۔ وہ یہ جانتے ہوں کہ فلاں شاعر کس صنف شعر میں مہارت رکھتا ہے اور اس خاص صنف کے شعرا میں اس کا کیا مقام ہے۔ اس کے انداز میں تکلف اور آورد ہے یا سادگی

اور آمد۔ وہ زیادہ مترنم بحروں کا دلدادہ ہے، یا کم مترنم بحروں کا۔ اسے لمبی بحر سے دلچسپی ہے یا چھوٹی بحر سے۔ کسی خاص نظم میں الفاظ کے انتخاب میں وہ وقت پسندی کے رجحان کا اظہار کرتا ہے یا سہل پسند۔ وہ عام طور پر مشکل اور ناہموار زمین میں طبع آزمائی کرتا ہے یا آسان اور ہموار زمین میں۔ اسے ذخیرۂ الفاظ پر کہاں تک قدرت حاصل ہے۔ اس کی بحر اور اس کے الفاظ، صوتی اور معنوی اعتبار سے اس کے خیالات اور جذبات سے کہاں تک ہم آہنگ ہیں۔ یعنی شاعر نے اپنے جذبات کے اظہار کے لیے جو لفظ چنے ہیں وہ اپنی آواز اور معانی کے اعتبار سے کہاں تک اس کیفیت کو پیدا کرتے ہیں جو شاعر کے پیش نظر ہے۔ مثال کے طور پر علامہ اقبال کی ایک نظم "دریائے نیکر کے کنارے ایک شام" لیجیے:۔

خاموش ہے چاندنی قمر کی ۔۔۔ شاخیں ہیں خاموش ہر شجر کی
وادی کے نوا فروش خاموش ۔۔۔ کہسار کے سبز پوش خاموش
فطرت بے ہوش ہو گئی ہے ۔۔۔ آغوش میں شب کے سو گئی ہے
کچھ ایسا سکوت کا سماں ہے ۔۔۔ یہ قافلہ بے درا رواں ہے
خاموش ہیں کوہ و دشت و دریا ۔۔۔ قدرت ہے مراقبے میں گویا
اے دل تو بھی خاموش ہو جا ۔۔۔ آغوش میں غم کو لے کے سو جا

مندرجہ بالا اشعار میں الفاظ ایسے لائے گئے ہیں جو نہ صرف معنوی اعتبار سے ایک خاموشی کے آئینہ دار ہیں۔ بلکہ آواز کے لحاظ سے بھی شاعر کے جذبات کی ترجمانی کر رہے ہیں۔ مثلاً ش اور س کی تکرار صوتی اعتبار سے خاموشی اور سکوت کا سماں پیدا کر رہی ہے۔ خاموش شاخیں، شجر۔ نوا فروش۔ کہسار۔ سبز پوش۔ بے ہوش۔ آغوش شب، ایسے الفاظ کا استعمال اور پھر لفظ خاموش کا تکرار ایک خاص سکوت کی کیفیت کا عکاس ہے۔ اسی طرح علامہ اقبال کی نظم "والدہ مرحومہ کی یاد میں" الفاظ کی صوتی اور معنوی ہم آہنگی کی وجہ سے جو تاثر پیدا کرتی اور غم کا جو سماں باندھتی ہے۔ وہ شاعر کے ذوق انتخاب الفاظ کی عمدہ مثال ہے۔

کسی رزمیہ مثنوی میں ہلکے پھلکے، نرم و شیریں الفاظ کا انتخاب نامناسب ہوتا ہے۔ اور اسی طرح

بزمیہ مثنوی یا غزل میں بھاری بھرکم، پرجلال اور شکوہ دار الفاظ زیب نہیں دیتے۔ اسی لیے بعض شاعر جو بزم نگاری میں بہت کامیاب ہوتے ہیں رزم نگاری میں ناکام رہتے ہیں، اور رزمیہ کہنے والے شاعر بزم کے میدان میں بہت پیچھے رہ جاتے ہیں۔ فی الحقیقت شعر کی ہر صنف کا ایک خاص مزاج ہے۔ قصیدے کا مزاج الگ ہے اور غزل کا مزاج الگ ہے۔ اور ہر صنفِ شاعری میں بحر، الفاظ، حتیٰ کہ خیالات تک کے انتخاب میں اس کے مزاج کا لحاظ رکھنا ضروری ہے۔

یہ دیکھنا کہ شاعر کا تخیل کس قدر بلند ہے اور اس کی شعری تخلیق ہماری زندگی کے تجربات سے کتنی قریب یا دور ہے۔ اس نے اپنی نظم میں اپنے ماحول اور معاشرے کی کہاں تک ترجمانی کی ہے۔ اس نے انسانیت کو کیا سبق دیا ہے۔ اخلاق کے کن پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے۔ محبت کے کون لطیف جذبات کی عکاسی کی ہے۔ شاعر نے مختلف مناظر کو کس انداز سے دیکھا ہے اور ان کی تصویر کشی میں وہ کہاں تک کامیاب ہوا ہے۔ مختلف انسانوں کے جذبات سمجھنے اور پھر ان جذبات کو شعر کے قالب میں ڈھالنے میں اس نے کس فن کاری کا ثبوت دیا ہے۔ ان سب چیزوں کا تھوڑا بہت جائزہ لینا ضروری ہے۔ لیکن یہ سب کچھ بالتدریج ہوگا۔ ایک ہی نظم میں یہ ساری باتیں سمونا ناممکن ہے۔ معلم کو چاہیے کہ وہ منزل امتحان کو ہر سبق میں نگاہ میں رکھے۔ اور قدم بہ قدم سبق بہ سبق، ان کے ذوقِ تنقید کی تربیت کرتا چلا جائے۔

قراءت ثانی | تفہیم اشعار اور استحسانی سوالات کے بعد پوری نظم کو دوبارہ پڑھنے یا پڑھوانے سے طلبہ کے دل و دماغ مجموعی حیثیت سے نظم کی ہیئت اور اس کے مضمون کے بارے میں وہ تاثر قبول کرتے ہیں جس کے تحت خود شاعر نے وہ نظم کہی۔ پہلی مرتبہ جب انھوں نے نظم پڑھی یا سنی تو انھوں نے محض سطحی حظ اٹھایا، کیونکہ ہنوز وہ شعر کے مفہوم سے نا آشنا تھے۔ اب جب کہ وہ نظم یا غزل کے ایک ایک شعر کو سمجھتے، اس کی فنی خوبیوں پر نگاہ رکھتے اور شاعر کے کمال شعری سے کچھ واقف ہو چکے ہیں۔ تو نظم کی قراءت شراب دو آتشہ کی سی کیفیت پیدا کر دیتی ہے۔ اور اب جب طلبہ سر دھنتے ہیں اور ہونٹ چاٹتے ہیں تو ان کے مزے میں سطحیت نہیں بلکہ حقیقت اور گہرائی ہوتی ہے۔

اعادہ | یہ جائزہ لینے کے لیے کہ طلبہ نے کیا سمجھا اور کس کس طالب علم نے نظم کو پوری توجہ سے پڑھا معلم کو نظم پر مجموعی حیثیت سے کچھ سوالات کرنے چاہئیں۔ یوں تو اس کے پورے سبق میں سوالات کا ایک جال بچھا ہوتا ہے اور طلبہ کو ہوشیار اور متوجہ رکھنے کے لیے ہر چیز خواہ معانی ہوں، یا تشریح۔ انھی سوالات ہی کی مدد سے اخذ کراتا ہے۔ لیکن اس اقدام کا تو خصوصی مقصد ہی یہ ہے کہ پڑھے ہوئے سبق کی تمام باتوں کو دو چار منٹوں میں اس طرح دہرالیا جائے کہ طلبہ کے اذہان پر اس کا ایک مجموعی تاثر ثبت ہو جائے سبق کے مختلف حصوں اور اس کی مختلف کڑیوں میں اگر کچھ فرق رہ گیا ہے تو اس فیصلے کو پاٹ کر ان کو یک جا ں اور مربوط کر دیا جائے۔ اور ساتھ ساتھ طلبہ کے حافظہ قریب کا امتحان کر لیا جائے کہ اعادہ سے کم ہی چیزیں دیر پا اور ذہن نشین ہو جاتی ہیں۔ اعادہ میں نظم کا خلاصہ، کسی خاص شعر کی تشریح، کسی تلمیح کا پس منظر کسی تشبیہ کی وضاحت، کسی واقعہ یا منظر وغیرہ کا حال پوچھا جا سکتا ہے۔

اصولاً جہاں سبق کی تمام منازل پر بحث ختم ہوتی ہے وہاں سارا مضمون بھی ختم ہو جاتا ہے لیکن یہاں یہ بتانا ضروری ہے کہ استاد کو نظم پڑھانے کے بعد بچوں کو شعر یاد کرنے کی ترغیب دینی چاہیے اور انھیں جماعت میں بھی اس کام کے لیے وقت دینا چاہیے۔ انھیں بتایا جائے کہ شعر سے گفتگو میں رنگینی اور تقریر میں زور کیوں کر پیدا ہو جاتا ہے۔ شعر کے استعمال سے خط میں جاذبیت اور تحریر میں حسن نظر آنے لگتا ہے۔ انھیں پوری نظم یا کوئی خاص شعر یاد کرنے پر بھی مجبور نہیں کرنا چاہیے بلکہ اس کام اور اشعار کے انتخاب کو طلبہ کے اپنے اپنے ذوق اور اپنی اپنی اہلیت پر چھوڑ دینا چاہیے شعر سے فطری لگاؤ رکھنے والے بچے سینکڑوں اچھے شعر یاد کر لیتے ہیں، حالاں کہ بعض دوسرے بچے دس بیس شعر بھی مشکل ہی سے یاد کرتے ہیں۔ معلم کا کام رہ نمائی کرنا اور رغبت دلانا ہے نہ کہ جبر و تشدد۔ مدرس کو چاہیے کہ وہ بچوں کے ذوق، ان کی پسند اور ان کے رجحانات کو دبائے نہیں بلکہ ان کا مناسب احترام کرے۔ انھیں اپنے تاثرات بیان کرنے اور اپنے خیالات کے اظہار میں پوری آزادی ہونی چاہیے ؏

تدریس حساب

محمد ابوالفتح

حسابی کی اہمیت روزمرہ کی زندگی میں حساب کو جو اہمیت اور جو مقام حاصل ہے۔ وہ ہر فرد بشر پر روز روشن کی طرح عیاں ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ انسانی زندگی کا کوئی بھی شعبہ اور اس کی کوئی بھی سرگرمی اس کے بغیر سر انجام نہیں پا سکتی۔ اس کا اخلاقِ عامہ کے ساتھ ایک گہرا اور براہ راست رابطہ ہے، اور تمام دنیاوی فسادوں کے ساتھ پورا پورا واسطہ بلکہ ان میں سے نصف سے زائد کی حساب سے ناواقفیت ہوتی ہے۔ مگر افسوس کہ اس محیرالعقول ایجادات کے کہ ان میں سے تمام کی بنا ہی ریاضی پر ہے۔ اس مضمون سے بے توجہی برتی جا رہی ہے۔ اور بعض حضرات تو اسے ہائی کلاسز سے اڑا ہی دینے کے حق میں ہیں اور وہ اکثر یہ کہتے ہیں۔

(۱) حساب کا پڑھنا ہر بچے کے بس کی بات نہیں۔

(۲) عام بچے اس میں کمزور رہتے ہیں اور ان کی اکثریت ان سے متنفر ہوتی ہے۔

(۳) مڈل تک کا پڑھا ہوا حساب زندگی کے عام کاروبار چلانے کے لیے کافی ہے۔ وغیرہ

یہ دلائل کسی حد تک درست ہیں۔ مگر اس مضمون میں کمزوری کے چند خاص وجوہات بھی ہیں جن پر قابو پا لینے کی کوشش کی جائے تو صورتِ حال بہت حد تک بہتر بن سکتی ہے اور بچے اس مضمون میں نہ صرف دلچسپی لینے لگ جاتے ہیں بلکہ اس میں خاصے ہوشیار بھی ہو جاتے ہیں۔

حساب میں کمزوری کے اسباب پر پیشتر ازیں مختلف ماہرین نے بہت کچھ کہا سنا ہے۔ مگر میں اس مقالے میں زیادہ تر صرف ان چند وجوہ پر مختصر سی بحث کروں گا جو میرے تجربے میں بھی آئے ہیں۔

گھریلو تجربہ کمزور طلبا میں سے کوئی ستر فیصد ایسے ہوتے ہیں جنھیں گھر پر حسابی کام یعنی گننے، تولنے ماپنے، سودا سلف خریدنے یا بیچنے، گھریلو حساب کتاب رکھنے وغیرہ کا کوئی موقعہ ہی نہیں ملتا۔ ایسے

یا تو بڑے بڑے امرا، رؤسا اور اعلیٰ افسروں کے گھروں سے آتے ہیں، یا بالکل مفلس، قلاش کنبوں سے
الذکر قسم کے گھروں میں حسابی کام کاج یعنی سودا سلف کی خرید و فروخت وغیرہ نوکر لوگ کرتے ہیں اور
خرالذکر قسم کے گھروں میں زندگی اتنی سادہ اور مختصر ہوتی ہے کہ ان کا حسابی تجربہ از حد محدود اور پست
رہ جاتا ہے۔ مگر یہ بچے ان بچوں سے پھر بھی اچھے ہوتے ہیں جنھیں گھر پر کام کرنے کی کبھی کوئی تکلیف
نہیں دی جاتی اور وہ دس بارہ سال کی عمر تک من، سیر، چھٹانک۔ گز، فٹ، انچ۔ سوا آنہ، پیسے
روپے۔ اڑھائی سو وغیرہ کے تصور اور ان کی قیمت سے ناآشنا رہتے ہیں۔

منصوبی طریقۂ تعلیم، اس خامی کو بہت حد تک دور کر سکتا ہے۔ مگر نصاب کی طوالت، وقت کی قلت
امان کی کمی، وغیرہ، ایسی دقتیں ہیں کہ کوئی بھی استاد، اس طریق کار کو شوق اور جرأت سے اپنانے کو
ار نہیں۔ بہرحال اساتذہ کو اس سے ایک مناسب حد تک ضرور مستفید ہونا چاہیے اور انتظامیہ
ضروری سامان مثلاً ترازو اور باٹ از رتی تا من۔ فیتہ، گھڑی، مختلف سکے وغیرہ ہر حالت میں
یا کرنے چاہئیں۔

اس سلسلے میں، والدین اور اساتذہ، کی انجمنیں بھی بہت مفید کام کر سکتی ہیں۔ اساتذہ کو
لدین کی توجہ اس خامی کی طرف دلا کر تقاضہ کرنا چاہیے کہ وہ بچوں کو گھر پر زیادہ سے زیادہ حسابی کام
لاً گننے، تولنے، ماپنے، سودا سلف لانے، گھریلو حساب کتاب رکھنے اور گھریلو بجٹ بنانے کے
اقع دیں۔

ت کی قلت کوئی زمانہ تھا جب کہ حصہ پرائمری کے نصاب میں صرف تین مضامین یعنی لکھنا
ھنا اور حساب شامل تھے، اور موخرالذکر کو باقی دو مضامین پر فوقیت حاصل تھی اور اس پر
اوقات مدرسہ کا چالیس فی صد وقت صرف کیا جاتا تھا، مگر اب ضروریات زمانہ نے اس حصے کے
اب میں نصف درجن سے زائد نئے مضامین شامل کر دیے ہیں اور وہ یہ ہیں:-

فنون عملی۔ سائنس۔ تاریخ۔ جغرافیہ۔ شہریت۔ دینیات۔ جیومیٹری اور بعض سکولوں میں انگریزی
ا پکنک، ڈراما، گانا، بزم ادب، وغیرہ ایسی کئی سرگرمیاں مستزاد ہیں، یہ سب یقیناً دلچسپ

مگر ان کی ترویج سے حساب کا وقت از حد قلیل رہ گیا ہے۔ چناں چہ لاہور کے ایک بہت بڑے جونیر ماڈل سکول میں اس مضمون پر صرف ۹ پیریڈ (چار گھنٹے ۳ منٹ) فی ہفتہ صرف کیے جاتے ہیں۔ جو کل تدریسی اوقات کا ۱۳ فی صد ہیں اور قدیم زمانے کے وقت سے بقدر ساٹھ فی صد کم ہیں۔

ان حالات کے باوجود اس مضمون کے نصاب میں کوئی خاص کمی نہیں کی گئی، بلکہ بعض حالات میں بچے کی عمر کے مقابلے میں مشکل تر چیزیں شامل کر دی گئی ہیں۔ مثلاً جماعت سوئم میں طولانی پیمانے کے سلسلے میں گز، اور انچ کا استعمال۔ جماعت چہارم میں مکعب۔ مکعب نما، کرہ، بیلن وغیرہ کا تصور اور عاد اعظم۔ ذو اضعاف اقل۔ کسور عام کے سوالات، اسی طرح جماعت پنجم میں مخلوط وحدانی اور چوپیٹر کی سڑکوں کے سوالات اور متوازی خطوط کھینچنا۔ عمود گرانا، مستطیل اور مربع بنانا وغیرہ۔

اندریں حالات اس خاص فنی مضمون کا نصاب صرف اتنا ہونا چاہیے جس پر بچے وقت مقررہ کے اندر بخوبی عبور حاصل کر سکیں۔

عبارتی سوالات، حسابی علامات اور اصطلاحات بچوں کے لیے مجرد سوالات کے مقابلے میں عبارتی سوالات زیادہ الجھنیں پیدا کرتے ہیں اور وہ انھیں باوجود آسان ہونے کے حل کرنے سے قاصر رہتے ہیں۔ مثلاً ایک سکول کی جماعت سوم کو جب یہ سوال دیا گیا کہ ۱۳۵ کو ۸۷ سے ضرب دو تو $\frac{36}{44}$ یعنی ۸۲ فی صد طلبا صحیح حل کر لائے۔ مگر ایک ہفتہ بعد جب اسی دوسرے پیریڈ میں یہ سوال دیا گیا کہ ایک سوداگر نے ایران سے ۱۳۵ قالین منگوائے۔ اگر ایک قالین کی قیمت ۸۷ روپے ہو تو بتاؤ اس نے کل کتنی رقم کے قالین منگوائے؟ تو صرف $\frac{26}{44}$ یعنی ۵۹ فی صد طلبہ درست حل کر سکے البتہ عبارت کی تشریح کر دینے پر ۸ طلبا اور بھی درست حل پیش کر سکے اور اس طرح صحیح جواب نکالنے والوں کی تعداد $\frac{34}{44}$ یا ۷۷ فی صد ہو گئی۔ اصل میں اس سوال میں طلبا مسئلے کو سمجھنے سے قاصر رہے تھے اور وہ سوداگر، ایران، قالین، رقم وغیرہ کے الفاظ کے تصور میں مستغرق رہے تھے۔ غلط حل کرنے والوں میں سے دو طلبا تو یہ بھی نہیں سمجھ سکے تھے کہ ان دو رقوم کا آپس میں تعلق کیا ہے۔ چنانچہ ان میں سے ایک نے تو ان دونوں عددوں کو جمع کیا ہوا تھا، اور دوسرے نے صرف ان دونوں کو پہلو بہلو

لکھ کر، بیکوئی عمل نہیں کیا ہوا تھا۔ البتہ باقی ۸ طلبا کا جواب صرف پہاڑوں میں غیر پختگی کی وجہ سے غلط تھا۔

بے شک مجرد سوالوں کے مقابلے میں عبارتی سوالات کہیں زیادہ ضروری اور مفید ہیں۔ اس لیے اساتذہ کرام کو ابتداء میں ہر عبارتی سوال کو تختہ سیاہ پر لکھ کر پوری عبارت کی توضیح و تشریح کر دینی چاہیے۔ اور ان سے کہیں زیادہ وقت حسابی اصطلاحات و علامات پر صرف کرنا چاہیے۔ اسی طرح ہر نئے قاعدے کے شروع میں کم از کم ۵۰ فی صد سوالات عملی، اتنے ہی زبانی اور باقی تحریری طور پر کرانے چاہئیں۔

چاروں ابتدائی قاعدوں میں خامی ایک محتاط اندازے کے مطابق ثانوی جماعتوں کے طلبا ۵۰ فی صد غلطیاں محض ابتدائی قاعدوں بالخصوص ضرب، تقسیم اور پہاڑوں میں خامی کی وجہ سے کرتے ہیں چنانچہ دسمبر ۱۹۵۸ء کے امتحان میں ایک ممتاز درس گاہ کی جماعت ہفتم کے ۷۵ طلبا میں سے نصف سے زائد نمبر لینے والوں کی تعداد حساب میں صرف ۲۷ تھی اور الجبرا و جیومیٹری میں ۴۸ یا بقدر ۶۴ فی صد کے زیادہ تھی حالاں کہ اول الذکر مضمون وہ کم و بیش سات سال سے پڑھ رہے ہیں۔ مگر موخر الذکر مضمون انھوں نے صرف پچھلے سال چھٹی جماعت سے شروع کیا تھا۔

چاروں ابتدائی قاعدوں میں خامی کی بہت حد تک ذمہ داری ہماری ناقص جماعت بندی پر عائد ہوتی ہے۔ چناں چہ عام مشاہدہ اور تجربہ یہ ہے کہ جماعت دوم و سوم میں سادہ ضرب و سادہ تقسیم کی از حد کم مشق کرائی جاتی ہے اور پہاڑے تو بعض سکولوں میں ۱۰×۱۰ سے زیادہ یاد ہی نہیں کرائے جاتے چناں چہ ہمارے اپنے سکول میں ایسے بچوں کی کمی نہیں جو ۱۱ × ۱۱ کا جواب دو سطری ضرب دینے کے بعد دے سکیں گے۔

اصل میں جماعت دوم و سوم کے سالانہ امتحان میں ایسے طلبا کو بھی رعائتی ترقی دے دی جاتی ہے جو صرف ۳۳ فی صد نمبر حاصل کر لیتے ہیں۔ بالفاظ دیگر تین سوالوں میں سے صرف ایک سوال حل کر لیتے ہیں چاہے وہ صرف جمع یا تفریق کا ہی کیوں نہ ہو۔ اس لیے اساتذہ محض اپنی جماعت کا فی صد نتیجہ زیادہ تعداد میں دکھانے کی خاطر ضرب اور تقسیم کی بجائے جمع اور تفریق پر زیادہ وقت خرچ کرتے ہیں۔

ان حالات میں میرے خیال میں جماعت سوم سے جماعت چہارم میں کسی ایسے طالب علم کو ترقی نہیں ملنی چاہیے جو ۲۰ x ۲۰ تک کے سادہ اور کسری پہاڑے بخوبی طور پر نہ جانتا ہو، اور سادہ ضرب اور سادہ تقسیم کے سوالات صحیح طور پر حل نہ کر سکتا ہو۔

جماعت دوم اور سوم کے امتحانوں میں جمع اور تفریق کے سوالات دیے ضرور جائیں۔ مگر ان کے نمبرات ضرب اور تقسیم کے سوالوں کے نمبروں کے مقابلے میں صرف ایک چوتھائی ہوں۔ نیز ۵۰ فیصد سے کم نمبر حاصل کرنے والوں کو کسی صورت میں ترقی نہ دی جائے۔

تشخیص امتحان | جب کوئی بچہ یا ساری جماعت کسی قاعدے کو اچھی طرح نہ سمجھ رہی ہو تو اس کی وجہ معلوم کرنے کے لیے تشخیصی امتحان لیا جائے۔ ایسے امتحان میں ایک قاعدے کے متعلق وہ تمام کے تمام سوالات تبدریج دیے جائیں جن میں سارے مراحل آجاتے ہوں۔ ایسے امتحانات میں وقت کی کوئی قید نہ ہو، بلکہ تمام پیچیدگیوں، علامتوں اور اصطلاحوں کی پہلے سے ہی تشریح کر دینی چاہیے۔ مقصد نمبر حاصل کردہ کی تعداد معلوم کرنا نہ ہو بلکہ خاص رکاوٹ اور کمزوری کا سبب دریافت کرنا ہو۔

غیر حاضر طلبا | بعض طلبہ غیر حاضری کی وجہ سے کسی خاص قاعدے کو نہیں سیکھ سکتے۔ اور اس طرح وہ اس مضمون میں کمزور ہو جاتے ہیں۔ اساتذہ کو چاہیے کہ جو نہی کوئی بچہ غیر حاضری کے بعد واپس آئے اُسے فوراً چھوڑے ہوئے سوالات سمجھا دیں اور کمی کو کبھی بھی زیادہ دنوں تک باقی نہ رہنے دیں۔ اس غرض کے لیے گروپ مانیٹر کافی مدد دے سکتے ہیں۔

معلم کا رویہ | معلم کا رویہ بچوں کے ساتھ ہمیشہ ہمدردانہ اور مشفقانہ ہو۔ اسے یہ یاد رکھنا چاہیے کہ اگر بچہ مدرس کی ذات سے مطمئن ہے تو وہ اس کے مضمون سے بھی دلچسپی لے گا۔ اور اگر وہ اس سے ناخوش ہے تو اس کے مضمون سے بھی متنفر رہے گا۔

کمزور بچے | کمزور بچے ہر جماعت میں ہوتے ہیں۔ مدرس کا فرض ہے کہ وہ ہر بچے کا انفرادی طور پر مطالعہ کرے اور کمزوری کی خاص وجہ معلوم کر کے اسے رفع کرنے کی کوشش کرے۔ ایسے بچوں کو کبھی کبھی آسان سوال دے کر ان کی حوصلہ افزائی کرنی چاہیے۔

آموزش

شمارہ ۱۱] لاهور

اس شمارہ میں

(پروفیسر سراج الدین ... مطبع ... (عبدالغفور ...

تعلیمی ماہنامہ

آموزش لاہور

فروری سنہ ۱۹۵۹ء

جلد ———— ۱۱

شمارہ ———— ۱۱

سالانہ چندہ

پاکستان کے لیے ۶ روپے

غیر ممالک کے لیے ۸ روپے

قیمت فی پرچہ دس آنے

پبلشرز

یونی ورسٹی بک ایجنسی لاہور

آر۔ ایچ۔ ڈی کی خالد پرنٹر پبلشر نے دین محمدی پریس لاہور میں طبع کرا کے
یونیورسٹی بک ایجنسی ۲ کچہری روڈ لاہور سے شائع کیا

این۔ ای۔ ایف کان فرنس

ایم۔ اے مخدومی

نیو ایجوکیشن فیلوشپ (این۔ ای۔ ایف) استادوں کی ایک عالمگیر تنظیم ہے جس کا مقصد یہ ہے کہ تازہ ترین سائنسی اور نفسیاتی انکشافات کی روشنی میں تدریس و تعلّم کے عمل کو بہتر سے بہتر بنایا جائے۔ ترقی پسند تعلیم کی یہ تحریک پہلی عالمی جنگ کے بعد مغرب میں پیدا ہوئی تھی لیکن پچھلی چند دہائیوں میں اس نے عالمگیر مقبولیت حاصل کر لی ہے اور اس کی شاخیں مہذب دنیا کے کم و بیش ہر حصے میں قائم ہو چکی ہیں۔ مغربی پاکستان میں اس کی شاخ سنٹرل ٹریننگ کالج لاہور میں قائم ہے۔ پچھلے دس گیارہ برس میں اس شاخ نے نئے تعلیمی نظریوں اور جدید تدریسی طریقوں کی نشر و اشاعت کے لیے کئی تعلیمی اجتماعوں کا اہتمام کیا ہے۔ اس سال اس قسم کا ایک بے حد اہم اجتماع ۲ سے ۴ فروری تک سنٹرل ٹریننگ کالج لاہور میں منعقد ہوا اور اس کے مباحث میں ملک کے مشہور ماہرین تعلیم اور صاحب الرائے عالموں نے حصہ لیا۔

کان فرنس کا پہلا اجلاس ۲ فروری کو بعد دوپہر ہوا۔ اس کی صدارت گورنر مغربی پاکستان نے کی۔ این ای۔ ایف۔ مغربی پاکستان کے صدر، ایم اے۔ مخدومی نے اپنے استقبالیہ خطبے میں اس نکتے پر زور دیا کہ نظامِ تعلیم میں انقلاب پیدا کرنے کے لیے استاد کے نقطۂ نگاہ میں انقلاب پیدا کرنا چاہیے۔ اب تک نصابِ تعلیم ہی توجہ کا مرکز بنا رہا۔ مگر مقررہ نصاب کو اچھے طریق پر پڑھانے کی طرف کوئی توجہ نہیں دی گئی حالاں کہ این ای ایف کی تحریک فرسودہ طریقہ ہائے تدریس کی اصلاح کے لیے ہی وجود میں آئی تھی۔ ابھی ہمیں یہ سبق سیکھنا ہے کہ سائنسی طریقہ ہائے تدریس موجودہ نصاب سے بھی اچھا خاصا کام لے سکتے ہیں۔ امتحانی ضرورتوں کی آڑ میں اساتذہ، انتظامی افسر، والدین اور عوام سبھی نام نہاد "زود اثر" طریقہ ہائے تدریس کو قبول کرنے لگے ہیں۔ اس صورتِ حال کو بدلنا تعلیم کی اصلاح کی طرف پہلا قدم ہے۔ ہم استاد این۔ ای۔ ایف کے اصولوں پر یقین

سکتے ہیں۔ انھیں چاہیے کہ ان اصولوں کی عملی افادیت اچھی طرح ثابت کریں تاکہ اساتذہ ، والدین انتظامی حکا اور عوام سب کو یقین ہو جائے کہ جدید طریقہ ہائے تدریس اچھے امتحانی نتائج کے بھی ضامن ہیں۔ غرض نظام تعلیم کی اصل روح استاد ہے۔ تعلیم کا رُخ بدلنے کے لیے استاد کے زاویہ نگاہ اور اس کے اسلوب کار میں تبدیل پیدا کرنی چاہیئے۔ گورنر مغربی پاکستان نے اپنے افتتاحی خطبے میں مسٹر ایم ۔ اے مخدومی کے ان خیالات کی پوری تائید کی۔ انھوں نے استادوں سے اپیل کی کہ وہ جدید تعلیمی نظریوں سے عملی رہنمائی حاصل کریں اور ا تعلیمی مسائل کے ایسے حل تلاش کریں جو جدید دور کی ضرورتوں اور ملکی وسائل دونوں کے ساتھ پورا انصاف ک ہوں۔ گورنر مغربی پاکستان کے بعد بین الاقوامی تعاون کے امریکی ادارے کے تعلیمی مشیر ڈاکٹر گراہم نے تقریر انھوں نے اس نکتے پر زور دیا کہ آج دنیا کے سامنے سب سے اہم سوال انسانی آزادی برقرار رکھنے کا سوال اس سوال کو تسلی بخش طور پر حل کرنے کی صورت یہی ہے کہ بچوں اور نوجوانوں کو اپنے طور پر سوچنے قابل بنایا جائے۔ یہ غایت جدید تعلیمی طریقے اختیار کرنے سے ہی حاصل ہو سکتی ہے ۔

۳ رفروری کو کانفرنس کے دو اجلاس ہوئے۔ صبح کے اجلاس میں "تخلیقی تعلیم" بحث کا موضو تھا۔ اس اجلاس کی صدارت پروفیسر سراج الدین ڈائرکٹر تعلیمات مغربی پاکستان نے کی۔ بعد دوپہر اجلاس کی صدارت ڈاکٹر محمد جہانگیر ڈائرکٹر تعلیم لاہور ریجن نے کی۔ اس اجلاس میں "ذہنی صحت" موضوع پر مقالے پڑھے گئے ۴ فروری کی صبح کو کانفرنس کا چوتھا اور آخری اجلاس ہوا جس کی صد مسٹر ایل کرامت وائس چانسلر پنجاب یونیورسٹی نے کی۔ اس اجلاس میں "ترقی پسند تعلیم اور ضبط" موضوع پر تقریریں ہوئیں۔ کانفرنس کے موقع پر ایک عظیم الشان تعلیمی نمائش کا اہتمام کیا گیا تھا۔ مسٹر لو نے انعامات حاصل کرنے والوں میں انعامات تقسیم کیے ۔

کانفرنس میں جو مقالے پڑھے گئے اور ان پر جو مفید بحثیں ہوئیں ان سب کو یکجا کر کے ش کر دینے کی تجویز ہے۔ تاکہ ان مذاکرات سے وہ استاد بھی فائدہ اٹھا سکیں۔ جو کانفرنس میں شرکت کر سکے ۔

رسے کا ضبط

ل احمد

بط کی ضرورت

تعلیم کی نہائی غایت بچوں اور نوجوانوں کو ان کے ماحول پہ روز افزوں قدرت عطا کرنا ہے کہ وہ ایک
مرت اور بھرپور زندگی گذار سکیں۔ یہ غایت بچوں اور نوجوانوں کو ان کے اپنے حال پہ چھوڑنے سے حاصل
ں ہوسکتی۔ روسو اور اس کے بعد کے ماہرین تعلیم نے بچے کی آزادی پہ بڑا زور دیا ہے۔ اس سے بعض لوگوں
اشتباہ گذرا ہے کہ آزادی سے مراد بچے کو ہر قسم کی پابندی سے آزاد چھوڑ دینا ہے۔ لیکن تعلیمی تحقیق اس
بال کی تائید نہیں کرتی۔ مانٹسوری اور جدید دور کے دوسرے تعلیمی مفکروں نے اس غلط فہمی کا ازالہ کرتے
ے کہا ہے کہ بچے کی آزادی سے مراد یہ ہرگز نہیں کہ بالغ لوگ اپنی نکیل بچوں کے ہاتھ میں دیدیں اور
جس طرح چاہیں انھیں نچاتے پھریں۔ بعض حد سے بڑھے ہوئے ترقی پسند مدرسوں نے اس قسم کی بدلگام
زادی کا تجربہ کرکے دیکھا ہے۔ مگر نتائج نہایت تباہ کن نکلے ہیں۔ جو بچے ہر پابندی سے بے نیاز رہ کر پلیں
ہ زندگی کے ساتھ ہرگز نباہ نہیں کر سکتے۔ کیوں کہ زندگی میں قدم قدم پہ معاشرتی رکھ رکھاؤ کا لحاظ رکھنا پڑتا
ہے۔ جو شخص مقررہ معاشرتی آداب کی پرواہ نہ کرے معاشرہ اسے سختی سے ٹھکرا دیتا ہے۔ لہٰذا تعلیم کی یہ ایک واضح
ہ داری ہے کہ نئی پود کو اپنے اوپر وہ پابندیاں عائد کرنا سکھائے جن کی اس سے توقع کی جائے گی۔ اگر تعلیم
س معاملے میں غفلت برتے تو اس کی پیداوار وقتی ترنگ کی غلام بن کر رہ جائے گی اور وہ کسی بلند مقصد
یلیے اپنے آپ پر کوئی پابندی لگانے کے قابل نہ رہے گی۔

تعلیم ایک فن ہے۔ ہر فن کا امتیازی نشان کسی واضح مقصد کی متابعت ہوتی ہے۔ فن اس عمل کا
م ہے جس میں حالات کا رخ جان بوجھ کر اس طرح بدلا جائے کہ پیدا ہونے والے نتائج ان نتائج
ے مختلف ہوں جو اس مداخلت کے بغیر پیدا ہوتے۔ لہٰذا تعلیم اور مداخلت دو لازم ملزوم چیزیں
ں۔ بچوں کو ان کے حال پہ چھوڑ دینے سے تعلیم کا عمل ممکن نہیں رہتا۔ یہ خیال سراسر غلط ہے کہ اگر بچوں کو

بچے کو فطرت کی گود میں پلنے دیا جائے تو ان کی فطری صلاحیتیں بہترین نشوونما حاصل کریں گی۔ کو
بیس سال گذرے وسط ہند کے جنگلی علاقے میں دو لڑکیاں ایک بھیڑیے کی غار سے ملیں۔ ان میں سے ا
عمر نو سال تھی اور دوسری کی دو سال۔ یہ لڑکیاں ہر قسم کی انسانی مداخلت سے دور فطرت کی گود میں پل
تھیں۔ مگر جب انھیں انسانی معاشرے میں لایا گیا تو وہ ہر انسانی صلاحیت سے عاری پائی گئیں۔ و
چوپاؤں کی طرح ہاتھوں اور پاؤں پر چلتی تھیں۔ ان کے لیے دو پاؤں پر چلنا بلکہ کچھ دیر تک کھڑے ر
محال تھا۔ وہ بھیڑیے کی سی آواز کے علاوہ کوئی اور آواز نہ نکال سکتی تھیں۔ ان کے لیے انسانی غذا او
انسانی ماحول سبب تکلیف دہ تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ چھوٹی لڑکی کچھ مہینوں کے بعد مر گئی۔ بڑی لڑکی چند
سال زندہ رہی۔ اس اثنا میں اس میں صرف اتنی صلاحیت پیدا ہوئی کہ کھانے کے نام پر متوجہ ہونے
اور چند ٹوٹے پھوٹے الفاظ منہ سے نکالنے لگی۔

انسان نے یہ نکتہ دورِ وحشت میں ہی سمجھ لیا تھا کہ بچوں کو ان کے حال پر چھوڑنے کا مطلب
انھیں زندگی میں ناکارہ بنانا ہے۔ کیوں کہ وحشی سے وحشی معاشرے میں زندگی گذارنے کے لیے
تھوڑی بہت تربیت حاصل کرنا ضروری تھا۔ تعلیم و تربیت خواہ وہ ادنیٰ سے ادنیٰ قسم کی ہو، متعلم کی نشو
میں مداخلت کا مطالبہ کرتی ہے۔ وہ اس بات کا مطالبہ کرتی ہے کہ اس کی نشوونما کو ایسی سمت میں لگایا جائے
کہ وہ پسندیدہ طور طریقے، معلومات اور مہارتیں اخذ کر لے۔ دوسرے لفظوں میں تعلیم اور ضبط کے درمیا
چولی دامن کا ساتھ ہے۔ ہر مدرسے میں کسی نہ کسی قسم کا ضبط موجود ہونا ضروری ہے۔ اس کے بغیر مدرسہ ا
کام انجام نہیں دے سکتا۔ مدرسہ روایت پرست ہو یا ترقی پسند اس کے لیے نظم و ضبط کا اہتمام کرنا ضروری
نظم و ضبط کی نوعیت میں فرق ہو سکتا ہے، اس کی ضرورت سے انکار محال ہے

ضبط کی نوعیت

ضبط سے مراد اپنے اوپر جان بوجھ کر کوئی پابندی عاید کرنا ہے۔ تاکہ فوری طور پر حاصل ہونے
مسرت کے بدلے مستقبل میں زیادہ پائدار مسرت یا اطمینان حاصل ہو۔ فطرت نے انسان کو طرح طرح
اعلیٰ سے اعلیٰ صلاحیتیں عطا کی ہیں۔ یہ صلاحیتیں بروئے کار آنے کے لیے بے قرار رہتی ہیں، بچوں

بے قراری انتہائی درجہ کو پہنچی ہوتی ہے۔ ہر وقتی ترنگ بچے کی فطری صلاحیتوں کو حرکت میں لے آتی ہے مگر فطری صلاحیتوں سے بلند کام لینے کے لیے ضروری ہے کہ انھیں وقتی ترنگ کے تابع نہیں بلکہ پاسبان عقل کے تابع لایا جائے۔ ایسا کرنے سے نہ صرف خداداد صلاحیتیں پختگی حاصل کرتی ہیں بلکہ انسان کو اپنی بلندی کا احساس بھی ہونے لگتا ہے۔ اسے اس خیال سے دلی راحت حاصل ہوتی ہے کہ وہ ہر وقتی ترنگ کا غلام نہیں بلکہ اس کا آقا ہے۔ بلندی اور خود اعتمادی کا یہ احساس اسے اس قابل بنا دیتا ہے کہ وہ فطری طاقتوں کے راز معلوم کرنے اور انھیں مسخر کرنے کے در پے ہو جائے۔ اگر وہ وقتی ترنگوں کا غلام بنا رہے تو وہ کسی عظیم الشان کام کے متعلق سوچ بھی نہیں سکتا۔ اسے اس بلند مقصد کی مطلق خبر نہیں ہو سکتی جس کے لیے اسے پیدا کیا گیا ہے۔ غرض ضبط انسانی معراج تک پہنچنے کا زینہ ہے۔ یہی وہ واحد راستہ ہے جو انسان کو شرف انسانی کی راہ پر ڈال سکتا ہے۔

ضبط کی نوعیت پر بحث کرتے وقت یہ نکتہ اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے کہ انسان جس ماحول پر قدرت حاصل کرنا چاہتا ہے وہ دو عناصر پر مشتمل ہے۔ ان میں سے پہلا عنصر طبعی ہے اور دوسرا معاشرتی۔ طبعی ماحول کے تقاضے اس قدر ناہر نوعیت کے ہیں کہ ان کے ساتھ ہم آہنگی حاصل کیے بغیر چارہ نہیں۔ مثلاً آگ اپنا خاصہ جلا دینا ہے۔ اگر بچہ اس کی ظاہری چمک سے متاثر ہو کر اسے پکڑنے کی کوشش کرتا ہے تو اپنا ہاتھ جلا بیٹھتا ہے۔ اس کے بعد وہ آگ سے دور رہنے میں ہی سلامتی محسوس کرے گا۔ طبعی ماحول کے یہ قہرمانی تقاضے اپنا کام خود کر لیتے ہیں۔ وہ مدرسے کے لیے کوئی مشکل سوال پیدا نہیں کرتے۔ مدرسے کو زیادہ سے زیادہ یہ کرنا پڑتا ہے کہ ان تقاضوں کی نشان دہی کر دے۔ طبعی ماحول کے قہرمانی سلسلے اپنا تعلیمی کام خود انجام دے لیتے ہیں۔

معاشرتی ماحول کی نوعیت طبعی ماحول سے بہت مختلف ہے۔ دور وحشت میں انسان کا ماحول تقریباً تمام تر طبعی عناصر سے عبارت تھا۔ انسانی ضرورتیں بے حد محدود اور انسانی زندگی از حد سادہ تھی۔ انسان اپنی ضرورت کی تمام چیزیں فطرت کے دامن سے ہی حاصل کر لیتا تھا۔ وہ دوسرے انسانوں سے الگ تھلگ اپنی ضرورتیں خود پوری کر لیتا تھا۔ لیکن جونہی انسان نے تہذیب کی طرف پہلا قدم اٹھایا اس نے محسوس کیا کہ

فطرت کی عنایات پر مکمل بھروسہ نہیں کیا جا سکتا۔ اس کا دامن اگر بعض اوقات ابلتی ہوئی فراوانی سے بھرپور نظر آتا ہے تو بعض اوقات یہ دامن بالکل خالی بھی ہو جاتا ہے۔ اس بے یقینی سے نجات پانے کے لیے انسان نے نظامِ فطرت میں ردوبدل شروع کیا۔ اس نے جنگلی جانوروں کو فوراً ذبح کر کے کھا لینے کی بجائے انھیں پالنا شروع کیا۔ اس نے جنگل سے خوشے جمع کرنے کی بجائے اناج کی کاشت شروع کی۔ ان نئی ضرورتوں نے اسے ایک جگہ جم کر رہنے پر مجبور کیا۔ وہ بہتی ہوئی ندی میں سے پانی کا ایک دھارا کاٹ کر اپنی جھونپڑی تک لے آیا، تاکہ وہ اور اس کے مویشی پانی پیئیں اور اس کی فصل سیراب ہو۔ طبعی ماحول میں اس ادل بدل کے ساتھ ہی معاشرتی ماحول کی داغ بیل پڑ گئی۔ طبعی ماحول میں ردوبدل ممکن ہی اس وقت ہوا جب چند انسانوں نے باہم مل کر اجتماعی زندگی کی طرح ڈالی۔ اس وقت سے لے کر آج تک انسان لگاتار طبعی ماحول میں ردوبدل کرنے لگا ہے، اس نے دریاؤں کے راستے بدل دیے ہیں۔ صحراؤں اور برفانی ویرانوں کو لہلہاتی کھیتیوں میں تبدیل کر دیا ہے۔ سمندروں اور پہاڑوں کو خدمت بجا لانے پر مجبور کر دیا ہے۔ یہ تمام کارنامے انسانی تہذیب کے کرشمے ہیں۔ لیکن انسان نے تہذیب کی راہ پر جو قدم بھی اٹھایا ہے وہ اسے طبعی ماحول سے ایک قدم دور لے گیا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ جدید انسان کا ماحول تقریباً تمام تر معاشرتی عناصر سے عبارت ہے۔ وہ جس ماحول میں زندگی گزارتا ہے اس کی تقریباً ہر شے انسانی دماغ کی پیداوار ہے۔ آگ یا ایک آدھ اور چیز کو چھوڑ کر جدید معاشرے میں پیدا ہونے والے بچے کو جن چیزوں سے سابقہ پڑتا ہے وہ تمام کی تمام انسانی اختراع کی پیداوار ہیں۔

اس صورتِ حال کا نتیجہ یہ ہے کہ جدید انسان کو ایک بے حد پیچیدہ معاشرتی ماحول سے واسطہ پڑتا ہے۔ اس ماحول کا اہم خاصہ یہ ہے کہ اس کے تقاضے طبعی ماحول کی سی قہرمانی قوت نہیں رکھتے۔ طبعی ماحول کی مزاحمت جس ناہموار انداز سے انسان کو اپنی معقولیت کا قائل کر لیتی ہیں۔ معاشرتی ماحول اس سے عاری ہے۔ بیشک ہر معاشرے نے اپنے افراد کے لیے کئی طور طریقے مقرر کر رکھے ہیں جن کے سامنے سر جھکائے بغیر معاشرتی ہم آہنگی حاصل نہیں ہوتی۔ معاشرہ ایسے افراد کو قبول کرنے سے انکار کر دیتا ہے جو اس کے مقررہ ادب آداب کی تکذیب کریں لیکن یہ ادب آداب اپنی پشت پر معقولیت کی کوئی سند نہیں رکھتے۔ جس طرح آگ سے دور رہنے کی ضرورت

وسطے بڑے ہر ایک کو فوراً قائل کر لیتی ہیں۔ اس طرح معاشرتی طور طریقوں کے جواز میں کوئی ناقابل انکار سند بوہ نہیں۔ وجہ یہ کہ یہ طور طریقے انسان کے اپنے بنائے ہوئے ہیں۔ انھیں فطری قوانین کا درجہ حاصل نہیں سا طور پر فطری قوانین اپنی سطالیعت خود کرا لیتے ہیں۔ اس طرح معاشرتی آداب اپنے آپ کو انسانوں پر لاگو نہیں کر سکتے۔

مہذب زندگی کی یہ نوعیت تعلیم کے لیے ضبط کا مشکل مسئلہ پیدا کرتی ہے۔ مہذب زندگی کا سارا ماحول شرتی عناصر پر مشتمل ہوتا ہے جس کے پیچھے طبعی ماحول کی سی ٹھہراتی معقولیت موجود نہیں ہوتی۔ اس ماحول کی بت انسان کے بنائے ہوئے قواعد و ضوابط سے زیادہ نہیں ہوتی۔ یہ قواعد و ضوابط اس بات کا مطالبہ تے ہیں کہ فلاں فلاں کام کرنے چاہئیں اور فلاں فلاں کام سے احتراز کرنا چاہیے۔ مگر نئی پود کو ان قواعد و ضوابط ا کوئی ناگزیر معقولیت نظر نہیں آتی۔ تاہم نئی پود کو معاشرتی قواعد و ضوابط کا خوگر بنانا ایک واضح معاشرتی رت ہے۔ اس کے بغیر معاشرے کی انفرادیت اور اس کی سالمیت باقی نہیں رہ سکتی۔ لہٰذا بچوں، نوجوانوں کو معاشرتی طور طریقوں کا عادی بنانا ہر زمانے میں تعلیم کی ایک اہم ذمہ داری تسلیم کی گئی ہے۔ ہ اپنا یہ فرض ضبط و نظم کے ذریعے حاصل کرتا ہے۔ وہ طالب علموں پر ایسی پابندیاں لگاتا ہے جو بالآخر بن مطلوبہ ادب آداب کا خوگر بنا دیتی ہے۔

لف نظریے

ضبط و نظم کی ضرورت گو ہر زمانے میں تسلیم کی گئی ہے۔ مگر اس کی نوعیت کے متعلق ف نظریے کارفرما رہے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ضبط کا مفہوم ہر معاشرے میں وہی لیا جاتا ہے جو مفہوم معاشرے کے نزدیک زندگی کا ہو۔ زندگی کے نہائی مقصد کے متعلق انسانی فکر نے تدریجی ترقی کی جو منزلیں ہیں وہ ضبط کے تصور میں پورے طور پر منعکس نظر آتی ہیں۔ اس بات کا فطرتی نتیجہ یہ ہے کہ ضبط کے نظریے اپنے وقت کے مذہبی عقاید کی صدائے بازگشت معلوم دیتے ہیں۔ اس لحاظ سے دنیا بط کے متعدد نظریوں کو فروغ ملنا ناگزیر تھا۔ ان تمام نظریوں پر نگاہ ڈالنے کے لیے نہ یہاں گنجائش رنہ اس کی ضرورت۔ تاہم ان میں سے زیادہ مشہور نظریوں پر مختصر سی نظر ڈالنا دلچسپی سے خالی

ذہن ہو گا۔ غضب کے یہ مختلف نظریے تاریخی زمانے سے تعلق رکھتے ہیں۔

(۱) کلیتے کا نظریہ :۔ غضب کے متعلق غالباً سب سے پرانا نظریہ یہ تھا کہ زیردستوں کو بالادستوں کی خوشنودی مزاج کا ہر لحظہ خیال رکھنا چاہیے۔ اس معاملے میں ذراسی بھول چوک بھی ناقابلِ معافی تھی۔ غضب کا یہ نظریہ مذہب کے اس وحشیانہ تصوّر پر مبنی تھا جو بالاتر ہستی کو ایک بے حد خود پسند طاقت کے روپ میں پیش کرتا تھا۔ اس عقیدے کے مطابق بالاتر ہستی کسی ضابطے کی پابند نہ تھی۔ وہ جو جی میں آتا کر گزرتی۔ انسان کی سلامتی اس میں تھی کہ وہ اس کے تیوروں پر لگاتار نگاہ رکھے اور ناراضگی کے چھوٹے سے چھوٹے اظہار پر اسے راضی کرنے کے لیے ہر امکانی کوشش کرے۔ بصورتِ دیگر بالاتر ہستی کی خفگی انتہائی شدت اختیار کر کے خفا کرنے والوں کو ناگفتنی سزائیں دے سکتی تھی۔ غضب کا یہ نظریہ پرانے زمانے کے اخلاق پر پوری طرح چھایا ہوا نظر آتا ہے۔ چنگیز اور ہلاکو مفتوح قوموں کے سروں کے پہاڑ بناتے رہتے ہیں۔ ہارے ہوئے دشمن کی جیتے جی چمڑی ادھڑوا نا۔ اس کی آنکھیں نکلوا دینا۔ زبان، ناک کان کٹوا دینا۔ اسے زندہ جلوا دینا۔ زندہ دیوار میں چنوا دینا۔ یہ اور اس قسم کی دوسری وحشیانہ سزائیں زمانوں بلکہ قرونِ وسطیٰ میں بھی دی جاتی تھیں۔ پسماندہ معاشروں میں ناک، کان وغیرہ کاٹنے کی رسم اب تک بھی نا پید نہیں۔ ان سزاؤں کے پیچھے یہ عقیدہ کارفرما ہے کہ جب بالاتر ہستی سزا دینے میں معقولیت کی راہ کیوں اختیار کریں ؛ قرونِ وسطیٰ میں بادشاہوں کے حقِ آسمانی کا مسئلہ بھی اسی عقیدے کی پیداوار تھا۔ چناں چہ سعدی جیسے معلمِ اخلاق کے لیے بادشاہوں کے ساتھ معاملہ کو یہ انتباہ کرنا ضروری نظر آیا کہ "گاہ بسلامے برنجند وگاہ بدشنامے خلعتے دہند" یعنی بادشاہوں کا یہ عالم ہے کہ کبھی سلام کرنے پر ناراض ہو جاتے ہیں اور کبھی گالی دینے پر خلعت بخش دیتے ہیں۔

غضب کا یہ کینہ پرور، خود پسند نظریہ گو مہذب دنیا سے رخصت ہو چکا ہے۔ تاہم پسماندہ اس کے علمبرداروں کی آج بھی کمی نہیں۔ جو لوگ مذہب کو بھول بھلیوں کی شکل دے کر عوام کو بے دکھنا چاہتے ہیں۔ ان کی جائے پناہ یہی نظریہ ہے۔ تاہم یہ نظریہ معاشرتی زندگی کے لیے کو بنیادیں مہیا نہیں کرتا۔ مہذب انسان اس نظریے کو صدیوں پیچھے چھوڑ آیا ہے۔ لہٰذا

ضبط کے اس نظریے کا عمل دخل کسی صورت میں بھی قابلِ قبول نہیں۔

(۲) نظریہ انتقام:۔ ضبط کے کینہ دوز نظریے سے آگے بڑھ کر انسانی فکر انتقام کے نظریے پر پہنچا۔ اس نظریے کی کلاسیکی مثال موسوی قانون ہے جس کی رو سے "آنکھ کے بدلے آنکھ اور دانت کے بدلے دانت" کی سزا مقرر ہے۔ ضبط کا یہ نظریہ بالاتر ہستی کو ایک خود پسند غیر ذمہ دار حکمران کی شکل نہیں دیتا۔ بلکہ اسے حق پسند اور انصاف پرست ظاہر کرتا ہے۔ اس ضابطے کی رو سے خدا کے لیے بھی ضروری ہے کہ ایک مقررہ ضابطے کی پابندی کرے۔ لہٰذا اس کے پرستاروں پر بھی مقررہ قوانین کی پابندی لازم آتی ہے۔

ضبط کے انتقامی نظریے نے مہذب انسان کے فکر کو شدید طور پر متاثر کیا ہے۔ آج تک ہر مہذب ملک کے ضابطہ تعزیرات میں اس کی کارفرمائی واضح طور پر نظر آتی ہے۔ مدرسے نے صدیوں تک اپنا نظم و ضبط اس نظریے پر مبنی رکھا ہے۔ جدید تعلیمی فکر انتقامی نظریے کا چنداں قائل نہیں۔ اس کے باوجود اس بات کا کوئی امکان نہیں کہ مستقبل قریب میں انتقامی نظریہ مدرسے سے کلی طور پر خارج ہو جائے کیوں کہ اگر ہر قسم کی سزا بالکل ختم کر دی جائے اور مقابلے کے جذبے کو ترقی دینے کے لیے صرف انعامات سے کام لیا جائے تو بھی انتقامی نظریے کی حکومت باقی رہتی ہے۔ مزید براں نظامِ فطرت میں انتقام کا اصول اس طرح جاری و ساری ہے کہ اسے نظر انداز کرنا ممکن نہیں۔ فطرت کے قانون ذرا سی بھول چوک کا انتقام بھی فوراً لیتے ہیں۔ مثلاً صحت ہی کو لیجیے۔ اس کے متعلق ذرا سی غفلت بھی نظر انداز نہیں کی جاتی۔ لہٰذا جو لوگ ضبط کے معاملے میں نظامِ فطرت کو نمونہ بنانا چاہتے ہیں۔ انھیں یہاں ایک مثال بھی ایسی نظر نہیں آتی جہاں کسی عمل کا ردِ عمل پیدا نہ ہوتا ہو۔ اس صورتِ حال کو دیکھتے ہوئے یہ کہنا غلط نہیں کہ مدرسے کے نظم و ضبط میں انتقامی نظریے کی کچھ نہ کچھ جھلک ہمیشہ باقی رہے گی اور غالباً رہنی چاہیے۔ تاہم انتقام سے مراد یہ نہ لینی چاہیے کہ ضابطہ تعزیرات کی مختلف دفعوں کو آنکھیں بند کیے نافذ کر دیا جائے۔ سزا یا انتقام کی کمیت اور کیفیت دونوں کا انحصار محض جرم کی نوعیت پر نہیں بلکہ مجرم کے حالات پر بھی ہونا چاہیے۔ اگر دو شخص ایک ہی جرم کا ارتکاب کرتے ہیں تو ایک کے لیے محض چند سخت الفاظ کافی ہو سکتے ہیں

اور دوسرے کے لیے شاید خاصی شدید سزا بھی کافی نہ ہو۔ غرض ضبط کے معاملے میں انتقامی نظریے کا عمل دخل اس حد تک قابلِ قبول نہیں ہو سکتا جس حد تک وہ نظامِ فطرت میں کارفرما نظر آتا ہے۔

(۳) **تخویف کا نظریہ:** - یہ نظریہ انتقامی نظریے کی ضد نہیں لیکن یہ اس سے بعد کی پیداوار ہے۔ اس نظریے کا خلاصہ یہ ہے کہ غیر سماجی فعل کی سزا اس طور پر دی جائے کہ جرم کرنے والا شخص دوبارہ اس فعل کو نہ دہرائے۔ نیز یہ کہ سماج کے دوسرے افراد سزا پانے والے کو دیکھ کر عبرت پکڑیں۔ ضبط کا یہ نظریہ سماج کی بہبود کو اولیت دیتا ہے۔ اس کے پیشِ نظر اولین مقصد معاشرتی سالمیت ہے۔ فرد کی اصلاح اس کی ضمنی پیداوار ہے۔

تخویف کا نظریہ سزا کے برسرِ عام دیے جانے کا حامی ہے۔ قرونِ وسطیٰ میں مشرق و مغرب دونوں میں قاتلوں اور اس قسم کے دوسرے مجرموں کو چوراہوں میں پھانسی پر لٹکا دیا جاتا تھا۔ دوسرے مجرموں کو منظرِ عام پر کوڑے لگائے جاتے تھے۔ ایسے مواقع پر دوسرے شہری یہ تماشہ دیکھنے کے لیے جمع ہو جاتے تھے۔ انگلستان کے چوراہوں میں جب مجرموں کو پھانسی پر لٹکایا جاتا تو ستھرے گھرانوں کی عورتیں اس تماشے سے لطف اندوز ہونے کے لیے جمع ہو جاتیں۔ اسی طرح فرانس کے دورِ دہشت میں جب سر کاٹنے کی مشین دن رات کام میں لگی تھی، اچھے گھرانوں کی عورتیں سینے پرونے کا کام لے کر اس مشین کے گرد آ بیٹھتیں اور اس بھیانک منظر سے لطف اٹھاتیں۔ مدرسوں میں تخویف کے نظریے کی کارفرمائی حال ہی تک جاری رہی۔ زیادہ سنگین جرائم کی سزا سارے مدرسے کے سامنے دی جاتی۔ تاکہ دوسروں کو عبرت ہو۔ کمرہ جماعت میں استاد قصوروار طلبہ کو علیحدگی میں سخت سست کہنے کی بجائے انھیں ساری جماعت کے سامنے سزا دیتا، تاکہ نہ صرف قصوروار طالب علم کو درد کا احساس ہو بلکہ اس کے ساتھی بھی عبرت پکڑیں۔

تخویف کا یہ نظریہ ڈر کے جذبے کو موزوں طرزِ عمل کا محرک بنانا چاہتا ہے۔ نفسیاتی طور پر یہ حقیقت ثابت شدہ ہے کہ تشکیلِ کردار کے لیے ڈر کوئی بلند محرک نہیں۔ یہ منفی قسم کا محرک ہے۔ ڈر سے مراد یہ ہے کہ کسی کام کے تکلیف دہ نتائج سے خوف زدہ ہو کر اس فعل سے احتراز کیا جائے یا کسی کام کے نہ کرنے کی سزا سے ڈر کر وہ کام کیا جائے۔ اگر خوف مستقل طور پر موجود رہے تو بار بار کا عمل انسان کو مطلوبہ طرزِ عمل کا عادی بنا سکتا ہے۔ لیکن اگر ڈر کی بجائے شوق کو محرک بنایا جائے تو نتائج زیادہ پسندیدہ قسم کے حاصل

ہوتے ہیں۔ لیکن اس نفسیاتی حقیقت کے باوجود یہ بات اپنی جگہ بجا ہے کہ انسان فطرت کے اکثر قوانین پاس لیے عمل کرتا ہے کہ ایسا نہ کرنے سے سخت تکلیف اٹھانے کا ڈر سر پر منڈلاتا رہتا ہے۔ مثلاً حفظانِ صحت کے اصولوں کا احترام بہرصورت اچھی چیز ہے۔ لہٰذا اس بات کا بظاہر کوئی امکان نہیں کہ مدرسہ ڈر کو بطور ایک محرک کے استعمال کرنا کلی طور پر چھوڑ سکے گا۔ ایسے بالغوں کی کمی نہیں جو مذہبی عبادات کی پابندی محض دوزخ کے ڈر سے کرتے ہیں۔ لہٰذا مدرسے کے طلبہ کا ڈر کے محرک سے متاثر ہونا بالکل قدرتی ہے۔ اس محرک سے حتی الامکان تھوڑی ہی خدمت لینی چاہیے۔ لیکن اس کا خاتمہ غالباً ممکن نہیں۔

(۴) اصلاح کا نظریہ :- تخویف کے نظریے سے اگلا قدم اصلاح کے نظریے تک جا پہنچا یہ نظریہ ڈر کو مطلوبہ طرز عمل پیدا کرنے کی کافی ضمانت خیال نہیں کرتا۔ اس کا کہنا یہ ہے کہ جب ڈر اٹھ جاتا ہے یا انسان ممنوعہ فعل کے تکلیف دہ نتائج سے بچنے کی کوئی راہ ڈھونڈ لیتا ہے تو وہ کردار کے ان معیاروں کو اٹھا پھینکتا ہے جو ڈر نے اس پر مسلط کر رکھے تھے۔ قیام پاکستان کے فوراً بعد جب لاکھوں انسان اپنے گھر بار چھوڑ کر ایک نئے ماحول اور ناواقف پڑوسیوں میں آ بسنے پر مجبور ہوئے تو صاحبِ نظر لوگوں کو یہ دیکھ کر بڑا دکھ ہوا کہ اخلاق و کردار کے وہ معیار یک دم گر گئے جو صدیوں سے لوگوں کے طرز عمل کو قابو میں رکھے ہوئے تھے۔ افراتفری کے اس دور میں بہت سے لوگ اپنے کردار کو کسی معیار کے تحت رکھنے کے قابل نہ رہے کیوں کہ رائے عامہ کا وہ خوف یکدم اٹھ گیا تھا جو مدتوں سے انھیں مقررہ حدود کے اندر رکھے ہوئے تھا۔ کم و بیش یہی کیفیت دنیا کے ان ملکوں میں دیکھنے میں آئی۔ جہاں جنگ کی تباہ کاریوں نے معاشرتی زندگی کا تانا بانا منتشر کر دیا تھا۔

اصلاح کا یہ نظریہ اس بات پر زور دیتا ہے کہ کردار کو مطلوبہ شکل دینے کے لیے ڈر کی بجائے شوق اور پسند سے کام لینا چاہیے۔ پسندیدہ طرز عمل کو اس رنگ میں پیش کرنا چاہیے کہ وہ معقولیت کی بہترین راہ نظر آئے۔ انسانی طرز عمل میں جو تبدیلی دلیل و براہین کی بنا پر پیدا ہوگی وہ پائدار ثابت ہوگی افراد کی تربیت اس طور پر ہونی چاہیے کہ انھیں سماجی بھلائی میں اپنی بھلائی نظر آئے۔ انھیں صحت مندانہ پاکیزہ زندگی کی لذت سے آشنا کرنا چاہیے تاکہ وہ اس لذت کو کسی قیمت پر ہاتھ سے نہ دیں۔ ضبط کے اس

یے نے موجودہ صدی میں سزا کے تصور کو بڑی حد تک تبدیل کر کے رکھ دیا ہے۔ اب قید کا مقصد فرد کو سزا یا اس سے بدلہ لینا نہیں بلکہ اسے ایسے ماحول میں رکھنا ہے جو اس کی ذہنی عادتوں کو بدل دے اس کے ماتحت قید خانے، کھیتوں، کارخانوں، مدرسوں، کتب خانوں تفریحی سرگرمیوں کے مرکزوں اور اصلاحی وں میں تبدیل ہو گئے ہیں۔ اس نظریے نے مدرسے کی فضا کو بھی پورے طور پر متاثر کیا ہے۔ جدید مدرسے ضبط کے مسائل کو ذہنی صحت کے آئینے میں دیکھنے لگے ہیں۔ جب کوئی بچہ سماج دشمن رجحانات کا اظہار کرتا ہے یہ اس بات کی علامت سمجھی جاتی ہے کہ گھر یا مدرسے نے کسی مرحلے پر اس کی فطری ضرورتوں کا راستہ روکا جس کے سبب یہ ردّ عمل پیدا ہوا ہے۔ چنانچہ بچے کے ذہنی پس منظر کا ہمدردی سے مطالعہ کیا جاتا ہے اور ان عناصر کا خاتمہ کیا جاتا ہے جو اس کے ذہن میں الجھن پیدا کر رہے ہوں۔

(۵) پیش بندی کا نظریہ:- پیش بندی کا نظریہ اصلاح کے نظریے سے بھی ایک قدم آگے جاتا ہے۔ اس کا استدلال یہ ہے کہ پرہیز علاج سے بہرصورت بہتر ہے۔ وبا پھوٹ پڑنے کے بعد اس کا علاج کرنے سے کہیں زیادہ بہتر صورت یہ ہے کہ اس کے جراثیم کو پھیلنے ہی نہ دیا جائے۔ جرائم کی روک تھام کے لیے ہر قوم جو رقوم خرچ کرتی ہے۔ اس سے کہیں تھوڑی رقم صرف کر کے ان جرائم کا راستہ بند کیا جا سکتا ہے۔ ایک امریکی ماہر تعلیم نے ۱۹۳۰ء میں حساب لگایا تھا کہ امریکہ ہر سال اربوں ڈالر جرائم کے انسداد پر خرچ کرتا ہے۔ اگر وہ اس سے آدھی رقم اصلاحی اور تفریحی مرکز کھولنے پر صرف کر دے تو بننے والے مجرموں میں سے اکثر کے خیالات اور عادات کو بدلا جا سکتا ہے۔ پیش بندی کے اس نظریہ کے زیر اثر پچھلی چند دہائیوں میں طرح طرح کی اصلاحی اور تفریحی تحریکوں کو جنم ملا ہے۔ مغربی ملکوں میں کئی ایسی نیم مذہبی اور سماجی تحریکیں پیدا ہوئی ہیں جن کی شاخیں جگہ جگہ پھیلی ہوئی ہیں۔ یہ اصلاحی اور فلاحی مرکز طرح طرح کی کھیلوں اور دوسری صحت مند دلچسپیوں کا اہتمام کرتے ہیں۔ یہ مرکز زیادہ تر ایسے علاقوں میں قائم کیے جاتے ہیں جس کے لوگوں میں جرائم کی کثرت ہو۔ ان مرکزوں کی بدولت بننے والے مجرم اپنا وقت صحت مند دلچسپیوں میں صرف کرنے لگتے ہیں۔ ان کا طرز فکر بدل جاتا ہے۔ دلچسپیوں کے اس طرح تبدیل ہو جانے سے ان کا طرز عمل بھی تبدیل ہو جاتا ہے اور اس طرح جرائم کے سرچشمے خشک ہو جاتے ہیں۔

جدید نفسیاتی انکشافات نے ضبط کے اس نظریے کو بڑا سہارا دیا ہے۔ پہلے انسانی جبلت کو ایک مقررہ اور غیر متبدل چیز سمجھا جاتا تھا۔ اس پرانے نظریے کے ماتحت تربیت کے مقابلے میں جبلت یا وراثت کو زیادہ وزن حاصل تھا۔ مگر جدید نفسیاتی مطالعوں نے یہ بات پوری طرح ثابت کر دی ہے، کہ انسانی جذبات اصلاح و ترمیم قبول کرنے کی پوری صلاحیت رکھتے ہیں۔ اس حقیقت نے ضبط کے تصور پر گہرا اثر ڈالا ہے۔ مدرسے اب یہ محسوس کرنے لگے ہیں کہ ضبط کے اکثر مسائل بچوں کی ناگہ۔ برذہنی الجھنوں کی پیداوار ہوتے ہیں۔ ان الجھنوں کا راستہ روکنا نظم و ضبط کے بیشتر مسائل کو حل کر سکتا ہے۔ اس یقین کے ماتحت مغرب کے کئی ملکوں نے اپنے مدرسوں میں طبی امداد اور دوپہر کے کھانے کا انتظام کیا ہے تاکہ غریب اور بدحال گھروں سے آنے والے بچے صحت مند غذا اور صحت مند غذائی عادات سے بہرہ مند ہوں اور جسمانی عوارض ان کی ذہنی پریشانی کا سبب نہ بنیں۔

ایک غلط فہمی کا ازالہ

ضبط کے جن مختلف نظریوں کا اوپر ذکر ہوا ہے ان کی روشنی میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ جدید مدرسہ پرانی وضع کے ضبط میں یقین نہیں رکھتا۔ روایت پرست مدرسہ بڑی دیانت داری سے یہ خیال کرتا تھا کہ بچوں پر زیادہ سے زیادہ بوجھ ڈالنا چاہیے۔ تاکہ وہ زندگی کی سختیاں برداشت کرنے کے قابل ہو جائیں۔ اس یقین کے ماتحت کردار اور کارکردگی کے سخت معیار قائم کیے جاتے تھے، اور یہ معیار ہر ایک پر یکساں طور پر مسلط کیے جاتے تھے۔ بچوں کے انفرادی اختلافات یا ان کی مختلف دلچسپیوں کو کوئی توجہ نہ دی جاتی تھی۔ ہر ایک سے ایک ہی معیار کا مطالبہ کیا جاتا تھا۔ اور اس مطالبے کی پشت پر تخویف کے علاوہ سزا بھی ہوتی تھی۔

ترقی پسند تعلیم ضبط کے اس تصور کو قبول نہیں کرتی۔ وہ بچے کی انفرادیت کی قائل ہے۔ اس کا مطالبہ یہ ہے، کہ ہر بچے کی مخصوص صلاحیتوں اور اس کے مخصوص ماحول کا ہمدردی سے مطالعہ کرنا چاہیے۔ اور اس سے کسی ایسی چیز کا مطالبہ نہ کرنا چاہیے جو اس کی استعداد سے باہر یا اس کی دلچسپیوں کے خلاف ہو۔ جہاں بچے کی دلچسپیاں غلط قسم کی ہوں۔ وہاں پہلے ان دلچسپیوں میں تبدیلی پیدا کرنی چاہیے۔ غرض ضبط کا

جدید تصور بچے کے ماحول میں مناسب تبدیلی [illegible] کہ اس کے طرز عمل کو مطلوبہ شکل دینا چاہتا ہے۔

ضبط کے اس نئے تصور سے بعض لوگوں کو یہ غلط فہمی ہو جاتی ہے کہ شاید جدید تعلیم استاد کو بالکل بے بس بنا دینے میں یقین رکھتی ہے۔ یہ خیال بالکل غلط ہے۔ جدید تعلیم بے شک بچے کے دل میں سلامتی کا احساس پیدا کرنا چاہتی ہے۔ تاکہ وہ جو کچھ کرے اپنی پسند سمجھ کر کرے۔ لیکن سلامتی کا یہ احساس سزا کے منافی نہیں۔ بعض حالیہ مطالعوں نے یہ نفسیاتی نکتہ اچھی طرح واضح کیا ہے کہ بچے اس ماحول میں سلامتی محسوس نہیں کرتے جس کی ہر حد کو بلا خوف توڑا جا سکے۔ بعض مقررہ حدوں کا موجود ہونا جن سے آگے گزرنا تکلیف کا باعث ہو، سلامتی کا احساس پیدا کرنے میں مددگار ثابت ہوتا ہے۔ نام نہاد آزاد یا فطری ضبط جس میں کوئی حدود موجود نہ ہوں ایک خیالی چیز ہے جس کا دنیا میں کہیں وجود موجود نہیں۔ جدید تعلیم استاد کو ان ناگزیر حدود کا محافظ قرار دیتی ہے۔ استاد کو یہ حیثیت عطا کیے بغیر طلبہ کے دل میں سلامتی کا احساس پیدا کیا جا سکتا ہے نہ استاد کے دل میں ؎

زبان کا آغاز

سید کوثر حسین

آج دنیا میں بے شمار زبانیں رائج ہیں۔ ملک ملک کی زبان جدا ہے، اور ایک ایک ملک میں سینکڑوں زبانوں کا سکہ رواں ہے۔ ڈاکٹر سد ھیشور ورما آریائی زبانیں لکھتے ہوئے، برسبیل تذکرہ بیان کرتے ہیں کہ لندن میں ایک بزرگ غیر منقسم ہندوستان (قبل تقسیم) کو لسانیاتی بہشت کہا کرتے تھے۔ جہاں دو سو پچیس زبانیں بولی جاتی ہیں۔ اور بولیوں یعنی مقامی زبانوں کی تعداد سات سو پچاس ہے۔ فاضل مصنف نے ان زبانوں کی نشاندہی نہیں کی۔ لیکن اس زبانی حساب سے دنیا کی زبانوں کے بے حساب ہونے کا کچھ اندازہ ضرور ہو جاتا ہے۔ اور سر دست اتنا ہی کافی ہے۔

ظاہر ہے کہ یہ زبانیں مختلف حالات میں بنی ہیں اور تغیرات زمانہ کے ہاتھوں ان میں بے شمار تبدیلیاں ہوتی رہی ہیں۔ آج تک کسی ایسے تاریخی عہد کا پتہ نہیں چلا جب تمام عالم میں صرف ایک ہی زبان بولی جاتی ہو۔ ماہرین لسانیات نے، دنیا کی تمام زبانوں کو بہت سے گروہوں اور خاندانوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ جن زبانوں میں لسانی نقطۂ نظر سے مشابہت نظر آئی۔ انھیں ایک خاندان قرار دیدیا۔ مگر ہمیں اس وقت زبانوں کی خاندانی تقسیم سے دلچسپی نہیں۔ زبان کے آغاز اور اس کی ماہیت سے سروکار ہے۔

زبان کی لسانیاتی تعریف

ہندوستانی لسانیات میں زبان کی اس طرح تعریف کی گئی ہے کہ زبان انسانی خیالات و احساسات کی پیدا کردہ، اُن تمام عضوی و جسمانی حرکات و اشارات کا نام ہے جن میں زیادہ تر گویائی شامل ہے۔ اور جن کو ایک دوسرا انسان سمجھ سکتا ہے۔ اور جس وقت چاہے اپنے ارادے سے دوہرا سکتا ہے۔

نطق یا گویائی کی اہمیت

زبان کے ضمن میں گویائی کی کارفرمائی سے کسے انکار ہو سکتا ہے۔ گویائی خیالات کے اظہار کا ایک مکمل

خصوصیت تحریر کی بات تھی اسی، تقریر کا گویائی پر ہی دارو مدار ہے۔ پھر تقریر تحریر سے مقدم ہے۔ منہ سے نکلی ہوئی بامعنی اصوات ہی جب علامات کی صورت اختیار کرتی ہیں تو تحریر کی نقش بندی ہوتی ہے۔ گویا تحریر تقریر پر منحصر ہے۔ اور تقریر گویائی یا نطق پر۔ یہ نطق ہی انسان یا حیوان میں ما بہ الامتیاز ہے۔ انسان کو حیوانِ ناطق کہتے ہیں۔ اور دوسرے حیوانوں کو حیوانِ مطلق۔ شیخ شیراز کے نزدیک گویائی اور اس کی نوعیت ہی انسان کے عیب و ہنر کی کسوٹی ہے۔

تا مرد سخن نگفتہ باشد　　　عیب و ہنرش نہفتہ باشد

عضوی اشارات کی اہمیت

دلچسپ بات یہ ہے کہ لسانیات میں بعض عضوی اشارات کو بھی زبان کا نام اور مقام دیا گیا ہے کیوں کہ اُن سے اظہارِ خیال کا کام سرانجام ہوتا ہے۔ ادبیات میں ایسے اشارات کو زبان کا نام تو کبھی نہیں ملا ہے۔ لیکن ان کے ذریعۂ اظہار ہونے کو سب نے تسلیم کیا ہے سے

دنیائے حسن و عشق کی مجبوریاں نہ پوچھ　　　آنکھوں سے بھی سلام لیا ہے کبھی کبھی　(نامعلوم)

خاموش گفتگو کے اس انداز کی جس قدر تعریف کی جائے کم ہے سے

کس منہ سے شکر کیجیے اس لطفِ خاص کا　　　پُرسش ہے اور پائے سخن درمیاں نہیں　(غالب)

سچ پوچھیے تو بہت سے اشارات ہماری روزمرہ گفتگو کا ایک حصّہ ہیں۔ ہم بولتے وقت بھی اشارات سے مدد لیتے ہیں۔ خوش خوانی و خوش بیانی میں، اشارات گویائی کے شریک کار اور مددگار ہوتے ہیں۔ اشارات مقرر کی شان اور تقریر کی جان ہیں ڈرامائی پیشکش میں لب و لہجہ کے بعد اداکاری، اشاروں ہی کی محتاج ہے۔ اشارات کی پوری قدر و قیمت تو ڈراموں کے ہدایت کار ہی جانتے ہیں۔ لیکن اشارات سے متاثر ہوئے بغیر کوئی بھی نہیں رہ سکتا۔ کیوں کہ اشارات سے بعض اوقات ایسے ایسے مطالب ادا ہو جاتے ہیں جن کا پورا اظہار، الفاظ کے بس کا نہیں ہوتا۔

بعض اشارات بین الاقوامی حیثیت رکھتے ہیں۔ مثلاً ہاتھ ہلاکر بلانے یا چلے جانے کا اشارہ۔ یا سر کی جُنبش سے اقرار و انکار، اور ہاتھ سے بھوک یا پیاس کا اظہار۔ گو نگے اشاروں ہی سے زبان کا صرف

لیتے ہیں۔ اور اشاروں ہی اشاروں میں اپنے دل کی بات سنا دیتے ہیں۔ اور جب اجنبی زبان بولنے والوں سے واسطہ پڑتا ہے اور جب قوتِ گویائی کے حامل بھی گونگے رہ جاتے ہیں تو صرف اشاروں ہی سے گفتگو کی منزل سر ہوتی ہے۔

زبان کی ماہیت معلوم ہوئی کہ زبان کبھی آواز ہے کبھی علامت اور کبھی محض عضوی اور جسمانی حرکت یا اشارہ۔ لیکن جیسا کہ عنوانِ بیان سے ظاہر ہے ہم یہ معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ رواجی زبان ——— (CONVENTIONAL LANGUAGE) پہلے پہل کیوں کر معرضِ وجود میں آئی۔

اشارات کی اولیت

زبان کے آغاز کے متعلق، تاریخ سے استفادہ نہیں کیا جا سکتا کیوں کہ تاریخ آغازِ زبان کے شواہد پیش کرنے سے قاصر ہے۔ البتہ وحشی اور غیر متمدن قوموں کے اظہار کا مشاہدہ کر کے، آغازِ زبان کے متعلق قیاس آرائی ہو سکتی ہے۔ وحشی قوموں کی زبان اکثر و بیشتر عضوی و جسمانی حرکات و اشارات اور کچھ چیخوں پر مشتمل ہے۔ اس سے یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ ہر ابتدائی زبان کا آغاز ایسے ہی اشارات سے ہوا ہوگا۔ چناں چہ ابتدائی انسان کی یہی زبان تصور کی جاتی ہے۔ ابتدائی انسان (PRIMITIVE MAN) سے مروجہ قسم کی کسی زبان کی توقع ہو بھی نہیں سکتی کیوں کہ کسی باقاعدہ صوتی زبان کی تشکیل، ذہنی ارتقا اور تمدنی ترقی کو لازم قرار دیتی ہے۔ جبکہ ابتدائی یا وحشی انسان کے لیے ان دونوں کا فقدان تھا۔

اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ حرکات و اشارات سے کسی صوتی اور رواجی زبان کی تشکیل کیوں کر عمل میں آئی۔

رواجی زبان کی نفسیاتی حقیقت

زبان خواہ صوتی ہو، خواہ بصورتِ تحریر، علاماتی، اور خواہ حرکاتی یا اشاراتی، چوں کہ وہ ایک خارجی عمل کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس لیے نفسیات کے دائرے سے خارج ہے لیکن ذہنی فعلیت کے ایک مخصوص انداز کی حیثیت سے، زبان بھی نفسیات میں زیرِ بحث آ ہی جاتی ہے۔ علمائے نفسیات بتاتے ہیں کہ کسی زبان کے بغیر صرف ابتدائی قسم کا تخیل ممکن ہے کیوں کہ زبان کے بغیر ہم کسی خیال پر توجہ مرکوز نہیں کر سکتے۔ زبان ذہنی پیکر تراشیوں کو واضح اور معین کرتی ہے۔ علاوہ ازیں ہر خیال، اظہار کا رجحان رکھتا ہے۔ اور عمل یا حرکت میں

ل ہونا چاہتا ہے۔ چنانچہ پروفیسر بین (BAIN) نے خیالات کے حرکی عناصر پر بہت زور دیا ہے اپنے دعوے کے ثبوت میں تین شہادتیں پیش کی ہیں۔

۱ کوئی ایسا ذاتی تجربہ کہ جس میں زور آزمائی یا ہاتھا پائی کی ضرورت پڑی ہو، اگر یاد آجائے تو اس وقت بھی اعضا میں اُن حرکات کے دہرائے جانے کا رجحان محسوس ہوتا ہے۔

۱ اگر بچوں سے ان کے کسی کام کی بابت پوچھا جائے تو وہ اس کام کو عملاً کر کے دکھائے بغیر صرف بیان کرنے میں دقت محسوس کرتے ہیں۔

۱ جب ہم کسی لفظ کو زبان سے ادا کیے بغیر یاد کرنے کی کوشش کرتے ہیں تو ہمارے اعضائے صوت میں ایک ہلکی سی بے آواز حرکت ضرور محسوس ہوتی ہے۔

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ سوچنا "رکا ہوا بولنا یا عمل کرنا ہے۔

لات، حرکات میں منتقل ہونا کیوں چاہتے ہیں

اس سلسلے میں عام نظریہ یہ ہے کہ دماغ جسم نامی کے دوسرے حصوں سے ایسا گہرا تعلق رکھتا ہے س کے اعمال (PROCESSES) دوسرے حصوں تک پھیلے بغیر دقوع میں نہیں آسکتے۔ اور چونکہ غ عضلات سے براہِ راست تعلق رکھتا ہے۔ اس لیے ذہنی افعال، عضلات کو ضرور متاثر کر دیتے ہیں۔ طرح ذہنی فعل، یعنی خیال، یا تو اعضائے صوت کو متاثر کر کے منہ سے کوئی آواز نکال دیتا ہے۔ یا بصورتِ دہ، کسی عضو کی حرکت پر منتج ہوتا ہے۔

ن کا آغاز

ذہنی بالیدگی کی بلند سطح پر خیال کے فکری سلسلے کسی نمایاں جسمانی حرکت کے بغیر بھی ظہور میں آسکتے ، لیکن ذہنی ارتقاء کے ابتدائی مدارج میں، خیالات ہمیشہ صریح افعال یا حرکات میں منتقل ہو جاتے ہیں ں کہ اس منزل میں، حرکات کسی معروض (یا شے) پر توجہ مرکوز کرنے کا ایک تیار اور مؤثر ذریعہ مہیا کرتی ہیں۔ طرح نفسیاتی نقطۂ نظر سے، نہایت ابتدائی قسم کی زبان، تقلیدی اشارہ (CONVENTIONAL SIGN) ہے اس سے کہ وہ مرئی ہو یا سمعی۔ مثلاً کوئی چیخ ۔ مگر شرط یہ ہے کہ ان اشارات کے ذریعے ایک کہنے اور

سمجھے۔ یعنی یہ اشارات۔ باہمی افہام و تفہیم کا کام بھی انجام دے سکیں لیکن محض صرف اشارات سے کچھ نہیں بنتا، تا وقتیکہ وہ اشارات۔ افراد کے درمیان کسی سمجھے بوجھے متعینہ مفہوم کا اظہار نہ کریں۔ بالفاظ دیگر اشارات کو زبان کا نام صرف اس وقت دیا جا سکتا ہے جب وہ اشارات رواجی یا تقلیدی اشارات بن جائیں۔

فطری اشارات

فطری اشارات (NATURAL SIGNS) میں بالعموم اپنے مشار الیہ سے یا اس کے طریقۂ استعمال سے یا اس کی کسی حالت یا صفت سے مشابہت ہوتی ہے۔

کسی شے یا سمت کی طرف اشارہ کرنے والی حرکات۔ فطری اشارات میں شامل نہیں۔ کیوں کہ وہ کسی شے یا سمت کی طرف، صرف توجہ دلانے کا کام انجام دیتی ہیں۔ لیکن اگر یہ حرکات توجہ دلانے کے علاوہ کسی خیال کا اظہار بھی کریں تو زبان کے تحت آ جائیں گی۔

اسی طرح جذباتی یا ہیجانی اظہار کا موضوعی اشارہ (SULIJECTION GESTURE) بذات خود زبان کا حصہ قرار نہیں دیا جا سکتا۔ تا وقتیکہ جذباتی اظہار کا یہ اشارہ اس جذبے کے خیال کا اظہار نہ کرے۔

المختصر فطری اشارات (NATURALSIGNS) تقلیدی اشارات کی پیش قیاسی کرتے ہیں۔ وہ خود کسی زبان کی تشکیل سے قاصر ہیں۔ لیکن وہ تقلیدی اشارات کے لیے ضرور راہ ہموار کرتے ہیں۔ فطری اشارات کو تقلیدی اشارات پر، جو تقدم حاصل ہے۔ اس کی تائید گونگوں، بچوں اور وحشیوں کے اشارات و حرکات سے بھی ہوتی ہے جو خود اپنے لیے فطری اشارات کی ایک زبان تیار کر لیتے ہیں۔

(باقی)

کنڈر گارٹن

محمد ابو الفتح

کنڈر گارٹن جرمنی زبان کا ایک لفظ ہے جس کے معنی "بچوں کا باغ" ہے۔ اور اس سے مراد وہ طریقہ تعلیم لیا جاتا ہے۔ جسے جرمنی کے ایک معلم اور مصلح فروبل (۱۷۸۲ - ۱۸۵۲) نے جاری کیا تھا۔

یہ جدید طریقہ تعلیم چھوٹے بچوں، بالخصوص آٹھ سال کی عمر تک کے بچوں کی فطرت کے عین مناسب ہے، اور پرائمری کی پہلی تین جماعتوں کے لیے از بس مفید۔ اس میں تعلیم کتابوں کی بجائے مختلف کھیلوں، کھلونوں اور مفید مشاغل کے ذریعے دی جاتی ہے۔ اور اس طرح انھیں کھیلنے کودنے کے ساتھ ساتھ سوچنے سمجھنے تعلیمی کاموں میں دلچسپی لینے اور علم از خود حاصل کرنے کے مواقع دیے جاتے ہیں۔

یہ طریقہ تعلیم بچے کی تقریباً تمام فطری جبلتوں کی تصعید کرتا ہے۔ اس کی ذہنی جسمانی، اخلاقی اور روحانی تربیت کرتا، جمالیاتی ذوق کو بڑھاتا اور اس کی ہمہ گیر ترقی کا ضامن ہے۔ فروبل نے ابتدا میں تعلیم دینے کے لیے سات تعلیمی تحفے (کھلونے) تجویز کیے تھے۔ مگر بعد میں امتداد زمانہ اور وسعت تجربہ کے ساتھ ساتھ کئی اور تحفوں کا اضافہ ہوا ہے۔ مثلاً گولیاں، کوڑیاں، تنکے، کرٹے، رسیاں، تیلیاں، تصویریں وغیرہ۔

فروبل کے سات تعلیمی تحفے

پہلا تحفہ گیند:۔ سب سے پہلے بچے کو کھیلنے کے لیے رنگین گیندیں دی جاتی ہیں۔ چونکہ یہ شکل وصورت میں سادہ اور متحرک بھی ہوتی ہیں۔ اس لیے بچے کو اس کے ساتھ کھیلنے دوڑنے اور اس کا مطالعہ کرنے میں آسانی رہتی ہے۔

اس کے بعد مختلف رنگوں اور جسامتوں کی گیندیں ایک چوکھٹے کے ساتھ باندھ دی جاتی ہیں۔ بچہ انھیں دیکھتا، چھوتا، ہلاتا، اور گھماتا ہے۔ اس سے بچے کو مختلف رنگوں کی پہچان ہو جاتی ہے۔ سمتوں کا تصور ہو جاتا ہے اور دائیں بائیں، نیز نرم اور سخت میں فرق سمجھنے لگ جاتا ہے۔

دوسرا تحفہ:- اس میں مکعب ، مکعب نما ، بیلن اور گولا شامل ہیں ۔ بچہ ان سے کھیلتا ہے ۔ ان چیزوں کے کناروں ، کونوں اور سطحوں کو شمار کرتا ہے ۔ اس سے اسے گنتی کے علاوہ ان شکلوں کے نام بھی آجاتے ہیں ۔ اس کے بعد بچے کو چیزوں کا بنانا سکھایا جاتا ہے ۔ چنانچہ اس غرض کے لیے تیسرے چوتھے ، پانچویں اور چھٹے تحفے میں اسے ایسے چھوٹے چھوٹے صندوق دیے جاتے ہیں جن میں تعمیری سامان مہیا ہوتا ہے ۔

تیسرا تحفہ:- اس میں لکڑی کے ایک ایک مکعب انچ کے آٹھ ٹکڑے ہوتے ہیں ۔ بچہ ان سے مختلف سادہ شکلیں بناتا ۔ سالم اور جزو میں فرق سمجھتا اور گنتی سیکھتا ہے ۔

چوتھا تحفہ:- اس میں اینٹوں کی طرح لکڑی کے مکعب نما ہوتے ہیں جن سے بچہ متذکرہ بالا کی طرح مختلف چیزیں از قسم گڑیا کا گھر ، ریل کا پل وغیرہ بناتا ہے ۔

پانچواں تحفہ:- اس میں اکیس سالم ، چھ نصف اور بارہ چوتھائی مکعب نما ہوتے ہیں ۔ ان سے بچہ مندرجہ بالا کی طرح مختلف چیزیں تعمیر کرتا اور لاشعوری طور پر زاویوں کا تصور بھی حاصل کرتا ہے ۔

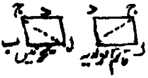
چھٹا تحفہ:- اس میں اٹھارہ سالم اور نو چھوٹی مستطیلیں ہوتی ہیں ۔ ان سے بچہ پیچیدہ قسم کے تعمیری کام کرتا ہے ۔ اس سے اس کی قوت فہم و ادراک بڑھتی ہے اور سوچ بچار کا مادہ زیادہ ہوتا ہے ۔

ساتواں تحفہ:- اس میں لکڑی کے پانچ رنگین و روغنی تختے ہوتے ہیں جن پر ذیل کی شکلیں بنی ہوتی ہیں (i) ۲ ۴ مربعے (ii) ۲ ۴ قائم الزاویہ مثلثیں (iii) ۲ ۵ متساوی الاضلاع مثلثیں (iv) ۲ ۴ متساوی الاضلاع مثلثیں (v) ۲ ۴ منفرجۃ الزاویہ مثلثیں ۔

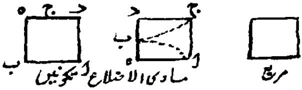
(i) سب سے پہلے بچے کو مربع دار تختہ دیا جاتا ہے وہ اس سے گنتی سیکھتا ہے ، اور لاشعوری طور پر اطراف ، اکناف ، اضلاع اور مربع کا تصور حاصل کرتا ہے ۔ چوں کہ یہ سب اصطلاحات آسان اور سادہ ہوتی ہیں اس لیے بچے کو ان کے سمجھنے میں کوئی دقت پیش نہیں آتی ۔  مربع

(ii) مربع کے وتر کو ملا دینے سے اس کے دو حصے ہو جاتے ہیں اور ہر حصہ قائمۃ الزاویہ مثلث بن جاتا ہے بچے کو صرف وتر کی لکیر لگانا سکھایا جاتا ہے ۔ قائمۃ الزاویہ مثلثیں خود بخود بنتی جاتی ہیں مثلاً :-

اب ج 
مربع

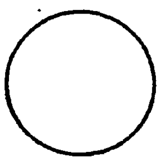
اور ب ج د دو الگ الگ قائمۃ الزاویہ مثلثیں بن گئی ہیں 

(iii) مربع کے کسی ایک ضلعے کی تنصیف کرکے اُسے سامنے کے دو کونوں سے ملا دیا جاتا



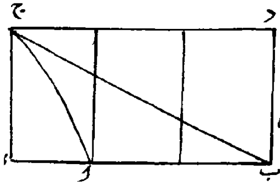
ہے۔ اس سے ہر مربع میں ایک متساوی الاضلاع تکون بن جاتی ہے اور دو قائمۃ الزاویہ تکونیں
مثلاً ا ب ج متساوی الاضلاع تکون ہے اور د ج ب اور ا ہ ب قائمۃ الزاویہ تکونیں۔

(iv) ایک مربع دائرہ بناکر اس کے محیط کو پرکار سے
چھے برابر حصوں میں تقسیم کرو۔



محیط کے ہر نقطے کو پہلے مرکز سے ملاؤ پھر محیط کے ہر
دوسرے نقطے سے ملاؤ۔ اس طرح ہر دائرے میں چھے برابر
مساوی الاضلاع تکونیں بن جائیں گی۔

(v) کوئی سے تین ملحقہ و متصلہ مربعے لو۔



مربع نمبر ۱ کے وتر ا ج کو ملاؤ اور مربع نمبر
۲، ۳ کے وتر ب ج کو ملاؤ۔
ا ب ج منفرجۃ الزاویہ تکون بن جائے گی
اس میں زاویہ ا قائمہ سے بڑا ہے۔

یاد رہے بچوں کو یہ سب سامان بنا بنایا مہیا کیا جاتا ہے۔ ان کا کام انھیں دیکھنا، سمجھنا اور کھیلنا ہے بنانا نہیں۔

مشاغل :۔ فروبل نے اسی طرح بچوں کے لیے ذیل کے چند مفید اور دلچسپ مشاغل، کھیلیں اور سرگرمیاں بھی تجویز کی ہیں۔ (تین سے پانچ سال کے بچوں کے لیے)

(۱) رنگین اشیاء :۔ مثلاً منکوں، پھولوں، گیندوں وغیرہ کے ذریعے مختلف رنگوں کی پہچان کرانا۔ یاد رہے رنگوں میں ایک بہت بڑی کشش ہوتی ہے، جس کی وجہ سے بچہ ان میں بہت دلچسپی لیتا ہے۔

(۲) گانا :- اس سے قوت گویائی بڑھتی ہے۔ جھجک دور ہوتی ہے۔ اپنا مافی الضمیر ادا کرنے میں مدد ملتی ہے اور جمالیاتی ذوق بڑھتا ہے۔

(۳) کھیلیں :- یہ تعلیمی اور متحرک ہوتی ہیں۔ نیز ان کے ساتھ ساتھ گیت بھی گائے جاتے ہیں جس سے بچے زیادہ لطف اٹھاتے ہیں۔ ان سے بچوں کی جسمانی اور سماجی اور ذہنی تربیت ہوتی ہے۔ اور جمالیاتی ذوق بھی بڑھتا ہے۔

(۴) تصاویر :- بچے مختلف جانوروں اور چیزوں کی رنگین تصویریں دیکھتے ہیں۔ استاد ان پر تصاویر کے متعلق سوال کرتا ہے اور بچے مکمل جواب دیتے ہیں اس سے بچوں کا ذخیرہ الفاظ و خیالات بڑھتا ہے اور معلومات عامہ میں اضافہ ہوتا ہے۔

(۵) کاغذ :- کاغذ کو قینچی سے کاٹ کر مختلف اشیا از قسم کشتی، پھول، علم ہندسہ کی مختلف شکلیں وغیرہ بنائی جائیں۔

(۶) فنون عملی :- پلاسٹر آف پیرس یا چکنی مٹی سے مختلف جانوروں وغیرہ، مثلاً۔ بلی کتے طوطے کی شکلیں بنانا۔ چاک اور پنسل سے مصوری کرنا۔ ان میں رنگ بھرنا۔ لکڑی، سرکنڈے، بید اور ناڑ وغیرہ سے ٹوکریاں۔ ٹوپیاں وغیرہ بنانا سکھایا جاتا ہے۔

(۷) سوزن کاری :- سوئی میں دھاگا ڈالنا معمولی ٹانکے لگانا وغیرہ سکھایا جاتا ہے۔

(۸) رنگوں کی پہچان :- گولیوں کے صندوق میں سے مطلوبہ رنگ کی گولی نکال کر لانے کی مشق کرائی جاتی ہے۔

(۹) پرونا :- اس میں پھولوں کے ہار پرونا۔ دو دو یا تین تین ہم رنگ گولیوں کو پرونا۔ کوڑیوں کو دو، تین، چار، یا پانچ کی قطاروں میں رکھنا شامل ہیں۔

(۱۰) الفاظ سازی :- گتے یا ٹین کے کٹے ہوئے حروف کو ملا کر چھوٹے چھوٹے بامعنی الفاظ بنانا سکھایا جاتا ہے۔

(۱۱) کہانیاں :- کہانیوں کا سننا اور سنانا۔ بچے ان میں فطری دلچسپی لیتے ہیں اور یہ زبان کے

سکھانے کا ایک بہت بڑا ذریعہ ہیں۔

(پانچ سے آٹھ سال کے بچوں کے لیے)

مذکورہ بالا کے علاوہ ذیل کے کام بھی کرائے جاتے ہیں:-

(۱) پیغام رسانی:- اس سے ذخیرہ الفاظ و خیالات بڑھتا ہے۔ ذمہ داری کا احساس پیدا ہوتا ہے اور سماجی کاموں کے لیے تربیت ملتی ہے۔

(۲) تول اور پیمائش:- باٹ اور ترازو لے کر مختلف چیزوں کا وزن کرنا۔ فیتہ اور گز لے کر مختلف چیزوں کی لمبائی چوڑائی، گہرائی اور اونچائی دریافت کرنا۔ نیز کچھ عرصے کی مشق کے بعد پہلے بذریعہ اندازہ اور پھر صحیح پیمائش کر کے فرق معلوم کرنا۔ ان عملی کاموں سے روزمرہ کا حساب سیکھنے میں بہت مدد ملتی ہے۔

(۳) پانی کا بھرا ہوا گلاس:- بغیر ایک بوند گرائے پانی کا بھرا ہوا گلاس کم از کم بیس قدم کے فاصلے تک لے جانا۔ اس سے بچے احتیاط سیکھتے ہیں۔

کامیابی کا دار و مدار:- اس طریقۂ تعلیم کی کامیابی کا دار و مدار دو چیزوں پر ہے (۱) سامان (۲) استاد۔

سامان:- ہمیشہ مکمل، نیا اور خوب صورت ہو، اور اس کا بکثرت استعمال کرایا جائے۔

استاد:- استاد میں ہمدردی ہو اور بچوں سے محبت کرتا ہو۔ اس لیے چھوٹے بچوں کے لیے معلمات جن میں مہر مادری کا جذبہ زیادہ ہوتا ہے بہت مفید ثابت ہوتی ہیں۔ بہرحال معلم یا معلمہ کا بچوں کی نفسیات سے واقف ہونا ضروری ہے۔ وہ بچوں میں بچہ بن کر کام کرے۔ ان کو مفید مشاغل میں مصروف رکھ سکے۔ انھیں کھیل ہی کھیل میں تعلیم دے سکے اور ان کی ہمہ گیر تربیت کر سکے۔

عادات:- بچہ کو شروع سے ہی ذیل کی اچھی عادات کا سکھانا ضروری ہے۔

سچ بولنا۔ ماں باپ کا کہا ماننا۔ دوسروں کی چیز پڑا پا کر قبضہ نہ جمانا۔ شیریں کلامی اور ادب سے بات نہ کرنا۔ قطار میں کھڑے ہو کر اپنی باری کا صبر سے انتظار کرنا۔ مل جل کر رہنا۔ فضول لڑنے جھگڑنے سے احتراز کرنا۔

حفظانِ صحت کی عادات:- وقت پر سونا اور وقت پر جاگنا۔ ہاتھ منہ دھونا اور ہمیشہ صاف ستھرا رہنا۔ ہر وقت مناسب لباس میں ملبوس رہنا۔ سکول وقت پر آنا۔ جگہ جگہ تھوکنے اور ناک صاف کرنے سے احتراز کرنا۔

اعلیٰ تعلیم اور اُردو زبان

نذیر احمد

کالج اور یونیورسٹی کے درجے پر اردو کو ذریعہ تعلیم بنانے کے متعلق یوں تو قیام پاکستان کے بعد ہی گرماگرم بحث چل نکلی تھی مگر وہ بحث کچھ نتیجہ خیز ثابت نہ ہوئی اور انگریزی بدستور اعلیٰ تعلیم کا ذریعہ بنی رہی۔ اب تعلیمی کمیشن کے تقرر کے بعد اس مسئلہ میں پھر سے سرگرم دلچسپی پیدا ہو گئی ہے۔ لاہور میں نامور اصحاب علم کی ایک مجلس اس غرض سے قائم کی جا چکی ہے کہ قومی زبان کو اعلیٰ تعلیم کا ذریعہ بنانے کے لیے عملی کام کرے۔

اردو کو اعلیٰ تعلیم کا ذریعہ بنانے کی راہ میں اب تک بڑی دشواری یہ رہی ہے کہ بعض لوگوں کے نزدیک اس زبان میں اتنی صلاحیت نہیں کہ جدید سائنسی علوم کو اپنے اندر سمو سکے۔ سائنس اور ٹکنالوجی کی برق رفتار ترقی کے پیش نظر یہ اعتراض اور بھی وزنی دکھائی دیتا ہے۔ لیکن تصویر کا دوسرا رخ یہ ہے کہ جن لوگوں نے سائنس کی اعلیٰ تعلیم اردو میں دینے کا عملی تجربہ کیا ہے وہ اس تجربے کو کامیاب بتاتے ہیں۔ کچھ سال گزرے بابائے اردو مولوی عبدالحق صاحب نے ملک کے نامور چند ماہرین سائنس اور ماہرین تعلیم کی رائے اس مسئلہ پر دریافت کی تھی۔ ان لوگوں کے جواب نہایت فیصلہ کن قسم کے تھے۔ چوں کہ ان دنوں یہ مسئلہ دوبارہ قومی تجربہ کا مرکز بن رہا ہے۔ اس لیے ہم ان حضرات کے خیالات کو ذیل میں درج کر رہے ہیں۔

سوال:- کیا اردو ذریعہ تعلیم ہونی چاہیے۔ اور کیا اردو تمام مضامین میں خصوصاً سائنس میں اعلیٰ مدارج تک ذریعہ تعلیم ہو سکتی ہے؟

(۱) جواب:- ڈاکٹر رضی الدین صدیقی، ڈائرکٹر ریسرچ پشاور یونیورسٹی۔

جہاں تک اردو کے ذریعۂ تعلیم ہونے کی صلاحیت کا سوال ہے اس کا جواب وثوق کے ساتھ اثبات میں دیا جا سکتا ہے۔ اب اردو میں وہی صلاحیت پیدا ہو گئی ہے جو دوسری بڑی زبانوں میں ہے۔ عمرانی۔ اقتصادی اور حیاتی ہر قسم کے علوم کے لیے اردو بخوبی ذریعہ تعلیم بن سکتی ہے۔ نہ صرف

انٹرمیڈیٹ کے لیے بلکہ انتہائی درجے تک یہ رائے صرف قیاس اور ظن پر منطبق نہیں بلکہ ایک تہائی صدی تک اس کو جامعہ عثمانیہ میں آزمایا گیا ہے۔ اب اردو زبان کی صلاحیت کے متعلق بلا خوف و تردید یہ عویٰ کیا جاسکتا ہے کہ اس کی صلاحیت کسی دوسری زبان کی صلاحیت سے کم نہیں۔ میری رائے میں اب اردو زبان کی صلاحیت کا سوال اٹھانا سوائے تضیع اوقات کے اور کچھ نہیں۔

اگر اردو پڑھنے اور پڑھانے والے دونوں کی اپنی زبان ہو اور وہ اس سے اچھی طرح واقف ہوں تو اس کو ذریعہ تعلیم بنانے سے وہی فوائد مرتب ہوں گے جو ایک انگریز کو انگریزی زبان میں ایک جرمن کو جرمنی زبان میں تعلیم دینے سے حاصل ہوتے ہیں۔

اس طریقے کو اختیار کرنے سے ہمارے طلبا کی آدھی مصیبت دور ہو جائے گی۔ اس وقت ان کو اپنے مضمون کی مشکلات پر حاوی ہونے کے علاوہ انگریزی زبان کی گتھیاں بھی سلجھانی پڑتی ہیں۔ اپنی زبان میں تعلیم حاصل کرنے سے ایک فائدہ یہ ہوگا کہ وہ اپنے مضمون (سائنس یا فن) پر پوری توجہ صرف کرسکتے ہیں جس سے یقیناً علم کے معیار میں اضافہ ہوگا۔

(۲) حافظ محمد عثمان —

"اتنا عرض کردینا ضروری سمجھتا ہوں کہ انسان بالطبع قدامت پسند ہے۔ وہ ہر قسم کے تغیر سے خواہ وہ اس کی ذات کے لیے کتنا ہی مفید کیوں نہ ہو گھبراتا ہے۔ ہر زمانے میں انسان نے اپنی قدامت پسندی کا ثبوت دیا ہے۔ یہاں تک کہ ہر مبلغ اور ہر پیغمبر کی مخالفت کی گئی اور تاریخ کے اوراق شاہد ہیں کہ انسان نے نئی اصلاحات اور آئین کو کن کن دشواریوں سے قبول کیا۔ خود اپنے ہی زمانے میں سرسید کی مثال ہمارے سامنے ہے۔ ان کو اس انگریزی تعلیم کے رائج کرنے میں کن کن دشواریوں کا مقابلہ کرنا پڑا۔ یہاں تک کہ کفر کے فتوے بھی دیے گئے۔

اب اس نئی طرز کے خلاف اعتراضات کا مختلف صورتوں میں پیش کیا جانا اس دیرینہ سنت کا ایک تکملہ ہے۔ اس سے گھبرانا نہیں چاہیے اور مسلمان قوم کو دیانت داری سے اپنی جدوجہد جاری رکھنی چاہیے۔

میٹرک تک آرٹس اور سائنس کے علمی مضامین اردو میں پڑھائے جاتے ہیں، اس لیے اب انٹرمیڈیٹ میں ان مضامین کو انگریزی میں سمجھنے میں غیر معمولی دقت ہوگی اور اب تک ہو رہی ہے۔ بسا اوقات سال اول کی تعلیمی مدت ختم ہونے تک طلبا اسباق کے سمجھنے کے قابل نہیں ہوتے۔ اگر انٹرمیڈیٹ میں بھی اردو ذریعہ تعلیم ہو جائے تو پہلے ہی دن سے افہام و تفہیم کی دشواری رفع ہو جائے گی۔ میٹریکولیشن کے طلبا کی انگریزی کی استعداد عموماً پست اور اردو سے تو یقینی طور پر پست ہوتی ہے، اس لیے وہ لکھتے وقت انگریزی میں اظہار مطلب میں عموماً قاصر نظر آتے ہیں۔ اس کے برعکس وہ اردو میں اپنے خیالات کو بہتر طور پر ادا کر سکیں گے۔

میں ایک عرصہ سے پنجاب یونیورسٹی کا ممتحن رہا ہوں اور ریاضی کے پرچے میں نے دیکھے ہیں عام طور پر جہاں کہیں کسی قسم کے دلائل کی ضرورت، کسی مسئلہ کی وضاحت کے لیے ہوتی ہے تو طلبا اسے کبھی بھی ڈھنگ سے ادا نہیں کرتے، صرف طوطے کی طرح رٹنے والے طالب علم محض کتابی انگریزی لکھ کر بازی لے جاتے رہے ہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ اکثر اول درجہ کے پاس شدہ طلبہ میں بھی علمی ذوق پیدا نہیں ہوتا۔ یہ رٹائی کی بیماری اس وقت تک طلبہ سے نہیں نکلے گی جب تک ان کی تعلیم انگریزی کی بجائے اردو میں منتقل نہیں ہوگی۔

(۳) ڈاکٹر محمد افضال حسین قادری۔ فارسٹ انشا ٹیوٹ حکومت پاکستان

اردو زبان انٹرمیڈیٹ کے درجوں میں نیز بی۔ ایس۔ سی، اور ایم۔ ایس۔ سی کے درجوں میں بھی ذریعہ تعلیم ہو سکتی ہے۔ فائدہ یہ ہوگا کہ مضامین سمجھ میں آ جائیں گے۔ سائنس کی کتابیں، رسالے اور مضامین لکھنے میں متوسط علم کے لوگوں کو آسانیاں ہو جائیں گی۔ عوام بلکہ ساری قوم اردو کے ذریعہ جلد جلد سائنس شناس اور سائنٹیفک ذوق اور تربیت دماغی کی حامل ہو جائے گی۔ قومی زندگی کے عملی پہلوؤں پر سائنس جاری و ساری ہو جائے گی۔ یعنی ہماری زراعت، حفظان صحت، صنعت و حرفت کے شعبے، سائنس سے صحیح طور پر اثر پذیر اور ترقی یافتہ ہو جائیں گے۔ اساتذہ کے مہیا کرنے میں بھی آسانی ہو جائے گی، اور عام تعلیم کا معیار بہتر اور دائرہ وسیع ہو جائے گا۔

انگریزی سے جو خرابیاں پیدا ہو رہی ہیں یہ ہیں کہ انگریزی کی مختلف اور پیچیدہ اصطلاحات عجیب اور اکثر فرسودہ لغات جو سائنس کی کتابوں میں موجود ہوتے ہیں طلبا کے لیے نفس مضمون سمجھنے میں دقت پیدا کرتے ہیں اور غایت یعنی سائنس کے مضمون کی حقیقت سمجھنے سے قاصر رہتے ہیں۔ انگریزی کی کتابیں اور رسالے کم یاب ہیں۔ اس سے تعلیم کی ترقی رکتی ہے اور اساتذہ کی کثیر تعداد کی تربیت میں دقت پیدا ہوتی ہے۔ ہمارے عوام سائنس سے قطعاً نا آشنا ہیں اور سائنس فکر و جستجو کا عام معیار بہت پست ہو رہا ہے اور اصل علاج یہ ہے کہ قومی زبان کو جلد از جلد ذریعہ بنایا جائے۔

(۴) ڈاکٹر رفعت حسین صدیقی۔

مجھے بالکل اتفاق ہے کہ اردو آسانی کے ساتھ سائنس کا ذریعہ تعلیم بن سکتی ہے۔ اس سے بڑا فائدہ یہ ہوگا کہ اساتذہ کو نفس مضمون سمجھانے میں اور طلبا کو سمجھنے میں بہت آسانی ہو گی اور سائنس کی تعلیم کا معیار بلند ہو جائے گا۔ موجودہ صورتِ حال یہ ہے کہ طلبا کو مضمون سمجھنے میں بڑی دقت ہوتی ہے بعض چیزیں جو ان کی سمجھ میں نہیں آتیں تو وہ ان کو رٹنا شروع کرتے ہیں اور چونکہ نفس مضمون کو سمجھے ہوئے نہیں ہوتے اس لیے اس کو ٹھیک طور پر ادا بھی نہیں کر سکتے۔ امتحانوں میں ان کے جواب واضح نہیں ہوتے۔ انگریزی پر ان کو عبور نہیں ہوتا جس قدر وقت وہ انگریزی سمجھنے اور لغت دیکھنے میں صرف کرتے ہیں وہ علم کے اضافہ پر صرف کیا جا سکتا تھا۔ اس سال پنجاب میں چوتھی اور پانچویں جماعت کے لیے سائنس کی جو کتابیں لکھی گئی ہیں، ان کا ترجمہ اگر آسان انگریزی میں بھی کر دیا جائے تو بھی طلبہ کے لیے ان مضامین کا سمجھنا تو درکنار پڑھنا بھی دشوار ہوگا۔ سائنس کا معیار اس وقت بلند ہو سکتا ہے، جبکہ کتابیں بھی اردو میں ہوں اور تعلیم

(۵) ڈاکٹر قاضی سعید الدین

اردو سائنس کا ذریعہ بن سکتی ہے۔ اس سے فائدہ یہ ہوگا کہ طلبا کو علم حاصل کرنے میں آسانی اپنے خیالات کے اظہار کرنے میں سہولت ہو گی۔ کم وقت میں نصاب کو زیادہ خوبی سے پڑھ سکیں مضامین کو آسانی سے سمجھ سکیں گے۔ آج کل خرابی یہ پیش آ رہی ہے کہ انگریزی کا معیار بہت خراب ہے۔ انٹرمیڈیٹ کے طلبا نہ کتاب کو آسانی سے سمجھ سکتے ہیں اور نہ اپنا مطلب صحیح انگریزی میں

ہ ہیں بعض اوقات اپنا مطلب بیان کرنے کے لیے جو الفاظ یا جملے استعمال کرتے ہیں ان کا مطلب
ے مختلف ہوتا ہے جو وہ بیان کرنا چاہتے ہیں۔ اس طرح وہ کتابوں کا مطلب بھی غلط سمجھتے ہیں۔

، میجر آفتاب حسن صدر شعبہ سائنس۔ پاکستان ملٹری اکاڈیمی۔ کاکول۔

میں اپنے چودہ سالہ تجربہ کی بنا پر کہہ سکتا ہوں کہ نہ صرف انٹرمیڈیٹ بلکہ بی۔ایس سی اور ایم ایس سی
ں اردو سائنس کی تعلیم کا ذریعہ بن سکتی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ سوال ہی کچھ غیر ضروری سا ہے۔ عثمانیہ یونیورسٹی میں ایم۔ایس۔سی کلاسیں بھی
اور اس سے آگے کے تحقیقی شعبہ جات بھی تھے۔ یہ کام سال ہا سال سے جاری تھا۔ جب دکن میں
اردو کے ذریعہ آسانی سے ہو سکتا تھا تو پاکستان میں نہ ہونا کچھ معنی نہیں رکھتا۔

اگر سائنس کی تعلیم کا مقصد واضح ہو تو پھر ذریعہ تعلیم کا سوال ہی نہ پیدا ہو۔ سائنس ایک زندہ اور
ں مضمون ہے۔ اس کی تعلیم صرف ذہنی جلا کے لیے نہیں دی جاتی۔ قدرت کے راز ہائے سربستہ
اف کرنا۔ قوانین قدرت سے واقفیت حاصل کرنا۔ مظاہر فطرت کو سمجھنا ایک سائنسدان کا اولین کام
ر اس کا مقصد یہ ہے کہ سمجھ لینے کے بعد ان سے اس طرح کام لیا جائے کہ بنی نوع انسان کا اس سے
ہو۔

سائنس کی تعلیم کے منازل یہ ہیں کہ پہلے اچھی طرح مضمون کو سمجھنا، پھر طالب علم میں آہستہ آہستہ
ی قوتوں کا بیدار ہونا اور آخر کار اس کا موجدین اور ماہرین کی صف میں شامل ہونا۔

ظاہر ہے کہ یہ کیفیت ادھوری تعلیم سے حاصل نہیں ہو سکتی۔ اس کے لیے بہت صحیح تعلیم اور بڑے وقت
مت ہے۔ مبتدی کو سائنس سمجھنے میں ابتدا میں کچھ دشواریاں ہوتی ہیں۔ لیکن جب ان دشواریوں
ن کی دشواری کا بھی اضافہ کر دیا جائے تو ظاہر ہے کہ طالب علم کے لیے کیسی مشکلات پیدا ہو جاتی ہیں اور
لیے باکمال بننے کا کتنا کم امکان رہ جاتا ہے۔

اپنی زبان ہو تو پڑھانے والے کے لیے سمجھانا اور پڑھنے والے کے لیے سمجھنا آسان ہو جاتا ہے۔
ت میں وہ کام ہو جاتا ہے جو غیر زبان کے ذریعے زیادہ وقت میں بھی نہیں ہو سکتا۔

مجھے یقین ہے کہ اگر اردو کو ذریعہ تعلیم بنا دیا جائے اور یہ کام سلیقے سے کیا جائے تو میٹرک کے بعد چار سال مدت میں بعض بی، ایس سی میں ہی طلبا وہ سب کچھ سیکھ سکیں گے جو اب ایم، ایس سی میں سیکھتے ہیں۔ جب تک یہ نہ ہوگا یورپ سے مقابلہ تو کیا عام ترقی بھی مشکل ہے۔

اردو ذریعہ تعلیم ہو تو اس کے فوائد بے شمار ہیں، نہ صرف یہ کہ طالبان علم بلکہ پاکستانی عوام بھی اس سے مستفید ہو سکتے ہیں۔ اردو عوام میں سائنس کو مقبول بنانے کا ذریعہ بن سکتی ہے۔ عام صنعت و حرفت کو ترقی ہو سکتی ہے اور ملک کی خوش حالی میں اضافہ ہو سکتا ہے۔

(۷) سید احمد فصیح۔

بلاشک و شبہ اردو ذریعہ تعلیم بن سکتا ہے۔ اردو ذریعہ تعلیم ہو تو اس کے فائدے بے شمار ہیں۔ سائنس کے بنیادی اصولوں اور خاص کر ان کے استعمال سے زیادہ بڑھتا جائے گا۔ ملک کے مادی ذخائر کو فائدہ مند بنانے اور قوانین قدرت سے فائدہ حاصل کرنے میں زیادہ سے زیادہ دماغ مصروف ہو سکیں گے۔ سائنس سمجھنے اور سمجھانے کی مشکلات بہت کم ہو جائیں گی اور تخلیق اور ایجاد کی راہیں کھل جائیں گی۔ سائنس کا کامل نصاب کم وقت میں پورا ہو سکے گا، اور علم کے استعمال کے لیے زیادہ موقع اور زیادہ مدت ملے گی۔ قومی اور ملکی اعتبار سے بڑی کفایت ہو گی۔ آج کل غیر ملکی زبان پر قدرت نہ ہونے سے نصاب کئی مرتبہ پڑھنے کے بعد بھی خیالات صاف نہیں ہوتے۔ اگر مطلب سمجھ میں آ جاتا ہے تو ادا کرنے میں اسی فیصد طالب علم ناکام رہتے ہیں اور کم ہمت ہو جاتے ہیں۔ اساتذہ کو خود بھی سمجھنے اور سمجھانے میں کئی سال لگ جاتے ہیں۔ اس عرصہ میں اکثر لکچر غیر مفید اور ناقص رہتے ہیں اور طلبا کی ذاتی کوشش کے باوجود مضمون کی گتھیاں کم نہیں ہوتیں۔

(۷) کپتان رشید الحق۔ استاد جغرافیہ پاکستان ملٹری اکاڈمی۔ کاکول۔

جی ہاں اردو ہمارے کالجوں میں انٹرمیڈیٹ اور اعلیٰ درجوں میں سائنس کے لیے ذریعہ تعلیم بن سکتی ہے۔ نہ صرف یہ کہ اردو میں یہ صلاحیت موجود ہے، بلکہ اردو کا ذریعہ تعلیم بن جانا نہایت ضروری ہے۔ اگر تعلیم کے معنی صرف کتابیں پڑھنا نہیں ہے۔ بلکہ دماغ اور ذہن کی جلا مقصود ہے تو اس کے لیے لازمی ہے کہ ذریعہ تعلیم طالب کی قومی زبان ہو، دوسرا فائدہ یہ ہے کہ مذہبی، معاشرتی اور تمدنی روایات کی حفاظت کے لیے

ایک قومی زبان ضروری ہے مجھے تاریخ میں کوئی ایسی مثال نہیں ملتی کہ قومیں غیر ملکی فاتحین کی زبان کی مدد سے بنی ہوں۔

انگریزی ذریعہ تعلیم جاری رکھنے میں پہلی دقت یہ ہے کہ طلبا کو بہت چھٹپنے سے انگریزی سکھانی پڑتی ہے یا پڑے گی جو تعلیمی اصول سے غلط ہے۔ کسی غیر زبان کی تعلیم چودہ سال سے کم عمر میں شروع نہ ہونی چاہیے یورپ میں جہاں غیر زبانوں کی تعلیم دی جاتی ہے (زبان کی حیثیت سے) وہاں اس اصول کو مدنظر رکھا جاتا ہے۔ غیر زبان سیکھ جانے کے باوجود طلبا میں وہ ذہنی بالیدگی ایک مدت تک پیدا نہیں ہوتی جو ایک مضمون کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے۔

غور طلب امر یہ ہے کہ اس وقت ہمارے اسکولوں میں دسویں تک اردو ذریعہ تعلیم ہے۔ انٹرمیڈیٹ میں آکر تمام مضامین کو یک بیک انگریزی میں پڑھانے میں وہی دقتیں پیش آتی ہیں جو کسی شخص کو کسی بالکل غیر زبان میں کسی مضمون کے سمجھنے میں پیش آتی ہیں۔ یہ ہرگز نہ سمجھا جائے کہ دسویں جماعت کا طالب علم انگریزی میں اتنی مہارت حاصل کر لیتا ہے کہ وہ کسی کتاب کو بلاتکلف پڑھنا شروع کر دے۔ لہٰذا انگریزی میں سائنس یا کوئی اور مضمون پڑھانے کے یہ معنی ہیں کہ انگریزی زبان پر انٹرمیڈیٹ میں اور اس سے قبل اسکولوں میں کافی زور دیا جائے اور پہلے انگریزی میں کافی مہارت حاصل کر لی جائے پھر سائنس یا کسی اور مضمون کا علم حاصل کیا جائے۔ یہی زبان کی دقت ہے جس کے سبب طلبا سائنس سے متنفر ہو جاتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ ہمارے طلبہ کا علمی معیار یورپ کے مقابلے میں اس قدر گرا ہوا ہے۔

(۸) کپتان اظہر علی خاں۔

اردو کو عام مضامین اور سائنس کے لیے بآسانی ذریعہ تعلیم بنایا جا سکتا ہے۔ اس سے بڑا فائدہ یہ ہوگا کہ طلبا مضمون کو حقیقی طور پر سمجھ سکیں گے۔ موجودہ صورت حال یہ ہے کہ طلبہ بغیر سمجھے ہوئے سائنس کے درس حفظ کر لیتے ہیں اور امتحان میں وہی چیزیں لفظ بہ لفظ پیش کر دیتے ہیں۔ انگریزی کا معیار چونکہ کم ہوتا ہے اس لیے طلبہ کو دو دقتوں سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ ایک تو زبان کی دقت دوسرے علم کی۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ سائنس کی تعلیم مشکل ہو جاتی ہے، وقت زیادہ درکار ہوتا ہے، سبق یاد کرنا ایک عذاب بن جاتا ہے

اور یاد کر لینے کے باوجود کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ مثال کے طور پر موجودہ تعلیم یافتہ طبقے میں ایسے افراد بے شمار مل جائیں گے جو باوجود انٹرمیڈیٹ سائنس پاس ہونے کے سائنس سے قطعی بے بہرہ ہیں۔

اردو ذریعۂ تعلیم ہو جائے تو یہ ساری مصیبتیں دور ہو جائیں۔ سبق یاد کر لینے کا سوال باقی نہ رہے گا صرف کالج میں توجہ سے سن لینا کافی ہوگا۔"

(۹) کپتان نور احمد خاں۔

انٹرمیڈیٹ کے درجوں میں اردو آسانی سے ذریعۂ تعلیم بن سکتی ہے۔ اس سے بڑا فائدہ ہوگا طلبا مضمون آسانی سے سمجھ لیں گے۔ میرا اپنا تجربہ ہے کہ بعض دقیق مسائل جب اردو میں بیان کیے گئے تو طلبا نے بہت خوشی سے سنے اور زیادہ آسانی سے سمجھ گئے۔

(۱۰) شریف احمد وارثی۔

مجھے یقین ہے کہ اگر انٹرمیڈیٹ کے درجوں میں سائنس پڑھانے کے لیے اردو استعمال کی گئی تو طلبا مضمون کو زیادہ آسانی سے سمجھ لیں گے اور معلم کو بھی آسانی ہوگی۔ میں لکچر کے دوران میں جس مقام پر بھی خیال کرتا ہوں کہ طلبا مضمون کو نہیں سمجھے اور ان کے چہرے سے یہ پتہ چلتا ہے کہ وہ زیر بحث امر کو قبول نہیں کر رہے ہیں تو اردو میں اس خیال کو دہراتا ہوں۔ اس سے ہمیشہ طلبا کے چہروں پر جو مسکراہٹ دوڑ جاتی ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سے پہلے جو دماغی بار ان پر پڑ رہا تھا وہ جاتا رہا ہے اور انھوں نے نفس مضمون کو پا لیا ہے۔

(۱۱) مسعود حسین خاں۔

مجھے اس سے اتفاق ہے کہ ہمارے کالجوں میں نہ صرف انٹرمیڈیٹ بلکہ بی۔ایس۔سی میں بھی سائنس کے لیے ذریعۂ تعلیم اردو قرار دی جا سکتی ہے۔ سب سے پہلا فائدہ تو یہ ہوگا کہ طالب علم کو ایک جانی پہچانی زبان میں علم حاصل کرنے میں بہ نسبت ایک مشکل زبان کے سہولت رہے گی۔ دوسرے وہ وقت جو طالب علم پہلے انگریزی زبان اور پھر مضمون کے سمجھنے میں صرف کرتا ہے، پوری طرح صرف مضمون کے سمجھنے میں لگا سکے گا۔ اس سے نتائج کے بہتر ہونے اور استعداد کے بڑھنے کے امکانات ہیں۔ آج کل سب سے بڑی

نت جو طلبا کو پیش آتی ہے وہ خود انگریزی سیکھنے اور پھر سمجھ کر سیکھنے کی ہے۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ طالب علم
نمون کو سمجھ لیتا ہے لیکن اس کو واضح طور پر بیان نہیں کر سکتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ گو ذریعہ تعلیم انگریزی
ہے لیکن ماحول انگریزی نہیں ہے، اور طالب علم اپنے وقت کے زیادہ حصہ میں انگریزی یا دوسری
یسی زبانوں کو استعمال کرنے کا عادی ہوتا ہے۔

(۱۲) کپتان فضل حسین

اردو یقیناً ذریعہ تعلیم بن سکتی ہے اور اسے جلد بننا چاہیے۔ کسی مضمون کے مطالعے میں عموماً اور سائنس
خصوصاً نفس مضمون پر غور کرنا اور اس پر عبور حاصل کرنا بذاتِ خود مشقت طلب امر ہے اور دماغی کاوش
ہتا ہے۔ غیر زبان کی الجھن اس میں اور دقت پیدا کر دیتی ہیں۔ اگر تعلیم اپنی زبان میں ہو تو وہ وقت جو
مشکلات کے حل کرنے میں ضائع ہوتا ہے نفس مضمون کے سمجھنے میں صرف ہوگی، اور طالب علم کی دماغی
ئیں تمام تر نفس مضمون حاصل کرنے میں صرف ہوں گی۔

طالب علم اپنی زبان میں اپنا ما فی الضمیر زیادہ صحیح اور بآسانی ادا کر سکتا ہے۔ اگر نفس مضمون اس کے
اغ میں صاف ہے تو اس کو یہ کسی نہ کسی طرح ضرور ادا کر سکتا ہے۔ لیکن زبان غیر ہو تو نفس مضمون ذہن
ں صاف ہونے کے باوجود بھی اس کو صحیح طور پر ادا کرنے میں دقت ہوتی ہے جس کی وجہ سے اس کو غیر
بان کے الفاظ اور فقرے اور ان کی ساخت بلا وجہ یاد کرنی پڑتی ہے اور اس کی توجہ نفس مضمون سے
ٹ جانے کا احتمال ہوتا ہے۔

(۱۳) ڈاکٹر رفیق احمد خاں صاحب۔ سابق صدر شعبہ نباتیات مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

مجھے اس رائے سے قطعی اتفاق ہے کہ ہمارے کالجوں میں سلیس اردو سائنس کی تعلیم کا اطمینان بخش
یہ بن سکتی ہے۔ اس سے اولاً استادوں کو لکچر دینے میں سہولت ہوگی۔ بد قسمتی سے کسی نے آج تک اس
یقت پر روشنی نہیں ڈالی کہ استادوں کے لیے بھی انگریزی زبان میں اعتماد کے ساتھ لکچر دینا کچھ آسان کام
ں ہے۔ چوں کہ اکثر استاد اپنے خیالات کو روانی کے ساتھ ادا نہیں کر سکتے۔ اس لیے ان کو مجبوراً مکمل
پہ حفظ کردہ کتابی زبان میں تقریر کرنی پڑتی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ متوسط درجہ کے ذہانت والے

طلباان کے لکچروں کو اچھی طرح سمجھ نہیں سکتے۔ میں نے علی گڑھ میں اکثر اپنے رفقائے کار کو جن کے ذمے انٹرمیڈیٹ کی تعلیم تھی اپنے لکچروں کو دل چسپ اور عام فہم بنانے کے لیے کہا مگر وہ انگریزی زبان میں عبور نہ رکھنے کے باعث اپنی کوششوں میں ناکام رہے۔ آخر کار میری ہدایت کے مطابق ان میں بعض نے سابقہ روایات کو بالائے طاق رکھ کر تجربہ کے طور پر وقتاً فوقتاً اردو میں تشریح کرنا شروع کر دیا۔ اس طریقے سے طلبا کو نمایاں فائدہ ہوا۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ طلبا کے لیے غیر زبان میں تعلیم حاصل کرنا بہت مشکل ہے۔ انٹرمیڈیٹ کے طالب علم انگریزی میں لکچروں کو اچھی طرح سمجھ بھی نہیں سکتے۔ نیز اپنی مشکلات کو رفع کرنے کے لیے استادوں سے انگریزی میں سوال و جواب کرنے سے قاصر رہتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ آیا طلبا اپنے گھروں یا ہوسٹلوں میں مشترکہ طریقے پر مطالعہ کرتے وقت انگریزی بولتے ہیں یا اردو۔ میرا مشاہدہ یہ ہے کہ وہ آپس میں دقیق مسائل پر بھی اپنی زبان میں گفتگو کرتے ہیں — آج کل عوام سائنس سے بالکل بے بہرہ ہیں۔ اس کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ ہمارے یورپ زدہ تعلیم یافتہ طبقے نے اپنی کوتاہ اندیشی سے سائنس اور انگریزی کو لازم ملزوم قرار دے کر عوام کے دلوں میں یہ غلط فہمی پیدا کر دی ہے کہ سائنس کے آسان اور روزمرہ مسائل کو سمجھنے کے لیے بھی انگریزی زبان سے واقفیت اشد ضروری ہے۔ اگر اردو میں سائنس کا چرچا ہو تو مجھے یقین ہے کہ عوام میں سائنس کو مقبولیت حاصل ہو جائے گی جو قومی ترقی کے لیے ضروری ہے۔

میرا ذاتی مشاہدہ ہے کہ اکثر طالب علم اپنے وقت اور قوت دماغی کا زیادہ حصہ انگریزی کے فقروں کو زبانی یاد کرنے میں خرچ کرتے ہیں۔ اگر اردو کو ذریعۂ تعلیم بنایا گیا تو طلبا وہی وقت اور دماغی قوت سائنس کے حقائق سے آگاہی حاصل کرنے میں صرف کریں گے۔

سوال :۔ کیا مختلف مضامین میں مناسب کتابیں موجود ہیں، اگر نہیں تو ان کے مہیا ہونے کی کیا صورت ہو سکتی ہے ؟

جواب (۱) ڈاکٹر رضی الدین صدیقی۔

اگر اردو کی اصطلاحیں خصوصاً جامعہ عثمانیہ کی اصطلاحیں اور علامتیں اختیار کی جائیں تو پھر

ہر مضمون کی کتابیں اردو میں دستیاب ہو سکتی ہیں۔

کسی مضمون کے لیے نصابی کتابیں دو تین سے زیادہ نہیں ہوتیں۔ ان کتابوں کو تیار کرانا خصوصاً انجمن ترقی اردو کے لیے مشکل نہ ہوگا۔ اس کے علاوہ طلبا چوں کہ انگریزی زبان سے واقف ہوں گے اس لیے وہ اس زبان کی کتابوں سے بھی استفادہ کر سکتے ہیں۔ بجنسہ اس طرح جس طرح خود انگلستان میں طلبا اپنی زبان کی کتابوں کے علاوہ فرینچ اور جرمن کتابوں سے بھی استفادہ کرتے ہیں۔

جامعاتی تعلیم میں اساتذہ کے لکچروں کی اہمیت کتابوں سے زیادہ ہوتی ہے۔ اس لیے اگر موزوں اساتذہ فراہم ہو جائیں تو پھر کتابوں کا سوال زیادہ اہمیت نہیں رکھتا۔

(۲) حافظ محمد عثمان

عثمانیہ یونیورسٹی کے نصابات آرٹس اور سائنس کے جملہ مضامین میں ایف۔ اے۔ ایف۔ ایس سی ـــ بی۔ اے۔ بی۔ ایس سی کے لیے قطعی کافی تھے اور ہیں۔ ان ہی کتابوں کو دوبارہ شائع کیا جا سکتا ہے۔ البتہ از بس ضروری ہے کہ ان کی زبان کو سادہ اور سلیس بنا لیا جائے۔ داخل نصاب انگریزی کتابوں کے تراجم طبع کرنے سے بہتر ہوگا کہ مصنفین اور ناشرین کو دعوت دی جائے کہ وہ ان کتابوں کی بنیاد پر جدید ترین نظریات کے اضافوں کے ساتھ نئی تالیف کی حیثیت سے پیش کریں۔ اس طرح اردو کی یہ نصابی کتابیں انگریزی کتابوں سے بدرجہا مفید ثابت ہوں گی۔ تالیف و اشاعت کا یہ کام زیادہ سے زیادہ ایک سال میں انجام پا سکتا ہے۔ اس عرصے میں معلمین اپنے لکچروں اور نوٹوں کے ذریعے طلبا کو بہترین فائدہ پہنچا سکتے ہیں۔ آج کل بھی یہی ہو رہا ہے کہ نصابی کتابوں کو ناکافی سمجھ کر اساتذہ تشریحی نوٹ لکھواتے ہیں۔ پھر یہ کام ظاہر ہے کہ اردو میں بھی انجام دیا جا سکتا ہے بلکہ اگر معلمین توجہ اور کوشش کریں تو ان کے یہی نوٹ ایک سال یا دو سال بعد کتابی صورت میں شائع ہو کر آئندہ آنے والے طلبا کو بھی فائدہ پہنچاتے رہیں گے۔

(۳) ڈاکٹر رفعت حسین صدیقی۔

انٹرمیڈیٹ کی جماعتوں کے لیے سائنس کی کتابیں موجود ہیں اور جس شعبے میں نہیں ہیں ان کو یقیناً ترجمہ کیا جا سکتا ہے۔ جو کتابیں موجود ہیں ان پر ممکن ہے کہ نظر ثانی کی ضرورت ہو۔ مگر اس کام میں زیادہ

وقت نہیں لگے گا۔

(۴) ڈاکٹر محمد افضال حسین قادری۔

بیشتر سائنسی مضامین کے لیے اردو میں کتابیں موجود ہیں۔ اردو زبان میں عثمانیہ میں تمام کلاسوں میں اور علی گڑھ میں انٹرمیڈیٹ میں تعلیم ہوتی رہی ہے۔ کچھ کتابیں چھپی ہوئی ہیں ان پر نظر ثانی کی جائے اور کچھ ترجمہ یا تالیف کی ہوئی رکھی ہیں ان کو شائع کیا جائے۔ زبان اور اصطلاحات کو خصوصیت کے ساتھ عام فہم کیا جائے۔

(۵) کیپٹن ان رشید الحق۔

دارالترجمہ حیدرآباد سے سائنس کی بہت سی کتابیں شائع ہو چکی ہیں، ان کی فہرست دیکھی جا سکتی ہے۔ جو کتابیں موجود نہیں ہیں ان کا ترجمہ کرایا جا سکتا ہے اور نئی کتابیں بھی مکمل لکھی جا سکتی ہیں۔ جب تک کتابیں نہ ملیں اساتذہ اپنے تفصیلی لکچر نوٹوں سے پورا کر دے سکتے ہیں۔

(۶) پیچر آفتاب حسن۔

حیدرآباد میں دارالترجمہ نے بہت سی موجودہ درسی کتابوں کا ترجمہ کر دیا ہے۔ ان کتابوں کو نظر ثانی کے بعد دوبارہ شائع کیا جا سکتا ہے۔ اکثر لوگوں کو ان کتابوں کی زبان بہت مشکل نظر آتی ہے۔ اس لیے نہایت ضروری ہے کہ دوبارہ شائع کرتے وقت زبان کو سلیس اور سادہ بنایا جائے۔

تراجم کے علاوہ بہت سے مصنفین نے انٹرمیڈیٹ وغیرہ کے لیے کتابیں بھی لکھی ہیں ان کو استعمال کیا جا سکتا ہے۔

جدید کتابوں کا ترجمہ کرایا جا سکتا ہے۔ اس سے بھی بہتر ہے کہ جدید کتابیں لکھوائی جائیں۔ یہ کوئی مشکل کام نہیں ہے۔ معقول معاوضہ دیا جائے تو اچھے کام کرنے والے مل جائیں گے۔

اساتذہ اپنے نوٹوں سے بھی درسی کتابوں کی کمی ابتدائی دور میں پورا کر سکتے ہیں۔

(۷) قاضی سعید الدین۔

کتابوں کی کمی اس طرح بھی پوری کی جا سکتی ہے کہ شروع شروع میں طلبا کو اجازت دی جائے

کہ وہ چاہیں تو اپنے جوابات انگریزی میں دیں یا اردو۔ کم از کم ایک عمدہ درسی کتاب جلد از جلد تیار کی جائے یا ترجمہ کروا لی جائے۔ اگر صرف ناشرین پہ کتابوں کو چھوڑا گیا تو کامیابی مشکل ہوگی۔ کیوں کہ اردو کتابوں کی نکاسی ابتدا میں کم ہوگی۔ اس لیے مناسب ہوگا کہ ایک رقم ہر سال ان کتابوں کی طباعت کے لیے مقرر کی جائے۔

مندرجہ بالا طریقوں سے صرف چند درسی کتابیں تیار ہو سکتی ہیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ دیگر عمدہ کتابیں تیار کی جائیں۔ فرانسیسی اور جرمن زبان کی اعلیٰ کتابوں کا ترجمہ کر دیا جائے۔ کتابوں کے لکھنے والوں اور ترجمہ کرنے والوں کو نہایت احتیاط سے محنت کرنی ہوگی۔ کیوں کہ ان کے کام پر آئندہ کام کا بہت کچھ دار و مدار ہوگا۔

(۸) مسعود حسن خاں

انٹرمیڈیٹ اور بی، ایس سی کے لیے کیمیا اور طبیعیات اور ریاضی کی تقریباً جملہ کتابیں ترجمہ یا تالیف شدہ حالت میں حیدرآباد سے شائع ہوئی ہیں۔ وہ دارالترجمہ کتاب محل نفیس اکاڈمی وغیرہ سے حاصل کی جا سکتی ہیں۔

(۹) کپتان فضل حسین۔

موجودہ اردو کی کتابیں اکثر انگریزی کی کتابوں کا ترجمہ ہیں جو خود پرانی ہیں۔ لہٰذا جو کتابیں موجود ہیں وہ اردو میں درسی کتابیں لکھنے میں تو ضرور مفید ہوں گی لیکن بذات خود کافی نہیں ہیں۔ علم کے معیار کو قائم رکھنے کے لیے بہتر ہے کہ ایسے اساتذہ جن کو پڑھانے کا تجربہ ہو کتابیں خود تالیف کریں۔ صرف ترجمہ پر قناعت نہ کریں۔

تالیف کا یہ کام نہایت سرعت سے ہونا چاہیے اور ابتدائی دو تین سالوں میں کافی ترقی کرنا چاہیے اس دوران میں اساتذہ کو نوٹ لکھوانے کی مشق اور موجودہ کتابوں سے پڑھانے کی دقتیں بھی معلوم ہو جائیں گی۔

(۱۰) کپتان نور احمد خاں۔

جامعہ عثمانیہ میں انٹرمیڈیٹ اور اعلیٰ تعلیم مدت سے اردو میں دی جا رہی ہے۔ وہ کتابیں استعمال کی جا سکتی ہیں۔ ضرورت ہو تو ان کی اصلاح بھی کی جا سکتی ہے۔ نئی کتابیں بھی لکھوائی اور ترجمہ کی جا سکتی ہیں۔

اس سلسلے میں میری ایک حقیر کوشش "انٹرمیڈیٹ آرگینک کیمسٹری" کے نام سے انگریزی میں موجود ہے اور درسی کتاب کی حیثیت سے پنجاب اور سرحد کے متعدد کالجوں میں مروج ہے۔ جس وقت

ضرورت ہوگی میں اس کو تین مہینے کے اندر اندر اردو میں منتقل کردوں گا۔"

(۱۱) ڈاکٹر رفیق احمد خاں۔

اردو میں سائنس کی کتابیں لکھی جائیں۔ میری رائے میں سب سے بہتر طریقہ یہ ہے کہ ہر ماہر فن سے درخواست کی جائے کہ وہ اپنے مضمون پر ایک مستند کتاب تالیف کرے۔ میں ترجمہ کے خلاف ہوں جہاں تک سائنس کا تعلق ہے ترجمہ کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ اردو میں سائنس کی کتابیں لکھنے والوں کی پاکستان میں بہت کمی ہے۔ بہرحال یہ کمی اردو کے عالموں کی مدد سے پوری کی جاسکتی ہے۔ اگر جادو ناتھ سرکار منشیوں کی مدد لے کر اورنگ زیب پر ایک کتاب لکھ سکتا تھا۔ اگر علامہ یوسف علی عربی کے عالموں کی مدد لے کر کلام پاک کا انگریزی میں ترجمہ کر سکتے ہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ ہمارے سائنس دان اردو کے ماہرین کے ساتھ مل کر سائنس پر کتابیں نہ لکھ سکیں۔ اس سلسلے میں میری تجویز ہے کہ ڈھاکہ، کراچی، لاہور اور پشاور میں اس مقصد کے لیے ادارے قائم کیے جائیں جہاں پر دھڑلے کے ساتھ اردو میں تصنیف و تالیف کا کام شروع کر دیا جائے۔

مجھے لکچر نوٹوں سے اتفاق نہیں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ استادوں کے نوٹ یقیناً مختلف ہوں گے ہاں اگر لکچر نوٹوں کی تیاری کے لیے ایک مرکزی ادارہ قائم کیا جائے تو اس تجویز کو عملی شکل دی جاسکتی ہے۔

(باقی آئندہ)

قطب جنوبی پر موسم سرما

(مسلسل نمبر۲)

ادریس احمد

آکسیجن کی کمی

بلند قطبی سطح مرتفع کی لطیف ہوا جہاں سردی کی شدت کو کم کرتی تھی، وہاں وہ کچھ اور قسم کی جسمانی تکلیفیں بھی پیدا کرتی تھی۔ لطیف ہونے کے باعث اس ہوا میں آکسیجن کی مقدار بہت کم تھی۔ نتیجہ یہ تھا کہ ذرا سا سخت کام کرنے سے انسان ہانپنے لگتا تھا۔ سائنس دانوں کی بستی کا ڈھانچہ اگرچہ موسم گرما میں تیار ہو گیا تھا۔ مگر اس ڈھانچے کو باقاعدہ کیمپ کی شکل دینے کے لیے ابھی کافی محنت کی ضرورت تھی۔ سرمائی رات کے شروع ہو جانے کے بعد تک یہ کام جاری رہا۔ چناں چہ ہر شخص کو روزانہ کئی گھنٹے کام کرنا پڑتا تھا۔ کم آکسیجن والی ہوا میں جسمانی مشقت کرنے سے تمام لوگوں کے وزن گھٹنے لگے۔ جو لوگ بڑے تن و توش کے مالک تھے ان کے وزن تیس تیس چالیس چالیس پونڈ کم ہو گئے۔ دبلے جسم کے آدمیوں کے وزن میں بھی کمی آ گئی۔ وزن کے علاوہ جسمانی قوت بھی واضح طور پر گھٹ گئی۔ اس بات کا احساس وزن اٹھاتے وقت یا ہاتھ سے وباؤ ڈالتے وقت ہوتا تھا۔ ہم جب کیمپ کو لیس کرنے کا کام ختم ہو گیا اور سب لوگ کیمپ کے اندر موجود ہو بیٹھے تو وزن دوبارہ بڑھنے لگے اور کچھ عرصہ بعد اصلی حالت پر واپس آ گئے۔ یہ اس بات کا ثبوت تھا کہ یہ لوگ قطبی موسم سے ہم آہنگ ہو گئے ہیں۔

اوّل اوّل ایک اور تکلیف جو بہت عام تھی جوڑوں کا سخت ہو جانا تھا۔ گھٹنے، کندھے اور کہنیاں اس طرح سخت اور بوجھل ہونے لگیں جیسے گنٹھیا شروع ہو رہا ہو۔ اس کی وجہ بھی آکسیجن کی کمی اور ایک دم شدید سردی میں آ جانے کے سبب دوران خون کا سست پڑ جانا تھا۔ رفتہ رفتہ یہ شکایات بھی دور ہو گئیں۔ اوّل اوّل باہر نکلنے پر سر درد ہونے لگتا تھا۔ لیکن وقت گذرنے کے ساتھ یہ شکایت بھی جاتی رہی۔

رات کا گھپ اندھیرا شروع ہو جانے کے بعد ان لوگوں نے اپنے کیمپ سے نیچے برف میں ایک سرنگ کھودنی شروع کر دی تھی۔ اس سے ایک غایت تو یہ تھی کہ برف کی موٹی تہ کا مطالعہ کیا جائے اور دوسری غایت

اِنی حاصل کرنا تھا۔ ہر شخص باری باری کھدائی کا کام کرتا تھا۔ اس طرح رفتہ رفتہ ۲۷۰ فٹ لمبی ۹ فٹ گہری ۱۱ فٹ چوڑی اور سات سے بیس فٹ اونچی سرنگ تیار ہو گئی۔ باہر درجۂ حرارت کی کیفیت خواہ کچھ بھی ہوتی سرنگ کے اندر درجۂ حرارت ہمیشہ کم و بیش صفر سے ۶۰ درجے کم رہتا۔ کھدائی کا کام خاصہ تکلیف دہ تھا۔ ایک آدمی لگاتار تین گھنٹے سے زیادہ کام نہیں کر سکتا تھا۔ کام کرتے وقت عموماً ہلکے کپڑے پہنے جاتے تھے یعنی بھاری سوتی انڈرویئر۔ اس پر ایک ہلکا اونی لباس اور اس کے اوپر دوبارہ ایک ہلکا سوتی عبا۔ اس لباس میں کام کرتے وقت پہلے گھنٹہ میں پسینہ آجاتا لیکن دوسرے گھنٹے میں جب تکان کے سبب کام کی رفتار مدھم پڑ جاتی تو جسم ٹھٹھرنے لگتا۔ سب سے پہلے پاؤں کی انگلیاں ٹھنڈی ہو جاتیں۔ پھر ناک منجمد ہونے لگتا۔ اور تیسرے گھنٹے کے آخر تک جسم بالکل سن ہونے لگتا۔ ہر شخص اس بات پر متفق تھا کہ کام کا دشوار ترین حصہ سرنگ میں سے واپس اوپر آنے کا کام تھا۔ واپس آکر گرم کمرے میں بستر پر کئی گھنٹے تک آرام کرنے کے بعد جسم کی حرارت واپس آتی۔

رہائشی انتظامات

سرد برفانی علاقوں میں رہائشی انتظامات کافی دِقّت کا موجب ہوتے ہیں۔ وجہ یہ کہ سردی کی شدت کم کرنے کے لیے لوگ تنگ و تاریک جگہوں میں سکڑ کر ایک ساتھ وقت گذارنے کی کوشش کرتے ہیں اس سے صاف ستھری زندگی اور ذاتی تنہائی ناممکن ہو جاتی ہے۔ تاہم سرد علاقوں کے لوگ ان چیزوں کے عادی ہو جاتے ہیں۔ وہ غلیظ اور تنگ و تاریک گھروں میں زندگی گذارنے کے خوگر بن جاتے ہیں۔

قطب جنوبی میں جب پہلی امریکی مہم گئی تو اس کے آٹھ آدمیوں نے دس فٹ مربع کمرے میں سردیاں بسر کیں۔ لیکن اس مرتبہ قطب پر جو امریکی کیمپ تیار کیا گیا اس کا چپٹا ہموار قبہ چھ ہزار مربع فٹ سے کم نہ تھا۔ یعنی ہر آدمی کو تقریباً اتنی جگہ حاصل تھی جتنی پہلی مہم میں آٹھ آدمیوں کو میسر تھی، صرف یہی نہیں بلکہ ہر آدمی کے لیے بجلی کا قمقمہ موجود تھا۔ پھر کپڑے دھونے والی مشین اور کپڑے خشک کرنے والی برقی الماری موجود تھی۔ ہفتے میں تین بار فلمیں دکھانے کا سامان موجود تھا۔ غرض قطب جنوبی کے عین اوپر بیٹھے ہوئے آدمیوں کے لیے زندگی کی وہ تمام سہولتیں موجود تھیں جو امریکی بحریہ کے اڈوں میں ہر جگہ مہیا کی جاتی ہیں۔

برفانی علاقوں میں بظاہر پانی کی کوئی کمی نہیں ہوتی لیکن برف کو کاٹنا اور اسے پگھلا کر پانی میں تبدیل کرنا کوئی آسان کام نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ برفانی علاقوں کے لوگ نہانے دھونے کے معاملے میں کافی بخیل ہیں۔ قرونِ وسطیٰ میں یورپ کے کئی مذہبی فرقے اور مذہبی سورما بڑے فخر سے کہا کرتے تھے کہ ہم نے اتنے ہفتوں یا مہینوں سے اپنے جسموں یا کپڑوں کو پانی سے تر نہیں کیا۔ تاہم قطب جنوبی پر مقیم سائنس دانوں نے پانی کی مطلق کفایت نہیں کی۔ ان کے کیمپ میں ٹھنڈے اور گرم پانی کے فوارے، غسل خانے موجود تھے۔ جسم اور لباس کی صفائی کا پورا پورا خیال رکھا جاتا تھا۔

کشادہ سکانیت کا ایک فائدہ یہ تھا کہ ہر شخص کو وقت کا بڑا حصہ اپنا کمرہ صاف ستھرا رکھنے میں صرف کرنا پڑتا تھا، اور یہ مصروفیت وقت گذارنے کا نہایت خوش گوار ذریعہ تھی۔ اس برفانی بیابان میں ایک اور اہم سوال غذا کا پیدا ہو سکتا تھا۔ لیکن ہر قسم کا رسد کا سامان سردیوں کے آغاز سے پہلے امریکی ہوا بازوں کے ذریعہ پہنچ گیا تھا۔ رسد کی فراوانی کا اندازہ اس امر سے ہو سکتا ہے کہ کیمپ میں تین ٹن تازہ گوشت موجود تھا۔ رسد کا تمام سامان برفانی تہ خانے میں محفوظ پڑا تھا۔ جہاں درجہ حرارت صفر سے ۰۰ درجے کم تھا۔ تاہم گوشت یا دوسری چیزوں کے استعمال سے پہلے ان کا انجماد توڑنا پڑتا تھا، اور یہ کام کوئی ہفتہ بھر لے لیتا تھا۔ ہر قسم کی غذائی ضروریات کوئی چھے سے آٹھ پونڈ روزانہ تھیں، اور یہ ضروریات بڑی آسانی سے پوری ہوتی رہیں۔

اس برفانی ویرانے میں جہاں روئیدگی کا نام و نشان تک نہ تھا۔ نہ درختوں کے پتے اکٹھے کرنے کے لیے جھاڑو کی ضرورت تھی اور نہ گرد ہٹانے کے لیے جھاڑ کا ڈ کی ضرورت۔ لیکن کیمپ کو جلد معلوم ہو گیا کہ انھیں ان دونوں چیزوں کی ضرورت ہے۔ جب زیادہ برف گرتی اور ان کے اندر باہر آنے جانے کا راستہ رک جاتا تو اسے جھاڑو سے صاف کرنے کی ضرورت پڑتی۔ لیکن بسا اوقات برف اتنی پتلی اور ہوائی قسم کی ہوتی کہ پانی چھڑک دینے سے وہ یوں غائب ہو جاتی جس طرح گرد تہ نشین ہو جاتی ہے۔

موسمیات کا مطالعہ

دنیا بھر کے مشہور سائنس دان قطب جنوبی پر دل لگی کے لیے جمع نہ ہوئے تھے بلکہ ان کے سامنے پہلا مفید مقصد سائنسی معلومات جمع کرنا تھا۔ چناں چہ ہر شخص توجہ کا زیادہ حصہ اسی مقصد پر صرف کرتا

قطب پر مقیم اٹھارہ افراد میں ایک ڈاکٹر تھا۔ حسن اتفاق سے اسے علاج معالجے پر وقت صرف کرنے کی ضرورت نہ پڑی چنانچہ وہ بھی سائنسی تحقیق میں مصروف رہا۔ سرما کے طویل اوقات فراغت میں اس نے قیاس القویم کے علم سے ایک آلہ وضع کر لیا جس کی مدد سے انسان کی حرکات کا ریکارڈ از خود تیار ہو جاتا تھا۔ مگر اس کا اس سے بڑا کارنامہ گملوں میں پودے تیار کرنا تھا۔ برفانی سرنگ کھودتے کھودتے یخ کی تہوں میں سے کائی کے ریشے نظر پڑ جاتے تھے۔ یہ ریشے دور دراز علاقوں سے ہوا کے کندھوں پر سوار ہو کر خاکی ذرات کے ہمراہ قطب پر آن پہنچے اور ان گنت سالوں سے یخ کے سینے میں چھپے پڑے تھے۔ جب انھیں اس سرد خانے سے رہائی دلا کر گملوں میں لگایا گیا تو وہ از سر نو زندہ ہو گئے۔

مگر سائنس دانوں کے نقطۂ نگاہ سے اہم ترین شے موسمیات کا مطالعہ تھا، یہ یقین کرنے کے لیے وجوہ موجود ہیں کہ دنیا میں جو موسمی تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں ان میں قطبوں کی موسمی کیفیتوں کو بڑا دخل حاصل ہے۔ چنانچہ سائنس دان لمبی قطبی رات میں لگاتار موسمی مطالعے میں مصروف تھے۔ قطب پر مقیم اٹھارہ آدمیوں کی جماعت میں سے چار موسمیات کے ماہر تھے۔ ان کے حساس آلے کیمپ سے باہر چند گز کے فاصلے پر نصب تھے۔ ان آلوں کا مطالعہ چوبیس گھنٹے جاری رہتا۔ اس غرض سے دو دو سائنس دان، باری باری کام سنبھالتے۔ باہر موسم خواہ کسی قسم کا ہوتا ہر دو تین گھنٹوں کے بعد ایک شخص بھاری بھر کم لباس پہنے باہر نکلتا اور بھاری قدموں سے چلتا ہوا نصب شدہ آلوں تک پہنچتا۔ موسمیات کے مطالعے میں ایک اہم چیز درجۂ حرارت تھی۔ تھرمامیٹر پڑھتے وقت سانس روک لیا جاتا تاکہ سانس کے بخارات سے تھرمامیٹر دھندلا نہ ہو جائے۔ یا اس کی حرارت سے پارہ ایک درجے کے دسویں حصے تک بھی متاثر نہ ہو جائے۔

ایک اور آلہ آندھی کی رفتار اور اس کی سمت کی خبر دینے کے لیے تھا۔ ایک اور آلہ یہ ظاہر کرتا تھا کہ یخ بستہ سطح اور آسمان کے درمیان حرارت کا تبادلہ کس انداز سے ہو رہا ہے۔ ماہر موسمیات کے ان تراشوں کی خاص طور پر تلاش کرتا جو صاف آسمان سے نیچے گرتے رہتے تھے۔ وہ کہر کے ان کھوکھلے گولوں کی تلاش بھی کرتا جو ہاتھ لگانے سے فوراً غائب ہو جاتے۔ یہ گولے اس وقت پیدا ہوتے تھے جب یخ کی سطح کے مقابلے میں بالائی ہوا زیادہ گرم ہو جاتی۔

موسمیات کے مطالعہ کا ایک اہم جزو ہوا کے بالائی طبقوں کی کیفیت کا حال معلوم کرنا تھا۔ اس مطلب کے لیے تھوڑے تھوڑے وقفوں کے بعد غبارے ہوا میں چھوڑے جاتے۔ غبارے کے اندر ریڈیائی پیغام نشر کرنے والے نازک آلے لگے ہوتے۔ جب غبارہ اوپر جاتا تو اس کے نشر کردہ پیغامات کیمپ میں نصب کردہ حساس آلوں کی مدد سے خود بخود ریکارڈ ہوتے جاتے۔ غباروں میں بھرنے کے لیے ہائیڈروجن تیار کرنے کا سامان موجود تھا۔ ایک بہت بڑے آلے میں المونیم کے ٹکڑے کاسٹک سوڈا اور کئی گیلن پانی ڈال دیا جاتا اور ہائیڈروجن تیار ہونے لگتی۔ غبارہ چھوڑنے کے لیے جب چھت کا دروازہ کھلتا تو زہریلی ہوا کی طوفانی لہریں پل بھر میں کمرے کو یخ سے سرد بنا کے رکھ دیتیں۔

موسم گرما میں قطبی سورج کے گرد قوس قزح کے رنگوں کا ایک دائرہ نظر آتا تھا۔ سردیوں میں جب سورج چھپ گیا اور چھے مہینے کی رات نے سیاہ چادر تان دی تو مہینے میں تقریباً آدھے دن چاند نظر آتا اس کے گرد بھی مدھم زرد روشنی کا ایک ہالہ موجود رہتا۔ یہ کرشمے فی الحقیقت یخ کے ان ننھے ننھے ذرات کی بدولت ظہور میں آتے ہیں جو قطبی ہوا میں تیرتے پھرتے ہیں۔

غبارہ بلندی پر جانے کے بعد بالائی طبقوں کی موسمی کیفیت کی خبریں دینے لگتا تھا۔ غبارہ چھوڑنے کے کوئی گھنٹہ بھر بعد موسمیات کے ماہران ریڈیائی پیغاموں کو جمع کرنے اور ان کی توجیہہ کرنے کا کام شروع کر دیتے یہ پیغام ہوا کے درجۂ حرارت، اس کے دباؤ اور اس میں موجود نمی کی خبر دیتے۔ تمام خبریں جمع ہو جانے پر انھیں ریڈیو کے ذریعے قطبی جنوبی کے مرکزی موسمی ادارے تک پہنچا دیا جاتا، جہاں سے یہ آگے نشر کی جاتیں۔
ماہرین موسمیات کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ قطب کے "آئنوسفیر" یعنی اس کی برقی فضا کا مطالعہ کیا جائے

جوں جوں زمین سے اوپر جائیں ہوا لطیف سے لطیف ہوتی جاتی ہے۔ زمین سے ۵۰ سے ۲۵۰ میل کے فاصلے پر ہوا کی جو چادر واقع ہے وہ بے حد لطیف ہے اور "آئنوسفیر" کے نام سے موسوم ہے۔ کرۂ ہوائی کا یہ حصہ برقی قوت کا حامل ہے۔ اور اس طرح ریڈیائی پیغاموں کے لیے ایک بہت بڑی دیوار کا درجہ رکھتا ہے۔ جو ریڈیائی پیغام اس دیوار سے جا کر ٹکراتا ہے وہ زور سے واپس آتا ہے اور اس طرح اسے افق سے آگے نشر کرنا ممکن ہو جاتا ہے۔ سائنس دان اس حقیقت سے مدتوں سے آگاہ ہیں۔ لیکن ان کا خیال تھا کہ "آئنوسفیر"

برقی قوت سورج کے انعکاس کی رہین منت ہے۔ جب سورج کی کرنیں کرۂ ہوائی میں سے گذرتی ہیں تو ہوا کے بالائی طبقے ان سے برقی قوت جذب کر لیتے ہیں لیکن قطبوں پر ہوا کے نچلے طبقے مہینوں تک سورج کی روشنی سے محروم رہتے ہیں بمثلاً قطب جنوبی پر جنوب کے مہینے میں سطح زمین سے لے کر ۳۰۰ میل کے فاصلے تک اندھیرا ہی اندھیرا تھا۔ ۳۰۰ میل سے آگے ابدی روشنی کا طبقہ شروع ہوتا تھا۔

قطب جنوبی سے آئنو سفیر میں ریڈیائی پیغام بھیجنے کے لیے ایک ۷۵ فٹ لمبا کھمبا موجود تھا۔ اس کھمبے سے ہر پندرہ منٹ کے بعد ریڈیائی پیغام اوپر بھیجے جاتے تھے۔ اور جب یہ واپس آتے تو انھیں حساس آلوں کے ذریعے ریکارڈ کر لیا جاتا۔ ان واپسی جوابوں کے متعلق خیال یہ تھا کہ وہ دنیا کے دوسرے حصوں کے مقابلے میں مختلف قسم کے ہوں گے۔ لیکن یہ خیال درست ثابت نہ ہوا۔ اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا گیا کہ آئنو سفیر سورج سے براہ راست برقی قوت حاصل نہیں کرتا۔ اس کی برقی قوت کا سرچشمہ کوئی اور ہے۔

قطبی خطوں میں رات کے اندھیرے میں بعض اوقات سبزی مائل سفید روشنی پیدا ہوتی ہے۔ یہ روشنی کبھی کبھی اتنی تیز ہوتی ہے کہ سارے آسمان کو نور سے بھر دیتی ہے۔ اس روشنی کے مطالعہ کا خاص اہتمام کیا گیا تھا۔ جو سائنس دان اس مطالعہ پر مامور تھا وہ چوبیس گھنٹوں میں بمشکل تین گھنٹے سوتا۔ اس کا بیشتر وقت پلاسٹک کے بنے ہوئے سفید مشاہداتی گنبدوں میں گذرتا۔ لیکن اول اول اسے مشکل یہ پیش آئی کہ گنبد کے اندر درجۂ حرارت کو کافی بڑھانے اور تیز پنکھوں کے ذریعے ہوا کو حرکت میں رکھنے سے اس مشکل پر قابو پا یا گیا۔

علم الارض کے ماہر کے ذمے یہ کام تھا کہ قطب کی برفانی ٹوپی کے مطالعہ سے گذرے ہوئے زمانوں پر روشنی ڈالے۔ یہ معلوم کرے کہ برفانی ٹوپی ہر سال موٹائی میں کس قدر بڑھتی ہے اور اس کی کل تہیں کتنی ہیں۔ اس سے ماضی کے موسمی حالات کا حال معلوم مطلوب تھا۔ اس سائنس دان کا بیشتر وقت یخ کی دنیا میں گذرتا کیوں کہ اسے اپنی تجربہ گاہ میں بھی درجہ حرارت صفر سے ۲۵ درجے کم رکھنا پڑتا۔

قطب کی برفانی ٹوپی کی یخ بستگی کا یہ عالم ہے کہ سردیوں میں اسے آگ کے شعلے بھی پگھلا نہیں سکتے۔ ایک روز جب درجہ حرارت صفر سے ۷۰ درجے کم تھا، چند سائنس دان باہر نکلے وہ پیا

وہ اپنے ساتھ کچھ خشک لکڑیاں بھی لیتے گئے۔ باہر یخ کے مرمریں فرش پر انھوں نے آگ روشن کی۔ اس کے شعلے اتنے بلند تھے کہ ارد گرد دور تک روشنی پھیل گئی۔ مگر سردی کی شدت کا یہ عالم تھا کہ یخ بستہ فرش میں سے پانی کا قطرہ تک نہ رِس سکا۔

قیدِ تنہائی کا خاتمہ

قطب پر مقیم سائنس دان اگرچہ علمی جہاد میں مصروف تھے اور یہ احساس ان کی ہمتوں کو بلند اور ان کے دلوں کو گرمائے رکھتا تھا۔ لیکن پھر بھی انسانی احساسات کبھی نہ کبھی ہر شخص پر غالب آ جاتے تھے۔ یہ اٹھارہ آدمی ایک بھیانک برفانی بیابان میں ساری دنیا سے الگ تھلگ بیٹھے تھے۔ مہینوں سے چند جانے پہچانے چہروں کے علاوہ ان کی نگاہ کسی اور انسان پر نہ پڑی تھی۔ اس سے لازمی طور پر تنہائی کا شدید احساس پیدا ہوتا تھا۔ یہ احساس بستر پر لیٹتے وقت اور بھی زیادہ شدید ہو جاتا۔

لیکن گو یہ لوگ جسمانی طور پر باقی دنیا سے الگ تھلگ تھے، وہ لگاتار خویش و اقارب اور عزیز و اقارب سے بات چیت کرتے رہتے تھے۔ الیکٹرونک آلوں کے ذریعے وہ امریکہ میں بیٹھے ہوئے دوستوں عزیزوں کے ساتھ ریڈیائی پیغاموں کا تبادلہ کر سکتے تھے۔ یہ چیز تنہائی کی شدت کو کم کرنے کا ایک اچھا ذریعہ تھی۔

آخر ستمبر میں سورج نکلنے پر سب کو امید بندھ گئی کہ اب کوئی دن جاتا ہے کہ ایک گرجتا ہوا ہوائی جہاز آئے گا اور گھر سے خطوط لائے گا۔ لیکن اس انتظار میں بھی تقریباً ایک مہینہ گذر گیا۔ آخر ۱۷ اکتوبر کو پیغام پہنچا کہ ہوائی جہاز چلا آ رہا ہے۔ سب لوگ کیمپ سے باہر نکل آئے اور تمام نگاہیں شمالی افق پر گڑ گئیں۔ آخر افق پر ایک سیاہ نقطہ ظاہر ہوا، جو بڑھتے بڑھتے ایک چمکیلے ہوائی جہاز کی شکل اختیار کر گیا۔ آخر یہ جہاز سروں پر آن پہنچا۔ ایک بھاری جہاز تھا جو نیچے نہیں اتر سکتا تھا۔ اس نے ڈاک کے تھیلے اور کچھ ضروری سامان پیراشوٹوں کے ذریعے نیچے گرایا اور واپس چلا گیا۔ ڈاک کی آمد ہر ایک کے لیے عید کی آمد سے کم نہ تھی۔ پورے آٹھ ماہ کے بعد وہ اپنے عزیز و اقارب کے خطوط پڑھ رہے تھے۔

اس کے نو دن بعد ایک مسافر بردار جہاز آن پہنچا جس میں سائنس دانوں اور فنی ماہروں کی ایک نئی کیمپ سوار تھی۔ یہ لوگ قطبی سرما گذارنے والے لوگوں کو سبکدوش کرنے اور ان کی جگہ لینے آئے تھے۔

مہینوں کی تنہائی کے بعد نئے چہروں سے دوچار ہونا خوش گوار چیز ہونی چاہیے تھی لیکن یہ خوش گوار جذبہ بہت جلد ناگواری میں تبدیل ہونے لگا۔ جن لوگوں نے پورے آٹھ مہینے مکمل علیحدگی میں گذارے تھے ان کے درمیان ایک عجیب و غریب جذبۂ رفاقت پیدا ہو چکا تھا۔ وہ ایک دوسرے کو خوب سمجھنے اور مقررہ روایات کا احترام کرنے لگے تھے۔ مگر نوواردان چیزوں سے نابلد تھے۔ انھیں کیمپ کی روایات اور اس کی اجتماعی فضا کی کچھ خبر نہ تھی۔ اس چیز نے نوواردوں اور پہلے سے موجود لوگوں کے درمیان مغائرت کی ایک دیوار سی کھڑی کر دی۔ اس پر طرہ یہ کہ تقریباً ایک ہفتے کے اندر اندر تمام نوواردہ صاحب فراش ہو گئے۔ وہ ساتھ طرح طرح کا نزلہ و زکام اور اس قسم کی دوسری بیماریاں لائے تھے۔ قطبی سطح مرتفع کی بلندی کے سبب یہ بیماریاں فوراً شدید شکل اختیار کر گئیں۔ بالآخر نوواردوں کے جراثیم نے دوسروں کو بھی بستر پر چت گرا دیا۔ اور قطبی موسم کے خوگر لوگوں کو بھی نزلہ و زکام نے ایسی بری طرح زچ کیا جس کا انھیں پہلے کبھی تجربہ نہ ہوا تھا۔ بالآخر پرانے تجربہ کار لوگ دو دو چار چار کر کے رخصت ہونے لگے۔ سائنسی تحقیق و جستجو کا جو کام انھوں نے شروع کر رکھا تھا، وہ ابھی مکمل نہ ہونے پایا تھا۔ بہت سے سائنس دانوں کی دلی آرزو تھی کہ جس کام کو وہ ہاتھ ڈال چکے ہیں وہ خود انھی کے ہاتھوں پورا ہو۔ مگر امریکی بحریہ کے احکام کی بجا آوری ضروری تھی۔ لہٰذا تمام پرانے سائنس دانوں کو ایک ایک کر کے رخصت ہونا پڑا۔ ہر چند کہ گھر اور عزیز و اقارب کی کشش، مہذب زندگی کی گوناگوں سہولتوں کا لطف اور آنے والی کرسمس کا رنگا رنگ حسن ان لوگوں کو واپس گھر کی طرف کھینچ رہے تھے۔ تاہم قطب جنوبی سے رخصت ہوتے وقت ہر شخص ملے جلے جذبات سینے میں لیے رخصت ہوتا تھا۔ اس کی وجہ نہ صرف اس کیمپ کے ساتھ محبت تھی جس میں اٹھارہ انسانوں نے ایک مشترکہ مقصد کے لیے کئی مہینے اکٹھے گذارے تھے، بلکہ اس سفید بیابانی ویرانے کا وہ وحشی حسن بھی تھا، جو ہر دیکھنے والی آنکھ کو دعوت نظارہ دیتا تھا۔

سال کا گرم ترین دن

یہ پہلی بار تھی کہ انسان نے پورا سال قطب پر گذارا ہو۔ سال بھر میں درجہ حرارت کا جو ریکارڈ تیار ہوا تھا وہ ایک لحاظ سے غیر متوازن نظر آتا تھا۔ سال کا سرد ترین دن وہ تھا جب درجہ حرارت صفر سے ۱۰۲ درجے

ہے گر گیا تھا۔ یہ دن طلوع آفتاب سے عین پہلے آیا تھا۔ شدید سردی کا ایک دور موسم سرما کے آغاز میں بھی آیا
ا لیکن سال کا گرم ترین دن وہ تھا جس دن درجہ حرارت صفر سے ساڑھے پانچ درجے اوپر چڑھ آیا تھا۔
آب و ہوا کے ماہرین کو یہ چیز بڑی عجیب معلوم دیتی تھی۔ دنیا کے مختلف خطوں کی آب و ہوا کا خاصہ یہ ہے
زیادہ سے زیادہ درجہ حرارت اوسط درجہ حرارت سے تقریباً اسی قدر زیادہ ہوتا ہے جس قدر کم از کم درجہ
رت اسی سے کم ہوتا ہے۔ قطب جنوبی پر اوسط درجہ حرارت صفر سے ۶۰ درجے کم تھا۔ اس طرح اس کا زیادہ سے
ددہ درجہ حرارت اوسط سے ۶۴ درجے زیادہ تھا۔ عام قاعدے کے مطابق کم از کم درجہ حرارت بھی اوسط
ے ساڑھے پینسٹھ درجے کم ہونا چاہیے تھا یعنی اسے صفر سے ۱۲۰ یا ۱۲۵ درجے کم تک پہنچنا چاہیے تھا۔
رفی الحقیقت کم از کم درجۂ حرارت صفر سے صرف ایک سو درجے کم تک پہنچا تھا۔

درجہ حرارت کے اس عدم توازن کی ایک وجہ یہ ہو سکتی تھی کہ اس سال قطب کا موسم سرما غیر معمولی
د پر گرم ہو رہا ہو۔ اس کا سبب یقینی طور پر آندھیوں کی بلا خیز تندی ہی ہو سکتی ہے۔ قطب جنوبی پر
م سردیوں میں آندھی اتنی تیز چلتی رہی کہ پُر سکون موسم کی حالت کبھی کبھی پیدا نہ ہو سکی۔ ہوشیار
ے ماہر یہ نکتہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ سردی کی انتہائی شدت ان مقامات پر پیدا ہو سکتی ہے۔ جہاں
سم پُر سکون ہو۔ قطب جنوبی پر ہوا میں سکون صرف گرمیوں کے موسم میں دیکھنے میں آتا ہے۔

قطبوں کے متعلق جو ایک سوال بہت عام طور پر پوچھا جاتا ہے یہ ہے کہ وہاں کتنی برف پڑتی
ریۂ موسمیات کے سامنے سب سے بڑی مشکل قطبوں کی برف باری کی پیمائش ہے کیوں کہ یہ فیصلہ
ا مشکل ہو جاتا ہے کہ کتنی برف آسمان سے گری ہے۔ اور کتنی آندھیوں سے اڑ کر آئی ہے۔ قطب پر مہم
ئنس دانوں کو یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ پچھلے ماہ طویل رات کے آغاز سے پہلے ان کے ٹریکٹروں نے برف پر
ہری لکیریں پیدا کی تھیں وہ موسم سرما کے خاتمہ پر بھی نظر آتی تھیں۔ برف پر جگہ جگہ کچھ فاصلے پر جو کھمبے
ں گاڑے گئے تھے۔ ان کھمبوں کی پیمائش سے معلوم ہوا کہ فروری سے لے کر نومبر تک کے دس مہینوں
ں صرف چھے انچ برف پڑی تھی۔ یہ مقیاس گو سو فیصد درست خیال نہیں کیا جاتا تاہم جب تک کوئی
ر مقیاس تیار نہ ہو جائے اس وقت تک یہ اندازہ کافی سمجھا جانا چاہیے۔

قطبی برف کے متعلق ایک اور قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ یہ تہہ بہ تہہ جمع ہوتی چلی جاتی ہے۔ اسے پگھلنے کی کبھی نوبت ہی نہیں آتی۔ نتیجہ یہ ہے کہ قطبوں پر برفانی ٹوپی کی تہ میلوں موٹی ہو گئی ہے۔ قطبِ جنوبی کی سفید سطح سمندر سے ۹۲۰۰ فٹ اونچی ہے۔ لیکن ریڈیائی لہروں کی گونج سے اندازہ کیا گیا ہے کہ برف کی تہ کوئی ۸۳۰۰ فٹ موٹی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ قطبِ جنوبی پر سطحِ زمین کی اصل بلندی صرف ۹۰۰ فٹ کے لگ بھگ ہے۔ لیکن طویل صدیوں میں برف نے جمع ہو ہو کر سطحِ زمین کو ڈیڑھ میل موٹی سفید برفانی ٹوپی پہنا رکھی ہے۔

قطبِ جنوبی پر جو سائنس دان مقیم تھے۔ انھوں نے یہ معلوم کرنے کی کوشش بھی کی کہ زمین کے زلزلوں کے جو جھٹکے محسوس ہوتے رہتے ہیں، ان کا اثر قطبوں پر بھی محسوس ہوتا ہے یا نہیں۔ اس مطلب کے لیے ہزار فٹ گہری سرنگ میں حساس سائنسی آلے نصب کیے گئے تھے۔ ان آلوں کی مدد سے پہلی بار حقیقتہ معلوم ہوئی کہ قطب پر زلزلوں کے علاوہ کچھ اور جھٹکے بھی محسوس ہوتے رہتے ہیں۔ یہ جھٹکے یقیناً ان تبدیلیوں کی پیداوار ہیں جو برف کی ڈیڑھ دو میل موٹی تہ میں پیدا ہوتی رہتی ہیں۔

قطب پر مقیم لوگوں کے لیے جہاں اور خطرے تھے وہاں سب سے بڑا آگ کا تھا۔ کیمپ کو گرم اور روشن رکھنے نیز ہائیڈروجن پیدا کرنے کے لیے آگ اور بجلی سے لگاتار کام لینا پڑتا تھا۔ اس سلسلے میں ذرا بے احتیاطی کیمپ کو جلا کر راکھ کر سکتی تھی۔ اس خطرے کے پیشِ نظر کیمپ کو دو حصوں میں بانٹ گیا تھا اور دونوں حصوں کے درمیان برف کی ایک موٹی دیوار بنائی گئی تھی تاکہ اگر ایک حصہ جل جائے تو دوسرا سلامت رہے۔ اس احتیاط کے علاوہ اور بہت سی حفاظتی تدابیر اختیار کی گئی تھیں کہ چھ ماہ لمبی رات میں کسی بیرونی مدد آنا خارج از بحث تھا۔

غرض قطبِ جنوبی پر سردی کے چھ مہینے گذار کر سائنس دانوں نے نہ صرف بہت قیمتی سائنسی معلومات جمع کر لیں بلکہ دنیا پر یہ بھی ثابت کر دیا کہ عین قطب کی چوٹی پر سردیاں بسر کرنا ممکن ہے۔ یقیناً ایک بہت بڑا سائنسی کارنامہ ہے جس کی مدد سے نوعِ انسان آنے والے سالوں میں قطبوں کے کئی سر معلوم کر سکے گی ۰

اصلاحِ انشاء کی مہم

کوثر حسین

مدرسے میں تحریری کام کی اصلاح پر جس قدر زور دیا جائے کم ہے۔ کیوں کہ اصلاح میں تساہل برتنا غلط نویسی کی تربیت دینے کے مترادف ہے۔ اس طرح غلط نویسی فطرت ثانیہ بن جاتی ہے۔ اور آگے چل کر معلم و متعلم دونوں کو اس کا خمیازہ بھگتنا پڑتا ہے۔

عام طریقۂ اصلاح

اس میں شک نہیں کہ تحریری انشاء کی تصحیح آسان کام نہیں۔ اس میں محنت کی ضرورت پڑتی ہے اور صرف محنت سے بھی خاطر خواہ فائدہ حاصل نہیں ہوتا۔ عام طور پر معلم اپنے خالی وقت میں جماعت کی کاپیوں کا گٹھڑ لے کر بیٹھتا ہے اور رنگین پنسل یا سُرخ روشنائی سے بچوں کے مضامین کی سطریں اور بعض جملے کے جملے بدل ڈالنے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ معلم (بشرطیکہ وہ اصولِ تعلیم سے ناواقف ہو) یہ سب کچھ کرتا ہے۔ اور اس کے نتیجے کے طور پر اُسے آئندہ بھی ہر مرتبہ ایسا ہی کرنا پڑتا ہے۔ یعنی وہی کاٹ، چھانٹ، جسے صرف کاٹ، کہنا چاہیے۔ کیوں کہ "چھانٹ" کی گنجائش ذرا کم ہی نکلتی ہے۔ دراصل اس قسم کی اصلاح سے بچوں کی استعداد میں کوئی خاص اضافہ نہیں ہوتا، بلکہ اس کے برعکس وہ اپنی تلمی کوششوں کا یہ حسرت ناک حشر دیکھ کر احساس کمتری میں مبتلا ہو جاتے ہیں اور آئندہ مضمون لکھنے سے ہول کھاتے ہیں۔ آخر میں خود معلم بھی اس روح فرسا اصلاح سے جی چراتا۔ اور اپنی عافیت کی خیر مناتا ہے۔ وہ مضامین کی تعداد ہی پوری کرنے کے لیے کبھی کوئی مضمون لکھوا دیتا ہے۔ غرض اصلاح کے اس طریق سے مضمون نویسی کی قابلیت تو کیا ہو سکتی ہے البتہ اس میں بچوں کے ضبط و تحمل کا سخت امتحان اور معلم کے کفارہ گناہ کا اچھا خاصہ سامان ہے تھوڑی بہت خوش فہمی جو اس اصلاح سے وابستہ ہو سکتی ہے وہ اس کے "فرصت طلب" انداز کو دیکھ کر بالکل ختم ہو جاتی ہے۔ کیوں کہ یہ عظیم الشان

کام فرصت میں چھٹی ہی کے دن انجام پاسکتا ہے، اور اس طرح مضمون نویسی اور تصحیح کے درمیان کافی زمانہ گذر جاتا ہے۔ حالاں کہ غلطی کی اصلاح جلد از جلد، اور طالب علم کے سامنے ہونی چاہیے۔ اصلاح کے بعد، اصلاح کی مشق کا سوال پیدا ہوتا ہے۔ مگر اس قسم کی اصلاح کے بعد مشق کی افادیت بھی ختم ہوجاتی ہے۔ طلبا ءعلم کی اصلاح کے نام سے بنائی ہوئی عبارت کو ایک بار اپنے ہاتھ سے لکھ لیتے ہیں جس سے درحقیقت کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ مشق کا فائدہ اس وقت ہے جب غلط اور صحیح الفاظ و تراکیب کا صحیح مطالعہ ہوسکے۔ مگر اس کا یہاں کوئی امکان نہیں رہتا۔

حقیقت یہ ہے کہ اگر کسی مضمون میں چند غلطیاں ہوں تو معلم آسانی سے بلکہ بچے کے سامنے ہی اصلاح کے کام سے عہدہ برا ہوسکتا ہے اور بچہ اسے سمجھ کر یاد کرسکتا ہے۔ مگر بے شمار غلطیوں کی اصلاح کرنا معلم کے لیے ممکن ہو تو ہو، اس کا سمجھنا اور یاد رکھنا، بچے کے بس کی بات نہیں۔ ایسی اصلاح میں معلم کی دیانت غیر مشتبہ سہی، مگر اس کی صلاحیت کا دیہ ضرور حرف آتا ہے۔ معلم کا مقصد یہ نہ ہونا چاہیے کہ وہ غلطیوں کی اصلاح کرے۔ بلکہ وہ بچوں کو غلطی کرنے سے باز رکھے۔ اور یہ اسی وقت ہوسکتا ہے جبکہ معلم اپنے حسنِ تدبیر یا مہارتِ فن سے، تحریری کام کے آغاز ہی میں، اغلاط کے بیشتر امکانات کا سدّباب کردے۔ گویا اصلاحِ اغلاط سے پہلے، اِمتناعِ اغلاط کے اقدامات ضروری ہیں۔

اِمتناعِ اَغلاط

اِمتناعِ اغلاط کی تدابیر انشا پردازی کی عملی مشق سے پہلے یعنی بچوں کے لکھنا شروع کرنے سے قبل، بروئے کار لائی جاتی ہیں، اور اس ضمن میں نفسِ مضمون و ہئیت مضمون، ہر دو پر توجہ مبذول کرائی جاتی ہے۔

نفسِ مضمون کی خاطر معلم کو یہ چاہیے کہ مسلسل اور مربوط سوالات کرے، جن کے جوابات سے مضمون کی تعیین اور حد بندی ہوجائے۔ اس عمل کو مدرسی اصلاح میں زبانی یا تقریری انشا کہا جاتا ہے۔ اس کی بدولت بچے اچھی طرح سمجھ جاتے ہیں کہ کس چیز کے متعلق لکھنا ہے، اور کیا کیا لکھنا ہے۔ معلم کے پہلے سے سوچے ہوئے سوالات، بچوں کے ذہن میں خیالات کی تخلیق کرتے ہیں۔ بلکہ اظہار کا انداز بھی متعین کردیتے ہیں۔ کیوں کہ بچوں کے زبانی جوابات میں، زبان و بیان کی تمام غلطیاں دور کردیتا ہے۔ اور فکر انگیز، تصویرا فزا سوالات کے

ذریعے ضروری سوادِ تحریر اخذ کر لیتا ہے۔

اگرچہ اس زبانی انشا سے تحریری کام بہت کچھ سہل ہو جاتا ہے لیکن چھوٹی جماعتوں میں اور بالخصوص انشا کی ابتدائی مشقوں میں صرف زبانی انشا پر تکیہ کرنا کافی نہیں۔ چارٹ کی صورت میں ایک تحریری نمونہ بھی دکھانا چاہیے۔ تاکہ بچے مضمون کی ہیئت یا صورت سے واقف ہو جائیں۔ انھیں بالکل اسی طرح لکھنے کی تاکید ضروری نہیں کیوں کہ وہ غیر شعوری طور پر اسی نمونے کی تقلید کریں گے۔ یہ تحریری نمونہ جماعت کے سامنے کسی بچے سے پڑھ کر سنایا جائے۔ عنوان کی نشاندہی اور مضمون کی پارہ بندی کی طرف توجہ مبذول کرائی جائے۔ اگر تحریری انشا کسی خاص صنعت مثلاً مراسلہ نویسی سے متعلق ہو، تو مراسلے کے اجزاء کا صحیح مقام بتایا جائے۔ بلکہ لفافہ اور پوسٹ کارڈ دکھا کر ان کے طریق استعمال پر سوالوں کے ذریعے روشنی ڈالی جائے اس کے بعد تحریری نوبت آئے۔ مگر تحریری نمونہ ایسا معیاری ہونا چاہیے جو موضوع سے متعلق ضروری الفاظ اور موزوں تراکیب ضرور پیش کر دے۔ مگر بچوں کے فہم سے بالاتر نہ ہو اور جب بچے لکھنا شروع کریں تو نمونہ سامنے سے ہٹا لیا جائے۔ بڑی جماعتوں میں نمونے کی بجائے مربوط سوالات کی مدد سے تختہ سیاہ پر خاکہ تیار کیا جائے۔

یہاں اس وہم میں مبتلا ہونے کی ضرورت نہیں کہ خاکے کا پابند ہو کر طالب علم کا تخیل، اپنی انفرادیت کے اظہار سے باز رہے گا۔ اور اُپج پر بُرا اثر پڑے گا۔ طلباء کو عام معقول اور مقبول نمونے سے شناسا کرنا نہایت ضروری ہے۔ آگے چل کر جب طلباء خود کسی موضوع پر قلم اٹھائیں گے تو اپنے لیے انفرادی طور پر خاکے تیار کریں گے، اور وہ ان کے فطری و انفرادی انداز کے عین مطابق ہوں گے۔

مختصر یہ کہ تدریس انشا کی تیاری ہی طلباء کی اغلاط کو کم کر سکتی ہے اور اسی صورت میں کسی مفید مطلب اصلاح کا سوال پیدا ہوتا ہے، ورنہ نہیں۔ مندرجہ بالا طریق کار اغلاط کی پیش قیاسی کرتا ہے، اور امتناع اغلاط کا حکم رکھتا ہے۔ جب طلبا تحریری انشاء میں خاطر خواہ مہارت حاصل کر لیں تو پھر وہ خود خاکہ تیار کر کے تخیلی اور طبع زاد مضامین بھی لکھ سکتے ہیں۔ مگر مذکورہ بالا اقسام کی مشقوں سے پہلے طلباء سے تخلیقی یا تخیلی مضمون لکھوانا تضیع اوقات کے سوا اور کچھ نہیں۔

تجربہ شاہد ہے کہ امتناعی و انسدادی تدابیر کے باوجود بچے لکھتے وقت غلطیاں کر ہی جاتے ہیں

کیوں یا کیسے ہوئے۔ دراصل ہر قابلِ انسداد غلطی جو تحریر میں ایک مرتبہ بچے سے سرزد ہو جاتی ہے تکرار کا میلان رکھتی ہے۔ اور معلم کی اصلاح کے باوجود بچے کے حافظے سے نہیں نکلتی تا وقتیکہ بچہ خود بھی اس سے بچنے کی کوشش نہ کرے۔ اس سے یہ لازم آتا ہے کہ تدریسِ انشا کا عمل جلدی جلدی نہیں، بلکہ سوچ سمجھ کر، اور ذرا سنبھل کر کیا جائے۔ انشاء کی ہر منزل یعنی مضمون کے ہر جزو کو ملحوظ رکھا جائے۔ معلم خاکے کی ترتیب میں پوری احتیاط برتے اور بچوں کو ہدایت کرے کہ ہر جملے کو سپردِ قلم کرنے سے پہلے، ذہن میں مکمل کرلیں، اور ہر نیا پارہ شروع کرنے سے پہلے آخری جملے کو پڑھ لیں۔

زبانی اصلاح یا تبصرہ

مندرجہ بالا طریق کے مطابق جب تحریری انشاء کی تکمیل ہو جائے تو اس کی تصحیح کا سوال پیدا ہوتا ہے لیکن قلمی اصلاح سے پہلے زبانی تبصرے کی منزل ہے۔ معلم دو تین طلباء سے ان کی انشاء باواز بلند پڑھوا کر سنے، اور دوسرے طلباء اس انشاء کی خوبیوں اور خامیوں پر تبصرہ کریں۔ ظاہر ہے کہ طلباء کا یہ زبانی تبصرہ کسی لفظ کے تلفظ، کسی محاورے کے استعمال یا کسی جملے کی نحوی ترکیب یا کسی خیال کے بے محل یا برمحل ہونے کے متعلق ہوگا۔ اگر کوئی غلطی نظر انداز ہوتی نظر آئے تو معلم اس پر توجہ دلا سکتا ہے، اور ضرورت سمجھے تو تختۂ سیاہ پر لکھ کر اس کے حسن و قبح پر روشنی ڈال سکتا ہے۔ مگر اس کی نوبت صرف اس صورت میں آئے گی جب کوئی بات طلباء کے فہم و فراست سے بالاتر ہو۔ ورنہ عام غلطیوں پر بہت سے طلباء ہاتھ اٹھائیں گے خاموش خوانی کی صورت میں جن غلطیوں کے نظر انداز ہونے کا احتمال ہوتا ہے، بلند خوانی کی صورت میں وہ بھی آشکار ہو جایا کرتی ہیں۔

اس زبانی تبصرے کا بڑا فائدہ یہ ہے کہ اس سے طلباء میں تنقید کا مادہ پیدا ہوتا ہے۔ اور زبان و بیان کے خوب و زشت سے آگاہی ہو جاتی ہے جو آئندہ انشاء پردازی میں دلیلِ راہ بنتی ہے۔ علاوہ ازیں اس طرح معلم کی قلمی اصلاح کا کام بھی قدرے کم ہو جاتا ہے۔

باہمی اصلاح یا اغلاط کی نشان دہی

معلم کی قلمی اصلاح سے پہلے، بہتر یہ ہے کہ جماعت کے تمام طلباء، ایک دوسرے کی انشاء کا

خاموش مطالعہ کریں، اور اُس میں جو لفظ یا جو بات غلط معلوم ہو، اس پر پنسل سے نشان لگا دیں۔ اس عمل سے نہ صرف صحیح اور غلط کے پرکھنے میں مزید تربیت حاصل ہو گی بلکہ رفتہ رفتہ وہ اپنی اصلاح آپ کر لینے کے قابل ہو جائیں گے۔

قلمی اصلاح

مندرجہ بالا مراحل سے گذرنے کے بعد، طلباء کے کام کی قلمی اصلاح ہونی چاہیے۔ مگر قلمی اصلاح کو مفید و مؤثر بنانے کے لیے یہ ضروری ہے کہ اصلاح، طالب علم کے سامنے، انفرادی طور پر عمل میں آئے یا بعدِ اصلاح، طالب علم کو تصحیح کا منشا اچھی طرح سمجھا دیا جائے۔ اگرچہ بہترین صورت یہی ہے کہ معلم طالب علم کی انشاء کو، اس کے سامنے پڑھے اور سمجھا سمجھا کر اصلاح کرے۔ اصلاح کا یہ طریقہ ہرگز ایسا ناقابلِ عمل نہیں جیسا کہ اسے عام طور پر سمجھ لیا جاتا ہے۔ مگر شرط یہ کہ قلمی اصلاح سے قبل، اِمتناعِ اغلاط اور زبانی و باہمی اصلاح کے اقدامات ضرور کر لیے جائیں۔

اِصلاح کے معلّمانہ اَنداز

اصلاح میں سہولت کے لیے ہر طالب علم کو اپنی انشاء پردازی کی کاپی ہمیشہ اپنے پاس ڈیسک پر تیار رکھنی چاہیے۔ جب جماعت خاموش مطالعے میں مشغول ہو، یا دوسرے طلباء کی اغلاط کی نشان دہی میں مصروف، یا کسی نئی تحریری انشاء میں منہمک، تو معلم طلباء کو اپنے ڈیسک پر باری باری بلا کر قلمی اصلاح کر سکتا ہے۔

(ا) عام اَغلاط کی تصحیح:۔ معلم کو قلمی اصلاح کے دوران میں کچھ ایسی غلطیاں بھی نظر آئیں گی، جو جماعت کے اکثر و بیشتر طلباء کی انشائیں موجود ہوں گی۔ ایسی عام اور مشترک غلطیوں پر پوری جماعت کے سامنے روشنی ڈالنا ضروری ہے۔ معلم ان غلطیوں کو ایک جگہ لکھتا جائے۔ اور کسی وقت، مثلاً تحریری انشاء کے آئندہ پیریڈ میں، پوری جماعت کو زبانی سمجھا دے۔ اگرچہ خوب، مثلاً انگریزی یا فارسی کی صورت میں، عام اغلاط کی اصلاح تختہ سیاہ پر ہونی چاہیے۔

(اا) تصحیح میں اِشارت کا پہلو:۔ انشاء کی بعض غلطیاں طلباء کی بے پروائی کا نتیجہ

اور نافہمی کا نتیجہ۔ معلم خود ان اغلاط کی نوعیت کا اندازہ لگا سکتا ہے۔ وہ طلباء کی استعداد سے واقف ہوتا ہے۔ اسے اس واقفیت سے اصلاح انشاء میں مدد لینی چاہیے۔ جو اغلاط نافہمی کی وجہ سے ہوں معلم اپنے قلم سے ان کی پوری اصلاح کرے۔ مثلاً اگر کسی مشکل لفظ کا املا غلط ہو تو اسے کاٹ کر درست کرنا۔ گرامر کی غلطی کو دور کرنا، کسی جملے میں غلط تذکیر و تانیث کی تصحیح کرنا، غلط مرکبات، محاورات اور ضرب الامثال کو کاٹ کر صحیح لکھنا۔

جو غلطیاں طالب علم کی بے پروائی کی وجہ سے پیدا ہوئی ہوں یا جن کا سمجھنا آسان ہو معلم اپنے قلم سے اُن کی پوری اصلاح نہ کرے، ان پر خط کھینچ کر یا سوالیہ نشان بنا کر چھوڑ دے۔ طالب علم خود اس کی اصلاح کرے گا۔

(iii) **استعمالِ رموز:**۔ مؤخر الذکر قسم کی غلطیوں کی نشان دہی کے لیے کچھ نشانات مقرر کر لیے جائیں تو زیادہ مناسب ہے۔ مثلاً اگر طالب علم بے پروائی کی وجہ سے حرفِ ربط یا کوئی اور معمولی لفظ چھوڑ گیا ہے تو اس کی جگہ، سطر سے ذرا نیچے، یہ نشان (^) بنا دیا جائے۔ لفظ کے بے محل استعمال پر سوالیہ نشان (؟) لگا دیا جائے۔ اگر جملے کے اجزاء اپنے صحیح مقام پر موجود نہ ہوں، تو ہر جزو کے اوپر ایک خط کھینچ کر ان پر اس طرح نمبر ڈالے جائیں کہ اجزاء کی صحیح ترتیب سمجھ میں آجائے اور طالب علم اپنے ہاتھ سے اُس جملے کی تصحیح کر سکے۔ اگر طالب علم نے غیر ضروری طور پر نیا پارہ شروع کر دیا ہے تو اسے ایک تحریر (〰〰) کے ذریعے ملا دیا جائے۔ اگر ضرورت کے باوجود نیا پارہ نہیں کیا تو اس جگہ یہ نشان (نئے پ) بنا دیا جائے۔ علیٰ ہذا القیاس۔ ہر معلم خود اپنی ضرورت کے مطابق چند ایسی علامات مقرر کر سکتا ہے جنہیں طلباء ایک بار دیکھ کر اچھی طرح سمجھ لیں، بلکہ معلم کی قلمی اصلاح سے قبل مذکورہ بالا باہمی اصلاح میں خود بھی استعمال کر لیا کریں۔

(iv) **رموز کا جواز:**۔ ان علامات کے استعمال سے ایک طرف معلم کو سہولت رہے گی، وقت کم صرف ہوگا، اور نہ زیادہ خامہ فرسائی کی نوبت نہیں آئے گی۔ اور دوسری طرف طالب علم کو اس سے کہیں زیادہ فائدہ حاصل ہوگا۔ انشاء میں بے پروائی برتنے کی عادت جاتی رہے گی، اور اپنی اصلاح آپ

کرنے کا سلیقہ آجائے گا۔ یہی وہ مقصد ہے جس کی خاطر تدریس انشاء کا اقدام اور اصلاح کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ کون نہیں جانتا کہ صرف اسی اصلاح کو مفید، مؤثر کہا جاسکتا ہے جو طالب علم کی سمجھ میں اچھی طرح آجائے۔ لیکن جب طالب علم اپنے ہاتھ سے اپنی غلطی کی اصلاح کرلیتا ہے تو اصلاح کے سمجھ میں نہ آنے کا سوال باقی نہیں رہتا۔ اصلاح کی افادیت پر مہر تصدیق ثبت ہوجاتی ہے سچ یہ ہے کہ ایسی اصلاح درست نویسی کی جانب، راست اقدام کا حکم رکھتی ہے اور تعلیم کو تربیت سے ہم کنار کرتی ہے۔ اپنی اصلاح آپ کرنے کا بار طالب علم کی تعمیری جبلت کو بروئے کار لاکر، مشق و مہارت کی طرح ڈالتا ہے۔

(۷) **اشاریت کی حدود و قیود**:۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ اغلاط بھی جو طالب علم کی نافہمی کا نتیجہ ہیں، اشاریت کے طریق پر طالب علم ہی کے ہاتھ سے کیوں نہ درست کرائی جائیں؟ مگر اس میں بڑی قباحت ہے۔ کیوں کہ حرف فرمائش سے، فہمائش کا مصرف نہیں لیا جاسکتا۔ نافہمی پر مبنی اغلاط کو، صرف زبانی سمجھا کر چھوڑ دینا، اصول تعلیم کی صریح خلاف ورزی ہے۔ ممکن ہے، بچہ زبانی اصلاح کو عملی جامہ پہنانے تک یاد نہ رکھ سکے۔ اور جو غلط بات اس کے قلم سے نکل چکی ہے وہی یاد رہ جائے۔ علاوہ ازیں اس کی کیا ضمانت ہے کہ معلم کے صرف زبانی سمجھانے سے اس قسم کی غلطی کو طالب علم سمجھ ہی جائے گا؛ اس لیے معلم کو چاہیے کہ زبانی سمجھانے کے ساتھ ساتھ، ایسی اغلاط کو قلم زد کرکے صحیح لفظ یا جملہ اپنے قلم سے لکھ بھی دے کہ

"نوشتہ بماند سیاہ بر سپید"

(۸) **قلمی اصلاح کی مشق اور اشاری اصلاح کی تکمیل**:۔ معلم کی قلمی اصلاح کے بعد، اس کی مشق ضروری ہے۔ طالب علم کو متنبہ کردینا چاہیے کہ وہ اصلاح کی جلد از جلد مشق کرلے، کیوں کہ معلم ہر وقت مشق کا معائنہ کرسکتا ہے۔ قلمی اصلاح کی مشق اور اشاری اصلاح کی تکمیل (جو طالب علم، شارات و علامات کی مدد سے خود کرتا ہے) باقاعدہ عمل میں آنی چاہیے۔

تحریری انشاء کے مقابل کا پورا صفحہ اسی کام کے لیے مختص کر دیا جائے۔ تاکہ طالب علم اس پر سہولت اور صفائی سے، تبدیل شدہ لفظوں اور جملوں کو کئی بار لکھ سکے۔ مگر چند اصلاح شدہ لفظوں کی خاطر پوری انشاء کو دوبارہ نقل کرنا تضیعِ اوقات میں داخل ہے۔

معلم کو چاہیے کہ اپنی محنت کو رائگاں نہ جانے دے۔ ہر نئی انشاء کی قلمی اصلاح کرتے وقت اس سے پہلی انشاء پر ضرور ایک نظر ڈال کر یہ دیکھ لے کہ طالب علم نے اس کی باقاعدہ مشق کر لی ہے۔

انسدادِ اغلاط یا اصلاحِ اغلاط کے سلسلے میں جن تجاویز کا ذکر کیا گیا ہے ان پر عمل پیرا ہونے کے لیے یقیناً ذرا زیادہ وقت کی ضرورت ہوتی ہے لیکن ان سے جو نتائج مرتب ہوتے ہیں وہ نہایت عظیم الشان ہیں ؎

معلومات عامہ

شہزادہ فلپ پاکستان کا دورہ کریں گے

ڈیوک آف ایڈنبرا آئندہ سال کے شروع میں جس میں عالمی دورہ پر برطانیہ سے روانہ ہو رہے ہیں۔ اس کی تفصیلات کا حال ہی میں اعلان ہوا ہے۔ قصر بکنگھم کے ایک اعلان میں کہا گیا ہے کہ یہ سفر تین ماہ تک جاری رہے گا اور اس میں ہندوستان اور پاکستان کے علاوہ جنوب مشرقی ایشیا کے برطانوی علاقوں بشمول سنگاپور و ہانگ کانگ اور غرب الہند کے دورے شامل ہیں۔

شہزادہ فلپ پانچ ہزار میل کے اپنے پہلے دورہ پر بی۔او۔اے۔سی کے کامٹ فور طیارہ کے ذریعہ ۲ جنوری کو لندن سے دہلی روانہ ہوں گے۔ ڈیوک جو برطانوی انجمن سائنس کے صدر بھی رہ چکے ہیں۔ انڈین سائنس کانگریس ایسوسی ایشن، اور پھر کراچی میں پاکستان انجمن برائے فروغ سائنس کے اجلاسوں میں شرکت کریں گے۔

انڈین ایسوسی ایشن کانگریس کے سلسلہ میں ہندوستان کے دیگر حصوں کے دورہ کے بعد ڈیوک آف ایڈنبرا ۷ فروری کو ہندوستان سے پاکستان روانہ ہوں گے۔ جہاں ڈھاکہ سے وہ اپنے دورۂ پاکستان کا آغاز کریں گے۔ ڈیوک موصوف ۱۷ فروری تک پاکستان میں قیام کرنے کے بعد رنگون روانہ ہوں گے جہاں ان کا قیام ۲۰ فروری تک ہوگا۔

بعد کے دو ماہ میں وہ شاہی بجرے "برٹینیا" میں تقریباً سولہ ہزار میل کا سفر کریں گے۔ اس میں پہلا قیام سنگاپور میں ہوگا۔ بعد ازاں سارا واک، برونی اور شمالی بورنیو کے دورہ کے بعد وہ ۷ مارچ کو ہانگ کانگ پہنچیں گے۔

ان کا جزائر سلیمان کا دورہ ۱۸ مارچ کو شروع ہوگا جو ازگلبرٹ جاتے ہوئے وہ جدید یو سلانیا کا دورہ کریں گے جہاں وہ ۲۵ مارچ کو پہنچیں گے۔ ان کے پروگرام میں جزیرہ ادشن کا دورہ ۲۸ مارچ

اور جزائر ایلیس کا ۳۰ مارچ کو رکھا گیا ہے ۲ اور ۳ اپریل کو جزیرہ کرسس کا دورہ کرنے کے بعد ڈیوک شاہی بحریہ میں نہر پانامہ جائیں گے، ویسے وہاں سے وہ ۱۹ اور ۲۰ اپریل کو گزریں گے۔

۲۲ اپریل کو بہاماس پہنچنے پر ڈیوک شاہی بحریہ ”بریٹینیا“ کو فارغ کر دیں گے، اور بذریعہ طیارہ وطن روانہ ہونے سے قبل برمودا بھی جائیں گے خیال ہے کہ وہ ۳۰ اپریل کو برطانیہ واپس پہنچ جائیں گے

فلاح عامہ کے لیے مل جل کر کام

برطانیہ کی ٹریڈ یونین کانگرس اور حکومت وقت کے باہمی تعلقات پر اکتوبر ۱۹۵۱ء کے واقعات نے پہلی مرتبہ صحیح طور پر روشنی ڈالی ہے۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب عام انتخابات میں نئی قدامت پسند حکومت برسر اقتدار آئی تھی، لوگ پوچھتے ہیں کہ آخر چھ سال ہم خیال لیبر حکومت کے ساتھ کام کرنے کے بعد ٹریڈ یونین کانگرس کا رویہ قدامت پسند حکومت کے ساتھ کیا ہوگا۔

ٹی۔یو۔سی (ٹریڈ یونین کانگرس) کا جواب بالکل واضح تھا۔ اس نے غور و خوض کے بعد تیار کیے ہوئے ایک بیان میں کہا کہ ہمارا ہمیشہ سے یہ طریقہ چلا آ رہا ہے کہ جو بھی حکومت برسر اقتدار ہو ہم اس کے وزراء اور صنعت کاروں کے صلاح و مشورے کے ذریعے ان سے تعاون کی راہ تلاش کریں۔ تاکہ ملک کے معاشی اور معاشرتی مسائل کو عملی طور سے حل کر سکیں۔

یہ بات بھی واضح کر دی گئی تھی کہ اس نظریہ سے یہ مراد نہیں کہ ٹی۔یو۔سی اپنی پالیسی مرتب کرنے یا حکومت اور مالکوں کی مخالفت کے حق سے دست بردار ہو رہی ہے۔ ٹی۔یو۔سی نے اپنے بیان میں اس بات پر زور دیا کہ ٹریڈ یونینوں کو صنعتوں کو چلانے کے لیے حکومت اور صنعت کاروں سے گفت و شنید اور صلاح مشورے کرنے ضروری ہیں۔

برطانیہ کی ٹریڈ یونینوں کے قومی مرکز کی حیثیت سے ٹی۔یو۔سی اپنا بیشتر وقت حکومت اور صنعت کاروں کے سامنے ٹریڈ یونین کے نقطہ ہائے نظر کی وضاحت میں صرف کرتی ہے۔ اس کی سیاسی سرگرمیاں زیادہ سے زیادہ قومی کونسل برائے محنت کی ممبری تک محدود ہوتی ہیں۔

کونسل اپنے سہ ماہی اجلاس سے ٹی۔یو۔سی لیبر پارٹی اور انجمن تعاون باہمی کے نمائندوں کو

آپس میں ملنے اور ایک دوسرے کی سرگرمیوں پر بحث کا موقع فراہم کرتی ہے۔ کونسل پالیسی مرتب نہیں کرتی اور نہ ہی وہ ان تینوں جماعتوں میں سے کسی کو اس بات پر مجبور کر سکتی ہے کہ وہ کوئی ایسا کام کرے جس سے وہ متفق نہ ہو۔ اس کا وجود کم و بیش اس لیے ہے کہ یہ برطانیہ کی ملک گیر مزدور تحریک کے مختلف حصوں میں رابطہ قائم رکھتی ہے اور کسی طرح بھی ٹی۔یو۔سی کی آزادی میں مخل نہیں ہوتی۔

ٹی۔یو۔سی اور حکام کے درمیان جو تعلق ہے وہ صرف ایک لفظ سے ظاہر ہو سکتا ہے اور وہ لفظ ہے "مشورہ" گذشتہ پندرہ سال میں اس کام کی انجام دہی کے لیے جو ذرائع اختیار کیے گئے ہیں، اس سے یہ کام پہلے سے زیادہ پیچیدہ ہو گئے ہیں۔

حکومت اور ٹی۔یو۔سی کے مابین باقاعدہ مشوروں کی ابتدا ۱۹۳۹ء میں ہوئی۔ جبکہ اس تحریک نے جنگ کی جدوجہد کی حمایت کرتے ہوئے اس بات پر زور دیا کہ مزدوروں اور عمال سے متعلق مسائل پر مشوروں میں اسے بھی شریک کیا جائے۔

اس وقت بھی اور اب بھی اس مطالبہ کی بنا مزدوروں کے مفاد کی صحیح ترجمانی کرنے کے علاوہ یہ خواہش بھی کی تھی کہ جہاں تک ممکن ہو اس کے تجربات سے دوسرے بھی استفادہ کریں۔

یہ طریق کار دوسری جنگ عظیم میں اتنا کامیاب رہا کہ قیام امن کے بعد بھی سامان پیداوار قومی بچت اور دوسرے شعبوں سے متعلق کونسلوں، بورڈوں اور کمیٹیوں کو ختم نہیں کر دیا گیا۔ البتہ کچھ کے نام اور ذمہ داریوں میں فرق ضرور ہے۔ جب قومی بیمہ کارخانوں میں حادثات اور صحت عامہ کے منصوبوں پر عمل درآمد ہوا تو بہت سی نئی مشاورتی کمیٹیاں بھی قائم کی گئیں۔

سب سے زیادہ اہم اور سب سے بڑی مشاورتی کمیٹیوں میں جن سے ٹی۔یو۔سی کا تعلق ہے محنت کی مشترکہ قومی مشاورتی کونسل اور قومی صنعتی پیداوار کی مشاورتی کونسل شامل ہیں۔ پہلی کونسل کا تعلق ملازمت اور صنعتی تعلقات کے مسائل سے ہے اور دوسری کونسل وزیر خزانہ کی صدارت میں صنعتی پیداوار پر توجہ دیتی ہے۔ دونوں کی نمائندگی مساوی ہوتی ہے۔

آج کل ٹی۔یو۔سی کم و بیش سو سرکاری اور غیر سرکاری اداروں میں نمائندوں کا تقرر کرتی ہے۔

سرکاری اداروں میں معاشی منصوبہ بندی بورڈ (جو قومی ذرائع کے بہترین استعمال کے لیے حکومت کو مشورہ دیتا ہے) اور سائنس اور صنعتی تحقیقات کا محکمہ (جو اس بات کی نگہداشت کرتا ہے کہ سائنس کی تحقیقات سے حاصل کردہ معلومات اور نتائج صنعتی ترقی میں معاون ہوں) شامل ہیں۔

دوسرے قومی اہمیت کے ادارے جن میں ٹی۔یو۔سی کے نمائندے شامل ہوتے ہیں۔ یہ ہیں قومی بچت کی کمیٹی۔ برطانوی سیر و سیاحت اور تعطیلات کا ادارہ اور کھیل کے میدانوں کی قومی انجمن۔

ٹریڈ یونینوں اور حکومت کے نمائندوں میں جو مشورہ ہوتا ہے وہ قومی مسائل تک ہی محدود نہیں ہوتا۔ مثال کے طور پر پیداوار کے مسئلہ میں ٹریڈ یونینوں، مالکوں اور سرکاری محکموں کا جو باہمی مشورہ ہوتا ہے وہ علاقائی صنعتی بورڈ اپنے اپنے علاقے میں قومی صنعتی پیداوار کی مشاورتی کونسل کے طور پر کام کرتے ہیں۔

علاقائی ٹریڈ یونین۔ ٹی۔یو۔سی کے ماتحت کام کرتی ہیں، اور ملک بھر میں ملازمت دلانے والی کمیٹیوں کے لیے اپنے نمائندے مقرر کرتی ہیں۔ اس کے علاوہ علاقائی مشاورتی کمیٹیاں (جو قومی انشورنس اور صنعتی حادثات سے تعلق رکھتی ہیں) علاقائی ہسپتالوں کے بورڈ اور ہسپتالوں کی انتظامیہ کمیٹیوں میں بھی علاقائی ٹریڈ یونین کے نمائندے ہوتے ہیں۔

ان مشوروں میں وہ غیر رسمی روابط شامل نہیں جو علاقائی اور قومی سطح پر ٹریڈ یونین تحریک کے نمائندوں اور حکام کے درمیان قائم ہو جاتے ہیں۔ وزراء اور حکام اکثر پالیسی سے متعلق بہت سی باتوں پر ٹریڈ یونین کے نمائندوں سے گفتگو کرنے کی غرض سے ہر وقت تیار رہتے ہیں۔

ٹی۔یو۔سی نے اپنے کتابچہ "ٹریڈ یونین اور حکام" میں لکھا ہے کہ عوام سے ہمدردی رکھنے والے نظم و نسق اور موزوں منصوبہ بندی کا تقاضہ ہے کہ حکومت اور عوامی اداروں میں باہمی مشورے ہوں۔ ان مشوروں کا مطلب نہ تو پارلیمانی نمائندوں اور نہ ہی علاقائی اداروں کے منتخب نمائندوں کو اختیارات سے محروم کرنا ہے۔ نہ ہی اس کا یہ مطلب ہے کہ ٹریڈ یونینیں اپنی کونسلوں اور ارکان فرنٹوں کے ذریعہ آزادانہ پالیسی مرتب کرنے کی ذمہ داری سے لاتعلق ہوں۔

پانی کی رفتار سے تیز چلنے والی کشتی:- آواز کی رفتار سے تیز، فضائی ملاہ ہرمکے بارے میں

ہر شخص جانتا ہے۔ جیٹ تیارہ سات سو پچاس میل سے کچھ زیادہ رفتار سے پرواز کر کے آواز کی رفتار کے مقابلہ میں سبقت لے جا چکا ہے۔ اگرچہ اس کی پرواز فضا میں ایک جانا پہچانا دھماکہ سا پیدا کر دیتی ہے پانی کی رفتار سے تیز کشتی رانی کے مظاہرہ کے بارے میں کم سنا گیا ہے۔ کیوں کہ اسے اتنی شہرت حاصل نہیں ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر پانی کی رفتار سے تیز جہازرانی کے مظاہرہ سے مراد کیا ہے

دراصل پانی کی رفتار سے تیز جہازرانی کے مظاہرہ میں جو عناصر کام کرتے ہیں وہ ان سے مختلف ہیں جو آواز کی رفتار سے تیز فضائی مظاہرہ میں کام کرتے ہیں۔ یہ عناصر کچھ اس قدر پراسرار ہیں کہ ابھی تک قطعی طور پر سمجھ میں نہیں آسکے ہیں۔ کشتی ایک سیکنڈ میں بہت سی مرتبہ اوپر نیچے حرکت کرتی ہے۔ اس طرح اس کے ڈھانچہ پر بھاری وزن پڑ جاتا ہے اور اس کے پائلٹ کو بھی سخت کشش ثقل سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ یعنی ہر مرتبہ کشتی جھکولے کھاتی ہے اور اس کے جسم کا وزن وقتی طور پر سات گنا بڑھ جاتا ہے۔ یہ لمحہ انتہائی پرخطر ہوتا ہے۔ جان کوب کی اندوہناک موت کا سبب بھی پانی کی رفتار سے تیز کشتی رانی کا مقابلہ تھا۔ دو سو چھ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے سفر کرتے ہوئے اس کی کروسیڈر نامی کشتی، ایک سیکنڈ میں ۱۸۰ انچ اوپر اور ۷ مرتبہ نیچے کی طرف جھکولے کھا رہی تھی۔ اور انجام کار وہ ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی۔

"بلو برڈ" شروع سے ہی اس قدر مضبوط بنائی گئی تھی کہ وہ سدِ راہ کو توڑ کر باہر نکل سکے۔ اس کی تعمیر شروع کرنے سے قبل سائنسدانوں نے اس کی تحقیقات پر مجموعی طور پر بیس ہزار گھنٹے صرف کیے تھے۔ نمونہ کی راکٹ موٹر کے ساتھ مکمل طور پر آزمائش کی گئی تھی۔ کیا نتیجہ رہا؟ اپنی جسامت اور وزن کے لحاظ سے بلو برڈ مضبوط ترین کشتی ہے۔ اس سے زیادہ پائدار کوئی کشتی یا طیارہ اب تک نہیں بنا ہے۔ ہمارا اندازہ ہے کہ ریکارڈ توڑنے والی دوڑوں میں وہ دگنے دباؤ کو برداشت کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔

بلو برڈ کے متعلق ایک دوسری قابل ذکر بات ہے اس کی تیز رفتاری۔ غالباً ایک یا دو طیاروں کے علاوہ، بلو برڈ کی رفتار اب تک بنے ہوئے ہر جہاز سے بڑھی ہوئی ہے۔ اور اپنی پوری طاقت کے ۵۰ فیصد حصہ میں وہ پندرہ سیکنڈ میں دو سو میل فی گھنٹہ کی رفتار سے فاصلہ طے کرتی ہے۔

بلو برڈ کے ذریعے ریکارڈ توڑنے والی رفتار سے کانسٹن واٹر کیا رکرتے کیا محسوس ہوا؛ اس کا
جواب یہ ہے کہ :-

انتہائی تیز رفتار سے خاموشی کے ساتھ برف پر پھسلنے کا سا احساس ہوتا ہے۔ اس وقت جبکہ پانی ساکن ہو۔ اگر پانی میں ہیجانی کیفیت ہے تو اس وقت ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے ٹھوس ٹائروالی بغیر اسپرنگ کے کار میں بیٹھ کر ٹین پتھروں پر سے گذر رہے ہوں۔

اس بارے میں بہت کچھ کرنا اور سوچنا تھا۔ مثلاً اسٹیرنگ کو لیجیے۔ بلو برڈ جب اپنی پوری رفتار سے چلتی ہے تو اس پر قابو رکھنا نازک ترین مرحلہ ہوتا ہے۔ اور قابو پانے کے جوابی فعل میں یہ برق صفت ہوتی ہے۔ انگلی کا محض لمس بھی اس کا راستہ تبدیل کرنے کے لیے کافی ہے۔ پھر اس کے آلات کو غور سے دیکھنا پڑتا ہے کیوں کہ سلامتی اور حفاظت کا انہی پر تمام انحصار ہے، وہ ہیں فضائی رفتار پیما۔ پانی کی رفتار بتانے والا آلہ۔ کاؤنٹر جٹ پائپ۔ ٹمپریچر، دباؤ کا میٹر، پٹرول کے دباؤ کا پیمانہ وغیرہ۔ ریڈیو سے رابطہ قائم کرنا ضروری ہے۔ یہ سب کچھ غیر معمولی پھرتی سے کرنا پڑتا ہے کیوں کہ یہ بات ذہن میں رکھیے کہ پانی میں تیز دوڑ کی آغاز سے ساحل پر آنے تک صرف پچاس سیکنڈ کا وقفہ لگتا ہے۔

قدرتی طور پر مجھے خوشی اور فخر ہے کہ میں نے پانچویں مرتبہ پانی کی رفتار کا ریکارڈ توڑا ہے۔ میں اس مرتبہ دو سو پینتالیس میل فی گھنٹہ کی رفتار سے سبقت لے جانا چاہتا تھا۔ اور اس مہم میں مجھے کامیابی حاصل ہوئی ہے۔ اس سلسلہ میں، میں ہر اس شخص کا شکرگزار رہوں جس نے مجھے اس کامیابی سے ہمکنار کرنے میں مدد دی ہے۔ میں اپنے چیف انجینئر لیو ولاا اپنے تمام ساتھیوں اور برٹش پٹرولیم کمپنی کا جس نے بلو برڈ کو کامیابی سے چلانے کے لیے پٹرول اور مشینوں کو چکنا کرنے والا تیل مہیا کیا بے حد مشکور ہوں۔

(ڈونلڈ کیمبل)

آموزش

۱۱ شمارہ ۱۲] لاہور

اس شمارہ میں

تعلیمی ماہنامہ

آموزش

لاہور

مارچ ۱۹۵۹ء

جلد ــــــــــــ ۱۱

شمارہ ــــــــــــ ۱۲

سالانہ چندہ

پاکستان کے لیے ۶ روپے

غیر ممالک کے لیے ۸ روپے

قیمت فی پرچہ دس ۱۰ آنے

پبلشرز

یونی ورسٹی بک ایجنسی لاہور

آر ایچ ڈی خالد پرنٹر پبلشر نے دین محمدی پریس لاہور میں طبع کرا کے
یونیورسٹی بک ایجنسی ۷ کچہری روڈ لاہور سے شائع کیا

محاسبۂ نفس کی ضرورت

ایم ۔ اے مخدومی

فروری کے آغاز میں نیو ایجوکیشن فیلوشپ کے زیر اہتمام جو سہ روزہ تعلیمی کانفرنس ہوئی تھی اس کی مفصل روئداد کتابی شکل میں شائع کی جا رہی ہے۔ اس کانفرنس میں جو مقالے پڑھے گئے وہ من و عن اس کتابچے میں شامل کر دیے گئے ہیں۔ آموزش کے زیر نظر شمارے میں خطبۂ استقبالیہ کا اُردو ترجمہ شائع کیا جا رہا ہے۔ اس سے غرض یہ ہے کہ ملکی اور غیر ملکی تعلیمی ماہر ہمارے تعلیمی مسائل کے متعلق جو خیالات رکھتے ہیں اساتذہ اور عوام دونوں ان سے آگاہ ہو سکیں۔

ان اصحاب میں سے ہر ایک نے مختلف تعلیمی مسائل پر اپنے نقطۂ نگاہ سے نظر ڈالی ہے۔ مختلف مقالوں کے موضوع بھی مختلف ہیں۔ مگر تمام مقالوں میں ایک بات پر یکساں زور دیا گیا نظر آئے گا۔ خطبۂ استقبالیہ اور گورنر کے افتتاحی خطبہ سے لے کر آپ آخری مقالے تک پہنچ جائیں۔ جگہ جگہ آپ کو یہ آواز گونجتی سنائی دے گی کہ تعلیمی نجات کی چابی استاد کے ہاتھ میں ہے۔ اگر استاد موجودہ دور کے تقاضوں کو سمجھتا ہے اگر وہ اپنے علم کو تر و تازہ رکھتا ہے۔ اگر وہ بچوں کو قوم کی سب سے قیمتی متاع خیال کرتا ہے اور اگر وہ ان بچوں کو ملک کے بہترین اور کارآمد ترین شہری بنانے پر تلا ہوا ہے تو کم و بیش ہر قسم کے تعلیمی مسائل از خود حل ہونے لگیں گے۔ بچوں اور نوجوانوں سے جو توقعات بجا طور پر وابستہ کی جاتی ہیں گو پوری نہیں ہو رہیں وہ پوری ہونے لگیں گی۔ غرض قومی زندگی میں ایک خوشگوار انقلاب کا آغاز ہو جائے گا۔

ملکی اور غیر ملکی ماہرین تعلیم کی یہ متفق رائے پاکستانی استادوں کو دعوت فکر دیتی ہے۔ انہیں سوچنا چاہیے کہ وہ قومی بہبود کے لیے کیا کچھ کر رہے ہیں جس معاشرے میں استاد کی عزت نہ ہو

کی ترقی میں نمایاں حصہ لے رہی ہوں وہاں استاد کو دیر تک نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اگر ہمارے استاد کو یہ شکایت ہے کہ اسے معاشرے میں کوئی قابل ذکر مقام حاصل نہیں تو اس شکایت کے ساتھ ہی اسے محاسبۂ نفس سے بھی کام لینا چاہیے۔ اسے اپنے آپ سے پوچھنا چاہیے کہ کیا میں اپنے آپ کو تازہ ترین علمی اور فنی معلومات سے مستفید کرتا ہوں؟ کیا میں جدید تعلیمی طریقوں اور تکنیکوں سے واقف ہوں؟ جو طلبہ اور طالبات میرے حوالے کیے گئے ہیں کیا میں حتی الامکان ان کی دشواریاں سمجھنے کی کوشش کرتا ہوں؟ کیا میں تدریس کو بہتر سے بہتر اور مفید سے مفید تر بنانے کے لیے کوشاں رہتا ہوں؟

اب تک ہمارے استادوں نے ان سوالوں کے جواب معلوم کرنے کی کوئی جماعتی کوشش نہیں کی لیکن پاکستان اب زندگی کے ایک ایسے دور میں داخل ہو چکا ہے جہاں ہر شہری کے لیے پہلی ضرورت محاسبۂ نفس کی ہے۔ استاد کو قومی زندگی میں جو کلیدی حیثیت حاصل ہے اسی نسبت سے اسے محاسبۂ نفس کی ضرورت بھی زیادہ ہے ٭

ایں۔ای۔ایف کانفرنس

کا

خطبہ استقبالیہ

ایم اے مخدومی

آغاز فروری میں منعقد ہونے والی نیو ایجوکیشن فیلوشپ کانفرنس میں جناب ایم اے۔ مخدومی نے جو استقبالیہ خطبہ پڑھا۔ ملک کے تعلیمی اور علمی حلقوں میں اسے بے حد پسند کیا گیا ہے۔ کئی حلقوں کی طرف سے مطالبہ کیا گیا ہے کہ اس خطبے کا اردو ترجمہ ایک کتابچے کی شکل میں شائع کیا جائے۔ اس فرمائش کی تعمیل میں خطبے کا اردو ترجمہ آموزش میں شائع کیا جا رہا ہے۔ (مدیر معاون)

جناب گورنر،

اراکین نیو ایجوکیشن فیلوشپ۔

خواتین و حضرات۔

میرا یہ نہایت خوشگوار فرض ہے کہ نیو ایجوکیشن فیلوشپ اور سنٹرل ٹریننگ کالج کی طرف سے آپ سب کو نہایت گرم جوشی سے خوش آمدید کہوں۔ میرے اور میرے رفقائے کار کے لیے یہ امر بہت حوصلہ افزا ہے کہ آج اس جگہ سربرآوردہ اصحاب کا اجتماع موجود ہے۔ آپ نے جس انداز سے ہماری دعوت کو لبیک کہا ہے اس سے ہماری بڑی عزت افزائی ہوئی ہے۔ صاحب صدر میں خصوصیت سے آپ کا شکر گزار ہوں کہ آپ نے اپنی گوناگوں مصروفیتوں کے باوجود اس کالج میں آنے کے لیے وقت نکالا۔ میں واشنگٹن سٹیٹ کالج سے آنے والے احباب کا بھی ممنون ہوں کہ وہ اس کانفرنس میں شریک ہوئے۔

خواتین و حضرات، آپ کو علم ہے کہ نیو ایجوکیشن فیلوشپ کا مقصد یہ ہے کہ بچوں کو تعلیم دینے اور ان کی تربیت کرنے کے کام میں جدید ترین علم سے کام لیا جائے۔ اس کی یہ کوشش بھی رہتی ہے کہ آنے والے تعلیمی رجحانات کو پہلے سے معلوم کیا جائے۔ موجودہ کانفرنس کا مقصد نیو ایجوکیشن فیلوشپ کے اصولوں کا [illegible]

آیا بچے کو کچھ پابندیوں کے تحت رہنا چاہیے یا نہیں؟

حضرات! کسی ملک کے تعلیمی ڈھانچے کا انحصار ان مقاصد پر ہوتا ہے جو کسی قوم نے اپنے سامنے رکھے ہوئے ہوں۔ لہٰذا تعلیمی مقاصد قومی نصب العین کی روشنی میں ہی طے ہو سکتے ہیں۔ مختلف قوموں کی زندگی کے مقاصد مختلف ملکوں اور مختلف زمانوں میں مختلف رہے ہیں۔ مقاصد حیات کے اس اختلاف نے مختلف زمانوں اور مختلف معاشروں کے تعلیمی مقاصد کو بھی مختلف رنگ دیا ہے۔ لہٰذا ہمارا فرض ہے کہ قومی نصب العین کے متعلق ہمارے ذہن بالکل صاف ہوں تاکہ نئی پود کی توانائی صحیح نکاسوں میں بہتی رہے۔ مختلف تعلیمی فلاسفروں نے تعلیم کے جو مقاصد بیان کیے ہیں میں اس وقت ان کی بحث میں نہیں الجھنا چاہتا تاہم میں تعلیم کی ان تین ذمہ داریوں کا ذکر ضرور کروں گا جن کے متعلق عام اتفاق رائے ہے کہ وہ ایک جمہوری معاشرے میں پوری ہونی چاہئیں۔ وہ ذمہ داریاں یہ ہیں:-

(۱) ایک جمہوری معاشرے میں تعلیم کو ہر بچے کی فطری صلاحیتوں کی آبیاری کرنی چاہیے۔

(۲) تعلیم کو چاہیے کہ ان عام ذاتی مہارتوں کو ترقی دے جو معاشرتی زندگی میں عملی قابلیت حاصل کرنے کے لیے ضروری ہیں۔

(۳) تعلیم کو چاہیے کہ ثقافتی تسلسل اور ثقافتی مقاصد کی بقا میں مدد دے۔

ناقص تعلیم ان تینوں مقاصد میں ایک ساتھ ناکام رہ سکتی ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ ان میں سے ایک یا ایک سے زیادہ مقصد کو نظر انداز کر دے۔ صدر پاکستان نے حال ہی میں تعلیم کی اس سہ گانہ ذمہ داری کی طرف اشارہ کیا تھا۔ جب انھوں نے کہا تھا کہ ملک کا موجودہ نظام تعلیم لوگوں کو لکھنا پڑھنا سکھاتا ہے لیکن اس سے زیادہ بڑی ضرورت یقین اور کردار کی تعمیر ہے تاکہ ذمہ داری سنبھالنے کی جرأت پیدا ہو اور آزاد زندگی کی دوسری ضرورتیں پوری ہو سکیں۔ اس کے ساتھ انھوں نے یہ بھی کہا تھا کہ ہماری تعلیم کا مقصد یہ ہونا چاہیے کہ وہ زندگی کے تمام شعبوں کے لیے راہنما تیار کرے۔ مجھے یقین ہے کہ اس مجمع میں ہر شخص صدر مملکت کے ان خیالات سے پورا اتفاق رکھتا ہے۔

لیکن انھوں نے جو تعلیمی مقصد بیان کیا ہے وہ اسی صورت میں پورا ہو سکتا ہے جب [illegible]

کمرۂ جماعت میں ایک انقلاب بپا کر دے۔ اس کے لیے اسے زبانی رٹنے کی بجائے بچے کی تخلیقی قوتوں کو فروغ دینا ہوگا۔ آزادی کی آمد کے بعد تعلیم کے نصاب اور اس کے عام ڈھانچے میں کئی تبدیلیاں کی گئی ہیں لیکن نتائج مایوس کن رہے ہیں۔ یہ شکایت دن بدن بڑھ رہی ہے کہ ہمارے سکولوں اور کالجوں میں سے نکلنے والے لوگ زمانے کے امتحان میں پورے نہیں اترتے۔ زیادہ افسوس ناک امر یہ ہے کہ جب نوجوان زندگی کی آزمائش میں تسلی بخش نتائج نہ دکھا سکیں تو اس سے ان کے اعتمادِ نفس، احترامِ نفس اور گردوپیش کی دنیا کے ساتھ ان کے مراسم کو مزید ٹھیس پہنچتی ہے۔ اس سے ان کی استعدادِ حیات اور بھی گھٹتی ہے۔ لہٰذا اس بات کی شدید ضرورت ہے کہ ہم سائنسی اصولوں کی روشنی میں اپنی تعلیم کا جائزہ لیں۔ تعلیم کی ناکامی کی ایک وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ مدرسوں میں جو کچھ پڑھایا جا رہا ہے اس کا سارا تانا بانا اس زمانے کے مزاج کے منافی ہو جس میں تعلیم پانے والوں کو زندگی گزارنا ہے۔ دوسرے الفاظ میں یہ ممکن ہے کہ نصاب بے حد محدود اور بے نتیجہ قسم کا ہو۔ لیکن تعلیم ناقص طریقہ ہائے تدریس کی بنا پر بھی ناکام رہ سکتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ نیو ایجوکیشن کی تحریک صدیوں پرانے تحکم پسندانہ طریقہ ہائے تدریس کے خلاف ردِ عمل کے طور پر ہی شروع ہوئی تھی۔ تعلیم کی یہ سائنسی تحریک نفسیاتی حقائق کی روشنی میں اس یقین پر مبنی تھی کہ بچوں پر بے لچک عادات مسلط کرنا ایک جامد اور غیر متبدل معاشرے کو ہی راس آ سکتا ہے۔ سنہ ۱۹۲۱ء میں نیو ایجوکیشن فیلوشپ کے بانیوں نے اعلان کیا تھا کہ تعلیم کا فرض ہے کہ بچے کی روحانی قوتوں کو محفوظ رکھے اور انہیں ترقی دے اور ان روحانی قوتوں کی نشوونما کے لیے آزادی کا ماحول پیدا کرے" ظاہر ہے کہ روحانی قوتوں سے مراد بچے کی تخلیقی قوتیں ہیں۔ اپنی تعلیم کے کارناموں اور اس کی ناکامیوں کا جائزہ لیتے وقت ہمیں اسی پس منظر سے کام لینا چاہیے۔ جیسا صدر پاکستان نے بجا طور پر فرمایا ہے "تعلیم کی اصل غرض خواندگی کی اشاعت نہیں۔ گو ہماری تعلیم نے اس میدان میں بھی کوئی بڑا کارنامہ انجام نہیں دیا۔ بلکہ تعلیم کی اصل غرض معاشرتی عادتوں کی نشوونما ہے، جن کے نتیجے کے طور پر موثر تجارت اور صنعت کی استعداد پیدا ہوتی ہے۔ ہمیں اپنی تعلیم کی کامیابی اسی پیمانے سے ماپنی چاہیے۔ اس طرح جائزہ لینے سے ہماری تعلیم کی دو منزلیں واضح نظر آتی ہیں۔

والدین، بچوں اور نوجوانوں کی اچھے ماحول کے ساتھ مربوط ہونگی (ان لیے) انسان جب وہ زندگی میں داخل ہوتے ہیں تو وہ ان توقعات کو پورا نہیں کرتے جو زندگی کے امتحان میں ان سے وابستہ کی جاتی ہیں۔ معاشرتی اہلیت کا یہ نمایاں فقدان تعلیم کی کامیابی کے متعلق شدید تشویش پیدا کرتا ہے۔ جو لوگ تعلیم کی نئی تحریک کے ساتھ وابستہ ہو چکے ہیں یہ ان کا واضح فرض ہے کہ زندگی کی ضرورتوں اور تعلیم کی کارکردگی کے درمیان جو خلا ہے اس کی پیمائش کریں اور اس خلا کے پاٹنے کے ذرائع تجویز کریں۔ ہم یہاں ایک کان فرنس کی صورت میں اسی لیے جمع ہیں کہ یہ فرض ادا کریں۔

خواتین و حضرات! جدید دنیا ہوش ربا انقلابوں کی دنیا ہے۔ جو نوع انسان کی طرف بجلی کی سی تیزی کے ساتھ لپکے آ رہے ہیں۔ اس قسم کے دور میں کامیابی کے ساتھ زندگی گذارنے کے لیے تعلیمی مسائل کا تازہ رہنے پایا جائے اس سے مراد یہ ہے کہ اس بات کا مسلسل جائزہ لیتے رہنا چاہیے کہ ہم کیا پڑھا رہے ہیں اور کس طرح پڑھا رہے ہیں۔ مگر یہ عجیب بات ہے کہ گو پچھلے گیارہ برس میں نظام تعلیم کا رخ بدلنے کے متعلق بہت لکھا گیا ہے۔ طریقہ ہائے تدریس کو عملاً کچھ توجہ نہیں ملی۔ ہم اس اہم نکتہ کو نظر انداز کیے ہوئے ہیں۔ نصاب کے مندرجات کو معنی اور اہمیت عطا کرنے والی چیز وہ انداز ہے جس میں انھیں پیش کیا جائے ہمیں ابھی یہ نکتہ معلوم کرنا ہے کہ مروجہ طریقہ ہائے تدریس اس قدر فرسودہ ہیں کہ وہ موجودہ نصاب کے تمام امکانات کو بھی بروئے کار نہیں لا سکتے۔ موجودہ نصاب تعلیم کو برا بھلا کہنا ایک رواج سا بن گیا ہے۔ کوئی یہ نہیں سوچتا کہ اس تنقید سے آخر مراد کیا ہے؟ احاطہ ہر قسم کی ذمہ داری ایک شاذ ہی امتحان کے ظاہر نقائص کے سر تھوپ کر مطمئن ہو جاتے ہیں۔ اس سے زیادہ تعجب کی بات یہ ہے کہ یہ بودا استدلال سب کو مطمئن کیے ہوئے ہے۔ طلبہ اساتذہ، والدین، منتظم اور انتظامی افسر سب اس سے مطمئن ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ طریقہ ہائے تدریس سے کسی کو سروکار نہیں۔ ہر شخص اچھے امتحانی نتائج سے خوش ہو جاتا ہے۔ جو چیز اس مقصد میں مدد ہوا سے ایک ناگزیر برائی سمجھ کر خاموشی سے قبول کر لیا جاتا ہے۔ اس بات کا بہت کم احساس ہے کہ اچھے نتائج لازمی طور پر معاشرتی قابلیت کی ضد نہیں۔ نہایت آسانی سے یہ یقین کر لیا جاتا ہے کہ نظام تعلیم کی اصلاح کے لیے نصاب تعلیم اور طریق امتحان میں انقلابی تبدیلی ہونی چاہیے۔ طریقہ ہائے تدریس

اس سلسلے میں [illegible] ہیں [illegible] سے پہلے [illegible]

اور اکثر حالتوں میں بیشمار امتحانات بھی انھیں اشتعال دیتے ہیں کہ [illegible] میں [illegible]

سیکھی گئی تھیں۔ وہ کوئی عملی افادیت نہیں رکھتیں اور تدریس کے عمل میں قابلیت پیدا کرنے کی [illegible]

امتحانی نتائج پیدا کرنے کی بجائے بالا تر راہیں اختیار کی جائیں۔ ایک ایسے اجتماع میں جو نئی [illegible] کوشش [illegible]

اصولوں میں یقین رکھنے والے اساتذہ پر مشتمل ہو مجھے یہ وضاحت کرنے کی ضرورت نہیں [illegible]

مسائل کے متعلق اس قسم کا نقطۂ نگاہ بے حد افسوس ناک ہے۔ یہ صورت حال ہم سب کو دعوت عمل [illegible]

ہے۔ کیونکہ نئی تعلیم کی تحریک اس یقین کی پیداوار ہے کہ ہر بچے میں ایک تخلیقی قوت موجود ہے اور

پرانی وضع کے تحکم پسند طریقہ ہائے تدریس اس قوت کا گلا گھونٹ رہے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہنا

چاہیے کہ تعلیم کی سائنسی تحریک کی پہلی دلچسپی تدریسی طریقوں اور تکنیکوں میں تھی۔ ہم میں سے بہتوں کو یہ

بات یاد رکھنی چاہیے کہ مغربی تعلیم میں جو معرکۃ الآرا انقلاب پیدا ہوا۔ وہ استاد کے نقطۂ نگاہ میں بنیادی

تبدیلی پیدا کرنے سے ہی ممکن ہو سکا تھا۔ موجودہ کانفرنس کے منتظمین نے بحث کے موضوع [illegible]

وقت اسی نکتے کا لحاظ رکھا ہے۔

تخلیقی تعلیم پر زور دینا فی الحقیقت اس نکتے پر زور دینے کے مترادف ہے کہ الفاظ اور حقائق کا

ادھورا فہم حاصل کر کے انھیں طوطے کی طرح رٹ لینے کے مقابلے میں کردار کی نشوونما کو کہیں زیادہ توجہ ملنی چاہیے

عملی زندگی میں اعتمادِ نفس، قوت [illegible] جرأت عمل اور موثر قوت اظہار جیسے اوصاف ہی فیصلہ کن [illegible]

ہیں۔ آج ہمیں جس چیز کی فوری ضرورت ہے وہ جذبۂ جستجو اور تخلیقی اظہار کی آبیاری کا ہے۔ تعلیم کا نیا فلسفہ

استاد کو اس بات کا ذمہ دار ٹھہراتا ہے کہ وہ صرف تصورات، معلومات، مہارتوں اور عادات کو ترقی نہ دے

بلکہ طلبہ میں نقطۂ نگاہ، ادبی ذوق، قوت فکر اور ذاتی معاشرتی قوت مطابقت کی بھی نشوونما کرے۔

لیکن اگر تعلیم کو بچوں اور نوجوانوں کی تخلیقی قوتوں کو کام نا دکرنا اور انھیں مناسب راہوں پر [illegible]

[illegible] ان کی صلاحیتوں اور دلچسپیوں کے مطابق [illegible] چاہیے جو ان کی [illegible] کے لیے [illegible]

[illegible] اہمیت [illegible] ہے۔ [illegible] کی بہترین تعریف [illegible] ہے [illegible]

[illegible] کے درمیان صحت مند رشتہ قائم کیے جائیں۔ آخر کو بچوں کی ذہنی صحت کا مسئلہ اساتذہ اور والدین کے نقطۂ نگاہ میں تبدیلی پیدا کرنے کا مسئلہ بن جاتا ہے [illegible] غیر شعوری طور پر بچوں اور نوجوانوں کے ساتھ پرانے خیالات شفقت اور تحکمانہ انداز سے برتاؤ کرتے ہیں۔ اس قسم کا برتاؤ تخلیقی قوتوں کو پابند کر کے نہیں رکھ دیتا تو وہ انھیں مقید کر کے ضرور رکھ دیتا ہے۔ بچہ اپنی شخصیت کی آزادانہ نشوونما کے لیے محبت اور سلامتی چاہتا ہے تاکہ وہ ان اندرونی خلفشاروں سے عہدہ برآ ہو سکے جن کا اسے ناگزیر طور پر سامنا کرنا پڑتا ہے۔ مگر والدین خود ذہنی خلفشاروں کا شکار ہوتے ہیں۔ عین ممکن ہے کہ وہ ماضی سے احساس جرم کا بوجھ اٹھائے ہوئے ہوں۔ ایسی صورت میں وہ ایسے قصوروں کے معاملے میں غیر معقول حد تک آپے سے باہر ہو جاتے ہیں جو خود ان سے سرزد ہوئے تھے اور جن کا مرتکب وہ اپنی اولاد کو دیکھتے ہیں۔ موجودہ حالات میں ہمارے مدرسے والدین کو زیادہ تسکین بخشنے کے معاملے میں کچھ زیادہ نہیں کر سکتے۔ لہٰذا یہ امر اور بھی ضروری ہو جاتا ہے کہ ہمارے استاد ایسی نگاہ پیدا کریں جو طلبہ کے تحت الشعور کے ساتھ رابطہ پیدا کر سکے۔ اور اس طرح انھیں ان کے خوف اور بوجھل جذبات سے نجات دلا سکے۔

تخلیقی تعلیم اور ذہنی صحت کے ساتھ قریبی تعلق رکھنے والا ایک اور مسئلہ ضبط کا مسئلہ ہے یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ ہر مدرسے میں کچھ نہ کچھ پابندی کا ہونا ضروری ہے۔ لیکن ضبط کا پرانا نظریہ تنبیہ و سزا کے آزادانہ استعمال کی اجازت دیتا ہے۔ اس کے برخلاف نئی تعلیم قدرتی یعنی آزاد ضبط کی حمایت کرتی ہے جس کی تعریف یوں کی گئی ہے۔ "آزاد ضبط سے مراد یہ ہے کہ لڑکوں اور لڑکیوں کو ایک جمہوری معاشرے میں زندگی گزارنے کے لیے تیار کیا جائے"۔ اس تعریف میں اس نقطۂ نگاہ اور ضبط نفس پر زور دیا گیا ہے جو ایک مثالی جمہوریت میں زندگی گزارنے کے لیے بے حد ضروری ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ نئی تعلیم ضبط کو ایک تعمیری قوت خیال کرتی ہے جس کا مقصد اس طرز عمل۔ ان عادات اور ان طور طریقوں کو ترقی دینا ہے جو طالب علم کی معاشرتی بہبود میں اضافہ کریں۔ ضبط کا یہ تصور اس عقیدے پر مبنی ہے کہ غیر سماجی طرز عمل غیر آسودگی کا نتیجہ ہوا کرتا ہے علاوہ اس کے ہر طالب علم کی

[illegible] سے ہیں۔ کسی حد تک اس بات کا قائل ہے کہ [illegible]
بلا دلیل تعلیم مطلق اور استادوں کے درست فرض ہیں۔ ترقی پسند تعلیم کا عقیدہ یہ ہے کہ [illegible]
کی پابندی سے شروع ہو کر معقولیت کی متابعت پر ختم ہونا چاہیے۔ اس کا مطلب یہ ہے [illegible]
معاملے میں ذمہ داری حتی الامکان طلبہ کو سونپ دینی چاہیے۔ لہٰذا ہمیں استادوں سے یہ مطالبہ [illegible]
کیا جاتا کہ وہ بے اختیار ہو جائے۔ لیکن اس سے یہ مطالبہ یقیناً کیا جاتا ہے کہ وہ اپنے اختیارات کو [illegible]
دھند نہیں بلکہ مدرسے کی معاشرتی فضا کے قواعد و ضوابط کے طور پر استعمال کرے۔

نئی تعلیم کے بعض اہم پہلوؤں کی طرف مختصر طور پر اشارہ کرنے کے بعد مجھے اس سوال کا جواب
دینا چاہیے جو مروجہ طریقہ ہائے تدریس کے حامی شاید پوچھنا چاہتے ہوں وہ سوال یہ ہے کہ:۔ ہم [illegible]
مدرسے کے روزمرہ میں کس طرح داخل کر سکتے ہیں؟ میرا جواب یہ ہے کہ جس طرح دوسروں نے انھیں
خروج کیا۔ میرا یقین ہے کہ جن اصلاحوں کا ابھی ذکر ہوا ہے وہ مدرسے کے حسن کارکردگی میں خلل [illegible]
اس کے برعکس وہ اس میں حیرت انگیز اضافہ کرتی ہیں خواہ پیمائش کے لیے روایتی معیار ہی کیوں [illegible]
ہوں جدید قیاساتی تحقیق نے یہ بات پوری طرح ثابت کر دی ہے کہ ماڈل سازی تمثیل کاری مثلاً [illegible]
عجائب گھروں۔ سیاحتوں تعلیمی سفروں اور اسی قسم کے دوسرے سائل کی بدولت جن میں آزادی [illegible]
اور ذاتی تجربے کا عنصر غالب ہو، بچے زیادہ پائدار اور زیادہ بالکفایت تعلم حاصل کرتے ہیں بمقابلہ [illegible]
کہ تدریس کا سارا سہارا کتابی اور زبانی معلومات پر ہو۔ آپ سب کو معلوم ہے کہ ملکی اور غیر ملکی [illegible]
ہمیشہ یہ یاد دلاتے رہتے ہیں کہ ہمارا نظام تعلیم ضرورت سے زیادہ کتابی اور غیر حقیقت پسندانہ [illegible]
سے باہر زندگی کی چہل پہل نظر آتی ہے۔ مگر کمرۂ جماعت میں بےجان تدریس جاری رہتا ہے۔ یہ [illegible]
بچوں کے لیے مایوس کن اور روح کش ثابت ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ بچے طبعاً [illegible]
[illegible] پرست ہوا کرتے ہیں۔

[illegible] بچوں کو مرجھائی ہوئی اور غیر آہنگ شخصیتوں [illegible]
[illegible] کے مسئلہ پر سنجیدگی سے [illegible]

[illegible] سہولت نہیں ملتی پھر بھی ہر بچہ اس بات کا حق رکھتا ہے کہ بیرونی فضا میں دل کھول کر [illegible]
[illegible] ماحول سے آشنا ہو یا آزادی سے بھرپور ہو اور جو دوسرے کے اندر اور اس سے باہر واقعہ سے
[illegible] الٹ پلٹ کر دیکھے اور جنون گرمانے والے تجربہ حاصل کرنے کے مواقع سے بھرپور ہو۔ میں اجازت
چاہوں گا کہ اس ضمن میں رسالہ سلیقہ کے تازہ شمارہ سے ایک اقتباس پیش کروں۔

"تمام بچوں کو کھلی فضا سے واقف ہونا چاہیے۔ انھیں معلوم ہونا چاہیے کہ صحت بخش کیچڑ میں کھیلنے، صاف پانی میں چھپ چھپ کرنے، اور صبح کے وقت پرندوں کو اللہ کی تسبیح بیان کرتے سننے سے کیا مسرت حاصل ہوتی ہے۔ انھیں معلوم ہونا چاہیے کہ کھلے آسمان میں سورج نکلنے اور ڈوبنے کے وقت کیا ناقابلِ بیان حسن پیدا ہوتا ہے۔ صبح کے وقت شبنم کے انمول موتی سبزے میں کیا بہار پیدا کرتے ہیں۔ اناج سے ڈھکے ہوئے کھیت اور درختوں سے لدے ہوئے باغ کیا بھلے معلوم ہوتے ہیں۔ انھیں فصل بونے اور فصل کاٹنے کے اوقات اور گرمیوں کی بھری دوپہر کی خوشی محسوس کرنی چاہیے۔ انھیں اس بات کا تجربہ حاصل کرنا چاہیے کہ ننگے پاؤں چلنے، باہر بارش میں بھیگنے، بڑے درخت پر چڑھنے، پیڑ کی ٹہنیوں سے نیچے پھسلنے، اونچے درختوں پر چڑھنے اور ایک شفاف جوہڑ میں سر کے بل چھلانگ لگانے سے کیسی پرجوش مسرت ہاتھ لگتی ہے۔ انھیں اس بات کا موقع ملنا چاہیے کہ تیتریوں کے پیچھے بھاگے پھریں، سوکھے گھاس کے ڈھیر پر چڑھیں، باہر خیمہ لگا کر رہیں، کھلی آگ پر کھانا پکائیں اور ناواقف علاقے میں پیدل چلیں۔ انھیں یہ موقع ملنا چاہیے کہ گھوڑے کی سواری اور کشتی رانی سے تفریح حاصل کریں۔ انھیں یہ تجربہ حاصل ہونا چاہیے کہ خواہ وہ کتنا ننھا سا بیج بوئیں فطرت اس کا احترام کرتی ہے۔"

باہر کھلی جگہ میں جانے اور اس کا تجربہ حاصل کرنے سے دنیا کا بے حد بالیدگی اور صحت بخش فن پیدا ہوتا ہے۔ جس شخص نے آغاز زندگی میں دنیا کے ساتھ اس قسم کا رشتہ قائم نہ کیا ہو وہ فطرت پر بحث کرنے والی کتابوں، تاریخ کی کتابوں، نظموں

[illegible] سے بھی زیادہ ... نہیں ہو سکتا!

صاحب صدر! کچھ عرصے سے یہ رواج ہو گیا ہے کہ ہم اپنی ناکامی کا الزام حالات کے سر تھوپ دیتے ہیں۔ مثلاً ہم یہ کہہ دیتے ہیں کہ طلبہ کی تعداد بے تحاشہ بڑھ گئی ہے وغیرہ وغیرہ۔ حال ہی میں آپ نے یونیورسٹی کانووکیشن کے موقع پر جن خیالات کا اظہار کیا تھا میں نے ان کی تائید کی۔ آپ نے فرمایا تھا کہ موجودہ وسائل کے دائرے کے اندر بھی خاصا کام ہو سکتا ہے، بشرطیکہ ہم تخلیقی انداز، سرگرمی اور یکدلی سے عمل پیرا ہوں"۔ تعلیمی نصاب اور تعلیمی نظام میں خواہ کچھ اصلاح بھی ہو، مطلوبہ نتائج اس وقت تک حاصل نہیں ہوں گے، جب تک اس کے ساتھ ہی بچوں کی تربیت کے متعلق ہمارے نقطۂ نگاہ میں تبدیلی نہ آئے۔ ہمیں نئی نگاہ اور نئی قوت کی ضرورت ہے۔ ہمیں ایک نئی دھڑکتی ہوئی زندگی کی ضرورت ہے۔ غرضیکہ ہمیں کمرۂ جماعت میں ایک انقلاب کی ضرورت ہے۔ باہر سے خواہ ہمیں کتنی بھی امداد مل جائے، اس سے ہمارے مسائل حل نہ ہوں گے۔ ہماری آنے والی نسلوں کی نجات اساتذہ کے ہاتھ میں ہے جوہری توانائی اور خلائی سفر کے موجودہ دور میں ہمارے سامنے دو ہی راستے کھلے ہیں ہمیں یا تو متفکر اذہان پیدا کرنے ہوں گے ورنہ ہم مٹ جائیں گے۔ یہ امر خوشی کا موجب ہے کہ ملکی انتظام کے میدان میں ہم ایک حقیقی طور پر شاندار انقلاب میں سے گزر رہے ہیں۔ آئیے آج عہد کریں کہ ہم تعلیمی میدان میں بھی انقلاب کا آغاز کر دیں گے۔

ان الفاظ کے ساتھ جناب گورنر میں آپ سے استدعا کرتا ہوں کہ آپ کانفرنس کا افتتاح فرمائیں۔

(ترجمہ از فضل احمد)

مغربی پاکستان اُردو کانفرنس ۱۹۵۹ء

خطبۂ صدارت

مندرج ذیل خطبہ بابائے اُردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب نے مغربی پاکستان اُردو کانفرنس منعقدہ ۲۲ فروری ۱۹۵۹ء اورینٹل کالج لاہور میں کانفرنس کے صدر کی حیثیت سے ارشاد فرمایا۔ (معاون مدیر)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

رفیقو اور عز یزد!

عالی مقام اختر حسین صاحب

جسٹس رحمان

آپ نے اس کانفرنس میں جو اپنی نوعیت اور خصوصیت کے اعتبار سے خاص اہمیت رکھتی ہے، مجھے دعوتِ شرکت دے کر میری بڑی عزت افزائی فرمائی ہے۔ میں اسے اپنی زندگی کا سب سے بڑا اعزاز خیال کرتا ہوں۔ اس لیے کہ ایمان کے بعد مجھے جو چیز سب سے زیادہ عزیز ہے وہ اردو زبان کی ترقی و فروغ ہے اور اس ترقی و فروغ میں اول درجہ ذریعۂ تعلیم کا ہے۔ میں سالہا سال سے یہ کہتا اور لکھتا چلا آرہا ہوں کہ موجودہ ذریعۂ تعلیم نے جو ہمارے کالجوں اور یونیورسٹیوں میں مروج ہے۔ ہمارے جسمانی، ذہنی، روحانی اور اخلاقی تہذیبی نظام کو درہم برہم کرکے جو زیاں عظیم پہنچایا ہے وہ اس سے کہیں زیادہ ہے جو ہم اب تک سمجھے ہیں اس نے ہم میں عارضۂ کمتری پیدا کردیا۔ ہماری نظروں میں خود ہماری زبان، ہماری تہذیب و اخلاق اور روایات و مصنوعات کو حقیر بنا دیا۔ اس نے نہ صرف ہمارا طرز فکر بدل دیا بلکہ ہمارے دماغوں کی ساخت بھی بدل دی جس کے نمونے آپ کو ہر جگہ ملیں گے۔ میں آپ کو لاہور ہی کا ایک واقعہ سناتا ہوں۔

میں اُردو کی دھن میں بار بار دلی سے لاہور اس لیے آتا تھا کہ یہ اب اپنی حکومت ہے اور یہاں

اُردو کے پہنچنے کی زیادہ توقع ہے (یہی غلط فہمی مجھے بھارت سے آتے وقت پاکستان کے متعلق ہو گئی تھی) ایک بار میں وزیرِ تعلیم کی خدمت میں حاضر ہوا۔ یہ بہت قابل شخص تھے اور وکالت میں انھوں نے بڑا نام پایا تھا۔ میں نے ان سے عرض کیا کہ اگر آپ میٹریکولیشن کے درجوں میں ذریعۂ تعلیم اردو کر دیں تو پھر چند سال بعد یونیورسٹی میں بھی اردو کو ذریعۂ تعلیم بنانے میں آسانی ہو گی۔ کچھ دیر تو وہ میرا عرض خاموشی سے سنتے رہے اور اس سے پہلے کہ میں اپنی بات ختم کروں وہ جوش میں آ کر فرمانے لگے "مولوی صاحب آپ اس زمانے میں ایسی باتیں کہتے ہیں جب کہ لوگ "پتلون پہنتے اور ہاٹ پہ بیٹھتے ہیں" اور پھر فرمایا کہ انگریزی سے ہماری کوئی زبان مقابلہ نہیں کر سکتی، میرا بس چلے تو کشمیر سے لے کر راس کماری تک انگریزی ہی انگریزی کر دوں" اللہ اللہ کیا وفاداری ہے! انگریز کے اقبال کی قسم کھانی چاہیے کہ اسے ایسے وفادار جاں نثار خادم میسر ہیں۔ اس منصب پر اگر کوئی انگریز ہوتا تو کیا وہ ایسا کلمہ اپنی زبان سے نکال سکتا تھا؟ اس کے مقابلے میں میں آپ کو دوسرا واقعہ سناتا ہوں۔ سابق مرحوم ریاست حیدرآباد دکن میں بھی انگریزی علمداری کی طرح ایک زمانہ میں ذریعۂ تعلیم انگریزی تھا۔ میری تجویز پر ایک کمیٹی ذریعۂ تعلیم پر بحث کے لیے منعقد کی گئی۔ اس میں ہائی اسکولوں اور کالجوں کے پرنسپل اور بعض افسرانِ تعلیم بھی شریک تھے۔ ان میں سوا ایک انگریز کے باقی سب "نیٹو" تھے۔ ہمارے بھائی انگریزی کے حق میں تھے۔ یہ انگریز پرنسپل جس کا نام شوکراس تھا۔ بیٹھا سب بحث سنتا رہا۔ آخر اس سے نہ رہا گیا اور ایک دم بھڑک اٹھا اور میز پر زور سے مکّا مار کر کہنے لگا "آپ یہ کیا فضول بحث کر رہے ہیں ہم بھی ایک زمانے میں یہی کہتے تھے کہ انگریزی زبان اس قابل نہیں کہ اس میں علم و حکمت کی تعلیم دی جا سکے آج وہی زبان ہے جو دنیا پر چھائی ہوئی ہے اور اس کی مدح و ثنا کرتے کرتے آپ کا منہ خشک ہوا جاتا ہے۔"

مسٹر شوکراس نے بڑی سچی بات کہی۔ یہ الفاظ و اصطلاحات اور علوم و فنون حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے جو تھے آسمان سے نازل نہیں کیے تھے۔ اہلِ زبان کے دل میں اپنی زبان کی قدر و محبت تھی۔ انھوں نے اپنی کوشش اور محنت سے اسے بامِ عروج پر پہنچایا۔

یہ کس قدر عجیب اور حیرت انگیز بات ہے کہ ہم سوا سو سال سے ابھی اسی بحث میں الجھے ہوئے ہیں کہ اردو ذریعۂ تعلیم ہو سکتی ہے یا نہیں۔ حالاں کہ دو بار اس کا تجربہ ہو چکا ہے اور دونوں بار کامیاب رہا۔

ایک مرحوم دہلی کالج میں اور دوسرا [illegible] عثمانیہ یونیورسٹی میں۔ دونوں اداروں کا تجربہ اہل الرائے اور ماہرانِ تعلیم نے کیا اور اس امر کی تصدیق کی کہ ان کے طالب علم لیاقت میں ان طلبہ سے کسی طرح کم نہیں جن کی تعلیم انگریزی کے ذریعے سے ہوئی ہے۔ ایک ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کی نذر ہو گیا اور دوسرا پولیس ایکشن کی، عثمانیہ یونیورسٹی اب بھی موجود ہے۔ مگر اس کا ہونا نہ ہونا برابر ہے کیوں کہ وہ اس امتیازی خصوصیت سے جس کے لیے وہ قائم کی گئی تھی محروم کر دی گئی ہے۔ یہ سابق نظامِ حکومت کا عظیم الشان کارنامہ تھا جس پر اس نے بے دریغ روپیہ صرف کیا تھا اور جس کے چلانے میں ملک کے بہترین دماغوں نے کام کیا تھا۔ بھارت کا کیا بگڑتا، اگر اس کی وسیع اقلیم میں ایک یونیورسٹی ایسی بھی ہوتی جس میں ذریعۂ تعلیم ایک ملکی زبان ہوتی۔ مگر چوں کہ وہ زبان اردو تھی اس لیے گوارا نہ ہوا۔ ٹنڈن جی نے حیدرآباد کے ایک عام جلسہ میں ارشاد فرمایا کہ دارالترجمہ نے جو کچھ کیا ہے اسے موسیٰ ندی میں بہا دو۔ موسیٰ ندی میں تو نہ بہا سکے البتہ اسے آگ لگا کر اپنا کلیجہ ٹھنڈا کر لیا۔ حیدرآباد میں جس بے دردی سے ہماری زبان و تہذیب کو مٹانے کی کوشش کی گئی اس کا صدمہ ہم کبھی نہیں بھول سکتے۔

پاکستان میں اس بارے میں جو کچھ ہوا، اس کا بیان بھی اس موقع پر ضروری معلوم ہوتا ہے۔ پاکستان کو بنے ابھی کچھ اوپر تین مہینے ہوئے تھے کہ مسٹر فضل الرحمٰن نے جو اُس وقت وزیرِ تعلیم تھے ایک آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کا ڈول ڈالا جس کے اجلاس دارالحکومت کراچی میں ۲۷ نومبر ۱۹۴۷ء سے پہلی دسمبر ۱۹۴۷ء تک ہوتے رہے۔ اس کانفرنس میں پاکستان کے صوبوں اور ریاستوں کے وزرائے تعلیم اور ماہرینِ تعلیم مدعو کیے گئے تھے۔ یہ پہلی کانفرنس تھی جس میں تمام تعلیمی اہم بنیادی مسائل پر غور کیا گیا۔ زبان کا مسئلہ خاص طور پر زیرِ بحث آیا۔ صدرِ کانفرنس مسٹر فضل الرحمٰن نے اپنے خطبۂ صدارت میں اردو زبان کی تائید میں اپنا خیال ذیل کے مدلل اور پُر زور الفاظ میں اس طرح ادا فرمایا:۔

"ہمیں اپنی صوبائی زبانوں کی ترقی کے لیے زیادہ سے زیادہ گنجائش رکھنی چاہیے۔ نہ صرف ذریعۂ تعلیم کے لیے بلکہ اس تہذیب کی اشاعت کے لیے بھی جو ان زبانوں میں پائی جاتی ہے۔ لیکن صرف اس حد تک کہ اس مشترک تہذیب (کلچر) کی وحدت کو کوئی آسیب نہ پہنچے اس وحدت کے تحفظ کے لیے ہمیں ایک بین

صوبائی زبان کی ضرورت ہے۔ اس بارے میں اُردو زبان کے حقوق بابائے اُردو عبدالحق کے محتاج ہیں۔ یہ مسلمانان ہند کی خاص تخلیق ہے اور اس نے نسبتاً کم مدت میں اداے مافی الضمیر خیال کے نازک سے نازک فروق اور تخیل کی بلند ترین پرواز کے اظہار کی غیر معمولی قوت اور نزاکت احساس حاصل کر لی ہے۔ غیر زبانوں کے الفاظ مستعار لینے اور اپنے میں جذب کر لینے کی صلاحیت، فارسی، عربی اور انگریزی سے اس کے تاریخی تعلقات اور نظم و نثر میں اس کا اعلیٰ تخلیقی سرمایہ، یہ سب میری نظر میں اسے پاکستان کی "لنگوا فرینکا" کا مرتبہ دینے کے حق میں ناقابل تردید دلائل ہیں"۔

خطبۂ صدارت کے بعد کانفرنس مختلف کمیٹیوں میں ہر درجہ تعلیم کے مسائل پر غور کرنے کے لیے بٹ گئی ۲۹ نومبر کو ابتدائی ثانوی اور یونیورسٹی کی جملہ کمیٹیوں کا مشترکہ اجلاس ہوا جس کے صدر میاں افضل حسین تھے۔ اس میں جملہ کمیٹیوں نے سفارش کی کہ تمام سکولوں میں اردو بطور لازمی زبان پڑھائی جائے اور یہ امر ملحوظ رہے کہ صوبائی حکومتیں سکول ہی کے دوران تعلیم میں ذریعہ یا ذرائع تعلیم کا فیصلہ کریں مگر پاکستان کے نظام تعلیم میں ترقی رفتار کے ساتھ بتدریج اردو کو بطور ذریعۂ تعلیم اختیار کیا جائے"۔

اگرچہ کانفرنس میں مختلف اصول و عقائد اور مختلف زبانوں کے زبان دان شریک تھے لیکن وہ سب اس بات پر متفق تھے کہ اُردو کو ہر شعبۂ تعلیم میں لازمی زبان قرار دیا جائے اور تعلیمی ترقی کی رفتار کے ساتھ بتدریج اسے ذریعۂ تعلیم بنایا جائے۔ کانفرنس کا آخری اجلاس جو تمام مندوبین اور جملہ کمیٹیوں کا مجموعی اجلاس تھا اردو کو پاکستان کی لنگوا فرینکا تسلیم کرنے کی سفارش کی گئی۔

اس کے بعد حکومت پاکستان کی وزارت تعلیمات کے ایڈوائزری بورڈ کے اجلاس منعقدہ ماہ دسمبر ۱۹۴۸ء میں اردو کمیٹی کے قیام کی تجویز منظور ہوئی اور اس کا صدر مجھے منتخب کیا گیا۔ اس کمیٹی کے دوسرے اجلاس میں جو ۱۲ جولائی سنہ ۱۹۵۰ء میں منعقد ہوا، اور زبان کو ذریعۂ تعلیم بنانے کا مسئلہ پیش ہوا اور طے پایا کہ:- (۱) اُردو کو ذریعہ تعلیم بنانے کا آغاز پاکستان کے ایسے علاقوں سے ہو جہاں اُردو پہلے ہی سے سیکنڈری سکول کے درجے تک ذریعۂ تعلیم ہے۔ ایسے علاقوں میں پنجاب، صوبہ سرحد، بلوچستان اور کراچی شامل ہیں (۲) ان علاقوں میں انٹرمیڈیٹ تک اردو کو ذریعۂ تعلیم قرار دیا جائے اور اس پر ۱۹۵۱ء کے

تعلیمی سال سے عمل شروع ہو، اور اس دو سال کے عرصے میں مناسب نصابات کو لیے جائیں (ء) کمیٹی کی رائے میں انگریزی زبان کو بطور ایک لازمی مضمون کے باقی رکھنا نہایت ضروری ہے۔

(ب) حکومت کو چاہیے کہ وہ ان علاقوں میں اشتراک نصاب اور مشترکہ نصابی کتب رائج کرے تاکہ کام میں سہولت ہو۔

اسی اردو کمیٹی میں مسٹر فضل الرحمٰن نے اردو اکیڈیمی کی تجویز پیش کی اور اُن کی فرمائش پر میں نے اس کا آئین تیار کر کے پیش کیا۔

اُردو کمیٹی کے اور بھی کئی اجلاس ہوئے لیکن مسٹر فضل الرحمٰن کے وزارت تعلیم سے سبکدوش ہونے کے بعد یہ منصوبے سرپرستی سے محروم ہو گئے۔

تقسیم ملک کے بعد جب بھارت میں میرے لیے کام کرنے کی کوئی گنجائش باقی نہ رہی تو میں ہجرت کر کے کراچی آیا اور اپنے کتب خانے کا بڑا حصہ اپنے ساتھ لے آیا۔ یہاں آکر میں نے کل پاکستان انجمن ترقی اُردو قائم کی اور ۱۹۴۹ء میں ایک کالج قائم کیا جس کا ذریعۂ تعلیم یونیورسٹی کے تمام مضامین میں اُردو ہے اس کا قیام اچھی نظر سے نہ دیکھا گیا اور اس وقت کے گورنر جنرل اور گورنر سندھ دونوں نے اس کے افتتاح کی رسم ادا کرنے سے انکار کر دیا۔ اس وقت کراچی میں سندھ یونیورسٹی تھی۔ الحاق کے معاملے میں بڑی دشواری پیش آئی۔ یہ دشواری اس لیے پیش آئی کہ اس کا ذریعۂ تعلیم اردو تھا۔ یونیورسٹی کی نظر میں یہ ایسی بدعت تھی جو معاف نہیں ہو سکتی تھی۔ آخر بڑی کشمکش اور جدوجہد کے بعد الحاق منظور ہوا۔ ہم نے اردو ذریعۂ تعلیم کامیاب کر کے دکھا دیا۔ اس وقت بھارت اور پاکستان میں صرف یہی ایک کالج ہے جس کا ذریعۂ تعلیم یونیورسٹی کے تمام مضامین میں اُردو ہے۔ لیکن اس کے بعد سے اب تک کسی کالج کو یہ توفیق نہ ہوئی کہ وہ اردو کو ذریعۂ تعلیم بناتا۔

افسوس اس بات کا ہے کہ ہم نے اب تک اپنی زبان کا صحیح مقام نہیں سمجھا ورنہ اس کی وہ قدر کی جو ہونی چاہیے تھی۔ سچ پوچھیے تو اس کی قدر اور احترام ان لوگوں میں کہیں زیادہ ہے جن کی یہ زبان نہیں یا جہاں یہ کم مروج ہے۔ مشرقی پاکستان میں جیسا کہ ڈاکٹر سنتی کمار چیٹر جی نے لکھا ہے یہ زبان بنی جی کا بنا"

کہلاتی ہے اور اسے تقدس کا درجہ حاصل ہے۔ اردو دان اصحاب کا بڑا احترام کیا جاتا ہے۔ ان کے نکاح نامے اور میلاد اردو میں پڑھے جاتے ہیں۔ وعظ اردو میں ہوتے ہیں۔ عربی مدارس میں ذریعۂ تعلیم اردو ہے۔ جنوبی ہند کے علاقہ مدراس، میسور، ممالک متوسط، چھوٹا ناگپور وغیرہ میں اردو کا بھی احترام ہے۔ اردو کے ارتقا کی تاریخ پر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوگا کہ اردو زبان کی ترقی کی تقریباً تمام اہم تحریکیں ان لوگوں کی رہین منت ہیں جن کی زبان اردو نہ تھی۔ یہ ایسٹ انڈیا کے ڈائرکٹر اور حکام تھے جن کی تحریک سے فارسی کی بجائے اردو سرکاری زبان قرار پائی۔ قدیم دہلی کالج میں ڈاکٹر اسپرنگر نے تمام قدیم و جدید علوم کا ذریعۂ تعلیم اردو کو دیا اور ان کے جانشین مسٹر بٹروس نے اسے اور ترقی دی۔ کرنل ہالرائڈ نے پنجاب میں اردو کی جو خدمت کی آپ پر روشن ہے۔ سر اکبر حیدری کی مادری زبان گجراتی تھی۔ انہوں نے عثمانیہ یونیورسٹی قائم کرنے میں جو عظیم الشان کام کیا وہ تعریف سے بالا ہے۔ مسٹر فضل الرحمن نے اردو کی حمایت اور ترقی میں جو مدد دی وہ پاکستان میں ہمیں کسی جگہ نہ ملی۔ قائد اعظم کی زبان اردو نہ تھی لیکن محض اردو کے بچانے کے لیے اپنی جان جوکھم میں ڈال کر ایک پرانے ڈکوٹے میں بہت سا تیل بھروا کر سیدھے ڈھاکہ پہنچے اور میدانوں کے بھرے جلسے میں یہ یادگار زمانہ اعلان کیا کہ پاکستان کی زبان اردو ہوگی اور کوئی دوسری زبان نہیں ہو سکتی اور جو کوئی اس بارے میں غلط فہمی پھیلاتا جاتا ہے وہ صریحاً پاکستان کا دشمن ہے"۔ قائد اعظم کی دور اندیشی، سیاسی بصیرت اور اصابت رائے کا قائل ہونا پڑتا ہے کیونکہ اردو ہی پاکستان کی سالمیت و وحدت کی اصلی ضمانت ہے۔ ہمارے لیڈر اور حکام والاشان قائد اعظم کے اقوال اپنی تحریروں اور تقریروں میں بڑی شان اور فخر سے نقل کرتے ہیں لیکن اس اہم تاریخی قول کو بھول جاتے ہیں اور کوئی دوسرا نقل کرتا ہے تو برا مانتے ہیں۔ اس مرحوم کو وفات پائے ابھی دس سال تو ہوئے ہیں۔ آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا۔ اب میں آپ کو ایک واقعہ سناتا ہوں جس سے آپ کو معلوم ہوگا کہ اس برعظیم میں اردو کی کیا اہمیت تھی۔ سنہ ۱۹۳۶ء میں مسلم لیگ کی صدارت مسٹر محمد علی جناح کو پیش کی گئی۔ اس زمانے میں مسلم لیگ کا صدر ساری قوم کا سردار سمجھا جاتا تھا۔ آپ نے مولوی رفیع الدین مرحوم کا نام سنا ہوگا۔ یہ بہت قابل شخص تھے اور بڑے اچھے مقرر تھے

صوبہ بمبئی کی حکومت میں مسلسل کئی سال تک وزیر تعلیم رہے۔ انھوں نے اپنے اثر سے وہاں کی حکومت سے یہ بات منوائی کہ اردو بھی مرہٹی اور گجراتی کی طرح صوبہ بمبئی کی ایک زبان ہے۔ اور اپنے زمانۂ وزارت میں اردو کی ترقی اور اردو مدارس کھلوانے میں بڑا کام کیا۔ انھیں جب یہ معلوم ہوا کہ مسٹر محمد علی جناح آل انڈیا مسلم لیگ کے صدر منتخب کیے گئے ہیں تو وہ پونا سے بمبئی آئے اور قائداعظم سے ملے اور ان سے کہا کہ آپ مسلمانوں کے لیڈر نہیں ہو سکتے۔ انھوں نے پوچھا کیوں؟ تو مولوی رفیع الدین نے کہا اس لیے کہ تم اُردو نہیں جانتے۔" یہ بات لکھنؤ، دلی، حیدرآباد یا لاہور کے کسی شخص نے نہیں کہی تھی۔ یہ اُس شخص نے کہی جو بمبئی صوبے کا رہنے والا تھا۔ یہ تھا اردو کا احترام! کیا اب بھی کوئی ایسی بات اسی پایہ کے لیڈر سے کہہ سکتا ہے؟

یورپ کے مستشرقین بھی اب یہ سمجھنے لگے ہیں کہ اسلامی تہذیب و تمدن کے سمجھنے کے لیے اردو زبان کا جاننا بھی ضروری ہے۔ گذشتہ سال پروفیسر عطی نے اپنی ایک تحریر میں لکھا کہ "اسلام کی ایک اور عظیم زبان (اُردو) ہے جس کی طرف کہیں بھی کافی توجہ نہیں کی گئی"۔ لیکن باوجود اس کے وہ ایشیا، افریقہ، یورپ، امریکہ میں گھر کر رہی ہے۔ اور اس کے بولنے اور سمجھنے اور لکھنے پڑھنے والے برما، عدن، جدہ، مکہ، مدینہ، کربلا، نجف، طہران، بغداد، قاہرہ، سلون، انڈیمان، فجی، برٹش گائنا، ٹرنی ڈاڈ، ویسٹ انڈیز، جنوبی اور مشرقی افریقہ، مارشیس، ملایا، بخارا، انڈونیشیا، وغیرہ میں موجود ہیں۔ اور دنیا کی متعدد یونیورسٹیاں مثلاً جاپان، ماسکو، لینن گراڈ، مصر، ترکی، ایران، ملایا، اٹلی وغیرہ میں اس کی باقاعدہ تعلیم ہوتی ہے۔ اور سمرقند، تاشقند اور بخارا میں لازمی طور سے پڑھائی جاتی ہے، اور روز بروز اس کا دائرہ اثر بڑھتا چلا جا رہا ہے

یہ جو کہا جاتا ہے کہ انگریزی حکومت نے انگریزی زبان کو اس لیے رواج دیا تھا کہ وہ سستے کرانی پیدا کر سکے، صحیح ہے۔ اگر انگریزی زبان پڑھا کر وہ ملکی اغراض کے لیے اپنے ڈھب کے آدمی تیار کرنا چاہتی تھی تو یہ کوئی قابل اعتراض بات نہ تھی۔ لیکن قابل غور بات یہ ہے کہ اس نے ہمارے سکولوں اور کالجوں میں انگریزی کو ذریعۂ تعلیم کیوں بنایا۔ انگریزی کو ذریعۂ تعلیم بنائے بغیر بھی اسے اپنے دفتروں کے لیے کارآمد کرانی مل سکتے تھے۔ انگریزی کو ذریعۂ تعلیم قرار دینے میں انگریزی کی بہت بڑی حکمت پنہاں تھی۔ اس کی

نظر دوررس وہاں پہنچی جہاں اس وقت ہمارا طائر خیال بھی نہیں پہنچ سکتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ ایک وقت ایسا آنے والا ہے کہ اسے اس برِ عظیم کی شہنشاہیت سے دست کش ہونا پڑے گا، اس لیے اس نے ابتدا ہی سے ایسا عمل کیا کہ خارجی تسلط نہ بھی رہے تو بھی اہل ہندوستان پر اس کا باطنی تسلط برقرار رہے۔ اس نے صدیوں کی شان دیکھی تھی اسے کیا خبر تھی کہ اسے اس قدر جلد رخصت ہونا پڑے گا۔ پھر بھی اس کی دور اندیشی کام آئی۔ اور گو وہ ظاہر میں یہاں سے رخصت ہو چکا ہے لیکن باطن میں اس کی فرماں روائی ویسی ہی باقی ہے شاید کچھ زیادہ ہی ہو گی۔ اس نے ہم سے ہماری حکومت اور ہماری دولت تو چھینی ہی تھی۔ ظالم نے ہماری زبان بھی چھین لی۔ ہمارا دماغ بھی چھین لیا اور ہماری تہذیب اور ہمارے اخلاق بھی چھین لیے۔ اور باوجود تعلیم یافتہ کہلانے کے ہم جاہل کے جاہل ہی رہے۔ انگریزی کے اقبال اور اس کے جبروت و قہر نے وہ کام نہیں کیا جو چپکے چپکے انگریزی ذریعۂ تعلیم انگریزی قوم کے حق میں کر گذری۔ کہنے کو یہ ذرا سی بات ہے۔ لیکن یہ ذرا سی "غلطی" قوموں کے ڈبونے کے لیے کافی ہے۔ قوموں کے زوال کے متعدد اسباب بتائے گئے ہیں اور مورخوں نے اس پر بڑی دل چسپ اور عالمانہ بحثیں کی ہیں۔ لیکن آئندہ کے مورخ کو ان اسباب پر ایک اور سبب کا بھی اضافہ کرنا پڑے گا۔ اسے لکھنا پڑے گا کہ فلاں قوم اس لیے زوال پذیر ہو گئی کہ اسے ایک اجنبی غیر زبان کے ذریعہ تعلیم دی گئی تھی بعض اوقات یہ فاسد خیال دل میں آتا ہے کہ ایسی تعلیم سے تو جاہل رہنا بہتر ہے کہ اس میں اپنی اصلی حالت اور فطری سادگی تو باقی رہتی ہے۔ سر سید احمد خاں جو انگریزی تعلیم کے بہت بڑے حامی تھے اور جنھوں نے اپنی قوم میں جدید مغربی تعلیم کے رواج دینے کے لیے کیسی کیسی رسوائیاں اور مصیبتیں جھیلیں۔ تجربہ کے بعد انھیں بھی یہ کہنا پڑا کہ یونی ورسٹیوں کی مثال اور ہمارے لڑکوں کی مثال آقا اور غلام کی سی ہے۔ ہم یونیورسٹی کے تابع ہیں اور اسی کے ہاتھ بکے ہوئے ہیں۔ جو ٹکڑا علم کا دیتی ہے اس کو کھا کر پیٹ بھر لیتے ہیں اور اسی پر قناعت کرتے ہیں اے دوستو! ہماری پوری پوری تعلیم اسی وقت ہو گی جب ہماری تعلیم ہمارے ہاتھ میں ہو گی۔ یونیورسٹیوں کی غلامی سے آزادی ہو گی۔ ہم آپ اپنی تعلیم کے مالک ہوں گے۔ بغیر یونیورسٹیوں کی غلامی کے ہم آپ اپنی قوم میں تعلیم پھیلائیں گے۔ یونیورسٹی کی تعلیم ہمیں صرف نجر بناتی ہے ... ہم آدمی جبھی ہوں گے جب تعلیم ہمارے ہاتھ میں ہو گی۔"

اب ہماری تعلیم ہمارے ہاتھ میں ہے۔ مگر اس سے کیا فرق پڑا۔ وہ غلامی جس کی شکایت سر سید نے کی تھی اب بھی ہم پر مسلط ہے۔ آدمی ہم اب بھی نہ بنے۔ جب تک انگریزی ذریعۂ تعلیم رہے گا ہمیں نہ کبھی آزادی نصیب ہو گی اور نہ علم۔

ایک اعتبار سے دیکھا جائے تو ہماری زبان نے (میں اس وقت ادب سے بحث نہیں کر رہا ہوں) ایسٹ انڈیا کمپنی کے وقت سے کچھ تنزل ہی کیا ہے۔ ۱۸۳۵ء کے بعد سے جب اردو فارسی کی جانشین قرار پائی تو اس زبان کا رواج، دفتروں، عدالتوں اور مدرسوں میں ہونے لگا۔ عدالتوں میں وکیل اردو میں بحث کرتے تھے۔ جج یا منصف فیصلے اردو میں لکھتے تھے۔ عملہ سارا کاروبار اردو میں کرتا تھا۔ یہی حال دوسرے دفتروں کا تھا۔ انجینئرنگ کی تعلیم اردو میں دی جاتی تھی اور ڈاکٹری اردو کے ذریعہ سکھائی جاتی تھی۔ یہاں تک کہ انگریزی فوج کی کمان بھی اردو میں کی جاتی تھی۔ یہ سن کر آپ کو تعجب ہو گا اور شاید آپ کو یقین نہ آئے۔ اس لیے میں اس قول کی تصدیق میں ایک واقعہ نقل کرتا ہوں۔ لارڈ کارنوالس کے عہد میں جب ایسٹ انڈیا کمپنی کی فوج سلطان شہید (ٹیپو سلطان) کے لشکر کے مقابلے میں لڑ رہی تھی تو ایک نازک موقع پر انگریزی فوج کے کمانڈر نے حکم دیا "ہٹو" مگر پھر اسے خیال آیا کہ اس سے غلطی ہوئی ہے۔ اس نے فوراً حکم دیا "دبو" پہلے حکم کی تعمیل کی جاتی تو ساری فوج اور کمانڈر کا صفایا ہو جاتا . . . . اگر آپ کی معلومات انگریزی کو ٹھیس نہ لگے تو میں بڑے ادب سے یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ اگر ملک کی سرکاری یا قومی زبانیں دو یا زیادہ ہوں تو فوج کی کمان کس زبان میں کی جائے گی؟ اس کا مطلب صاف الفاظ میں یہ ہے کہ انگریزی کا راج اور سہاگ دائم و قائم رہے گا۔ رہے نام اللہ کا اور انگریزی زبان کا۔

فوج کی کمان تو رہی ایک طرف۔ ہم اکثر بات چیت انگریزی میں کرتے ہیں۔ ایک دوسرے کو خط بھی انگریزی میں لکھتے ہیں، اور اس میں فخر محسوس کرتے ہیں۔ کوئی دو سال ہوئے مولانا عبدالحلیم شررؔ کی نواسی نے جو لندن میں اپنے میاں کے ساتھ مقیم ہیں، مجھے ایک خط میں لکھا کہ چند روز ہوئے ایک انگریز دوست ہمارے میاں سے ملنے آئے، اتنے میں ڈاک آئی تو ہمارے میاں ایک خط کھول کر پڑھنے لگے، خط انگریزی میں تھا۔ ایک انگریز دوست ان کے قریب بیٹھا تھا، اس نے پوچھا، خط کسی انگریز کا ہے؟ ہمارے میاں نے کہا نہیں

ایک پاکستانی دوست کا ہے۔ اس پر اُس انگریز نے کہا سچ ہے ہم جہاں کہیں جاتے ہیں وہاں کے لوگوں کو لکھنا پڑھنا اور تہذیب سکھاتے ہیں اور انسان بنا دیتے ہیں"۔ یہ سن کر ہمارے میاں کو بڑا طیش آیا اور جھٹ دوسرے کمرے سے تاریخ کی ایک دو کتابیں لے کر آئے اور اسے بتایا کہ جب ہماری تہذیب اور علم و فضل عروج پر تھا تو تم جاہل تھے، جنگلی تھے۔ ہم نے یورپ کی جہالت کو مٹایا اور علم کی شمع روشن کی اور تم کو انسان بنایا"۔ انگریز دوست بہت جھینپا اور معذرت کرنے لگا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ پاکستانی صاحب کا یہ جواب بے محل تھا۔ اس نے انگریزی خط دیکھ کر بالکل بجا خیال کیا کہ پاکستانیوں کی کوئی زبان نہیں، انگریز نے اپنے تسلط کے زمانے میں انگریزی زبان سکھائی اور پڑھائی۔ اگر ان کی اپنی کوئی زبان ہوتی تو وہ غیر زبان میں خط و کتابت کیوں کرتے۔ وہ ایک آزاد قوم کا فرد تھا، اسے کیا معلوم تھا کہ غلامی کیسی بڑی لعنت ہوتی ہے اور اس کے اثر کیسے انسانیت کش اور غیرت سوز ہوتے ہیں۔

مجھ سے کئی اردو داں یورپینوں نے شکایت کی کہ ہم جب کسی پاکستانی سے اردو میں بات کرتے ہیں تو وہ جواب انگریزی میں دیتے ہیں۔ یہ شکایت صحیح ہے۔ جو لوگ اپنی قومی زبان کے استعمال سے شرماتے ہیں ان میں قومی غیرت کا احساس نہیں۔ وہ قائد اعظم کی توہین کرتے ہیں۔ وہ اپنے اسلاف کی اور خاص کر ان بزرگوں کی توہین کرتے ہیں جنہوں نے اپنی مادی، ذہنی، اخلاقی اور روحانی ساعی سے اس زبان کو عروج تک پہنچایا وہ ساری قوم کی توہین کرتے ہیں۔

سر سید احمد خاں نے ۱۸۶۷ء میں سائنٹفک سوسائٹی کی بنا ڈالی جس کا مقصد یہ تھا کہ علمی اور تاریخی کتابیں انگریزی سے اردو میں ترجمہ کرائی جائیں۔ بقول مولانا حالی انہوں نے اس بات کو انگریزی تعلیم پھیلانے سے زیادہ ضروری اور مقدم سمجھا۔ اسی سال انہوں نے ایک عرضداشت دربارہ قیام ورنیکلر یعنی اردو یونیورسٹی گورنر جنرل باجلاس کونسل کی خدمت میں بھیجی۔ یہ بڑی اہم دوررس اور اصلاحی بلکہ انقلابی تحریک تھی۔ اس عرضداشت میں مروجہ طریقہ تعلیم کو ناقص اور غیر کافی بتایا جس کا سب سے بڑا سبب یہ ہے کہ ذریعۂ تعلیم انگریزی زبان ہے اور ایک ایسی غیر اور اجنبی زبان کے ذریعۂ تعلیم قرار دینے سے جو خرابیاں پیدا ہوتی ہیں ان کی صراحت کی ہے۔ یہ عجیب بات ہے کہ اسی زمانے میں ایک سال بعد ۱۸۶۸ء میں جاپان کے شہنشاہ

(ست شی ہشی) نے اپنے ملک میں اصلاحات کا بیڑہ اٹھایا۔ اور یہ عہد کیا کہ علم کو روئے زمین سے حاصل کر کے اپنے ملک میں پھیلائیں گے۔ سرسید کو اور شہنشاہ جاپان دونوں کو جدید تعلیم کی اشاعت کا خیال ایک ہی وقت آیا لیکن وہ اس عرصے میں کہیں سے کہیں پہنچ گیا۔ اور ہم ابھی تک یہی فیصلہ نہیں کر سکے کہ ذریعۂ تعلیم کیا ہو۔ وجہ یہ ہے کہ جاپان نے تمام علوم و فنون کو اپنی زبان میں منتقل کر لیا اور اپنے مدرسوں اور کالجوں میں ہر علم و فن کو اپنی زبان کے ذریعہ پڑھایا۔ یہاں تک کہ وہ انگریزی زبان بھی جاپانی زبان ہی کے ذریعہ پڑھاتے ہیں۔ وہ بھی ہمارے جیسا ایشیائی ملک ہے اس کی زبان بھی ایسی ہی ہے جیسی ہماری زبان۔ اس کی حیرت انگیز ترقی اس وجہ سے ہے کہ اس نے اپنی تعلیم کا ذریعہ کسی غیر زبان کو نہیں بنایا۔ ہم پسماندہ اس لیے رہے کہ ہم پر ڈبل غلامی سوار تھی۔ ایک انگریزی حکومت کی دوسری انگریزی زبان کی۔ انگریزی تعلیم اس برعظیم پر سو سوا سو برس سے جاری ہے۔ اگر ہمیں تمام علوم و فنون اپنی زبان کے ذریعہ دی جاتی تو یہ سارے علوم ہمارے اپنے ہو جاتے اور مغربی ادیبوں اور شاعروں، فلسفیوں، سائنس دانوں اور مفکرین کے افکار و خیالات سب ہماری زبان میں آ جاتے، خیال کیجیے کہ ہماری زبان کس قدر وسیع اور پرمایہ ہو جاتی اور اس کا مرتبہ کتنا بلند ہو جاتا۔

ہمارے سردارانِ قوم، ماہرینِ تعلیم، اربابِ حکومت اور سیاست دانوں نے اپنی تحریروں اور تقریروں میں ہمارے موجودہ نظامِ تعلیم کو مقتضائے وقت اور ہماری تہذیب و تصورات کے خلاف اور انگریزی عہد کی سیاسی پالیسی پر مبنی بتایا ہے اور اس کی اصلاح اور تبدیلی پر بار بار زور دیا ہے لیکن اصل بنیادی نقص پر کسی کی نظر نہیں جاتی جو تمام خرابیوں کی جڑ ہے اگر ہم دل سے اصلاح کے خواہاں اور ملک میں تعلیم عام ہونے کے متمنی ہیں تو سب سے مقدم اصلاح ذریعۂ تعلیم کی ہونی چاہیے۔ ورنہ اگر ہم اسی طرح صدہا سال تک بھی تعلیم پاتے رہے تو بھی علوم سے محروم رہیں گے۔

جب ہم نے عثمانیہ یونیورسٹی کا منصوبہ اکابر ملک اور ماہرینِ تعلیم کی خدمت میں بھیجا اور ان سے رائے طلب کی تو ڈاکٹر رابندر ناتھ ٹیگور نے لکھا کہ آپ نے جو اپنے منصوبے کو تجربہ کے نام سے موسوم کیا ہے یہ صحیح نہیں۔ اصلی اور فطری طریقۂ تعلیم وہی ہے جو آپ نے تجویز کیا ہے۔ سر تیج بہادر سپرو مجھ سے کہتے تھے کہ میں کئی یونیورسٹیوں کا ممتحن ہوں، عثمانیہ یونیورسٹی کے طلبہ کے پرچے دیکھ کر مجھے معلوم ہوا کہ

یہ جو کچھ لکھتے ہیں سمجھ کر لکھتے ہیں، وہ انھیں اپنے مضمون پر کافی عبور ہے۔ بخلاف ان طلبہ کے جن کا ذریعہ تعلیم انگریزی ہے۔ ان کے جوابات سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ کتابیں رٹ کر لکھتے ہیں۔ اس فرق کا میں ایک معمولی مثال پیش کرتا ہوں۔ ہمارے قدیم عربی مدارس کے طلبہ کو لیجیے۔ اسے چھوڑیے کہ ان کے علمی نصاب کا بیشتر حصہ ایسے نظریات اور اصولوں پر مبنی ہے جو باطل قرار پا چکے ہیں۔ لیکن انھوں نے جو کچھ بھی پڑھا ہے اس پر انھیں کافی قدرت ہوتی ہے اور ان کا علم پختہ ہوتا ہے وہ ان مسائل پر پورے اعتماد کے ساتھ گفتگو اور بحث کر سکتے ہیں ہمارے انگریزی مدارس کے طلبہ میں یہ اعتماد نہیں ہوتا۔ ان کا علم خام، ادھورا اور ناقص ہوتا ہے۔ عربی مدارس میں اپنی زبان کے ذریعہ تعلیم دی جاتی ہے اور ان کے سارے بحث مباحثے اپنی زبان میں ہوتے ہیں۔ اس لیے اُن کے طلبہ جو کچھ پڑھتے ہیں اسے اچھی طرح جذب کر لیتے ہیں۔

جب کبھی ہم ذریعہ تعلیم بدلنے اور اپنی زبان میں تعلیم دینے کی تجویز کرتے ہیں تو وہی فرسودہ اور پامال دلائل پیش کی جاتی ہیں جو سو سال سے بار بار پیش کی جاتی رہی ہیں۔ نہ صرف ان کے نہایت معقول جواب دیے جا چکے ہیں بلکہ ان دلیلوں کی قلعی تردید اس طرح کی گئی کہ اردو کو ذریعہ تعلیم بنا کر اپنے دعوی کا ثبوت بہم پہنچایا گیا۔ لیکن سب کچھ دیکھنے کے بعد بھی "میں نہ مانوں" کی رٹ برابر لگی رہی۔ سوتے کو جگانا آسان ہے۔ جاگتے کو جگانا محال ہے۔ اب اس بارے میں مذاکرے، مباحثے، سوال و جواب اور ردوکد بے کار ہے۔ اس کا واحد علاج صرف ایک ہے اور وہ یہ کہ ہم اللہ کا نام لے کر اردو یونیورسٹی قائم کر دیں، جسے نہ غدر کی غداری مٹا سکے نہ پولیس ایکشن کی تباہی۔ یہ کام ایسا مشکل نہیں جیسا کہ سمجھ لیا گیا ہے۔ اگر ہم ہمت کر کے اٹھ کھڑے ہوں اور سچے عزم اور خلوص سے اس کا تہیہ کر لیں تو کوئی بڑی بات نہیں۔ یہ یونیورسٹی بن کے رہے گی، آج نہیں تو کل۔ کل نہیں تو پرسوں اس کی بنا پڑ کے رہے گی، اور کچھ تعجب نہیں کہ آج ہی سے اس کا ڈول پڑنا شروع ہو جائے۔ اردو زبان کی صلاحیتیں بے پایاں ہیں۔ اس میں ترقی و توسیع کی بے حد گنجائش ہے اور بین الاقوامی زبان بننے کی اہلیت رکھتی ہے۔ یہ یونیورسٹی ان تمام امکانات اور صلاحیتوں کو روشنی میں لائے گی اور ہماری قومی زبان و تہذیب اور ہمارے تصورات کی صحیح ترجمانی اور نمائندگی کرے گی۔ یہ مقام علم و تحقیق کا مرکز ہوگا۔ اس وقت ہم یہ کہنے کے قابل ہو سکیں گے کہ آج ہم نے حلقۂ غلامی سے نکل کر آزادی کی سرحد میں قدم رکھا ہے۔ اردو زندہ باد ÷

پاکستان پائندہ باد

ہمارے نظامِ تعلیم میں اردو کا مقام

شیخ اصغر علی

ایک قومی اور ملکی زبان سے اس سے بڑھ کر اور نا انصافی کیا ہو سکتی ہے کہ اسے اپنے ہی نظامِ تعلیم میں ایک متوقر اور رفیع مقام سے گرا کر اس کی مسند پہ ایک غیر ملکی زبان کو بٹھا دیا جائے اور وہ تمام حقوق جو اس کے لیے مختص ہونے چاہییے تھے۔ سمندر پار کی زبان کو عطا کر دیے جائیں یہ فی الحقیقت ایک سانحہ عظیم ہے ۔

میں کسی غیر ملکی زبان کا مخالف نہیں ہوں اور نہ ہی آپ یہ خیال فرمائیں کہ میں انگریزی یا ایسی ہی دوسری کثیف یا یہ غیر ملکی زبانوں کی قدر کرنا نہیں جانتا۔ میں جانتا ہوں کہ ہماری زبان ان تمام زبانوں کی احسان مند ہے، اس نے ان سے الفاظ، محاورات لیے ہیں، خیالات لیے ہیں، انداز اور اسلوب چھینا ہے۔ فن اپنایا ہے۔ تحقیق و تنقید کے اصول سیکھے ہیں اور نہ معلوم ابھی اور کیا کچھ سیکھے گی لیکن اس ساری احسان مندی کا یہ مطلب تو نہیں کہ یہ اپنے وقار کو ان کی بھینٹ چڑھا دے اپنی آن کو ان پہ قربان کر دے۔

دنیا بھر کے آزاد ممالک میں گھوم جائیے۔ نچلی جماعت سے لے کر اوپر کی جماعتوں تک آپ کو وہاں کی ملکی و قومی زبان کا بول بالا نظر آئے گا۔ نہ صرف یہ کہ وہ زبان علوم و فنون کی تحصیل کا ذریعہ ہو گی، بلکہ اسے ایک مضمونِ تدریس کی حیثیت سے بھی اعلیٰ جماعتوں کے نصاب میں شامل رکھا گیا ہو گا۔ اگر یہ نہ ہو تو افراد قوم میں قوتِ اظہار کہاں سے آئے۔ طلبہ میں انفرادی رنگ کیوں کر جھلکے۔ ان کی تخلیقی صلاحیتیں کس طرح اجاگر ہوں۔ ان کی شخصیتوں میں نکھار اور ان کے ذہنوں میں چمک کیسے پیدا ہو؟

ذہنی صحت کی علامات میں سے ایک علامت یہ بھی ہے کہ انسان صحیح زبان بولتا ہو۔ اگر اس علامت کو ذہنی صحت کا معیار مان لیا جائے تو ہم میں کتنے ہیں جو اس کسوٹی پر پورے اتر سکیں گے؟ اور تعجب بھی کیوں کر ہو جس ملک کے نظامِ تعلیم میں اختیاری مضمون کی حیثیت سے بھی اسے ایک گھٹیا درجے کا مضمون قرار دیدیا جائے۔ اس نظام سے نکل کر باہر ہونے والے افراد اگر گھٹیا اور غلط زبان بولیں تو تعجب کیسا؟

آج ہر جگہ اس بات کا رونا ہے کہ ہمارے طلبہ میں اُپج کا فقدان ہے۔ ان میں گہرا انفرادی رنگ نظر نہیں آتا۔ وہ دوسروں کی چبائی ہوئی باتوں کو اُگلتے ہیں۔ ان کے خیالات اپنے ہوتے ہیں نہ الفاظ۔ وہ تاریخی واقعات کو اپنی زبان میں لکھنے کے بجائے کتاب کے الفاظ میں لکھتے ہیں۔ معاشیات ہو یا جغرافیہ طبیعات ہو یا کیمیا ان کا علم رٹنے پر مبنی۔ ان کی واقفیت گھوسٹے کی مرہون اور ان کی قابلیت نقالی کی محتاج۔ ان کے جوابات سے ان کی تخلیقی صلاحیت کی شہادت نہیں ملتی۔ ان کے پرچوں سے یہ اندازہ نہیں ہوتا کہ ان کا علم ٹھوس، ان کے خیالات پختہ اور ان کی زبان شستہ ہے۔ وہ بولنے اُٹھتے ہیں تو زبان لڑکھڑانے لگتی ہے۔ علمی محفل میں بات کرتے ہیں تو جھینپے جاتے ہیں، خود اعتمادی کے جوہر سے معرّا، مافی الضمیر کے ادا سے قاصر، کیفیات کے بیان سے عاری، انداز ان کا بھونڈا، اسلوب ان کا قابلِ اعتراض، نہ تقریر کا ملکہ نہ تحریر کا فن۔ آخر یہ کیا تعلیم ہے کہ یونیورسٹی سے جُبّے پہننے اور دستارِ فضیلت باندھنے کے بعد کوئی ایک زبان بھی قاعدے اور صحت سے بولنا نہیں آتی۔ کسی موضوع پر گفتگو کرنا ہو تو جب تک تین زبانوں کا سہارا نہ لیں، مافی الضمیر کو واضح نہیں کر سکتے، اور طرّہ یہ کہ تینوں میں سے ایک بھی ٹھیک نہیں بولتے۔

صرف انگریزی ہی میں ان کی یہ حالت ہوتی تو قابلِ معافی تھے۔ آخر غیر ملکی زبان ہی تو ہے، کوئی کہاں تک مہارت بہم پہنچائے۔ پھر اس زبان میں بولتے اور لکھتے وقت اپنی زبان بھی تو حارج ہوتی ہے۔ اپنی زبان میں سوچتے ہیں، پھر انگریزی میں ترجمہ کر کے بولتے ہیں — غیر زبان میں براہِ راست سوچنے کی صلاحیت کس درجے پر پیدا ہوتی ہے، خدا معلوم۔ شاید آکسفورڈ اور کیمبرج میں پہنچ کر یہ بات ہاتھ آجاتی ہو۔ لیکن یہاں رہتے ہوئے یہ مہارت بہم پہنچانا ع۔ ایں خیال است و محال است و جنوں۔

اب رہ گئی اپنی زبان تو اس کے اظہار میں کوتاہی اور خامی، اتنا عجز، اور لاچاری، یہ واقعی قابلِ افسوس اور باعثِ تشویش ہے۔ لیکن اس میں میرے اس فاضل نوجوان کا، جو ابھی ابھی یونیورسٹی سے فارغ التحصیل ہو کر نکلا ہے، کیا قصور، آخر اس بے چارے کو باقاعدگی اور سنجیدگی سے اس زبان کے مطالعے کا موقع ہی کہاں ملا۔ اسے یہ مضمون کس نے پڑھایا؟ وہ حصولِ علم کے لیے آیا تھا۔ اسے غیر زبان کے چکر میں اُلجھا دیا گیا، وہ غیر ملکی زبان کی ثقیل اور بوجھل تعریفات اور اصطلاحات کے بوجھ تلے دب کے رہ گیا۔ اس کی

اپنی جولانیٔ طبع کو قفل لگ گیا۔ قوت اظہار کے پاؤں میں زنجیر پڑ گئی۔ خود اعتمادی کا گلا گھٹ گیا۔ قوت فکر مجروح ہو گئی، غیر ملکی زبان کا ایسا رعب طاری ہوا کہ اپنی زبان بھی بھول بیٹھا۔ جب تخلیقی صلاحیتیں موت کی نیند سو گئیں تو بیچارا رٹنے پر مجبور ہوا۔ ذریعۂ تعلیم تو بدلا ہی تھا۔ اس پر دوسرا ظلم یہ کیا کہ اردو کو بحیثیت ایک زبان پڑھنے کا اسے موقع نہ بخشا۔ نویں جماعت ہی میں اردو کو سائنس یا ڈرائنگ کا متبادل مضمون بنا دیا، سائنس اور ایٹم کے دور میں جب کہ ہر طرف سائنس ہی سائنس کی مانگ تھی، اردو کون پڑھتا۔ طلبہ نے سائنس کی تعلیم میں روشن مستقبل کے آثار دیکھے تو اردو کو خیر باد کہہ دیا۔ اگر سائنس کے ساتھ ساتھ انگریزی کی طرح فوقانی منازل میں اُردو کو بھی لازمی مضمون کی حیثیت سے نصاب میں جگہ ملی ہوتی تو یہ نوبت نہ آتی۔

وہ زبان جو ہمارے ملک کی معاشرتی زندگی کا ایک جزو لاینفک ہو، جو ملک کی وحدت اور صوبے کی سالمیت کی آئینہ دار ہو، جو مغربی پاکستان کے ایک گوشے سے دوسرے گوشے تک سمجھی اور بولی جاتی ہو، جو ملک کی نشری، تبلیغی، کاروباری، علمی، ادبی، اور تعلیمی زبان ہو اور جو بعض منازل تعلیم تک ذریعۂ تعلیم بھی قرار دی جا چکی ہو۔ آٹھویں جماعت کے بعد طلبہ کو اس سے محروم کر دینا نظام تعلیم کی ایک بہت بڑی خامی ہے۔ کیا اردو زبان کو فوقانی منزل اور اس سے اوپر کی جماعتوں کے نصاب سے خارج کر کے تعلیم کے وہ بڑے مقاصد پورے کیے جا سکتے ہیں جن کا آج ببانگ دہل اعلان کیا جاتا ہے کیا طلبہ کے کردار کی تشکیل، ان کی بھرپور نشوونما، ان کی ذہنی اور تخلیقی صلاحیتوں کی تربیت، ان کو مفید شہری بنانے کا کام اُردو کے اخراج کے بعد بطریق احسن سرانجام دیا جا سکتا ہے؟ مگر اس کا جواب نفی میں ہے اور یقیناً نفی میں ہوگا تو پھر آٹھویں جماعت کے بعد اسے اختیاری مضمون قرار دے کر سائنس یا ڈرائنگ کا متبادل مضمون بنا دینے کے لیے وجہ جواز کیا ہے؟ ذرا میٹرک تک اردو پڑھے ہوئے طلبہ کا معیار تو دیکھیے، ان کی تقریر، ان کی تحریر، ان کی ادبی اور علمی قابلیت، کیا ہم اس سے مطمئن ہیں؟ ہوا یہ ہے کہ اس بات کی آزادی دے دی جاتی ہے۔ بلکہ عملاً اس کو اس بات پر مجبور کر دیا جاتا ہے کہ وہ اردو ایسے مفید مضمون کو خدا حافظ کہہ دے۔

ثانوی مدارس میں اُردو ذریعۂ تعلیم ہے۔ گویا تمام مضامین کی تعلیم میں اردو کی حیثیت ایک بنیادی کی سی ہے۔ تمام علوم میں مہارت اور کامیابی کا راز اردو میں مہارت اور اعلیٰ قابلیت میں مضمر ہے۔ جو طالب علم

اچھی اُردو لکھتا ہے وہ یقیناً دوسرے طلبہ سے ہر مضمون میں ہر لحاظ سے اونچا رہتا ہے۔ بہتر سے طلبہ عمدہ عقلی قابلیت رکھنے اور درست حقائق ازبر کرنے کے باوجود قوت اظہار کے مفلوج ہونے کی وجہ سے امتحانات میں مات کھا جاتے ہیں۔

آج ہم اصولاً یہ تسلیم کر چکے ہیں کہ تمام مضامین کی تعلیم اُردو میں ہونی چاہیے۔ کیا آٹھویں تک اردو پڑھنے کے بعد ہمارے طلبہ سائنسی حقائق، فلسفیانہ مسائل اور تاریخی اور جغرافیائی حالات پر مشتمل اردو کتابیں سمجھ سکیں گے اس کے لیے یقیناً ہمیں اردو کی تعلیم کو تمام منازل تعلیم میں رائج کرنا ہوگا۔ جو زبان ذریعہ تعلیم بن جائے اس کی باقاعدہ تعلیم دوسرے علوم کی تحصیل کو آسان کر دیتی ہے۔ اور طالب علم زبان کی مشکلات میں پھنسنے سے بچ نکلتا ہے۔

ہم یہ بھی مانتے ہیں کہ دفتری زبان اردو ہو۔ عدالتوں میں اردو سے کام چلایا جائے۔ فیصلے اردو میں لکھے جائیں۔ سرکاری کاروبار اردو میں انجام پائے تو اس کام کو سنبھالنے اور چلانے کے لیے یقیناً ایسے تعلیم یافتہ افراد کی ضرورت ہوگی جو اردو زبان میں خاص مہارت رکھتے ہوں۔ اب وہ دور گیا جب ہمارے اکثر افسران اگر کبھی اردو بولنے پر مجبور ہوتے تھے تو بڑے فخر سے کہتے تھے کہ "معاف کیجیے گا مجھے اردو کم آتی ہے" اب اردو میں دسترس بہم پہنچائے بغیر کام نہ چل سکے گا لہٰذا ضروری ہے کہ بہتر افراد پیدا کرنے کے لیے اردو کو تمام منازل تعلیم میں یعنی بی اے تک لازمی مضمون کی حیثیت سے ہر طالب علم کو پڑھایا جائے تاکہ ان میں اس زبان کو بولنے، اس میں لکھنے، اور اس میں سوچنے کی وافر صلاحیت پیدا ہو۔ ان کی قوت اظہار جلا پائے اور ان کی تقریر و تحریر پر نکھار آئے۔ وہ اپنی زبان اور پھر زبان کے وسیلے سے اپنے ملک اور اپنی قوم سے محبت کرنا سیکھیں۔ وہ اپنی ثقافت سے واقف ہوں۔ اپنے فن سے روشناس ہوں۔ اپنی سابقہ روایات سے آگاہ ہوں۔

اردو کو فوقانی جماعتوں میں یا اس سے اوپر کی منازل میں جب کبھی بھی لازمی مضمون بنانے کا سوال اٹھا تو انگریزی سنگ راہ بن کر حائل ہو گئی۔ ہمارے بعض ارباب اختیار اور ماہرین تعلیم نے یہ کہہ کر اس آواز کو ابھرنے سے روک دیا کہ نصاب تعلیم پہ پہلے ہی زبانوں کا بڑا بوجھ ہے۔ آٹھویں جماعت تک بچے اردو اور انگریزی کی ہر دو زبانیں لازمی طور پر پڑھتے ہیں۔ آخر کہاں تک دو دو زبانیں لازمی پڑھائی جائیں۔ اس

اردو کے علاوہ دو لازمی غیر زبانوں کا بوجھ باقی مضامین کی تدریس پر بُرا اثر ڈالتا ہے۔ طلبہ کی قوتِ اظہار دب کے رہ جاتی ہے۔ اور ان کے اذہان مختلف زبانوں کے چکر میں پھنس کر الجھنوں اور خلفشاروں کی آماجگاہ بن جاتے ہیں جس پر ان کی اس صائب رائے اور وزنی دلیل سے ہمارا پورا اتفاق رہا ہے اور اتفاق ہے۔ یہ امر ایک حقیقت پر مبنی ہے کہ ایسی دو غیر زبانوں کی لازمی تعلیم جو رسم خط، تلفظ، محاوروں، امثال اور قاعدوں کے لحاظ سے ایک دوسرے سے مختلف ہوں اور جن کے سیکھنے میں طلبہ کے انفرادی رجحانات اور ان کی ذاتی پسند کو بھی نظر انداز کر دیا گیا ہو یقیناً ان کی ذہنی نشوونما اور فکری بالیدگی کے حق میں سمِ قاتل کا حکم رکھتی ہے۔ بلاشبہ اس دور میں کسی شخص کی قابلیت کا راز اس بات میں مضمر نہیں ہے کہ وہ کتنی زبانیں جانتا ہے بلکہ اس امر میں پوشیدہ ہے کہ وہ اعلیٰ اور بلند پایہ خیالات کو کس سلیقے اور عمدگی سے کسی ایک زبان میں بیان کر سکتا ہے اور اس کا تخلیقی کارنامہ کیا ہے۔ مختلف زبانوں میں دسترس حاصل کرنا کتنا بڑا کمال سہی لیکن مختلف علوم میں دستگاہ حاصل کرنا یقیناً اس سے بڑا کمال ہے۔ سطحی علم کا مالک دس زبانیں بھی جانتا ہو ۔ دنیائے علم و ادب میں کوئی مقام نہیں رکھتا، اور اس کے برعکس صرف مادری زبان جاننے والا شخص اگر بالغ نظری، ژرف بینی اور تخلیقی صلاحیتوں ایسے اوصاف سے متصف ہو تو دنیا میں اپنا نام اور مقام پیدا کر لیتا ہے۔ ہاں کسی کی ذات میں علوم اور السنہ ہر دو کا اجتماع ہو تو قابلِ تحسین و رشک ہے۔

اس ساری بحث کا حاصل یہ ہے کہ طلبہ کو لازماً ایک سے زیادہ زبانیں پڑھانا ان کے حق میں مفید ہونے کی بجائے مضر ثابت ہوتا ہے۔ دوسری زبانوں کی تحصیل طلبہ کی اپنی پسند، داخلی تقاضوں اور ذوقِ طبعی پر موقوف ہونی چاہیے۔ انگریزی راج میں حکام نے یہ تعلیمی اور نفسیاتی نکتہ تو سمجھ لیا تھا۔ لیکن چوں کہ وہ اپنی زبان ہم پر مسلط کر کے ہمیں سیاسی غلامی کے ساتھ ساتھ ذہنی غلامی میں مبتلا کرنا چاہتے تھے۔ اس لیے قرعۂ فال اپنی زبان کے حق میں ڈالا۔ اور ہمیں گفتگوئے مستعار سے بولنا سکھا دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہمارے قلوب و اذہان، مذہب اور وطن کی محبت سے خالی ہو کر مستعار آرزوؤں اور مانگے تانگے کی تمناؤں کا مرکز بن کے رہ گئے۔ بقول حکیم الامت علامہ اقبالؒ ؎

برزبانش گفتگو ہا مستعار   در دل او آرزو ہا مستعار

لیکن افسوس کہ آزادئ ملک کے بعد بھی ہم نے انھیں کے فیصلے پر مہر تصدیق ثبت کر دی اسے ہماری [illegible]
فلاح و بہبود کا راز اسی زبان مستعار کی تحصیل و ترقی میں مضمر ہے۔ چنانچہ جب نصاب تعلیم میں ان دو
زبانوں میں سے ایک کو لازمی مضمون بنانے کا وقت آیا تو انگریزی ہی کو یہ مقام اعزاز بخشا اور وہی [illegible]
دلائل دے کر اپنی بات پر اڑے رہے کہ :-

(۱) انگریزی بین الاقوامی زبان ہے۔ اگر اسے ہم نے چھوڑ دیا تو دوسرے ممالک سے ناطہ کٹ جائے گا۔

(۲) پاکستان میں بہت سی علاقائی بولیاں اور زبانیں ہیں۔ انگریزی یہاں قدر مشترک کا کام دیتی ہے اور ملک کے تمام باشندوں کو ایک دوسرے کے قریب لاتی اور اظہار خیال کا ذریعہ بنتی ہے۔

(۳) انگریزی دفتری اور عدالتی زبان ہے۔

(۴) انگریزی ذریعۂ تعلیم ہے۔

حامیانِ اُردو عرصے سے ان سوالوں کے جوابات دیتے آئے ہیں اور حقائق سے دلائل کو رد کرتے چلے آئے ہیں۔ انھیں یہ بتایا جاتا رہا ہے کہ

(۱) انگریزی واقعی بین الاقوامی زبان ہے۔ اسے ضرور پڑھائیے۔ بلکہ اس کی تدریس کے اور بھی بہتر انتظامات کیجیے۔ لیکن صرف ان کے لیے جو اسے پڑھنا چاہیں۔ بین الاقوامی زبان کی ضرورت ہر شخص کو نہیں ہوا کرتی، بلکہ چیدہ اشخاص کو ہوتی ہے اس لیے اسے سب پر مسلط کرنا اور امتحانات میں لازمی مضمون کا درجہ دینا اشاعت علم اور تعلیمی سرگرمیوں کی راہ میں روڑا اٹکانا ہے۔

(۲) انگریزی کے پرستاروں کی دوسری دلیل خاصی مضحکہ خیز ہے۔ اس زبان کو ملک کی ہمہ گیر زبان بنانا اسے قدرِ مشترک کا درجہ دینا جس کے بولنے بلکہ سمجھنے والے ایک فی صد بھی نہ ہوں، غلطی نہیں تو اور کیا ہے۔ متحدہ ہندوستان میں جہاں بیسیوں مختلف بولیاں بولی جاتی تھیں اردو کو ایک قدرِ مشترک سمجھا جا رہا۔ خود انگریزی حکومت نے اپنے ابتدائی دور میں اس کی ہمہ گیریت کے پیش نظر اس کے فروغ کی [illegible] کیں۔ انگریزی افسروں کو اردو پڑھانے کے لیے کالج کھولے۔ اور اسے فارسی کی جگہ کچھ عرصے سرکاری زبان قرار دیے رکھا۔ جارج کیمبل کا اپنی تصنیف "انڈیا از اٹ مائٹ بی" IA 13 17
DO IT BE

میں یہ بیان قابلِ توجہ ہے۔

"ہندوستانی ہی کو تمام اعلیٰ مدارس کی مشترک اور عام زبان قرار دیا جائے۔ دوسری زبانیں حسبِ ضرورت سکھائی جائیں۔ ایک عام مشترک زبان کے بغیر ترقی ناممکن ہے اور جیسا کہ میرا خیال ہے انگریزی تو عام زبان بنائی نہیں جا سکتی۔ ہمارے لیے اب اہم مقصد یہ ہونا چاہیے کہ جہاں تک ممکن ہو ہندوستانی ہی مشترک زبان ہے۔ ہندوستانی زبان ہندوستان کے تمام طبقوں میں اس قدر عام اور مقبول ہے کہ کسی اور زبان کو اس کے مقابلے میں پیش کرنا بہت ناموزوں ہوگا۔"

اگر متحدہ ہندوستان میں اردو ایک ملک گیر زبان تھی اور قدرِ مشترک کا کام دیتی رہی ہے تو پاکستان میں کیوں نہیں؟

(۳) تیسری دلیل کہ انگریزی پاکستان کی دفتری زبان ہے۔ خاصی وزنی ہے۔ انگریزی کو لازماً مدارس میں اسی لیے پڑھایا جاتا ہے کہ مدارس سے فارغ ہونے کے بعد لوگ سرکاری دفاتر میں کھپ سکیں۔ لیکن کیا غیر ملکی زبان کو اپنے ملک کی سرکاری زبان بنائے رکھنا ملکی وقار کے منافی نہیں؟ اضطراری حالت میں جب کہ ہمارے پاس اصطلاحات نہ تھیں، یہ اقدام درست تھا۔ اب جب کہ ہزاروں کی تعداد میں اصطلاحات وضع ہو کر شائع ہو چکی ہیں اور بعض دفاتر میں انھیں کامیابی سے آزمایا بھی جا چکا ہے انگریزی کو باقی رکھنا غیر ضروری ہے۔ انگریزی کو دفاتر اور عدالتوں سے رخصت کرنے کے بعد ہمیں ایسے افسروں اور اہل کاروں کی ضرورت ہوگی جو اردو لکھنے پڑھنے میں خاصی مہارت رکھتے ہوں۔ اور یہ اسی صورت میں ممکن ہے جب ہم اعلیٰ منازل میں اردو کی تعلیم کو لازم قرار دیدیں۔

(۴) چوتھی دلیل یہ کہ انگریزی زبان ذریعۂ تعلیم ہے اس لیے اسے لازمی ہونا چاہیے۔ یہ دلیل خود اردو کے حق میں جاتی ہے۔ اردو بھی میٹرک اور ایف۔ اے کے درجوں تک ذریعۂ تعلیم ہونے کا شرف حاصل کر چکی ہے۔ اس لیے ایف۔ اے تک تو اسے فی الفور لازمی مضمون قرار دینا چاہیے۔ باقی مدارج میں اردو کو ذریعۂ تعلیم بنانے کے سوال پر غور ہو چکا ہے۔ اور اس اصول کو تمام ماہرینِ تعلیم تسلیم کر چکے ہیں کہ تمام علوم کی تعلیم اپنی قومی زبان میں ہی ہونی چاہیے۔ یہ سمجھنا کہ علوم اور سائنس انگریزی زبان کے غلام اور لونڈیاں ہیں درست نہیں علوم کو کسی خاص زبان کی حدود میں مقید نہیں کیا جا سکتا اور نہ ہی علم کسی خاص خطے یا کسی خاص زبان کی

اجارہ داری ہے۔ علوم کی اقدار ایسے مصنوعی احاطوں اور فروعی حد بندیوں کی پابند نہیں ہوتیں۔ اگر سائنسی علوم جرمن، روسی، جاپانی، چینی، انڈونیشی اور مردہ زبان عبرانی میں پڑھائے جا سکتے ہیں تو اردو میں کیوں نہیں ؟ انگریزی زبان کا ذریعہ تعلیم بنے رہنا اس ملک کی سائنسی ترقی کی راہ میں زبردست رکاوٹ ہے چاہیے تو یہ تھا کہ علوم اور ٹیکنالوجی کی خاطر ہم ذریعۂ تعلیم بدلتے۔ ہم نے ذریعہ تعلیم کی خاطر انگریزی کو لازمی قرار دے دیا۔

یہ ساری بحث اس نقطے کی غماز ہے کہ اگر اردو کو بلند مقام عطا کرنے اور اعلیٰ منازل میں لازمی مضمون قرار دینے میں انگریزی کا لازمی ہونا رکاوٹ ہے تو اس رکاوٹ کو دور کر دیا جائے اور اسے انتخابی مضمون بنا دیا جائے یقیناً یہ اقدام دونوں کی تدریس کے حق میں مفید ہوگا۔

اردو کو ثانوی مدارس اور کالجوں میں لازمی مضمون بناتے وقت ان تمام عناصر اور عوامل کو بھی پیش نظر رکھنا ہوگا جو کسی مضمون کے وقار اور عظمت کے ضامن ہیں۔ بعض مضامین لازمی ہونے کے باوجود محض اس لیے غیر اہم اور کم رتبہ ہو جاتے ہیں کہ ان کی تدریس گھٹیا اساتذہ کے سپرد ہو جاتی ہے۔ امتحان میں پاس ہونا یا تو لازمی نہیں ہوتا یا ان کے نمبر بہت کم رکھ دیے جاتے ہیں۔ وقت نامے میں گھنٹیاں کم دی جاتی ہیں۔ ارباب اقتدار کو ان سے ہمدردی نہیں ہوتی افسران معائنہ اسے ایک گھٹیا مضمون سمجھتے ہیں۔ اسلامیات آج کل لازمی مضمون ہے لیکن انھی عوامل کی بنا پر اس کی طرف نہ استاد متوجہ ہے نہ شاگرد۔ اردو کو نظام تعلیم میں صرف اسی وقت بلند مقام مل سکتا ہے جب کہ اس میں کامیابی لازم ہو۔ مجموعی نمبر کسی دوسرے مضمون سے کم نہ ہوں اور اس کی تدریس کو بہترین اساتذہ کے سپرد کیا جائے۔ اردو زبان کے ساتھ یہ ایک بہت بڑا حادثہ ہے کہ انگریزی دور حکومت میں مخصوص مصلحتوں کی بنا پر اسے کم تعلیم یافتہ اور غیر تربیت یافتہ اساتذہ کے سپرد کر دیا گیا اور انگریزی کی تعلیم افسران محکمہ تعلیم کی توجہ کا مرکز بنی رہی۔ آج بھی یہی رجحان غالب ہے۔ اور اردو کے ساتھ وہی سلوک روا رکھا جاتا ہے۔ مدارس میں اردو اور فارسی کے ایم۔ اے اساتذہ موجود ہیں ایسے بھی ہیں جو بی۔ اے تک اردو پڑھنے کے بعد بی۔ ایڈ میں تدریس اردو کی خصوصی تربیت حاصل کر چکے ہیں لیکن ان سے تدریس اردو کا کام لینے کی بجائے انگریزی اور دوسرے مضامین پڑھوائے جاتے ہیں۔ اردو کے لیے کم تنخواہوں یا ادنیٰ قابلیتوں کے اساتذہ رکھے جاتے ہیں۔ جب تک اردو کے لیے بہتر سے

نہیں رکھے جائیں گے، اور ان اساتذہ کو وقار اور تنخواہ کے لحاظ سے انگریزی اور دوسرے مضامین کے اساتذہ کی سطح پر نہیں لایا جائے گا۔ اردو زبان لازمی مضمون ہوتے ہوئے بھی شایان شان عظمت حاصل نہ کر سکے گی اساتذہ کی موجودہ گریڈ بندی اور ان کے عہدوں کے نام انگریزی اساتذہ سے ترجیحی سلوک کی چغلی کھاتے ہیں۔ انگلش ٹیچر اور ورنیکلر ٹیچر کی اصطلاحات انگریزی ذہن کی پیداوار ہیں، اور اسی افتراق نے اردو کے اساتذہ میں احساس کمتری کو جنم دیا۔ تمام زبانوں کے اساتذہ کو ایک صف میں کھڑے کرنا نہایت ضروری ہے۔

اردو کے وقار کو بڑھانے کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ مقابلے کے امتحانات اور سرکاری اسامیوں کے انٹرویوز میں اردو کو صحیح مقام دیا جائے۔ جب تک یہاں اردو کا سکہ رائج نہ ہوگا، انگریزی کے مقابلہ میں اس کا بھاؤ گرا ہی رہے گا۔ یورپی طرز کے اداروں اور پبلک سکولوں میں بھی اردو کو وہی مقام ملنا چاہیے جو اسے دوسری پاکستانی درس گاہوں میں میسر ہو۔

اردو بادصف اپنے تمام صوری اور معنوی محاسن کے، اور آزاد ملک کے نئے تقاضوں اور نئی قومی ضروریات کے پیش نظر اس بات کی مستحق ہے کہ اسے آئندہ نظام تعلیم میں جو انشاء اللہ صحیح خطوط پر مرتب ہوگا، ایک عظیم، بلند تر، وقیع اور ارفع مقام دیا جائے۔ اسے ثانوی جماعتوں اور اعلیٰ منازل تعلیم میں لازمی مضمون قرار دینے کا مطالبہ بہت پرانا ہے۔ بلکہ یوں کہیے کہ تقاضا کرنے والے حق مانگتے مانگتے تھک چکے ہیں سب سے پہلے آزادی کے فوراً بعد کراچی میں منعقدہ تعلیمی کانفرنس نے اس بات کی سفارش کی تھی کہ تمام مدارس میں اسے لازمی کر دیا جائے۔ اس سفارش کو چونکہ عملی جامہ نہ پہنایا جا سکا۔ اس لیے اس مطالبے کو وقتاً فوقتاً دہرایا جاتا رہا۔ یہ امر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ سنہ ۱۹۵۶ء میں منعقدہ "نصاب کانفرنس" نے سنٹرل ٹریننگ کالج لاہور میں تین دن کے مسلسل مذاکرات کے بعد یہی سفارش کی کہ اردو کو دسویں جماعت تک لازمی مضمون بنا دیا جائے۔ جتنے امریکی ماہران نصاب یہاں آئے ان سب نے نصاب سازی کا بنیادی اصل یہ بیان کیا کہ ملکی و قومی زبان کو ثانوی مدارس کے نصاب میں لازمی مضمون ہونا چاہیے۔ ڈاکٹر اوسی پرشوبرنگ ایک امریکی ماہر نصاب نے اپنی سفارشات میں اردو کو لازمی اور انگریزی کو انتخابی مضامین کی صف میں جگہ دی۔ قسمت لاہور کے ہیڈ ماسٹر صاحبان کی کانفرنس میں جو اپریل سنہ ۱۹۵۸ء میں سنٹرل ٹریننگ کالج لاہور میں

منعقد ہوئی۔ اسی مطالبے کو دہرایا گیا۔ دسویں آل پاکستان سائنس کانفرنس ۱۹۵۸ء منعقدہ ڈھاکہ کے تعلیمی سیکشن میں اسی رائے کا اعادہ کیا گیا کہ فوقانی منزلوں میں اردو کو لازمی مضمون کا درجہ ملنا چاہیے۔ اور تشکیل کانفرنس میں ہونے والے ہر اجلاس میں اسی مضمون کی قراردادیں پاس ہوتی رہیں لیکن سب صدا بصحرا۔ آج پھر ہم اس تاریخی اردو کانفرنس کے عظیم الشان اجتماع میں پورے گیارہ سال پہلے کی سفارشات کا اعادہ کرنے کے لیے جمع ہیں۔ نہ جانے ہماری محبوب زبان اردو کب راج گدی پر بیٹھے گی اور اس کا چھنا ہوا تخت و تاج اسے کب واپس ملے گا۔ خدا کرے تعلیمی کمیشن ہی اس کی فریاد کو پہنچے۔ مرزا غالب نے شاید اسی موقع کے لیے فرمایا تھا

دیکھیے پاتے ہیں عشاق بتوں سے کیا فیض
اک برہمن نے کہا ہے کہ یہ سال اچھا ہے

٭

اعلیٰ تعلیم اور اردو زبان

نذیر احمد — مسلسل نمبر ۲

سلسلہ کے لیے جنوری ۱۹۵۹ء کا آموزش ملاحظہ فرمائیے (مدیر)

ســـــــــــوال: ذریعۂ تعلیم کی تبدیلی کے سلسلے میں کن کن ابتدائی دشواریوں کا امکان ہے۔ اور ان دشواریوں کو حل کرنے کی کیا صورت ہو سکتی ہے۔ کیا اساتذہ ذریعۂ تعلیم کی تبدیلی کے لیے تیار ہیں۔ وہ کتنے عرصے میں اس قابل ہو جائیں گے کہ اردو میں تعلیم دے سکیں۔

جواب (۱) ڈاکٹر رضی الدین صدیقی۔

اس ملک میں اکثر طلبا خود اپنی زبان سے بھی کما حقہ واقف نہیں کیوں کہ گھر پر اور مدرسہ میں ان کو اردو کی باضابطہ تعلیم کبھی نہیں دی گئی۔ اکثر خاندانوں میں اُردو کو درخور اعتنا سمجھا ہی نہیں جاتا تھا۔ اور شاید بعض صورتوں میں اب بھی یہی حال ہے۔ اس لیے خود اُردو سے ناواقفیت کی بنا پر بھی مشکلات پیش آئیں گی اگرچہ یہ مشکلات انگریزی زبان کی مشکلات کے بارے میں بدرجہا کم تر ہوں گی ان کو دفع کرنے کے لیے ابتدا میں اردو زبان کی باضابطہ لازمی تعلیم کا انتظام کرنا ہوگا۔ آئندہ جب ہر بچے کو مدرسہ میں اپنی زبان خود سکھائی جائے گی تو کالج میں اس کی تعلیم کی ضرورت باقی نہیں رہے گی۔

بہت سے اساتذہ بھی ممکن ہے اُردو زبان پر کافی عبور نہ رکھتے ہوں، اور فوراً اس زبان میں لکچر دینے کے قابل نہ ہوں۔ ان کے لیے تربیت کا انتظام ضروری ہوگا۔ بعض سن رسیدہ اصحاب جن کی ملازمت صرف چند سال رہ گئی ہے۔ اب آخری عمر میں اس تبدیلی کے لیے یا نئے سرے سے تربیت حاصل کرنے کے لیے بطیب خاطر تیار نہ ہوں گے، انھیں مجبور کرنا کچھ مناسب معلوم نہیں ہوتا۔ انھیں اختیار دیا جا سکتا ہے کہ وہ چاہیں تو انگریزی کا لکچر دیں۔ اس طرح طلبا کو بھی ابتداءً یہ حق انتخاب ہونا چاہیے کہ وہ امتحانوں میں جوابات چاہے انگریزی میں دیں یا اردو میں۔

اساتذہ کے متعلق ٹھیک جواب دینا مشکل ہے کیونکہ یہ امر ان کی اردو سے واقفیت پر منحصر ہے
مندرجہ ذیل مختلف صورتیں پیش آ سکتی ہیں۔

(الف) بعض اساتذہ اس قابل ہوں گے کہ اردو میں فوری تعلیم دینا شروع کریں۔ ان میں وہ لوگ شامل ہوں گے جو اردو زبان سے کماحقہٗ واقف ہیں اور سابق میں اردو تعلیم کا تجربہ حاصل کر چکے ہیں۔

(ب) بعض لوگ اردو زبان سے واقف ہیں لیکن تعلیم کا تجربہ نہیں رکھتے یا اصطلاحات سے ناواقف ہیں۔ ایک دو سال میں یہ تجربہ اور واقفیت حاصل کر سکتے ہیں۔

(ج) جو لوگ زبان سے بھی واقف نہیں ہیں اور تعلیم کا تجربہ بھی نہیں رکھتے۔ ان کو تیاری کے لیے تین چار سال لگ جائیں گے۔

علمی اصطلاحوں کے متعلق بھی ابتدا میں دقتیں پیش آئیں گی۔ جامعہ عثمانیہ میں سینکڑوں ماہرین فن اور ماہرین لسانیات کے اشتراک عمل سے لاکھوں روپے خرچ کر کے ہر مضمون کی اصطلاحیں بنائی گئی تھیں۔ پھر انجمن ترقی اردو نے ان میں سے بعض مضامین کے اصطلاحوں پر نظر ثانی کی اور ان کو زیادہ سلیس بنا دیا۔ ابتدا میں ان اصطلاحوں کو اختیار کیا جا سکتا ہے۔ اور ان کو بتدریج بہتر بنانے کی کوشش کی جا سکتی ہے۔

(۲) حافظ محمد عثمان

اس مسئلے میں جو دقت پیش آتی ہے وہ چند گونہ ہے۔ اردو میں ہر علم و فن کی کتابیں تالیف یا ترجمہ کی گئی ہیں۔ مگر عثمانیہ یونیورسٹی اور دارالترجمہ کی کتابیں پاکستان میں ناپید ہیں۔ صوبائی حکومتیں۔ یونیورسٹیاں اور اساتذہ (علی العموم) پرانے ڈگر سے ہٹنے میں بربنائے تساہل لیت و لعل کر رہے ہیں۔ ورنہ اگر ہماری حکومت اور ناشرین اور مکتبے اٹھ کھڑے ہوں تو چند ماہ میں بے شمار کتابیں ہر علم و فن پر ہمارے سامنے آ جائیں۔ اگر تصنیف و تالیف و ترجمہ کا کوئی بڑا ادارہ کھولنا دشوار سمجھا جائے تو حکومت اور تعلیمی ادارے ایک دوسرا طریقہ اختیار کر سکتے ہیں۔ وہ یہ کہ کتابوں کے لیے اشتہار دیا جائے معقول معاوضے کا اعلان کیا جائے تو یہی مصنفین اور مولفین جو تساہل برت رہے ہیں بہتر کتابیں چھاپ کر پیش کریں گے۔ یہ کتابیں شریک نصاب ہو سکیں گی اور ہمارے علمی سرمائے میں اضافہ ہوگا۔

کتابوں سے زیادہ ضروری اس وقت یہ ہے کہ ہمارے اساتذہ ذرا غیرت سے کام لیں اور ہمت کریں اور ہندوستان کے معلمین سے سبق سیکھیں، جنھوں نے یو۔پی۔سی۔پی اور بہار میں انٹرمیڈیٹ کے تمام مضامین کے لیے اور بی اے کے اکثر مضامین کے لیے ہندی جیسی زبان کو ذریعہ تعلیم بنا دیا۔ اور حوصلے کو کام میں لاکر خود کو اس لائق بنا لیا ہے کہ اچھا یا برا کام چلا رہے ہیں۔ ہمارا علمی سرمایہ ہندی سے بدرجہا کافی و وافی ہے۔ معلمین اور ناشرین کی ہمت کی ضرورت ہے۔

اگر ہمارے معلمین نیت کرلیں تو وہ ایک سال ورنہ زیادہ سے زیادہ دو سال میں بالیقین اردو میں تعلیم دینے لگیں گے۔ ابتدا میں ان کو ضرور الجھن ہوگی۔ لیکن میں اپنے تجربہ اور مشاہدے کی بنا پر وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ اس الجھن کو دور کرنے کے لیے دو سال سے زیادہ مدت درکار ہوگی۔ یو۔پی کے محکمہ تعلیم نے جب انٹرمیڈیٹ کے تمام مضامین کو جب ہندی میں جاری کیا تھا تو وہاں کے مدرسین نے ایک سال میں کام چلانے کی استعداد پیدا کرلی تھی اور دو سال کے بعد وہ کہنے لگے تھے کہ اب طلبا ہی کو نہیں ہم کو بھی ہندی کے ذریعہ پڑھانا اور سمجھانا سہل ہوگیا ہے۔ پنجاب اور سرحد کے اکثر مہاجر مدرسین میٹرک تک اس سے پہلے انگریزی میں پڑھانے کے عادی تھے۔ انھوں نے ہجرت کے بعد پہلی مرتبہ ان مضامین کو اردو میں پڑھانا شروع کیا۔ یہ اپنے تجربات کی بنا پر مجھ سے بیان کرچکے ہیں کہ ابتدا میں یہ کام ان کو جوئے شیر لانے کے برابر معلوم ہوتا تھا۔ مگر عمل اور تجربے نے ثابت کیا کہ ایک ہی سال کے اندر انھوں نے اتنی مشق اور مہارت بہم پہنچائی کہ وہ اردو کو انگریزی سے بہتر پانے لگے۔

مجھے اعتراف ہے کہ انٹرمیڈیٹ میں کچھ مشکلات زیادہ ہوں گی۔ لیکن مجھے سائنس کے مدرسین کالج نے بتایا ہے وہ ان مشکلات کو زیادہ سے زیادہ دو سال میں یقیناً حل کرلیں گے۔

(۳) ڈاکٹر محمد افضال حسین قادری۔

ابتدائی دشواریاں نقشوں کی، کتابوں کی اور اساتذہ کی ہوں گی۔ کتابیں تو کچھ نہ کچھ ہیں بھی لیکن نقشے اور چارٹ وغیرہ کم یاب ہیں۔ میری رائے میں مضامین مطلوبہ کے چارٹ، تصاویر، اشکال وغیرہ کو اردو میں شائع کرکے فوراً کلاسوں میں پڑھانے کے لیے ان سے مدد لی جائے۔

واضع اصطلاحات کے سلسلے میں پچھلی اصطلاحات پر نظر ثانی کرنے کی ضرورت ہوگی۔ اس کام کے لیے اور نیز دیگر اصطلاحات کو واضع کرنے کے لیے کمیٹی مقرر کی جائے اور اردو کی ایک سائنس لغت جلد از جلد شائع کی جائے۔ ایسی لغات دنیا کی ہر بڑی زبان میں عرصہ سے موجود ہیں۔

اساتذہ کی دشواری کا حل میری رائے میں یہ ہے کہ اردو کالج میں اساتذہ کی تربیت دینے کا ایک سہ ماہی کورس شروع کیا جائے۔ تین مہینے کی تربیت کافی ہوگی۔ ایسی تدابیر بنیادی (بیسک) طریقۂ تعلیم کی ٹریننگ اور سوشل سروس کی ٹریننگ کے سلسلے میں بھارت اور دوسرے ممالک میں کامیاب ہو چکی ہیں

(۴) ڈاکٹر رفعت حسین صدیقی۔

اس سلسلے میں حسب ذیل دشواریاں پیش آئیں گی۔

(۱) کتابوں کی کمی

(۲) مناسب اصطلاحات کا نہ ملنا۔

(۳) اساتذہ کی زبان اور اصطلاحات سے عدم واقفیت

متذکرہ بالا دشواریاں اس طرح دور ہو سکتی ہیں کہ پہلے اصطلاحات معیاری ادارے سے شائع ہوں جو ماہرین کی مدد سے تیار کی جائیں۔ ماہرین کتابیں تالیف کرنے کا کام فوراً شروع کریں۔ ترجمہ میں زیادہ وقت ضائع نہ کیا جائے۔ بلکہ عمدہ ماخذ سے مواد جمع کر کے اپنی زبان میں پیش کیا جائے۔

ایک ادارہ اس کا ذمہ دار ہو کہ اصطلاحیں ٹھیک رہیں اور کتاب معیار کے مطابق ہو میرا خیال ہے کہ اساتذہ ایک سال کی مدت میں زبان اور اصطلاحات سے آشنا ہو جائیں گے۔ اس کے بعد وہ اردو میں خوش اسلوبی سے تعلیم دینے لگیں گے۔

(باقی آئندہ)

بلجیم کا بین الاقوامی تعلیمی ادارہ
کالج آف یورپ

حافظ محمد شریف

پس منظر اور قیام :- آج کی دنیا میں جب کہ مختلف اقوام بین الاقوامی سطح پر نہایت اہم انتظامی، اقتصادی اور معاشرتی نوعیت کے فیصلے کر رہی ہیں۔ اس امر کی شدید ضرورت محسوس کی گئی کہ یورپی ممالک یونیورسٹی طلبا کی ایسی تعلیم قائم کریں جو ان نئے مسائل کا بین الاقوامیت کے جذبے کے ساتھ جائزہ لے کر ان کے حل کی فکر کریں۔ پہلی جنگ عظیم کے فوراً بعد ہی سے اس ضرورت کا احساس پیدا ہو گیا تھا کہ یورپ میں ایسے لوگوں کی شدید قلت ہے جو بین الاقوامی برادری کے جذبات رکھتے ہوں۔ تاہم آج کی دنیا میں یہ احساس بڑی شدت سے ہونے لگا ہے کہ ایسے تنازعات اور جنگیں جو صرف اقتصادی مفادات کے تصادم کا نتیجہ ہوتے ہیں، بین الاقوامی سطح پر دی جانے والی تعلیم کے ذریعے سے ہلکے اور بڑی حد تک کم کیے جا سکتے ہیں چنانچہ ایسی ہی تعلیم کے حصول کے لیے ۱۹۵۰ میں کالج آف یورپ کی بنیاد رکھی گئی۔

مقاصد اور لائحہ عمل :- اس کالج کے قیام کا مقصد ایسے افراد کی تنظیم کرنا تھا جو مل جل کر کام کریں جو اپنے سامنے ایک ہی قسم کے مقاصد رکھتے ہوں اور مسائل کا مشاہدہ و مطالعہ کر کے ان کے سلجھانے کی فکر کریں۔ یہ ادارہ جیسا کہ نام سے ظاہر ہے اپنی خصوصیات کے لحاظ سے یورپین طرز ہونے کے باوجود قومیت پرستی کے جذبات سے ماورا اعلیٰ و ارفع نظریات کا علمبردار ہے اور بین الاقوامی اتحاد و اشتراک کے خیالات کی کما حقہ ترجمانی حق ادا کر رہا ہے۔ اس وقت یہ ادارہ ہالینڈ کی ایک یونیورسٹی کے ایک ولندیزی پروفیسر کی زیر نگرانی سرگرم عمل ہے۔

اس ادارے کے لیے بلجیم میں ایک شہر B[illegible] منتخب کیا گیا جو جغرافیائی لحاظ سے ہی موزوں نہیں بلکہ وہ قرون وسطیٰ میں ایک اہم مقام۔ قدیم عمارات کا مرکز۔ آرٹ کے لاثانی نوادرات کا مخزن اور تہذیب و تمدن کا گہوارہ رہ چکا ہے۔ مزید یہ کہ اس شہر میں چونکہ کوئی یونیورسٹی نہیں ہے اس لیے ہر قسم کی تنظیموں اور ملکی اور قومی تحریکوں سے بے نیاز ہے اور کالج کی جماعتی زندگی میں ایک نئی روح پھونک رہا ہے۔

نصاب اور تدریس :- کورس کا معیار صرف پوسٹ گریجویٹ حضرات کے لیے ہے جو تین ہفتوں کی مدت میں لیکچرز کے ذریعہ ختم کیا جاتا ہے۔ ذریعۂ تعلیم انگریزی اور فرانسیسی دونوں زبانیں ہیں۔ تمام اہم مضامین مثلاً تاریخ، عمرانیات، جغرافیہ، بین الاقوامی اقتصادیات، سیاسی نظریات و تحریکات اور بین الاقوامی قوانین غرضیکہ وسیع علمی میدان موجود ہے۔ دیگر یونیورسٹیوں کی تدریس سے اس کا مقابلہ نہیں کیا جا سکتا۔ بلکہ یہاں کا مواد و طریق تدریس دونوں مختلف نوعیت کے حامل ہیں۔ یہاں پر اساتذہ و طلبا تمام بنیادی اور اہم مسائل کا مطالعہ کرتے اور ان کا حل تلاش کرنے کی سعی کرتے ہیں۔ اور اس طرح اپنے اخذ کردہ نتائج کی مدد سے نئے اصول و نظریات مرتب کرتے ہیں۔ اس قسم کی تدریس کا صرف مقصد یہ ہے کہ اساتذہ اور طلبہ کے درمیان ذاتی اور قریبی تعلقات استوار ہوں لہٰذا اس مقصد کے حصول کے لیے لیکچروں، کانفرنسوں، سیمیناروں اور تعلیمی و تفریحی سفروں کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ اگرچہ مضامین کی تعداد بھی خاصی ہے۔ جن پر عبور حاصل کرنا طلبہ کے لیے بہت مشکل ہے لیکن اس کے باوجود تین تعلیمی اور تین تحقیقی سرگرمی کے حامل مضامین کا انتخاب کرنا لازمی ہے۔ ہر طالب علم کو اس کے سالانہ امتحان کے نتائج، تحقیقی کاموں میں دلچسپی و محنت اور دیگر جماعتی و ذہنی سرگرمی والے مضامین میں حصہ وغیرہ کے معیار سے جانچا جاتا ہے۔ علاوہ ازیں طلبا کو ایک تحقیقی مقالہ بھی سپرد قلم کرنا پڑتا ہے جو وہ متعلقہ حضرات کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ ان تمام سرگرمیوں کا نتیجہ ایک ڈپلوما ہے۔ جو اچھے نتائج دکھانے پر طلبہ کو دیا جاتا ہے۔

دیگر سرگرمیاں :- کالج سے ملحقہ ایک لائبریری ہے جس میں ہر قسم کی کتب اور مسودات رکھے ہوئے ہوتے ہیں۔ ان سے طلبہ و پروفیسر صاحبان مطلوبہ مواد و معلومات حاصل کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ اساتذہ کی زیر نگرانی تعلیمی سفر وغیرہ کا انتظام کیا جاتا ہے، جن میں سب سے اہم یورپ کے مختلف حصوں کا سالانہ سفر ہے جو کالج میں دیے گئے نظری لیکچروں کی عملی توضیح و تشریح کا کام دیتا ہے۔

جہاں تک تدریس کا تعلق ہے، پروفیسر صاحبان کا ایسا عملہ موجود ہے، جو سال میں دو مرتبہ ہر طالب علم کے کام کا جائزہ لیتا ہے۔ یہ حضرات لیکچر سسٹم کے پورے پورے ذمے دار ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ ان کے معاون اساتذہ ہوتے ہیں۔ جو لیکچروں کی باقاعدگی اور طلبہ کے علم مطالعہ کی نگرانی کے ذمہ دار

ہوتے ہیں۔ مزید براں گشتی (visiting) پروفیسر صاحبان بھی ہوتے ہیں۔ جو دنیا بھر کی مختلف یونیورسٹیوں میں مختلف عہدوں پر فائز ہوتے ہیں۔ ان کے لیکچرز سے بھی استفادہ کیا جاسکتا ہے۔

طلبہ اور اساتذہ تیس ہفتہ تک کے لیے اکٹھے ہی رہتے اور کام کرتے ہیں اور اس طرح کا طریق تدریس اختیار کیا جاتا ہے کہ قریب سے قریب ہو کر باہمی تبادلہ خیالات کے مواقع بہم پہنچ سکیں اور اس طرح یہ روزانہ کا باہمی انضباط و اختلاط انفرادی اور اجتماعی دونوں لحاظ سے عمدہ کارکردگی کے لیے نہایت اچھا محرک ثابت ہوتا ہے۔

داخلہ:۔ داخلہ کے لیے صرف چالیس نشستیں ہیں۔ پانچ پانچ تو بلجیم، فرانس، جمہوریہ جرمنی اٹلی، لکسمبرگ، نیدرلینڈ اور یوکے (انگلینڈ) وغیرہ ممالک کے لیے ایک یا دو مغربی یورپ کے دیگر ممالک کے لیے اور چند افراد یورپ کے باہر سے بھی لیے جاتے ہیں۔

رہائش:۔ طلبہ اور طالبات ہر دو کے لیے ایک ہی ہوسٹل کا انتظام ہے جو شہر کی انتظامیہ کے زیر نگرانی ہے۔

فنڈز:۔ کالج کے انتظامی معارف کے لیے۔ بلجیم، فرانس، جرمنی، لکسمبرگ، نیدرلینڈ اور یوروپین کول اینڈ سٹیل اتھارٹی کے مشترکہ فنڈ سے پورے ہوتے ہیں۔ طلبہ کا انتخاب "قومی انتخابی کمیٹی" کرتی ہے۔ جو مختلف ملکوں کی حکومتوں کے نمائندوں، پروفیسروں اور یوروپین کول اینڈ سٹیل کمیٹی کے افسران پر مشتمل ہوتی ہے۔

فوائد:۔ مختلف اقوام اور نسلوں کے اس طرح کے ارتباط اور اختلاط سے یورپی تہذیب و تمدن کا ارتقا، جدید خیالات و افکار کی توسیع اور رواداری اور بین الاقوامی برادری کے جذبات کا استحکام حاصل ہوتا ہے۔ دیگر یونیورسٹیوں سے علیحدہ اور آزاد ہونے کے باعث کالج آف یورپ اپنے مقاصد و اصول برقرار رکھے ہوئے ہے۔ اس کا جو مقصد یعنی یورپی اقوام کو وسیع النظری کی تعلیم دینا اور جدید یورپ کے لیے سچے اور دیانت دار شہری پیدا کرنا تھا: تا حال بطریق احسن پورا ہو رہا ہے۔ موجودہ دور کی نظریاتی تنگ نظری اور عصبیت کی مکدر فضا کو دور کرنے کے لیے ایسے ہی اداروں کی شدید ضرورت ہے۔ تاکہ عالم گیر برادری کا احساسات کو جلا قائم کیا جاسکے۔ کیوں کہ یہی وقت کا اہم ترین تقاضا ہے۔

زبان کا آغاز

سید کوثر حسین

(مسلسل نمبر۲)

آغاز زبان کے متعلق تین اہم نظریے ہیں، جو تقلیدی اشارات سے فطری اشارات کے ڈانڈے ملاتے ہیں۔ لیکن ان نظریات میں صرف صوتی اشارات کو ملحوظ رکھا ہے۔ دوسرے مرئی اشارات کو نظر انداز کر دیا ہے۔

(۱) تضحیکی یا فجائی نظریہ (FOOH FOOH THEORY OR INTERJECTION THEORY)

اس نظریے کی رو سے، زبان، آواز، ذہن کے جذباتی ردِ عمل سے پیدا ہوئی ہے۔ مثال کے طور پر چند ابتدائی انسان جنگل میں ایک خوفناک درندے سے دوچار ہوئے۔ ڈر کے مارے ان میں سے کسی ایک کے منہ سے یکایک ایک چیخ (جیسے شے شے یا شیر) نکل۔ آگے چل کر یہی آواز اس درندے کا نام ہو گئی۔ جب وہ نظر آتا یا جب اس کے نظر آنے کو یاد دلانا مقصود ہوتا تو یہی آواز (شیر) منہ سے نکالتے۔

اس طرح ابتدائی زبان کے الفاظ ان چیخوں سے بنے جو کسی واقعی صورتِ حال پیش آنے کے سبب، غصے، خوشی یا خوف کے مارے ابتدائی انسانوں کے منہ سے نکلیں۔

(۲) نظریہ عف عف یا صوتی نظریہ (BOW VOW THEORY OR ONOMATOPOEIC THEORY)

یہ نظریہ زبان کے آغاز کی تشریح، اشیاء کی ان آوازوں کے حوالے سے کرتا ہے، جن کی ابتدائی انسانوں نے نقل کی۔ مثلاً ایک جانور کو میاؤں میاؤں کرتے دیکھا تو اس کا نام "میاؤں میاؤں" رکھ دیا۔ کسی چیز سے جھن جھن کی آواز سنی، تو اسے "جھن جھن یا جھنجھنا" کہنے لگے۔ جیسا کہ برازیل کی ایک زبان میں چشمے کو "آ ذُٹا آ وُ دیکو آ ذُٹا اُو آ ذُ" اور سمندر کو "آ ذُٹ آ وُ آ وُ آ ذُ" کہتے ہیں۔ یہ الفاظ (یا نام) اپنی تشکیل کے لیے ان آوازوں کے مرہونِ احسان ہیں جو سننے والوں نے چشمے دریا اور سمندر سے سنیں۔ اس نظریے کے حامیوں

خیال ہے کہ ابتدائی زبان کے سب الفاظ صوتی تھے یعنی آوازوں کی نقل تھے ۔

(۳) نظریۂ ناقوس یا تأثراتی نظریہ (DING DONG THEORY OR PAPHOONOMIC THEORY)

اس نظریے کی رو سے زبان کا آغاز اُن الفاظ سے ہوا جو بصورت آواز ابتدائی انسان کے منہ سے اس وقت برآمد ہوئے جب وہ کسی شے یا کسی صورتِ حال سے متاثر تھا، یا جب اُسے اس کا خیال آیا، اور اُس نے محسوس کیا۔ مثلاً کسی ابتدائی انسان کے منہ سے "ٹیڑھی میڑھی" کے الفاظ اس وقت نکلے جب اسے کسی ٹیڑھی میڑھی شے کی صورت یا حقیقت کا خیال آیا۔

اس میں شک نہیں کہ صوتیاتی عناصر زبان کی ترقی میں، ایک اہم کام انجام دیتے ہیں۔ لیکن یہ تینوں نظریے جو صوتی تقلید کے حوالے سے آغازِ زبان کی تشریح کر رہے ہیں، ایک اہم نکتہ فراموش کر جاتے یعنی اصل زبان میں حرکی عنصر کا شمول جس کا مفصل ذکر آموزش کی گذشتہ اشاعت میں آ چکا ہے۔

اس ایک لفظ "ٹیڑھی میڑھی" کو لیجیے، اس میں بھی حرکی عُنصر موجود ہے۔ "ٹیڑھی میڑھی" کہنے میں زبان خود ٹیڑھی میڑھی ہوتی ہے۔

آغازِ زبان اور تشکیلِ الفاظ کے سلسلے میں پروفیسر الیکزنڈر جاہنسن کی تحقیقات کا ذکر بھی ضروری ہے موصوف نے سنہ ۱۹۴۹ء میں ماہرینِ لسانیات سے خطاب کرتے ہوئے کہا تھا کہ آئس لینڈ کی زبان کے بیس ہزار، اور آریائی زبانوں کے ڈھائی ہزار الفاظ کے گہرے مطالعے سے، مجھ پر یہ انکشاف ہوا ہے کہ بیشتر الفاظ کا ماخذ منہ کے وہ اشارے ہیں جن میں ہاتھوں کے اُن حرکات و سکنات کی نقل کی گئی ہے جو کسی کام کی انجام دہی کے وقت ہاتھوں سے سرزد ہوتی ہیں ؂

سنٹرل ٹریننگ کالج کی نمائش

ناصر علی

سنٹرل ٹریننگ کالج کی صنعتی اور آرٹ کی نمائش اپنی کئی خصوصیات کے اعتبار سے بڑی اہم رہی۔ اس دفعہ بہت سے صنعتی ماڈلوں اور تصاویر کے علاوہ گورنمنٹ جونیئر ماڈل سکول کے بچوں کا کام بھی پیش کیا گیا تھا۔ بچوں کی بنائی ہوئی تصویریں اور پراجیکٹ دیکھنے سے پتہ چلتا تھا کہ ان کے خیالات کی پرواز کبھی نہ کبھی انہیں ایک اچھا آرٹسٹ بنا دے گی۔ ان کے کام میں تدریجی قوت اور زندگی موجود تھی۔ اور ان کے موقلم کی سیدھی سادھی گردشیں ظاہر کرتی تھیں کہ وہ بھی اس فن لطیف کی ترویج میں برابر کے شریک ہیں۔

بچوں کی لاعلمی میں آرٹ ذرا مختلف قسم کا ہوتا ہے۔ جس میں خوشی، لاپرواہی، الھڑپن اور ایک بے ترتیب سا لگاؤ پایا جاتا ہے۔ وہ فن کو فن جان کر نہیں دیکھتے اور سمجھتے۔ البتہ ان کے دل میں اس کی محبت ضرور موجود ہوتی ہے۔ اور یہ محبت ان کی تصویروں میں نمایاں نظر آتی ہے۔ ان کی مثال ایک ایسے سازندے کی سی ہے جو اپنے دل کی گہرائیوں میں سے نکلی ہوئی آواز سے سامعین کو مسحور کرنا چاہتا ہے اور ساز سے صرف آواز کے اتار چڑھاؤ کا کام لیتا ہے۔ معصوم بچے بھی اس فن کی محبت کو اجاگر کرنے کے لیے کاغذ، برش اور رنگ استعمال کرتے ہیں۔ وہ اپنی ٹیڑھی ترچھی لکیریں اس لیے نہیں کھینچتے کہ وہ آرٹسٹ کہلائیں۔ بلکہ ان سے ان کا یہ غرض ہوتی ہے کہ وہ اپنے خیالات کا اظہار کر دیں۔ اور یہ خیالات ہی ان کی آئندہ زندگی کا عکس ہوتے ہیں۔

بچے دیکھی بھالی چیزوں کی تصویریں بنا کر بہت خوش ہوتے ہیں۔ پرندوں، درختوں، پھولوں، بیلوں اور سبزہ زاروں کی تصاویر اور سینریاں انہیں بہت بھاتی ہیں۔ ان کی اس دلچسپی کو دیکھتے ہوئے جونیئر سکولوں میں ابتدائی آرٹ اور تصویر کشی کے شعبے قائم کر دیے گئے ہیں جن میں بچوں کو کاغذ، پنسل اور رنگوں کا استعمال سکھایا جاتا ہے۔

آرٹ کے علاوہ پیپر کٹنگ سے کام لینے کے طریقے۔ سیڈنگ، چکنی مٹی سے ماڈل اور ... بنا ...

ے جاتے ہیں، جن میں بچے بہت دل لگاتے ہیں۔ وہ اسے ایک کھیل جان کر کرتے ہیں لیکن حقیقتاً
ہ سے ان کی دماغی نشو ونما ہوتی ہے، دیکھنے سننے اور سمجھنے کی طاقتیں بڑھتی ہیں۔ یہ سب کچھ ایک سوچے
ہے سبق کے مطابق ہوتا ہے۔ استاد سبق ترتیب دیتے وقت بچے سے کام لینے کا مقصد ملحوظ رکھتا ہے اور
نیز بچے کی قوت مشاہدہ کو حرکت میں لانا ہوتا ہے۔

بچے اچھے مصوروں کی بنائی ہوئی تصاویر بھی بہت غور اور شوق سے دیکھتے اور یہ معلوم کرنے کی
شش کرتے ہیں کہ مصور نے کون کون سے رنگوں کی آمیزش سے اپنی تصویر بنائی ہے۔ وہ سیٹل سبز یوں
دلوں، پھول اور پھل دار پیڑوں، آب شاروں، فواروں، پرندوں، چرندوں اور درندوں کی رنگدار تصاویر
ں انتہائی دل چسپی لیتے ہیں۔ یوں تو ہر عام آدمی کی نظر کسی تصویر پر پڑے بغیر نہیں رکتی۔ لیکن ایک بچہ
ں دلی ذوق سے اسے دیکھتا ہے، وہ ذوق قدرت نے ہر انسان کو نہیں بخشا۔ بچوں میں یہ قدرتی ذوق
تے ہوئے اگر انھیں تصویر کشی کا مبادیاتی ماحول بھی میسر آجائے جہاں انھیں اپنی تخلیقی قوتیں روبہ کار لانے کا
وقع ملے، تو مجھے یقین ہے کہ ایسے بچے جو آج الھڑ اور نوآموز ہیں، کل آرٹسٹ اور استاد کہلائیں گے۔ اور
ں کا ذوق ان کی شہرت کا ضامن ہوگا۔

طالب علم بچے دوسرے ملکوں کے بچوں کی بنائی ہوئی تصاویر بھی بہت شوق سے دیکھتے ہیں۔ وہ سمجھتے
ں کہ یہ ہمارے ہی جیسے ننھے منے بچوں کی دماغی کاوش ہے۔ اکثر بچے ایسی تصاویر دیکھ کر انھیں اپنے
مال کی کنجی تصور کرتے ہیں، اور محسوس کرتے ہیں، جیسے دنیا کے قیمتی تحفے انھیں مل گئے ہوں۔

آرٹ کے فن سے بچوں کے دل لگاؤ کے یہ معنی ہرگز نہیں کہ وہ جو کچھ دیکھے یا پسند کرے، وہ اس
یا بنائے بھی، نہیں وہ جو کچھ خود بنائے گا۔ اس میں اس کی اپنی انفرادیت کا دخل ہوگا۔ اس کی تخلیقی یا دماغی
ت جس حد تک اس کا ساتھ دے گی، وہ اس سے کام لے گا۔ خواہ وہ چیز اور اس کے بنانے کا طریقہ آپ کے
سند ہو یا نہ ہو خود اسے ایسا ہی پسند ہے، اس لیے ہمیں بچوں کی بنائی ہوئی تصویریں دیکھ کر یہ سمجھنے کی
شش کرنی چاہیے کہ تصویر کس خوبی کی مالک ہے۔ اور اسے بناتے وقت بچے نے اپنی ذہنی اور تخلیقی قوت کا
ہار کس حد تک کیا ہے۔ تھوڑے سے غور کے بعد آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ اس ننھے فنکار نے تصویر کا موضوع

کیا منتخب کیا ہے اور کس نظریے کے زیرِ اثر منتخب کیا ہے۔ آپ جس بچے کی تصویر دیکھیں گے اس میں کچھ نہ کچھ نیا پن ضرور اور آخر اس کے نظریے کے قائل ہو جائیں گے۔

بچہ جب نئی طریقوں کو کام میں لا کر اپنے دل کی بات ظاہر کرتا ہے۔ ان میں سے کوئی طریق وہ اپنی تصویر کی بناوٹ میں بھی ظاہر کرے گا۔ مثلاً تصویروں میں اس نے لباس کا ارغوانی رنگ تجویز کیا ہے۔ یا کوئی اور چیز خصوصیت سے ظاہر کی گئی ہے تو غور کرنا پڑے گا کہ پس منظر اور اس کے چھوٹے چھوٹے حصوں میں کون سے رنگ استعمال کیے گئے ہیں۔ مثال کے طور پر میں یہاں دو تصویروں کا ذکر کروں گا جو نمائش میں موجود تھیں۔

(۱) بارش ہو رہی ہے ایک ننھی بچی چھتری سنبھالے اپنے گھر کی طرف جا رہی ہے۔ ساتھ اس کی ایک سہیلی بھی ہے۔ پس منظر میں درخت، مکان اور آسمان پر گھرے ہوئے بادل ہیں۔ یہ جو کچھ ایک بچی نے بنا کر رکھ دیا۔ کیا آپ اس کی داد نہیں دیں گے۔ یہ تصویر عزیزہ فریدہ نبلیہ فر کی بنائی ہوئی تھی۔ جو زینتِ نمائش ہوئی اور جس سے اس کی ندرتِ خیال اور تخلیقی قوت کا پورا اظہار ہوتا ہے۔

(۲) بشیر احمد (عمر ۱۰ سال) کی بنائی ہوئی تھی۔ تصویر "داستان گو"۔ ایک بوڑھا کہانی سنا رہا ہے۔ لوگ آس پاس بیٹھے کہانی سن رہے ہیں۔ ان میں بچے بھی ہیں اور جوان بھی۔ داستان گو کے بیٹھنے کا انداز اور لوگوں کے کہانی سننے کے آداب اس ننھے فن کار نے اپنی تصویر میں نمایاں کیے ہیں۔ حالاں کہ اس بچے نے کسی کہانی سنانے والے اور سننے والوں کو شاید یوں بیٹھے کبھی نہ دیکھا ہوگا۔ مگر اس نے اپنی دماغی قوت اور ذہنی کاوش سے تصویر میں یہ سب کچھ دکھا دیا ہے۔ بشیر احمد کی ایک اور تصویر کو بھی نمائش میں جگہ دی گئی جس کا موضوع تھا۔ "دیہاتی لڑکی"۔ اس میں ایک لڑکی نے پانی کا گھڑا سر پر اٹھا رکھا ہے۔ پس منظر میں تمام تر دیہاتی ماحول دکھایا گیا ہے۔

ان کے علاوہ اور بہت سے بچوں کا کام نمائش میں آویزاں کیا گیا تھا جس کی تفصیل حسبِ ذیل ہے :-

(۳) امجد علی نے کالے کاغذ پر جو پھول پتے بنائے تھے وہ ایسے معلوم ہوتے تھے جیسے پیارے پتھر پر موتی جڑے ہوئے ہیں۔ ان کی ایک پینٹنگ واٹر کلر ایک اچھوتے خیال کو ظاہر کرتی تھی۔ ان ہی کا کام پیکنگ خوب صورت باغ بہت دل کش اور دیدہ زیب تھی۔ امجد علی سیکنڈری کے طالب علم

اس وقت ان کی عمر ۹ سال ہے۔

(۴) طارق فاروقی یہ بھی سیکنڈری کے طالب علم ہیں۔ ان کی بنی ہوئی پینٹنگ دوسطح خود ساختہ آرٹ کا بہترین نمونہ تھی۔

(۵) سیف اللہ سیکنڈ اسٹینڈرڈ بی کا بنایا ہوا سیلہ قابل دید تھا۔

(۶) نرگس، انعم فرسٹ اے۔ نے اپنے مکان کی تصویر بنائی تھی جو رنگوں کی تقسیم کے لحاظ سے بہت خوب تھی۔

(۷) سلیمان عزیز نے پیول اور شبنم میں اپنی ذہانت دکھائی تھی۔

(۸) جاوید یونس اول نے "یوم آزادی" بنا کر اپنی قوم اور ملک سے محبت کا اظہار کیا تھا۔

(۹) خالدہ بانو ان کی تصویر میں کیکل کا کھیل دکھایا گیا تھا، جسے پنجاب کا قومی کھیل کہنا چاہیے

(۱۰) مجاہد سلیم۔ یہ ننھا آرٹسٹ بڑا ہونہار ہے۔ اس نے اپنی ایک سینری میں شام کا منظر دکھایا تھا دوسری میں پہاڑ کی چڑھائی دکھائی تھی۔ تیسری میں پانی کا طوفان بتایا تھا۔ چوتھی میں آم کے پودے۔ پانچویں میں نقش قدم کا خیال ظاہر کیا تھا۔ چھٹی میں جھیل کا آئیڈیا خوب تھا۔ یہ طالب علم رنگ آمیزی کا اور اچھوتے خیالات پیش کرتے ہیں۔ بڑی قابلیت رکھتے ہیں۔ انھوں نے رائل آرٹ اکیڈمی سے پہلا انعام حاصل کیا ہے۔ ان کی پینٹنگ دو سو ستر کلاسوں کے بچوں کی نمائش میں اول نمبر آئی تھی۔ اس وقت ان کی عمر ۸ سال ہے۔

(۱۱) تیرہ ڈیمن۔ ان کی بنائی جاپانی ریس بھی خوب تھی۔ انھوں نے اپنی تصویر میں اپنے حسن مذاق کو بہت خوبی سے اجاگر کیا تھا۔ رنگ آمیزی کاغذ کی تقسیم اور سر پر چھوٹی سی مٹکی رکھے لڑکیوں کے دوڑنے کا انداز بے حد دلکش تھا۔

(۱۲) لالہ رخ پانی میں تیرتی ہوئی مچھلیاں بنانے میں کامیاب رہیں۔ انہوں نے پس منظر میں دور تک نیلگوں پانی دکھا کر اس میں اس طرح مچھلیاں تیرائی تھیں جیسے واقعی حوض یا دریا میں پانی کی یہ رانیاں سرگشت کر رہی ہوں۔

(۱۳) تحسین خالد نے دریائے راوی اور شام کا منظر بہت خوبی سے پیش کیا تھا۔ وہ شام کا وقت

اور عدیا کا سکون دکھانے میں بڑی حد تک کامیاب رہے ۔

(۱۴) عتیق احمد نے مکانوں کے مختلف ڈیزائن بنائے تھے ۔ انہوں نے مکانوں میں جو رنگ استعمال کیے تھے اور جس حسن مذاق سے انھیں نمایاں کیا تھا وہ ان کی قوت مشاہدہ کی بین دلیل ہے

(۱۵) ارشد محمود علی نے کشتی کا بیڑہ بنایا تھا جس میں بیٹھے کے دانوں اور بتوں میں بڑی خوبصورتی سے رنگ لگائے تھے ۔ پس منظر دیہاتی اور کھیتی باڑی کا تھا ۔ یہ تصویر ان کا زیادہ گاؤں کا خیال بھی ظاہر کرتی تھی ۔

(۱۶) "سیرگاہ" یہ سینری ناظم الدین نے بنائی تھی ۔ اور اپنی رنگ آمیزی ابرش کے استعمال اور بیلوں پھلوں اور درختوں کی بناوٹ سے دیکھنے والے کے سامنے ایک سبزہ زار کا سماں پیش کرتی تھی

(۱۷) عائشہ سیکنڈ اے نے ایک بہت ہی خوب صورت گلدستہ پیش کیا تھا جس میں رنگا رنگ کے پھول اپنی بہار دکھا رہے تھے ۔

(۱۸) میرہ فسٹ اے ۔ راوی کا نظارہ بنانے میں اپنی مشاہدہ کی قوت روبکار لائی تھی ۔ انھوں نے دریا کا منظر دلکش انداز میں پیش کیا تھا ۔

(۱۹) سہیل پرویز ۔ فسٹ بی نے میرے کھلونے بنانے میں اپنے کمال کا اظہار کیا تھا ۔ کھلونا یوں بھی بچوں میں ایک پسندیدہ چیز ہے ۔ سہیل نے انھیں بنا کر بچوں کے اس ذوق کو ابھارا ہے ۔

(۲۰) زکریا ۔ انھوں نے رنگین پھول بنائے تھے اور رنگ بڑی خوب صورتی سے استعمال کیے تھے ۔

(۲۱) مجیبہ کے بی ایڈ اے ۔ ان کی پینٹنگ ۔ بلی اور بلی کے بچے ۔ بلی کی ماتما کا اظہار کر رہی تھی ۔

کے بی ایڈ اے ۔ رشید نجم ۔ طوطا شاخ پر بیٹھا ہے ۔ بیٹھنے کا انداز خوب دکھایا ہے ۔

کے بی ایڈ بی ۔ محمد شفیق ۔ انھوں نے پانی میں تیرتی ہوئی بطخ خوب بنائی ہے ۔ دل چاہتا ہے دیکھتے ہی رہیے ۔

اسلامی فنِ تعمیر میں مغلیہ عہد کا مقام

ڈاکٹر اعجاز حسن قریشی

ڈاکٹر اعجاز حسن قریشی سنٹرل ٹریننگ کالج لاہور کے ایک سابق طالب علم ہیں۔ آپ جرمنی سے تاریخ اسلام میں پی۔ ایچ۔ ڈی کرنے کے بعد حال ہی میں واپس آئے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے جرمنی جانے سے پہلے مغلیہ فنِ تعمیر پر ایک مقالہ تیار کیا تھا۔ یہ مفید اور پراز معلومات مضمون اب قارئین آموزش کی خدمت میں پیش کیا جا رہا ہے (نائب مدیر)

فنِ تعمیر انسانی تہذیب و تمدن اور اس کے معاشرتی ارتقا کی وہ مقدس تاریخ ہے، جو ان گنت صدیوں سے پتھر کی سلوں اور قدیم عمارات و صنادید کے سینے پر نقش ہے۔ کسی قوم کے حسنِ تخیل، رفعتِ افکار، علوئے ہمت اور صداقتِ کردار کا اس سے بڑھ کر اور کوئی آئینہ دار نہیں۔ فنِ تعمیر ابن آدم کی پیہم کاوشوں، لامحدود کوششوں اور ان گنت محنتوں کا دل نواز ہی نہیں بلکہ اس کی خارا تراشیوں، تیشہ پرستیوں اور انجمن سازیوں کی ایک حیات افروز داستان بھی ہے۔ فنِ تعمیر ایک قوم کی مادی فتح مندیوں کی عظیم ترین دستاویز اور اس کی فکری سربلندیوں کا ایک بے نظیر مرقع ہے۔ یہ فن ہماری تہذیبی روایات، ہمارے معاشرتی تخیلات، ہمارے فن کارانہ تصورات، ہمارے مذہبی میلانات، روزمرہ کے تقاضات، سیاسی رجحانات، اور مخصوص روحانی تصورات کا وہ باصرہ نواز شاہکار ہے جس کا ایک ایک نقش کتنے برس گذرنے کے بعد بھی آج تک انسانی تاریخ تہذیب کا ایک جداگانہ مستقل اور درخشاں باب ہے۔ اور ایام کے ساتھ ساتھ اس فن میں کیوں کر تبدیلیاں ہوئیں؟ دورِ وحشت و بربریت میں اس فن نے کون کون سے انقلابات دیکھے؟ اس فن نے انسان کی بڑھتی ہوئی ضرورتوں کا ساتھ کیوں کر دیا؟ کسی ملک کے مخصوص ماحول اور آب و ہوا نے اس پر کون سا اثر ڈالا؟ ان تمام سوالات کا جواب صرف چند عمارات پر نظر ڈالنے سے بخوبی مل سکتا ہے۔ مختلف ملکوں کے محلات، قلعہ جات، عبادت گاہوں اور زیارت گاہوں کو محض دیکھ کر ہی ان تمام اسباب و علل کا جائزہ لیا جا سکتا ہے۔ جو مختلف زمانوں میں فنِ تعمیر پر اثر انداز ہوتے رہے

اور جنھوں نے اس فن کی تشکیل میں نمایاں حصّہ لیا۔

عہدِ مغلیہ کا فنِ تعمیر، اسلامی فنِ تعمیر کی آخری کڑی ہے۔ اس لیے مغلیہ عہد کا جائزہ لینے سے قبل بحیثیت مجموعی مسلمانوں کے فنِ تعمیر کے تاریخی ارتقاء سے بحث کرنی لازمی ہے۔

یہ قانونِ قدرت ہے کہ جب بھی کوئی نئی تہذیب جنم لیتی ہے تو وہ اپنے جلو میں زندگی کے گمنام ترین گوشوں سے لے کر اہم ترین پہلوؤں تک کو متاثر کرنے کی قوت و صلاحیت لے کر نمودار ہوتی ہے اگر یہ نئی تہذیب اپنے اندر اس قسم کی قوت (FORCE) نہیں رکھتی تو وہ ہمہ گیر اور دیرپا ثابت نہیں ہو سکتی اسلامی تہذیب جب دنیا میں نمودار ہوئی تو وہ انسانی زندگی کے تمام گوشوں کو تفصیلات سمیت محیط کیے ہوئے تھی۔ اُس نے حکمرانی سے لے کر فنونِ لطیفہ کے مسائل پر شرح و بسط سے نہ صرف روشنی ڈالی بلکہ اُن کے لیے واضح اور صحیح راہ متعین کی۔ یہ تہذیب جو اپنی پشت پر زندگی کے تمام مسائل کے لیے ایک نیا نظریہ اور ایک نیا حل رکھتی تھی جب سابقہ تہذیبوں سے ٹکرائی تو اپنی قوت و صلاحیت کی وجہ سے نہ صرف سیاسی طور پر ان پر غالب آئی بلکہ معاشرتی طور پر بھی اس نے فتح حاصل کی۔ اس سیاسی فتح سے ہا اس تہذیب کو دوسری قدیم تہذیبوں کے مقابلے میں ذہنی فوقیت حاصل ہوئی۔

تہذیبوں کے ٹکراؤ کا یہ لازمی نتیجہ ہے کہ جس طرح فاتح تہذیب اثر پذیر ہوتی ہے۔ اس اثر پذیری سے فاتح تہذیب اپنے پورے شعوری احساس کے باوجود بچ نہیں سکتی۔ وہ نہ صرف سیاسی اور مذہبی معاملات میں مغلوب تہذیب کے اجزا اپنے اندر جذب کرتی ہے۔ بلکہ اس کی معاشرت اور فنونِ لطیفہ سے بھی اصول اور اطوار اخذ کرتی ہے۔ اور رفتہ رفتہ نئی تہذیب قدیم تہذیبوں سے اتنا کچھ لے لیتی ہے کہ تھوڑے ہی عرصے میں وہ نئے خیالات اور پرانے اطوار کا ایک ناقابلِ تقسیم مرکب بن جاتی ہے۔ اس ارتقائی عمل کی وجہ سے تہذیبوں کے درمیان کوئی خطِ فاصل کھینچنا ناممکن ہوتا ہے۔ اس کا قدرتی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بادی النظر میں دیکھنے والے کے لیے حقیقی تہذیب کو پہچاننا اور اس کے متعلق کوئی منفرد رائے قائم کرنا دشوار ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے جب اروپائی مستشرقین نے اسلامی تہذیب کا مطالعہ کیا تو انھیں اس میں سوائے روما، بازنطینی اور ایرانی تہذیب کے اسلامی تہذیب کے اپنے کوئی واضح خدوخال نظر نہ آئے اور انھوں نے اسی بنا

اپنی تمام تحقیقات کی عمارت کھڑی کی اور اسلامی نظریہ حیات و تہذیب کو نفی کر کے رکھ دیا۔

اسلامی نظریہ جمالیات پر جب بھی گفتگو کی جاتی ہے تو اس پر یہ الزام عائد کر دیا جاتا ہے کہ اسلامی تہذیب جمالیات کی دشمن ہے اور اسلامی معاشرہ میں جمالیاتی ذوق کے اظہار کے لیے کوئی موقعہ نہیں ہے۔ اس لیے یہ ایک ایسی تہذیب ہے جو تمدن کی بڑھتی ہوئی ضروریات کا ساتھ نہیں دے سکتی۔ اس الزام کا اگر تجزیہ کیا جائے تو اس کا سطحی پن نمایاں ہو جاتا ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ اسلامی نظریہ جمالیات دوسری تہذیبوں کے جمالیاتی نظریات سے مختلف ہے۔ اسلامی تہذیب زندگی کے تمام مسائل کے حل کے لیے اپنا ایک مخصوص طریقہ کار رکھتی ہے۔ صرف اسی طریقہ کار کے مطابق ہر اہم اور غیر اہم مسئلہ کا حل تلاش کیا جا سکتا ہے ذوقِ جمالیات کے اظہار کے لیے بھی اسلام نے چند واضح اور متعین حدود مقرر کر دی ہیں، جن کے اندر رہ کر ہی حسن کارانہ جذبہ کا اظہار کیا جا سکتا ہے۔ اسلام نے بت پرستی کو حرام اور جاندار شے کی حقیقی تمدنی ضرورت کے بغیر تصویر کشی کو ممنوع قرار دے کر باقی تمام ایسے طریقوں کو جن سے ان حدود کے ٹوٹنے کا خطرہ نہ ہو جائز قرار دیا ہے۔ چناں چہ مسلمانوں کے فن تعمیر سے اس فلسفہ کو بخوبی نمایاں طور پہ معلوم کیا جا سکتا ہے۔

کسی قوم کا مزاج اس کے فنونِ لطیفہ اور خاص طور پہ ادب اور فن تعمیر سے جھلکتا ہے۔ مسلمانوں نے ادب کے علاوہ فن تعمیر میں بھی مسلسل ذہنی اور فنی روایات چھوڑی ہیں اور یہی روایات ان کی مبسوط ذہنی تاریخ ہیں۔ اسلامی فن تعمیر میں ہمیں مسلمانوں کا قومی مزاج اور ان کی بنیادی وحدت نظر آتی ہے۔ ساتویں اور آٹھویں صدی عیسوی میں اسلام نے بکھرے ہوئے عربوں کو ایک منظم قوت بنا دیا اور اسلام بڑی تیزی کے ساتھ چند ہی سالوں میں ساری دنیا میں پھیل گیا۔ اسلام کے ان سارے ماننے والوں کے درمیان ایک ذہنی ہم آہنگی تھی اور اسی ہم آہنگی نے آگے چل کر اسلامی فن تعمیر کی تشکیل میں مدد دی۔

مسلمانوں کے فن تعمیر میں ہمیں مختلف اسالیب کی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔ ہر ملک میں مسلمانوں کے فن تعمیر میں کچھ نہ کچھ فرق ضرور ہے۔ مغرب یعنی اندلس میں اسلامی فن تعمیر مغرب کے اسلوب سے متاثر ہوا اور مشرق میں مصر، ایران اور ہندوستان کے مروجہ اسالیب سے۔ لیکن بنیادی طور پہ ہر ملک کی اسلامی تعمیرات میں ایک مضبوط وحدت ملتی ہے۔ اپنی عظمت، گنبدوں، میناروں اور نقاشی کی وجہ سے اسلامی طرز

ملتی ہے۔ محراب کی بھی کئی ساختیں رائج رہی ہیں۔ عرب زیادہ تر گول محراب بناتے تھے۔ بیرونی اثرات کے تحت بیضوی محرابیں بنائی گئیں۔ ہندوستان اور ایران میں ضد محرابوں کا رواج کم ہی رہا۔ ان ملکوں میں محرابوں کی اوپر کی جانب بیضوی شکل دی جاتی تھی۔

مسلم فن تعمیر میں ان محرابوں اور دیواروں کے درمیان توازن اور تناسب پر ہمیشہ زور دیا گیا۔ دیواروں پر نقاشی کی جاتی۔ نقوش کے رنگ جاندار اور بڑے جاذب نظر ہوتے۔ رنگوں کے درمیان بڑا خوش گوار تضاد ہوتا اور کوئی ایک رنگ زیادہ شوخ نہ ہونے پاتا۔ دیواروں کے ان نقوش میں بڑا تنوع ہوتا تھا۔ مسلمان فن کاروں کے ذہن تھکنا تو جانتے ہی نہ تھے۔ وہ طرح طرح کے نقوش بناتے جو فطرت کے حسن اور معصومیت کو پیش کرتے۔ اسی لیے پھول اور پتیوں کو بھی ان نقوش کے درمیان مناسب جگہ دی جاتی۔ دور اول میں ان نقوش میں ساسانی اثرات کا غلبہ نظر آتا ہے۔ لیکن بعد کے دور میں کرنی اثرات زیادہ شامل ہو گئے۔

اسلامی فن تعمیر کی ابتدا مسجدوں سے ہوتی ہے۔ اور اسلامی فن تعمیر کا پہلا نمونہ مسجد نبوی ہے جو سلسہ میں تعمیر ہوئی اور جس کے معماروں میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم بھی شامل تھے۔ یہ عمارت کھجور اور کچی اینٹوں کا مرکب تھی۔ اس عمارت کے علاوہ نبی اکرم صلعم کے عہد میں مسجد قبا تعمیر ہوئی جس میں البتہ پتھر استعمال کیا گیا تھا۔ اس طرز تعمیر کا سبب مسلمان جماعت کی معاشی اور اقتصادی حالت تھی۔ ان حالات میں نفاست اور تعیش کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا تھا۔

حضرت ابوبکر صدیق کا دور اقتصادی اعتبار سے گو کسی قدر بہتر تھا مگر سیاسی انتشار نے اس دور کافی دور رس اثرات ڈالے اور اسی وجہ سے انداز تعمیر میں کوئی نمایاں تبدیلی نہ ہوئی۔ حضرت عمر فاروق کے عہد سعید میں مسلمانوں کی اقتصادی حالت زیادہ بہتر ہو گئی تھی۔ ملک میں سیاسی سکون قائم ہو گیا تھا۔ اس لیے اس عہد میں جو قومی عمارات بھی تعمیر ہوئیں ان کا انداز پہلی عمارات کی نسبت بدلا ہوا تھا۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ روح سادگی اب تک باقی تھی۔ فاروق اعظم اسی مسلک کے پابند تھے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکر صدیق کا تھا۔ مسجد نبوی اور حرم کعبہ کی عمارات میں حضرت عمر نے اپنے عہد میں جو ترامیم کیں ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ تکلف کو ہرگز پسند نہ کرتے تھے۔ رسول اکرم کے زمانے میں

جو دوسرے اسالیب سے جدا گانہ اور ممتاز ہے۔ مسلمانوں نے مختلف طرزوں کو اس طور پر ملا دیا کہ عربی طرز ان سب میں اجاگر رہا اور مجموعی طور پر کہا جا سکتا ہے کہ اسلامی فن تعمیر میں عیسائیت کے ابتدائی دور کی جھلک، روم کے آخری دور کا عکس اور ایشیائی فن کے مخلوط خدوخال نظر آتے ہیں۔

مجموعی طور پر مسلمانوں کے فن تعمیر کی نمایاں خصوصیات چھ ہیں۔

(۱) اسلامی فن تعمیر کی نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ مسلمانوں نے علم اقلیدس (جیومیٹری) کو فن تعمیر کی بنیاد قرار دیا۔ زاویے، محرابیں، خطوط منحنی و مستقیم، دائرے اور جالیاں۔ ان سب چیزوں کو اقلیدس کے اصولوں پر قائم کیا۔

(۲) اسلام نے آدمی یا جانور کی تصویر کشی کی ممانعت کی ہے۔ اس لیے اسلامی فن تعمیر میں مصوری کی جگہ نقاشی کو دی گئی اور مشاہدہ کی جگہ تخیل نے خود بخود لے لی۔ لیکن مسلمان حقیقت سے بھٹکے نہیں اور انھوں نے اپنے تصور و تخیل سے نقاشی میں انسانی فطرت کو ڈھال دیا۔

(۳) اسلامی فن تعمیر داخلی اور خارجی عناصر کا امتزاج ہے۔ مسلمانوں نے بلند میناروں اور بلند چار دیواری کی نئی تکنیک کے ذریعے خارجی وسعت اور داخلیت کو ایک ساتھ ملا دیا۔

(۴) اسلامی اسلوب تعمیر کی ایک اور بڑی خوبی یہ ہے کہ کسی اور طرز تعمیر میں کسی قوم کا مزاج اس طرح حل نہیں ہوا جس طرح اسلامی فن تعمیر میں مسلمانوں کا مزاج اس اسلوب میں عرب کا زندہ اور جاندار تخیل بھی موجود ہے۔ اور ساتھ ہی ساتھ ہر ملک کے مسلمانوں کی اپنی روایات بھی۔

(۵) مسلمانوں کے قومی مزاج کے علاوہ اسلام کا مذہبی اثر بھی مسلمانوں کے فن تعمیر پر پڑا۔ مسلمانوں نے قرآن مجید کی آیات دیواروں اور محرابوں پر لکھوائیں اور اس طرح کہ تمام حروف ہر جگہ سے برابر نظر آئیں۔

(۶) اسلامی فن تعمیر میں انسانی اقدار ہمیشہ نمایاں رہی ہیں۔

اسلامی فن تعمیر کی یہ خصوصیات اسے دوسرے اسالیب فن سے علیحدہ کرتی ہیں۔ اسی طرح محراب اور ستون بھی مسلم طرز تعمیر میں بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ ستونوں کی ساخت اور ان کی تعداد کے بارے میں کوئی خاص اصول نہیں بنائے گئے۔ بھاری اور ہلکے ستونوں کی آمیزش اسلامی طرز تعمیر میں یکساں طور پر

مسجد نبوی کی جو ہیئت تھی قریب قریب وہی ہیئت قائم رہی۔ حرم کعبہ کی چاردیواری کی گئی پتھر استعمال کیے گئے۔ مسجد میں فرش لگا، روشنی کا انتظام ہوا۔ فرش میں چٹائیاں استعمال کی گئیں۔ تعمیرات کے متعلق حضرت فاروق کا صحیح طرز عمل اس وقت واضح طور پر سامنے آتا ہے۔ جب بصرہ کوفہ، فسطاط اور موصل آباد کیے گئے ان شہروں کی عمارات میں سادگی کو ہر لحاظ سے ملحوظ رکھا گیا۔ البتہ فوجی ضروریات کےلیے جو قلعے تعمیر ہوئے ان میں کسی قسم کے بخل سے کام نہیں لیا گیا اور پوری کوشش کی گئی کہ قلعوں کی عمارت مضبوط سے مضبوط تر ہو۔

حضرت عثمان کے زمانہ میں کچھ پختہ مکانات تعمیر ہوئے۔ مسجد نبوی میں توسیع ہوئی۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے عہد خلافت میں کوئی نئی عمارت تعمیر نہیں ہوئی۔ غرض کہ خلفاء راشدہ کا دور سعید عمارات میں سادگی کا مظہر تھا۔ صرف وہی عمارات تعمیر کی گئیں جن کی اس وقت مسلم معاشرہ کو ضرورت تھی۔ اور ان عمارات میں وہ سامان استعمال کیا گیا جو مقامی طور پر آسانی سے میسر آسکتا تھا۔ تصنع اور تکلف کا نام و نشان بھی اس عہد کی عمارات میں نہیں پایا جاتا۔

خلفائے راشدہ کے دور سعادت کے بعد اموی دور میں جس طرح زندگی کا ہر انداز بدلا جس طرح اموی بادشاہوں نے رومی اور ایرانی انداز بادشاہت اختیار کیے۔ اسی طرح ان کے دور میں جو عمارات تعمیر ہوئیں وہ بھی ہر اعتبار سے خلافت راشدہ کی عمارات سے مختلف تھیں۔ مسٹر آرنلڈ فاضل مستشرق اس نمایاں تبدیلی کو ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں۔

The transition from bare necessity to attempts at dignity and splendour was very rapid – surprisingly so when one considers the austerity of the Islamic cult and the severity of the campaigning life led by so many of its votaries. Within twenty years of

Mohammad's death, his own mosque at Madina was rebuilt with walls and piers of dressed stone and in the last year of the 7th century was built, near the rude mosque erected by the Caliph Omar at Jerusalem, after the Arab conquest of that city in 693 A.D. the magnificent 'Dome of Rock' (قبۃ الصخرہ) as it is commonly called, a building of impressive size and monumental character, gorgeously decorated.

زیاد بن ابیہ اموی پہلا امیر ہے جو اُموی فنِ تعمیر کا بانی خیال کیا جاتا ہے۔ اس نے تعمیرات میں نیا انداز اختیار کیا۔ اور بنو امیہ کے اقتدار کے پورے دور میں عبدالملک پہلا خلیفہ ہے جس نے اس شعبہ میں دل چسپی لی جو ایک بادشاہ کے شایانِ شان تھی۔ بنو امیہ کے دور میں مندرجہ ذیل مساجد یا تو نئی تعمیر ہوئیں یا پرانی عمارات کو از سرِ نو تعمیر کیا گیا۔

جامع بصرہ۔ جامع کوفہ۔ جامع مصر۔ قبۃ الصخرہ۔ مسجد نبوی۔ جامع ولید۔

تعلیمی دنیا پر ایک نظر

مزدوروں کی تعلیم و تربیت

آج برطانوی صنعت کو ایک بہت اہم اور آخری موقع میسر ہے۔ ایسا موقع جس سے اسے بہبود اور قومی مفادات کے لیے فائدہ اٹھانا چاہیے۔ سال بہ سال سے کافی تعداد میں لڑکے اور لڑکیاں سکولوں سے فارغ التحصیل ہو کر ملازمتوں کے لیے نکل رہے ہیں۔ اس وقت جوہری اور برقیا کا زمانہ ہے اور اس زمانہ کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے فنی ماہرین، فنی اور دوسرے کاریگروں کی جو مانگ پیدا ہو رہی ہے وہ ان ہی طلبا سے پوری کی جا سکتی ہے۔ دورِ حاضر کے تقاضے فوری ہیں پانچ سال کے بعد اسکولوں سے فارغ التحصیل ہونے والوں کی تعداد میں کمی آنے لگے گی۔ آج کل فارغ ہونے والے طلبہ کی سب سے زیادہ تعداد آٹھ لاکھ تیس ہزار سالانہ ہے پھر یہ تعداد ۶ لاکھ پچاس ہزار اور سات لاکھ کے درمیان رہ جائے گی۔

ٹریڈ یونین کانگریس اور مالکوں کی تنظیموں کی امداد سے حکومت نے وزارتِ تعلیم کے ذریعے اپنے منصوبے صنعت کے سامنے پیش کیے ہیں۔ ان میں ایسی تجاویز ہیں جن سے نئے لوگوں کا انتخاب کر کے انھیں فنی کاریگری اور دوسری عادتی تربیت دی جائے گی۔ تاکہ ان نئے مزدوروں کے ذریعہ صنعتوں کی بڑھتی ہوئی مانگ کو پورا کیا جائے۔ ٹریڈ یونین کانگریس ان منصوبوں کو اپنی الحاق شدہ یونینوں کو بھیج رہی ہے۔ تاکہ وہ اس سلسلہ میں اپنی رائے دے سکیں۔

وہ لوگ جنھوں نے ۱۹۵۸ء کی ٹریڈ یونین کانگریس کے اجلاس میں مباحثات سنے ہیں وہ جانتے ہیں کہ معیارِ زندگی اور سائنسی ترقی کے مابین جو تعلق ہے اس کے بارے میں برطانوی ٹریڈ یونینوں کو بہت کچھ کہنا ہوتا ہے۔ یہ ایسا موضوع ہے جس کو دوسری جنگِ عظیم سے اب تک بہت زیادہ زیرِ بحث لایا گیا ہے۔

فنی تعلیم میں امداد :- دوسری جنگ عظیم کے بعد سے ٹریڈ یونینوں نے فنی تعلیم کے سلسلے میں مسلسل اپنی دلچسپی کا اظہار کیا ہے۔ لہٰذا انھوں نے مالکوں سے ایسے معاہدات کیے ہیں جن کے تحت امیدواروں کو تربیت دی جا سکے گی۔ چناں چہ آج کل ایسے لوگوں کی ایک کثیر تعداد دن کے وقت محنت کرتی اور باقاعدہ تعلیم حاصل کرتی رہتی ہے۔ فنی کالجوں میں شام کے بعد مزدور فنی تعلیم بھی حاصل کرتے رہتے ہیں۔

تربیت کے مشترکہ معاہدات سے صرف امیدواروں کو ہی فائدہ نہیں پہنچتا۔ بعض فرمیں کسی فنی کالج سے یہ انتظام کر لیتی ہیں کہ ان کے نوجوان کارکنوں کو کالج کے فاضل وقت میں تعلیم دی جائے۔ بعض ایسی فرمیں بھی ہیں جو اپنے مزدوروں کے لیے بہت سے اور متنوع تعلیمی کورس شاید چلاتی ہیں۔ بعض ابتدائی کورس عموماً ایسے لوگوں کے لیے موزوں ہوتے ہیں جو فاضل وقت میں تعلیم حاصل کر سکتے ہیں، یا کسی اعلیٰ کام کے لیے انھیں بنیادی باتوں کی تعلیم دی جاتی ہے۔ کاریگروں اور فنی ماہرین کے لیے بھی کورس موجود ہیں ان میں سے اکثر فاضل وقت میں ہوتے ہیں، اور پھر کام کی نوعیت کے مطابق ان کی تعلیم کی مدت مقرر کی جا سکتی ہے۔

ان کے علاوہ اور بھی کورس ہیں جن کی ہمہ وقتی اور فاضل وقت میں تعلیم دی جاتی ہے۔ یونیورسٹی کالج آف ایڈوانسڈ ٹیکنالوجی یا ٹیکنیکل کالج میں بھی ایسی تعلیم حاصل کی جا سکتی اور اس تعلیم کو مکمل کرنے کے بعد ڈگری یا ڈپلوما حاصل کیا جا سکتا ہے۔

تربیت کے طریقوں میں سے ایک سب سے دلچسپ طریقہ یہ ہے کہ کالج کی تعلیم اور صنعتی تربیت کے اوقات یکے بعد دیگرے ہوتے ہیں۔ یہ تعلیم پانچ برس تک جاری رہتی ہے۔ حکومت اس طریق تعلیم کو وسعت دینا چاہتی ہے۔ تاکہ سالانہ پانچ ہزار پانسو مزید طلبا کو اعلیٰ معیار کی تعلیم حاصل کرنے کے ذرائع مہیا کیے جا سکیں۔ حکومت ہر سال ۱۰ ہزار طلبا کو اس قسم کی تعلیم دینا چاہتی ہے۔

ملک بھر کے ٹریڈ یونین کے نمائندوں اور مالکوں سے حکومت نے اپیل کی ہے کہ اس طریق تعلیم سے صنعت کو ایسے مرد اور عورتیں میسر آ سکیں گی جو کام کرتے کرتے بالغ ہوئے ہیں اور اس کے ساتھ انھیں تعلیمی تربیت

بھی ملتی رہی ہے اور یہ لوگ کارخانوں میں جا کر ان مسائل پر قابو پا سکتے ہیں جو کام کے دوران پیش [illegible] ہوتے ہیں کیونکہ یہ لوگ طریق ہائے کار اور ان لوگوں سے جو صنعتوں میں کام کرتے ہیں پوری طرح واقف ہوتے ہیں۔

اس کی کامیابی کے لیے حکومت کی تجویز یہ ہے کہ کالج اور فرم کا باہمی تعاون نہ صرف علمی پہلو تک محدود رکھا جائے، بلکہ صنعت میں جب یہ لوگ تربیت حاصل کرنے میں مصروف ہوں تب بھی یہ اشتراک موجود ہو۔ کام کرنے کا عرصہ اسی صورت میں بہترین صورت سے استعمال کیا جا سکتا ہے جبکہ انتظامیہ ٹریڈ یونین اور کالج کے عملے کی طرف سے طلباء پر پوری پوری توجہ دی جائے۔

اس بات کی بھی ضرورت ہے کہ دن کے وقت جو کورس امیدواروں کے لیے تجویز کیے جائیں وہ صرف ان کی ضرورتوں کو مدنظر رکھ کر نہ ترتیب دیے جائیں، بلکہ دوسرے لوگ جو کسی پلانٹ پر کام کر رہے ہیں وہ بھی ان سے مستفید ہو سکیں۔

حکومت یہ استدعا کرتی ہے کہ یونین اور مالک تربیتی نظام پر مسلسل نگاہ رکھیں تاکہ ہر فرم اپنے نوجوان رنگروٹوں سے پورا پورا فائدہ اٹھا سکے۔ یونینوں سے خاص طور سے یہ توقع کی گئی ہے کہ وہ ایسی اسکیموں کو بروئے کار لانے میں امداد کریں جن پر متفقہ فیصلہ ہو چکا ہوتا ہے۔ نیز وہ نوجوان مزدوروں کی حوصلہ افزائی کریں تاکہ وہ اس سے پورا فائدہ اٹھانے لگیں۔ حکومت یہ چاہتی ہے کہ یونین مالکوں سے مل کر فنی کالجوں میں دلچسپی لیں اور اس امر کے لیے تیار رہیں جیسا کہ بعض یونینوں نے اس پر عمل درآمد کرنا شروع کر دیا ہے کہ وہ حکومت کے اداروں میں اپنے نمائندے مقرر کر سکیں اور ایسی صنعتی مشاورتی کمیٹیوں کے لیے بھی اپنے نمائندے مقرر کرے جو کالج کے مختلف شعبوں کے کورس کے مرتب کرنے میں امداد کر سکیں۔

وزارت تعلیم ملک بھر کے بلدیاتی تعلیمی حکام سے بھی رابطہ قائم کر رہی ہے کہ وہ اپنے علاقے کی فرموں سے رابطہ اور زیادہ استوار کریں اور آجروں اور ٹریڈ یونین کے نمائندوں کو ان تمام [illegible] سے باخبر رکھیں جو میسر آ سکتی ہیں۔

جنگ کے بعد سے فنی تعلیم میں بے حد ترقی ہوئی ہے۔ یہ ترقی تعلیمی کورسوں اور طلباء کی تعداد میں ہوئی ہے۔ سنہ ۱۹۳۸ء کے مقابلے میں دن کو جن مزدور پیشہ لوگوں کو فاضل اوقات میں تربیت کے لیے چھٹی دی جاتی ہے ان کی تعداد دس گنا ہو گئی ہے اور جو طلباء ہمہ وقتی تعلیمی اور علمی کورس میں داخل ہوئے ہیں۔ سنہ ۱۹۳۸ء کے مقابلے میں ان کی تعداد چار گنا ہے۔

سنہ ۱۹۶۳ء میں چار لاکھ ستر ہزار محنت پیشہ لوگوں کے دن کے وقت فاضل اوقات کے کورس میں شمولیت کی اور اسی ہزار مزدور فنی کالجوں اور دیگر تعلیمی اداروں میں ہمہ وقتی تعلیم حاصل کرتے رہتے ہیں۔

سنہ ۱۹۵۶ء میں حکومت نے دس کروڑ پونڈ کا ایک توسیعی پروگرام شروع کیا تاکہ فنی کالجوں کو بہتر بنایا جا سکے۔ وزارت تعلیم کا کہنا ہے کہ یہ پروگرام بڑی تیزی سے ترقی کر رہا ہے۔ وزارت تعلیم کا یہ بھی کہنا ہے کہ فنی کالجوں کی نشو و نما کا انحصار محض حکومت اور بلدیاتی نظام پر نہیں ہے۔ اس کے لیے صنعت اور تجارت کے پورے تعاون کی بھی ضرورت ہے۔

وزارت تعلیم کی طرف سے یہ بھی کہا گیا ہے کہ یونیورسٹیوں کو توسیع دینے اور ثانوی سکولوں کی تعلیم کو بہتر بنانے اور اسے وسعت دینے کے سلسلے میں بڑے پیمانے پر کوششیں کی جا رہی ہیں۔

ٹریڈ یونین کانگریس کے خیال میں اس بات پر زور دینا ضروری ہے کہ تمام فنی تعلیم کی بیشتر صحت مند عام تعلیم کی ٹھوس بنیاد پر کی جائے۔ سنہ ۱۹۵۶ء میں کانگریس نے اعلیٰ تعلیم کے بارے میں جو رپورٹ شائع کی تھی اس میں اس کا یہی موضوع تھا۔

مس ملک کوولے، جو ٹرانسپورٹ اینڈ جنرل ورکرز یونین کی اعلیٰ خاتون افسر اور اب ٹریڈز یونین کانگریس کی جنرل کونسل کی رکن ہیں۔ اسی مسئلہ پر سنہ ۱۹۵۰ء کی ٹریڈ یونین کانگریس میں اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

انہوں نے کہا کہ الیہ ہوگا اگر ہم اس صورت حال پر مجبور کر دیے جائیں کہ ایسے نوجوان لوگ جن کی بنیادی تعلیم اتنی اچھی ہے کہ وہ ضرورت پڑنے پر فنی مہارت سیکھ سکتے ہیں، ان کو فنی کاریگر بنا دیا جائے۔

برٹش میوزیم

برطانیہ کے شہرۂ آفاق عجائب گھر برٹش میوزیم کے شائقین اور بہی خواہوں کو غالباً یقین نہ آ سکے

یہ عظیم الشان عجائب گھر جو علم کی ترقی و حفاظت اسلاف ، تاریخ، فنی تعمیر اور فنون لطیفہ کے سلسلہ میں بہت اخراجی میں پیش پیش رہتا ہے۔ اس کی ابتدا کچھ انتہائی غیر شریفانہ اور رسواکن ذرائع سے ہوئی تھی اور وہ غیر شریفانہ اور بدنام زمانہ ذرائع کیا تھے، لگے ہاتھوں ان کی بھی تفصیل سن لیجیے۔ بات دراصل یہ تھی کہ اس عجائب گھر کو قائم کرنے کی غرض سے لاٹریوں کے ذریعے سرمایہ جمع کیا گیا تھا اور ایک تو کوا کریلا اور دوسرے نیم چڑھا کے مصداق ان لاٹریوں میں دیانت داری قطعی نہیں برتی جاتی تھی تیجتاً سرمایہ بچانے کی غرض سے ان لاٹریوں میں خوب خوب گھپلے بازی ہوتی۔ "انتہائی رسواکن" یہ تھی جچی تلی رائے برٹش میوزیم کے ایک سابق ڈائرکٹر کی لاٹریوں کے بارے میں۔ بہرکیف ان لاٹریوں کی بدولت تین لاکھ پونڈ جمع ہو گئے، جس میں کچھ رقم سے بلومبری (لندن) میں مانٹیگو ہاؤس خرید لیا گیا۔ جہاں پر ابتدا ہی سے برٹش میوزیم قائم ہے۔

جیسا ذکر ہے ۱۷۵۳ء کا، اس سے قبل برطانوی پارلیمنٹ نے ایک ایکٹ پاس کر کے اس بات کے متولیوں کو سر ہینس سلون کی ذاتی لائبریری قدیم نادر اشیا اور شاہکار تصویروں، نیز آکسفورڈ کے پہلے ارل (ارل) کے ذاتی کتب خانوں کے مخطوطات کے خریدنے کی اجازت دیدی تھی۔

عجائب گھر کے بیش قیمت خزانوں کی نمائش گذشتہ پورے دو سال سے جاری ہے۔ ان میں سے کچھ اس سے بھی قبل وصیتوں کے ذریعہ برٹش میوزیم کے سپرد کیے گئے تھے۔ عہد الزبتھ میں نامور نادر اشیا، کے ماہر رابرٹ کاٹن نے کتابوں سکوں، اور مسودات اور تمغوں وغیرہ کا بڑی دیدہ ریزی سے جگر کاوی اور لیر دیدہ کثیر ایک بڑا اعلیٰ ذخیرہ جمع کیا تھا۔ سنہ ۱۷۰۰ء میں ان کے پوتے نے یہ بیش بہا خزانہ قوم کے حوالے کر دیا۔ پہلے پہل قدیم اشیا کے ان خزانوں کی نمائش موجودہ دارالامراء کے قریب ایک گھر میں ہوئی۔ بعد ازاں جب مانٹیگو ہاؤس ضروری مرمت کے بعد تیار ہو گیا تو مذکورہ بالا تینوں ذخیرے نیز شاہ جارج ثانی کا شاہی کتب خانہ جو ۱۷۵۷ء میں برٹش میوزیم کو مل گیا تھا، ایک ہی چھت تلے جمع ہو گئے۔

جوں جوں وقت گذرتا گیا برٹش میوزیم کے ذخیروں میں دھیرے دھیرے اضافہ ہوتا گیا۔ اور آج یہ ایک تسلیم شدہ حقیقت ہے کہ اس عجائب گھر کو دنیا بھر میں بہترین مانا جاتا ہے، اور اب لندن میں ...

ملک سے آنے والے لوگ یہاں بیٹھا مطالعہ کرتے دیکھتے ہیں۔ شاہی خاندان نے ہمیشہ ہی سے برٹش میوزیم میں بہت دلچسپی لی۔ میوزیم کی منتظمہ میں فرماں روائے وقت کا ایک نمائندہ ضرور ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ دیگر اراکین میں کینٹربری کے لاٹ پادری، وزیر خزانہ (لارڈ چانسلر) اور دار العوام کا اسپیکر ہوتے ہیں۔ شاہ جارج چہارم نے اس میوزیم کو شاہ جارج سوم کا کتب خانہ بھی دیدیا تھا۔

وقت کے ساتھ ساتھ جب اس عجائب گھر کے ذخیروں میں بے پناہ اضافہ ہو گیا تو ان کی خاطر خواہ نمائش کی غرض سے مزید عمارتوں کی ضرورت درپیش آئی، چناں چہ پرانی عمارت کو ڈھا کر نئی عمارت کے ایک حصے میں شاہی کتب خانہ کو جمع کر دیا گیا۔ سنہ [illegible]ء میں اس کا افتتاح ہوا۔ گریٹ رسل اسٹریٹ میں میوزیم کی بڑی عمارت سنہ ۱۸۵۲ء میں مکمل ہوئی اور اس کے وسطی صحن کو مطالعہ گھر ریڈنگ روم بنا دیا گیا۔ جہاں ایک صدی سے زائد عرصے سے علم و ادب کے متوالے آ آ کر اپنی پیاس بجھاتے رہے۔

برٹش میوزیم کو توسیع دینے کے بارے میں بڑے بڑے منصوبے تھے۔ لیکن اس کی موجودہ عمارتوں کے پیش نظر ان منصوبوں کو عملی جامہ پہنایا جا سکتا تھا۔ چناں چہ فیصلہ کیا گیا کہ اس کے مختلف شعبوں کو علیحدہ علیحدہ عمارات میں منتقل کر دیا جائے۔ نیچرل ہسٹری سے متعلق ذخیروں کو ساؤتھ کینسنگٹن بھیج دیا گیا۔ اخبارات کے پرانے فائلوں کے مجموعے شمال مغربی لندن میں کولنڈیل کے مقام پر بھیج دیے گئے، دوسری جنگ عظیم میں دشمن کی بمباری سے جو نقصان ہوا، ان میں کچھ علاقائی اخبارات کے فائل بھی تھے جو ضائع ہو گئے۔ میوزیم کی بڑی عمارت میں وقتاً فوقتاً نئی گیلریاں بنتی رہیں، اور اس سال امید ہے کہ برٹش میوزیم کا وہ حصہ جہاں قدیم اسناد اور سکے جمع ہیں بن کر مکمل ہو جائے گا۔ پہلا والا سکہ گھر (کوئین ہاؤس) بھی دوسری جنگ عظیم کی بھینٹ چڑھ گیا تھا۔

برٹش میوزیم میں تقریباً سب ہی بڑی قوموں کی ثقافت سے متعلق مواد موجود تھے۔ مثال کے طور پر یونان کے فن سنگ تراشی کے وہ [illegible] نمونے موجود ہیں جنھیں ایلگن ماربلز کہا جاتا ہے۔ مصر قدیم سے جو اشیاء آئی ہیں ان میں ایک روسیٹا پتھر بھی ہے جس پر کسی مصری بادشاہ کا فرمان کندہ ہے اور اس پر ۱۹۶ قبل مسیح کی تاریخ پڑی ہوئی ہے۔ دوسری صدی عیسوی کے ذخیروں میں امراوتی کے مقام پر بدھ مذہب کی عبادت گاہ کے

سنگتراشی کے نمونے ہیں۔ یہ ہندوستان سے حاصل کیے گئے تھے۔ مشرقِ بعید کی قدیم اشیا اور ایشیا ہندوستانی نوادر کی برٹش میوزیم میں بڑی باقاعدگی سے نمائش کی جاتی ہے۔

دنیا بھر کی کسی لائبریری میں اتنے زیادہ اور اتنے قیمتی قلمی مسودات نہیں ملیں گے جتنے برٹش میوزیم میں ہیں۔ ان میں قدیم بھی ہیں اور جدید بھی۔ ان مسودات میں چوتھی صدی عیسوی کا کوڈیکس سائنٹیکس کا مسودہ بھی ہے۔ جسے ایک لاکھ پونڈ میں خریدا گیا تھا اور میگنا کارٹا کی دو نقلیں بھی ہیں۔ یہاں بیٹھ کے لکھے ہوئے اینگلو سیکسن کرونیکل سے لے کر بحری جنگ کے بارے میں نیلسن کے لکھے ہوئے مسودات اور توا ور اسکاٹ کے انٹارکٹک جرنلز بھی مہیا ہیں۔

جب شاہ جارج ثانی کا شاہی کتاب خانہ برٹش میوزیم کو ملا تھا تو اس کے ساتھ ہی یہ اس کو شاہ جارج ثانی کی طرح یہ بھی حق حاصل ہو گیا تھا کہ برطانیہ بھر میں کہیں بھی چھپنے والی کتاب کا ایک نسخہ اس کو بھی بلا قیمت ملا کرے۔ چنانچہ آج میوزیم کی کتابوں کے ذخیروں میں سات لاکھ کے قریب مختلف موضوعات پر کتابیں موجود ہیں۔

صرف گذشتہ سال ہی جو یہاں کتابوں وغیرہ میں اضافہ ہوا ہے اس پر نظر ڈالیے تو پتہ چلے گا کہ یہاں ۵۲ ہزار کتابیں دو لاکھ دس ہزار ایک سو چھیالیس رسالے ۹۳ اٹلس دو ہزار چھ سو اکیانوے مکمل نقشے گیارہ ہزار تین سو اٹھتر ورقی نقشے اور دو ہزار ایک سو اناسی موسیقی سے متعلق کتابیں اور رسالے وغیرہ موصول ہوئے۔ علاوہ ازیں مجموعی طور پر ایک لاکھ اناسی ہزار چھہتر اخبارات کی کاپیاں کولنڈیل بھیجی گئیں جو دراصل چار ہزار آٹھ سو چوالیس اخبارات کے سال بھر کے فائل تھے۔

گذشتہ سال یعنی سنہ ۱۹۵۰ء میں ساڑھے سات لاکھ کے لگ بھگ لوگ برٹش میوزیم میں آئے ایک لاکھ تینتالیس ہزار لوگوں نے یہاں آکر مطالعہ کیا اور پانچ ہزار سات سو اٹھانوے اشخاص مخصوص اخبارات کے فائل دیکھنے کی غرض سے کولنڈیل گئے آج سے دو سو سال قبل بھی یہاں آنیوالوں کی رہنمائی کے لیے گائیڈ ہوا کرتے تھے اور جب بھی ان سے کوئی فیس نہیں لی جاتی تھی، اسی طرح یہ طریقہ آج بھی لاگو

ــــ

پاکستان میں فنی تعلیم کی توسیع

یونسکو اقوام متحدہ کے بین الاقوامی ادارۂ تعلیم نے لندن میں تعلیم سے متعلق جو بین الاقوامی سالنامہ شائع کیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سنہ ۱۹۵۵ء میں بشمول پاکستان متعدد ملکوں میں فنی ماہرین کی کمی دور کرنے کی غرض سے کئی اقدامات تیز تر کر دیے گئے ہیں۔ جن ۱۶ ممالک کا ذکر کیا گیا ہے ان میں پاکستان بھی شامل ہے۔ جہاں نئے نئے کالج قائم ہونے کے علاوہ نئے کورس شروع کیے گئے ہیں۔ سالنامہ میں جسے ہز میجسٹی اسٹیشنری آفس نے شائع کیا ہے۔ کہا گیا ہے کہ ایران نے پیشہ ورانہ اور زراعتی تعلیم کے لئے اپنے طلباء کی تعداد دگنی کر دی ہے۔

سنہ ۱۹۵۵ء کی ایک اور قابل ذکر بات یونیورسٹیوں اور دیگر اعلیٰ تعلیمی اداروں میں طلباء کی تعداد میں اضافہ ہے۔ چند ایک ملکوں کے ثانوی اسکولوں میں بھی طلبا کی تعداد میں قابل قدر اضافے دیکھنے میں آئے۔

کتابوں کی اشاعت کے اصولوں کا مطالعہ

مسٹر آر، اسلام، آکسفورڈ یونیورسٹی پریس ڈھاکہ کے برانچ منیجر اور مسٹر عزیز احمد کنوینر اردو ٹرسٹ آج کل برطانیہ میں کتابوں کی طباعت کے کاروبار اور طریقوں کا مطالعہ کر رہے ہیں۔ یہ لوگ دراصل یونسکو کے ایک منصوبہ کے تحت نیشنل بک لیگ لندن کی زیر نگرانی چار ماہ کا کورس کر رہے ہیں۔ یونیسکو کے اس منصوبہ کا مقصد اشاعتی اداروں (بک ٹرسٹس) سے متعلق نظم ونسق اور طریقہ کار کے مطالعہ کو فروغ دینا ہے۔ یہ پاکستانی طلبہ یہاں کے اشاعتی اداروں اور کاغذ بنانے کے کارخانوں کا دورہ کر چکے ہیں۔ وہ یہاں کے ناشروں، بلاک بنانے والوں اور جلد سازوں سے بھی ملے ہیں۔ وہ لائبریریوں کے منتظمین کی انجمن کے اجلاس میں بھی شریک ہوئے جو برائٹن میں منعقد ہوا تھا۔ اس کے علاوہ انھوں نے گلاسکو ایڈنبرا، آکسفورڈ اور کیمبرج کے اسکولوں اور کالجوں کا بھی دورہ کیا۔

مسٹر احمد ڈھاکہ مارننگ نیوز کے ایک سابق صحافی ہیں جو ایسے طباعتی طریقوں میں دلچسپی لے رہے ہیں جن کو وہ اردو ٹرسٹ کے تقاضوں سے ہم آہنگ کر سکیں۔ اس ٹرسٹ کو حکومت پاکستان مالی امداد دیتی ہے اور یہ تفسیر منافع کے اردو کی کلاسیکل کتابیں شائع کرتا ہے۔